مقالاتِ

شہیدِ لاہور

مولانا سید محمد جعفر زیدی (شہید)

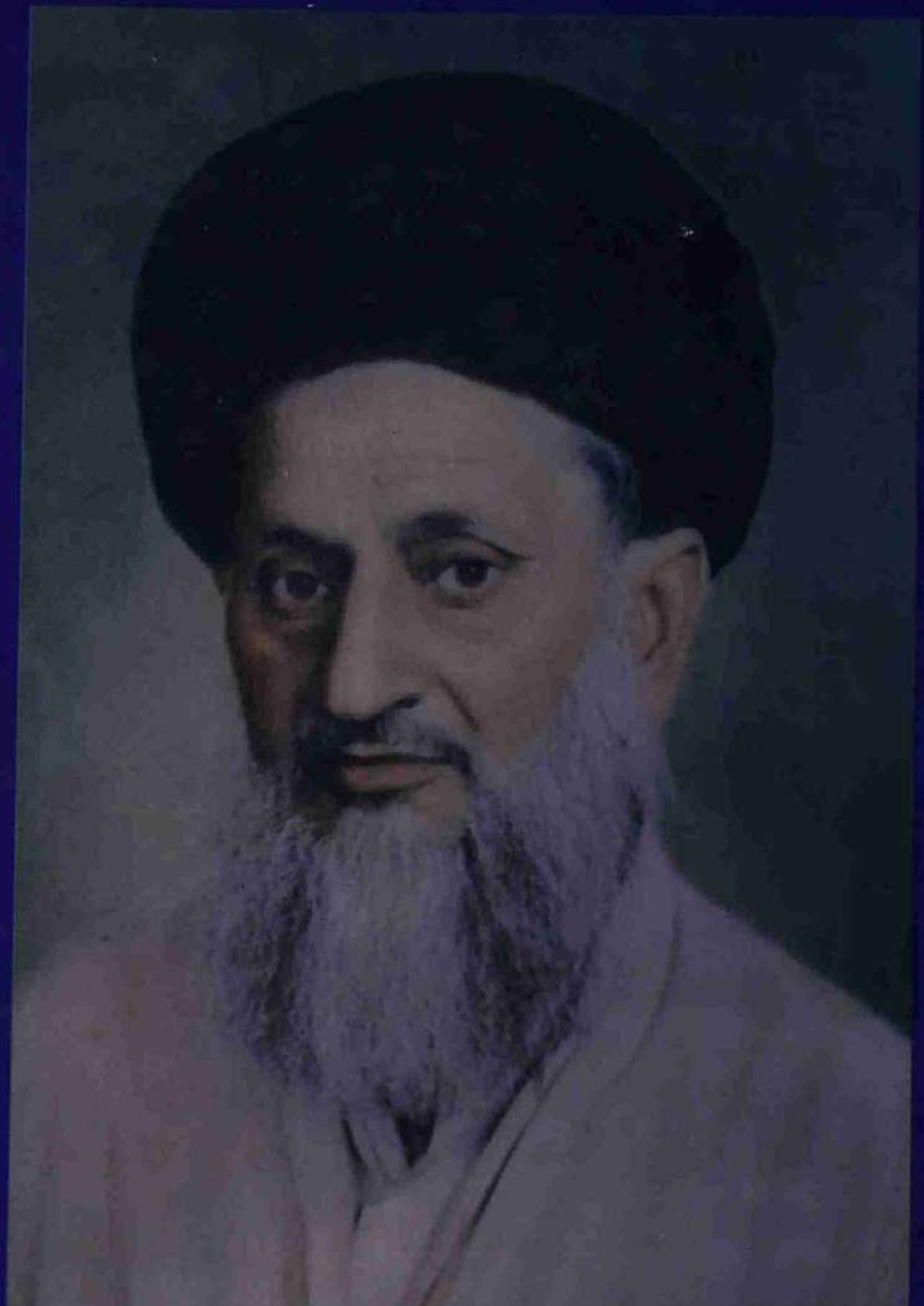

محفوظ بک ایجنسی
مارٹن روڈ
کراچی
Tel: 4124286-4917823 Fax: 4312882

وَلَا تَحۡسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوافِی سَبِيلِ اللهِ اَمۡوَاتاً بَلۡ اَحۡيَآءٌ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ يُرۡزَقُوۡنَ •

مقالاتِ

شہیدِ لاہور

مولانا سید محمد جعفر زیدی (شہید)

ناشر : ڈاکٹر سید محمد نصیر عالم زیدی

ترتیب و تدوین : سید وحید الحسن ہاشمی

نام کتاب : شہیدِ لاہور

مصنف : مولانا سید محمد جعفر زیدی شہید

سالِ اشاعت : ۲۰۰۱ء

مطبع : اظہار سنز ریٹیگن روڈ' لاہور

ناشر : ڈاکٹر سید محمد نصیر عالم زیدی

کمپوزنگ : تصور حسین' 4-بی رائل پارک' لاہور

ہدیہ : دو سو روپے

مقام اشاعت : لاہور

ملنے کے پتے

1- امامیہ مشن پاکستان' 8-بی شمع پلازا' فیروز پور روڈ' لاہور

2- افتخار بک ڈپو' مین بازار اسلام پورہ' لاہور

3- حق برادرز' انار کلی' لاہور

4- رحمت اللہ بک ایجنسی' کھارادر کراچی

5- احمد اسٹیشنرز' انچولی کراچی

حکیم مولوی سید محمد عباس

(مولانا کے والد)

حکیم مولوی سید محمد علی صغیر

(مولانا کے دادا)

انتساب

علومِ محمدؐ و آلِ محمدؐ کے شیدائیوں

کے نام

مولانا کا استدلالی اسلوب نگارش

علیؑ تو حجت اللہ، ولی اللہ، نفسِ رسولؐ، امامِ برحق، امیر المومنین، مقرب بارگاہِ ذوالجلال، شہید اور زندہ جاوید ہیں مدد تو ہم ہر کس و ناکس سے مانگتے ہیں۔ شوہر زوجہ سے، زوجہ شوہر سے، اولاد سے، ماں باپ سے، احباب سے، راستہ چلتے سے، حکام سے، رعایا سے، عالم کا نظام ہی ایک دوسرے کے تعاون سے وابستہ ہے اگر اللہ کے سوا اور کسی سے مدد مانگنا کفر ہے تو معاذ اللہ پہلا کافر خود خدا ہوا کیونکہ وہ اپنے بندوں سے مدد مانگتا ہے۔ ان تنصروا اللہ ینصرکم (آیت قرآنی) یعنی اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا۔

اتنا ہی نہیں بلکہ خدائے تبارک و تعالیٰ نے مومنین کو بھی حکم دیا کہ وہ نجات چاہتے ہیں تو میرے رسولؐ کی مدد اور نصرت کریں فرماتا ہے فالذین آمنوا بہ وعزروہ ونصروہ ...... اولئك هم المفلحون (آیت قرآنی) یعنی نجات پانے والے وہ ہیں جو رسولؐ پر ایمان لائے اور رسولؐ کی اعانت کی اور رسولؐ کی جنہوں نے نصرت کی۔ رسولؐ کی مدد کرنے ہی کی بناء پر مومنینِ مدینہ کا لقب انصار ہوا۔

حضرت عیسیٰ نے بھی اپنی قوم سے مدد مانگی اور فرمایا من انصاری الیٰ اللہ۔ یعنی تم میں کون لوگ راہ خدا میں میرے مددگار ہیں۔ حضرت ذوالقرنین نے بھی لوگوں سے فرمایا اعینونی بقوۃ (آیہ قرآنی) یعنی تم لوگ اپنی طاقت سے میری مدد کرو۔

کفر ہے غیر خدا کی پرستش کرنا اور اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو معبود ماننا اسی طرح کفر ہے غیر خدا کو معبود مان کر اس سے مدد چاہنا اسی کی طرف اشارہ ہے۔ ایاك نعبد وایاك نستعین ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں۔

فہرست

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
1-	مولانا سید محمد جعفر زیدی (شہیدِ) ڈاکٹر سید محمد نصیر عالم	7
2-	پیش گفتار	20
3-	تقریظ (از علامہ طالب جوہری مدظلہ)	24
4-	تاثرات	26
5-	اہل واہلبیت	37
6-	حیات حضرت عیسیٰ مسیح علیہ السلام	113
7-	ذبح عظیم	120
8-	محسنۂ اسلام	141
9-	سورۂ دہر کے بارے میں	149
10-	وجود انساں	161
11-	جمع بین الصلوتین اور اوقات نماز	168
12-	جناب سید الشہدا اور درس ایمان و عمل	185
13-	بعثتِ سیدِ انبیاء	199
14-	امام زماں کا وجود و ظہور	205
15-	کلام انیس	219

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
16-	تعارف...... شہیدِ انسانیت	225
17-	ثانئ زہرا	238
18-	صحابیت اور قرآن	277
19-	احقاقِ حق یعنی سوال وجواب	393
20-	مولانا کے خطوط (از سید وحید الحسن ہاشمی)	447
21-	شہیدِ لاہور کی آخری نامکمل تحریر	452
22-	عکس تحریر مولانا سید محمد جعفر زیدی شہید	462
23-	منظوم نذرانۂ عقیدت	463
24-	شہیدِ راہِ خدا (از سید محمد ثقلین بخاری)	482

مولانا سید محمد جعفر زیدی (شہید)

ڈاکٹر نصیر عالم زیدی

والد مرحوم مولانا سید محمد جعفر زیدی 1908ء میں میمن سادات ضلع بجنور (ہندوستان) میں پیدا ہوئے۔

آپ کا شجرۂ نسب چوتھے امام حضرت امام زین العابدین کے بیٹے حضرت زید شہید سے ملتا ہے۔ آپ کے والد حکیم مولوی سید محمد عباس صاحب تھے جن کے پاس جمعہ وجماعت کی امامت کا اجازہ تھا اور اپنے علاقے کے مشہور حکیم تھے۔ آپ کچھ عرصہ طبیہ کالج دہلی میں استاد بھی رہے۔ والد مرحوم کے دادا حکیم مولوی سید محمد علی صغیر مرحوم ایک عالم دین ہونے کے ساتھ ایک نامور حکیم بھی تھے اور دور دور تک علاج کے لئے بلائے جاتے تھے۔ حکیم مولوی علی صغیر کے بڑے بھائی حکیم علی امیر بھی اپنے زمانے کے مشہور حکیم تھے۔ حکیم مولوی علی صغیر کے والد عنایت علی مرحوم بھی حکیم تھے۔ اس لئے ہمارا خاندان "حکیموں کا خاندان" کہلاتا تھا۔ اس طرح علم وحکمت کا خزانہ والد مرحوم کو ورثے میں ملا تھا۔ یہ تمام بزرگ حضرات صاحبان جائیداد بھی تھے۔

آپ کی زیادہ تر تعلیم مدرسہ منصبیہ میرٹھ میں ہوئی۔ آپ مدرسے کے ہوسٹل میں رہتے تھے۔ آپ کے اُستاد مجتہد قبلہ یوسف حسین مرحوم امروہوی تھے۔ والد مرحوم نے مدرسہ منصبیہ میں پڑھ کر یوپی بورڈ سے ادیب فاضل کی سند حاصل کی اور قبلہ یوسف حسین نے جمعہ وجماعت کی امامت کا اجازہ عطا فرمایا۔ تعلیم سے فارغ

ہو کر اپنے وطن میمن سادات تشریف لے آئے۔ تقریباً 18 سال کی عمر میں آپ کی شادی سید احسان حسین مرحوم کی اکلوتی بیٹی عزیز بانو سے ہوئی۔

والد مرحوم نے کچھ عرصہ افغانستان کے سفارت خانہ دہلی میں مترجم کی حیثیت سے کام کیا پھر دہلی کے ایک گورنمنٹ ہائی اسکول میں مدرس بھی رہے۔ ملازمت کی پابندی طبیعت پر گراں گزری اس لئے دونوں ملازمتیں چھوڑ دیں اور پھر وطن واپس تشریف لے آئے۔

ہماری دادی قدیر النساء مرحومہ بھی ایک بڑی زمیندار تھیں۔ والد مرحوم زمینداری کے معاملات میں اپنی والدہ کا ہاتھ بٹاتے رہے۔ ایک دفعہ میمن میں ایک مجلس میں ایک مدعو شدہ ذاکر نے عین وقت پر آنے سے معذرت کر لی۔ مجلس کا اعلان ہو چکا تھا۔ بزرگوں نے والد مرحوم سے مجلس کی ذاکری کے لئے اصرار کیا۔ بزرگوں کے بے حد اصرار پر مجبوراً آپ منبر پر تشریف لے گئے اور زندگی کی پہلی مجلس پڑھی جو بہت زیادہ مقبول ہوئی اور یوں مجلس پڑھنے کا سلسلہ شروع ہو گیا جو تاحیات قائم رہا دور دور سے مجالس پڑھنے کے لئے بلایا جاتا رہا۔

1930ء میں ایک بیٹے کی ولادت ہوئی جن کا تاریخی نام میرے دادا نے محمد ظہیر عالم (1348ھ) رکھا۔ 23 جنوری 1933ء کو دوسرے بیٹے کی ولادت ہوئی جن کا نام محمد نصیر عالم اور تاریخی نام قمر اعظم (1351ھ) رکھا گیا۔ ان کے علاوہ دو بیٹیاں بھی پیدا ہوئیں جو بہت ہی کم عرصہ زندہ رہیں۔

ایک دفعہ آپ سہارنپور میں مجالس پڑھنے گئے۔ وہاں بریلی کے ایک بزرگ کربلائی حسین صاحب نے والد سے بریلی میں پیش نمازی قبول کرنے کے لئے درخواست کی جسے آپ نے قبول کر لیا۔ اس طرح 1934ء میں والد مرحوم مع اہل و عیال بریلی تشریف لے آئے۔ بریلی کے ایک علاقہ میں جو 'کالا امام باڑہ' کے نام سے مشہور تھا' قیام پذیر ہوئے۔ بریلی میں 22 سال کا عرصہ انتہائی شاندار اور پروقار طریقہ سے گذارا۔ بریلی کے مومنین خصوصاً کنبوہ حضرات نے دل و جان سے محبت و تکریم و

تعظیم کی۔ یہ لوگ بے شک بہت علم دوست و قدر شناس، محمدؐ و آل محمدؐ کے شیدائی اور زبردست عزادار حسین تھے۔

والد مرحوم کے ایک بڑے بھائی محمد ہاشم اور دو چھوٹے بھائی محمد قیصر اور محمد حیدر تھے جو دو بہنیں حیات رہیں ان میں والد مرحوم سے بڑی بہن کنیز فاطمہ اور چھوٹی بہن افضال فاطمہ تھیں۔ دونوں چھوٹے بھائی والد مرحوم سے بہت چھوٹے تھے۔ والد مرحوم اپنے چھوٹے بھائیوں سے اولاد کی سی محبت کرتے تھے۔ دونوں چھوٹے بھائیوں کو تعلیم کی غرض سے بریلی اپنے ساتھ لے آئے۔ والد مرحوم اپنے چھوٹے بھائیوں سے اتنی محبت اور پیار کرتے تھے کہ بہت کم بریلی والوں کو یہ علم تھا کہ یہ دونوں بھائی ہیں۔ اکثر لوگ ہم چاروں کو والد مرحوم کے بیٹے ہی سمجھتے تھے۔ وقت کے ساتھ ساتھ والد مرحوم کی مقبولیت بہت بڑھتی گئی اور دور دور سے مجالس کی ذاکری کے لئے دعوتیں آنے لگیں۔ آپ کی مجالس میں اہل سنت حضرات بھی خاصی تعداد میں شرکت کرتے تھے اور بہت محظوظ ہوتے تھے۔ مجھے یاد ہے ایک بہت عالم و فاضل اہل سنت حکیم بڑی پابندی سے آپ کی مجالس میں آتے تھے۔ ایک دفعہ فرمانے لگے ”مولانا کی مجلس میں گلاب کے پھول جمع کرتا ہوں کبھی کبھی کوئی چھوٹا موٹا کانٹا بھی لگ جاتا ہے مگر اس کا بھی اپنا ایک مزا ہوتا ہے“۔

1945ء میں جب برصغیر کے مسلمانوں میں مسلم لیگ کی مقبولیت بڑھی اور مطالبۂ پاکستان نے زور پکڑا تو والد مرحوم بہت پرجوش انداز میں مسلم لیگ اور مطالبۂ پاکستان کی حمایت کرنے لگے۔ اسی عرصے میں ایک دفعہ جب قائداعظم محمد علی جناح بریلی تشریف لائے تو والد مرحوم کا تحریر کردہ سپاس نامہ پیش کیا گیا۔

بریلی کے مومنین حضرات ہی نہیں بلکہ سنی اور ہندو بھی آپ کی بڑی عزت کرتے تھے۔

1947ء میں میرے بڑے چچا محمد قیصر صاحب نے بریلی کالج سے B.Sc کیا اور قیام پاکستان کے فوراً بعد وہ پاکستان تشریف لے آئے۔ قیام پاکستان کے بعد

ہندوستان میں بدامنی کی لہر دوڑ گئی تھی اور آئے دن ہندو مسلم فسادات ہونے لگے تھے اور فوراً ہی کشمیر میں جنگ بھی شروع ہو گئی اس زمانے میں ہمارے یہاں تو ریڈیو نہیں تھا۔ گھر سے کافی فاصلے پر ایک صاحب کے یہاں ریڈیو تھا والد مرحوم بڑی پابندی کے ساتھ بہت خاموشی سے وہاں کشمیر کی خبریں ریڈیو پاکستان سے سننے جاتے تھے۔

قیام پاکستان کے بعد آئے دن کے فسادات کی وجہ سے ہندوستان کے مسلمان اپنے آپ کو ہر وقت غیر محفوظ سمجھتے تھے۔ اس زمانے میں نواب رام پور کی طرف سے رام پور کے لئے پیش نمازی کی دعوت آئی جو والد مرحوم نے جان و مال کی حفاظت کے لئے قبول کر لی اور بریلی سے رام پور تشریف لے گئے۔ چند ماہ رام پور رہے مگر نواب صاحب کی پابندیاں طبع نازک پر گراں گزریں اور پھر بریلی واپس آ گئے۔

عشرۂ محرم کی مجالس کے لئے آپ زیادہ تر بریلی سے باہر ہی تشریف لے جایا کرتے تھے۔ آپ نے ہندوستان میں محرم کے عشرے زیادہ تر میرٹھ، فیروزپور، مراد آباد، فیض آباد، کلکتہ و بہاولنگر وغیرہ میں پڑھے۔

1953ء میں آپ کے بڑے بیٹے محمد ظہیر عالم نے اُردو میں M.A کیا۔ رزلٹ آنے کے صرف ایک ہفتہ بعد جوان اور لائق و فاضل بیٹے نے 23 سال کی عمر میں باپ کو داغ مفارقت دیا۔ یوں تو ہر باپ کو اپنے بیٹوں سے محبت ہوتی ہے لیکن والد مرحوم کو جو اپنے بچوں سے بے پناہ محبت تھی اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ آپ نے اپنے بیٹے کی علالت کے زمانہ میں جس بے جگری سے خدمت کی وہ بیان سے باہر ہے۔ ایسی صورت میں جوان بیٹے کی موت پر باپ کی جو حالت ہونی چاہئے وہ ظاہر ہے مگر اس موقع پر انہوں نے جس صبر و استقلال اور برداشت کا مظاہرہ کیا لوگ دیکھ کر حیران و ششدر رہ گئے۔ رمضان اور سخت ترین گرمی کے دو بجے دن بیٹے کا انتقال ہوا۔ انہوں نے ارتجالاً تقریباً مغرب کے وقت تدفین کرا دی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ روزہ کی حالت میں جوان بیٹے کی نماز جنازہ خود پڑھائی اور اپنے پارۂ جگر کی میت کو متواتر کاندھا دیتے ہوئے قبرستان گئے۔ مجھے یاد ہے اس موقع پر کسی نے کہا کہ قبلہ نماز جنازہ پڑھانے کے

لئے آپ کسی اور کو حکم دے دیتے تو انہوں نے فرمایا اصل میں نمازِ جنازہ دعاء مغفرت ہے۔ باپ سے زیادہ خلوص سے بیٹے کے لئے دعاء مغفرت کون کر سکتا ہے۔ بیٹے کے سوئم کی مجلس بھی آپ نے خود پڑھی۔

جوان بیٹے کی موت کو ابھی ایک مہینہ بھی نہیں گزرا تھا کہ والد صاحب کے کڑیل جوان بھائی محمد حیدر نے 25 سال کی عمر میں M.A.(Economics) L.L.B. کرنے کے فوراً ہی بعد دارِ فانی سے کوچ کیا اور والد مرحوم کے دل پر ایک اور کاری زخم لگایا۔

چھوٹے چچا کے انتقال کے چند ماہ بعد میرے دادا حکیم مولوی محمد عباس مرحوم کا بھی انتقال ہو گیا۔ مجھے یاد ہے کہ دادا اور دادی میمن سادات میں رہتے تھے جبکہ ہم بریلی میں تھے۔ والد مرحوم مجلس پڑھنے کے لئے بریلی سے باہر تشریف لے گئے تھے۔ رات کا سفر کر کے صبح بریلی واپس تشریف لائے تو کافی پریشان تھے۔ آپ نے بتایا میں نے صبح کی نماز ٹرین میں پڑھی اس کے بعد میں کچھ کہہ نہیں سکتا کہ جاگ رہا تھا یا کچھ غنودگی ہو گئی تھی میں نے دیکھا کہ گاڑی کے کمپارٹمنٹ کے ایک دروازے سے میرے والد داخل ہوئے اور مجھے دیکھ کر مسکراتے ہوئے دوسرے دروازے سے باہر چلے گئے۔ اسی دن بعد دوپہر وطن سے ٹیلی گرام ملا کہ وطن میں دادا ابا کا انتقال ہو گیا۔ والد صاحب اس خواب کے متعلق کہا کرتے تھے کہ ابا کی روح انتقال کے بعد مجھ سے ملنے آئی۔

اگرچہ انہوں نے ان اموات کے حادثات کا بڑے صبر اور جواں مردی سے مقابلہ کیا تھا مگر دل ٹوٹ چکا تھا۔ اُس وقت آپ کی عمر 45 سال تھی مگر اپنی زندگی سے بھی مایوس ہونے لگے تھے اور گھر بھی خالی ہو گیا تھا۔ اِن حالات کی بنا پر 1954ء میں جبکہ میں B.Sc میں پڑھ رہا تھا۔ انہوں نے میری شادی اپنے بڑے بھائی محمد ہاشم صاحب کی بیٹی خوشنود فاطمہ سے کر دی۔ اس موقع پر انہوں نے مجھ سے کہا تھا "بیٹے میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہاری شادی تمہاری پڑھائی میں انشاء اللہ رکاوٹ نہیں بنے گی

اور تم جتنا چاہے پڑھ لینا۔ اس وعدہ کو انہوں نے نباہا اور میری بیوی نے بھی پوری طرح میرا ساتھ دیا۔ میں نے شادی کے بعد ہی M.Sc, B.Sc اور Ph.D کیا۔

میں نے 1955ء میں B.Sc کیا۔ امتحان کے فوراً بعد انہوں نے مجھے کھوکھرا پار (سندھ) کے راستہ مستقل طور پر پاکستان میرے چچا کے پاس ملتان بھیج دیا۔ کچھ دنوں بعد پاکستان کے ویزہ پر میری بیوی اور میری چچی کے ساتھ آپ بھی پاکستان تشریف لائے۔ آپ کے آنے کے کچھ ہی دنوں بعد محرم آگیا۔ آپ نے عشرۂ محرم ملتان میں مہاجرین کے امام بارہ میں پڑھا۔ یہ آپ کا پاکستان میں پہلا عشرۂ محرم تھا۔ مجالس بہت پسند کی گئیں اور مقبول ہوئیں اور اسی عشرۂ محرم میں اگلے سال کے عشرہ محرم کے لئے شاہ گردیز (ملتان) میں وعدہ لے لیا گیا۔

کچھ دن پاکستان میں قیام کر کے آپ ہندوستان واپس تشریف لے گئے۔ ہندوستان میں کچھ زمینوں اور مکانات وغیرہ کا بندوبست کر کے 1956ء میں بمع اہلیہ مستقل طور پر پاکستان ہجرت کر کے آگئے۔ ان دنوں میرے پھوپھا ڈاکٹر منظور عباس مزنگ ڈسپنسری (لاہور) کے انچارج تھے۔ اس لئے پاکستان آکر والد مرحوم نے اپنے بہنوئی کے یہاں لاہور ہی میں قیام کیا۔ مجھے M.Sc کرنے کے لئے پشاور یونیورسٹی بھیج دیا جہاں میں ہوسٹل میں رہا۔

ماہِ رمضان 1957ء میں شیعہ جامع مسجد کرشن نگر (اسلام پورہ) کے منتظمین نے مستقل پیش نمازی کے لئے درخواست کی جو والد مرحوم نے قبول کر لی۔ والد مرحوم میری والدہ، میری بیوی اور دو بچیوں شاہانہ طلعت اور انجم جبیں کے ساتھ مسجد کے مکان جو مسجد کے عقب میں دکانوں پر واقع ہے منتقل ہو گئے۔ مکان بہت چھوٹا اور خصوصاً گرمیوں میں بہت تکلیف دہ تھا مگر کبھی شکایت نہیں کی اور اسی چھوٹے سے مکان میں تمام بچوں کے ہمراہ تیرہ چودہ سال مقیم رہے۔ جب میں پہلی دفعہ اس مکان میں پشاور سے تین چار دن کے لئے چھٹی پر آیا اور نماز پڑھنے لگا تو والد مرحوم نے کہا بیٹے یہاں نماز قصر نہ پڑھنا اب لاہور کو اپنا وطن سمجھو۔

1959ء میں پشاور یونیورسٹی سے کیمسٹری میں M.Sc کرنے کے فوراً بعد ہی مجھے پشاور یونیورسٹی میں لیکچرر رکھ لیا گیا۔ اس خبر سے جدائی کے تصور سے والد صاحب کو بہت رنج ہوا مگر یہ الفاظ کہے خیر یہ اطمینان ہے کہ نصیر عالم کو ایسی ملازمت ملی ہے کہ اس کے پاس جا کر کھانا کھاتے ہوئے یہ فکر نہیں ہو گی کہ یہ کمائی حلال کی ہے یا نہیں۔

ہندوستان سے لائے ہوئے قلیل سرمایہ سے 1961ء میں ایک رہائشی قطعہ اراضی ید ھشٹر روڈ (عمر روڈ۔ کرشن نگر) پر ہادی حسن ایڈووکیٹ مرحوم سے میرے نام پر خریدا۔ اپنی نگرانی میں اُس پر مکان کی تعمیر شروع کرائی۔ مکان کی تعمیر میں کافی پریشانیاں اور جانفشانی ہوئی۔ اللہ اللہ کر کے 1962ء میں مکان کی تعمیر مکمل ہوئی۔ مکان کا نام الفانوس رکھا اور یہ قطعہ ارشاد فرمایا:

یہ بخشش قدوس مبارک ہو نصیر
یہ مسکن مانوس مبارک ہو نصیر
اللہ رکھے تم کو مرے چشم و چراغ
اور تم کو یہ فانوس مبارک ہو نصیر

مکان کے سامنے ماتھے پر یہ شعر لکھوایا:

وسیلۂ منِ عاصی بہ دو جہاں یارب
محمدؐ است علیؑ فاطمہؑ حسنؑ و حسینؑ

مکان کی تعمیر کے سلسلہ میں کچھ مقروض ہو گئے تھے اس لئے فوراً کرائے پر دے دیا۔ کرایہ داروں نے کچھ دنوں بعد بہت پریشان کیا۔ کرایہ دینا بند کر دیا اور مکان خالی بھی نہیں کرتے تھے نوبت طویل مدت تک مقدمہ کی آئی۔

اگرچہ میری ملازمت 1959ء میں پشاور یونیورسٹی میں ہو گئی تھی مگر 1963ء تک میری بیوی اور میری چاروں بچیاں والد مرحوم کے پاس لاہور ہی رہیں۔ وہ اپنی چاروں پوتیوں سے بے انتہا محبت کرتے تھے جس کی مثال مجھے اس دنیا میں نظر

نہیں آتی۔ نتیجتاً میری چاروں بیٹیوں کو بھی اپنے دادا سے میرے مقابلہ میں کہیں زیادہ محبت تھی۔ میری بیوی نے بھی اپنے چچا یعنی اپنے سسر کی بے مثال خدمت کی۔

بہت جلد اہالیان لاہور والد مرحوم کے علم و فضل، پرہیزگاری اور متانت کے مداح اور گرویدہ ہوگئے۔ آپ زندگی بھر گروہ بندی اور ہر قسم کی سیاست سے بالکل الگ رہے۔ منطق اور قرآن فہمی میں آپ کا جواب نہ تھا۔ ہر مسئلہ کا بہت واضح دوٹوک الفاظ میں فیصلہ کن جواب دیتے تھے۔ کسی بھی مسئلہ میں گنجلک بات نہ کرتے تھے۔ لاہور میں مسجد مذکورہ سے منسلک ہونے کے بعد جہاں تک مجھے یاد ہے آپ نے عشرۂ محرم لاہور سے باہر نہیں پڑھا۔ عشرۂ محرم کے علاوہ مجالس پڑھنے باہر جاتے رہتے تھے مگر حتی الامکان کوشش کرتے تھے کہ جمعہ کو نمازِ جمعہ کے لئے لاہور ہی میں رہیں۔ آپ تاحیات پیامِ عمل اور درسِ عمل کے سرپرست اعلیٰ رہے۔ آپ باقاعدگی سے سیٹھ برادران اور موچی دروازہ میں درس قرآن دینے جاتے تھے۔ اکثر درسِ قرآن میں اپنی سب سے چھوٹی پوتی بشریٰ کو اپنے ساتھ لے جایا کرتے تھے۔ اب تک کچھ بزرگ بشریٰ کو اس حوالے سے یاد کرتے ہیں۔ والد صاحب جب کہیں جانے کے لئے تیار ہوتے تھے تو چھوٹی سی بشریٰ آپ کے لباس کو درست کرنے کی کوشش کرتی تو کبھی آبدیدہ ہو کر سوز و سلام کا یہ شعر پڑھا کرتے تھے:

سکینہ جھاڑ رہی تھی عبا کے دامن کو
حسین جھکے کھڑے تھے جھکائے گردن کو

آپ نے درسِ عمل اور پیامِ عمل کے لئے بہت سے گرانقدر و نادر اور علم افروز مضامین لکھے جو مومنین میں بہت مقبول ہوئے۔ مولانا علی نقی صاحب قبلہ کی مشہور کتاب شہیدِ انسانیت کا تعارفی دیباچہ لکھا جسے علم دوست حضرات نے بہت ہی سراہا۔

1964ء میں والد مرحوم اپنی والدہ اور اپنی اہلیہ کے ہمراہ زیاراتِ مقدسہ کے لئے ایران اور عراق تشریف لے گئے۔ اسی سال مجھے بڑی مشکل سے میرے بہت اصرار پر Ph.D کے لئے لندن جانے کی اجازت دی۔ تین سال کی جدائی کے خیال

سے بہت اُداس اور پریشان تھے۔ میری بیوی اور چاروں بچیاں حسبِ معمول والد صاحب کے پاس ہی رہیں۔

1967ء میں کیمسٹری میں لندن یونیورسٹی سے Ph.D کر کے واپس آیا اس وقت بھی مسجد کے اسی چھوٹے مکان میں مقیم تھے۔ کچھ دنوں بعد مسجد کے مشرق میں مسجد کا ایک اور مکان تعمیر ہوا جو قدرے پہلے مکان سے بڑا تھا۔ وہ اس نئے مکان میں منتقل ہو گئے۔ میں 1968ء میں اپنی اہلیہ اور دو بڑی بچیوں کو پشاور لے گیا جبکہ دو چھوٹی بچیاں والد صاحب کے پاس لاہور رہیں۔

1973ء میں والد مرحوم اور والدہ صاحبہ حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے۔ جنوری 1974ء میں والد مرحوم اپنی پیاری والدہ کے پیار سے محروم ہو گئے۔ انہیں اپنی والدہ سے بہت زیادہ محبت تھی۔ ظہور جارچوی صاحب نے مندرجہ ذیل قطعہ تاریخ کہا جو والد صاحب کو بہت پسند آیا۔

خیر النساء کے پاس قدیر النساء ہے آج

میں 1974ء میں سلیمانیہ یونیورسٹی (عراق) چلا گیا جہاں 1978ء تک رہا۔ میرے بچے ایک بار پھر والد کے پاس لاہور رہے۔ غالباً 1976ء میں طویل مقدمہ کے نتیجہ میں اور کافی پریشانی اور نقصان کے بعد اپنا مکان کرایہ داروں سے خالی ہوا۔ انہوں نے مکان کی مرمت اور کچھ مزید تعمیر کرائی۔ 1977ء میں اپنے مکان میں منتقل ہو گئے۔

اگست 1978ء میں انہوں نے میری بڑی بیٹی شاہانہ کی شادی اپنے چھوٹے بھائی محمد قیصر صاحب کے چھوٹے بیٹے محمد اظہر سے کر دی۔ شادی کا سارا انتظام خود ہی کیا جبکہ میں ایک مہمان کی طرح شریک ہوا۔ میں 1978ء عراق سے یونیورسٹی بنغازی (لیبیا) چلا گیا۔ 1979ء میں انہوں نے اپنی دوسری پوتی انجم جبیں کی شادی منظور عباس نقوی صاحب کے بڑے بیٹے مسعود عباس کے ساتھ کی اور اس شادی کے بھی تمام انتظامات خود ہی کئے۔

1979ء میں جب ایران میں اسلامی انقلاب آیا تو آپ انقلابِ ایران سے بہت خوش تھے اور انقلاب کے زبردست حامی تھے۔ آیت اللہ خمینی کے بہت مداح تھے۔ مسجد میں بڑے جوش و خروش، خلوص اور انہماک کے ساتھ انقلاب ایران کی کامیابی اور آیت اللہ خمینی کی طویل عمر کے لئے دعائیں کراتے تھے۔ اس قسم کے اشارے بھی ملے کہ یہ بات ہماری اُس وقت کی حکومت کو شاید پسند نہ تھی۔ مگر اِن باتوں کو بالکل خاطر میں نہ لاتے ہوئے ایران سے اپنی محبت اور خلوص کا اظہار کرتے رہے۔

1980ء میں اپنی تیسری پوتی انجمن آراء کی منگنی اظہار حسن ایڈووکیٹ مرحوم کے بیٹے محمد ہادی سے کر دی۔ اس موقع پر آپ نے خود حدیثِ کساء پڑھی اور محمد ہادی کے امام ضامن باندھا۔

میں جب 1980ء میں موسم گرما کی تعطیلات میں لیبیا سے لاہور آیا تو ایک دن مجھ سے فرمانے لگے کہ بیٹے ہر خبر کے لئے تمہیں تیار رہنا چاہئے۔ میں یہ جملہ سن کر بہت پریشان ہوا کیونکہ اشارہ سمجھ گیا تھا۔ شہادت سے دو تین دن پہلے میری بیٹی انجم جبین نے خواب میں دیکھا کہ ”میں نماز پڑھ رہی ہوں تسبیح اٹھائی تو اس پر خون تھا جو میری انگلیوں پر لگ گیا۔ بی بی فاطمہ زہراؑ آئیں تو میں نے اُن سے اپنی اس پریشانی کا اظہار کیا تو انہوں نے کہا بیٹی ڈرو نہیں یہ تو شہید کا خون ہے“ انجم نے یہ خواب والد صاحب سے بیان کیا تو آپ نے فرمایا جب بی بی نے خود تمہیں تسلی دے دی ہے تو کیوں پریشان ہوتی ہو۔ ایک دن میری بڑی بیٹی شاہانہ سے اپنے پاس رکھی ہوئی کچھ امانتوں کی تفصیل بتانے لگے جب شاہانہ پریشان ہوئی تو اسے تسلی دی اور بات کو ٹال گئے۔ ان باتوں سے معلوم ہوتا ہے ان کو اپنی شہادت کے اشارے مل گئے تھے۔ ابھی مجھے لیبیا واپس گئے ہوئے تقریباً دو ماہ ہی ہوئے تھے کہ وہ خبر جس کے لئے انہوں نے مجھے ذہنی طور پر تیار کیا تھا بالآخر پہنچ گئی۔ 3 نومبر 1980ء مطابق 24 ذی الحجہ 1400ھ بروز دوشنبہ مسجد میں نمازِ مغربین پڑھائی۔ نماز کے بعد مسجد ہی میں عید مباہلہ کی محفل میں محمد و آل محمد کے فضائل بیان کئے اور پھر ایک مومن کے گھر نیاز میں شرکت کر کے گھر

واپس آئے۔ ابھی دروازے میں داخل ہوئے ہی تھے کہ کسی نے دروازے پر دستک دی واپس آئے تو ایک ظالم ملعون نے تیسی سے سر پر گہری ضربیں لگائیں' خون میں نہا گئے۔ بے ہوشی کی حالت میں میو ہسپتال پہنچایا گیا جو لوگ ہسپتال میں قریب تھے وہ بتاتے ہیں کہ اس بے ہوشی کے عالم میں بھی با آواز بلند درود اور آیاتِ قرآنی کا ورد کرتے رہے جس سے ہسپتال کے ڈاکٹر اور عملے کے لوگ حیران و ششدر تھے۔ جسم کا سارا خون بہ چکا تھا۔ چاہنے والوں نے بہت سا خون دیا مگر حالت بگڑتی ہی گئی پھر آپ کو میو ہسپتال سے جنرل ہسپتال منتقل کیا گیا۔ 7 نومبر 1980ء مطابق 28 ذی الحجہ 1400ھ بروز جمعہ صبح اڑھائی بجے جنرل ہسپتال میں اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے بقول ڈاکٹر مسعود رضا خاکی مرحوم :

عمر بھر کرتے رہے آلِ عبا کا تذکرہ
سُرخ رو ہو کر گئے جعفر خدا کے سامنے

ہزاروں مومنین نے (سوائے بد نصیب بیٹے کے) زبردست آہ و زاری کے ساتھ بڑی شان و شوکت سے آپ کو جمعہ کی شام کو کربلا گامے شاہ میں سپردِ خاک کیا۔ میں بنغازی میں اپنے فلیٹ میں تنہا رہتا تھا۔ 7 نومبر جمعہ کو صبح ناشتہ کر کے جب میں باورچی خانہ سے نکلا تو T.V لاؤنج میں ایک لمحہ کے لئے مجھے والد صاحب کی شبیہ نظر آئی جو فوراً ہی میری نظر سے غائب ہو گئی۔ فوراً ہی مجھے والد صاحب کا خواب جو انہوں نے اپنے والد مرحوم کے انتقال کے دن دیکھا تھا یاد آ گیا اور میں بہت پریشان ہوا کیونکہ مجھے کسی بیماری یا کسی واقعے کی اس وقت تک کوئی اطلاع نہیں تھی۔ میں نے اپنے آپ کو تسلی دی۔ یونیورسٹی گیا اپنی کلاسوں سے فارغ ہو کر دوپہر کو حسبِ معمول اپنا پوسٹ بکس دیکھنے ڈاک خانے گیا تو ٹیلی گرام ملا :

"Your father died have patience and courage"

اِس طرح میرے والد صاحب کی روح بھی انتقال کے بعد مجھ سے ملنے آئی تھی۔

ذوق شعر :

والد صاحب کی دینی علمیت سے تو زمانہ خوب اچھی طرح واقف ہے۔ آپ کی تقاریر اور تحاریر آپ کے علم و فضل اور قرآن فہمی کا منہ بولتا ثبوت ہیں لیکن شاید یہ کم ہی لوگوں کو علم ہوگا کہ والد صاحب شعر فہمی اور شعر گوئی کا بھی اعلیٰ ترین ذوق رکھتے تھے۔ بریلی اور لاہور میں نامور شعراء اپنا کلام تصحیح کے لئے آپ کے پاس لاتے تھے۔ خود بھی اگرچہ زیادہ نہیں پھر بھی مختلف مواقع پر آپ نے کافی اشعار کہے ہیں مگر افسوس یہ نادر خزانہ ہمارے پاس موجود نہیں ہے۔ جب شیعہ جامع مسجد تعمیر ہوئی تو مندرجہ ذیل قطع آپ نے تحریر فرمایا :

بنائی قوم نے ممتاز مسجد جامع
رہیگا فردِ جزا پر ہر اِک کا نام مدام
سرِ ورق پہ لکھا کاتبانِ قدرت نے
حبیبِ قوم محمد علی حبیب کا نام

ایک دفعہ ڈاکٹر مسعود رضا خاکی نے اپنا کلام والد مرحوم کو تصحیح کے لئے دیا تو آپ نے اپنا ایک شعر اس میں شامل کر دیا :

دعویٰ نہیں وِلا کا پہ بیزار ہیں بہت
اعدائے فاطمہؑ سے مُحبّانِ فاطمہؑ

امام مہدی علیہ السلام کے متعلق آپ کا ایک شعر ہے :

اے حُجّتِ اِلٰہ بس اب آ بھی جایئے
لے کر جلو میں نورِ گلستانِ فاطمہؑ

میرے چھوٹے چچا مرحوم کے انتقال پر آپ نے چند اشعار کہے ان میں سے ایک شعر مجھے یاد ہے :

غم زدہ ماں دیکھتی ہی رہ گئی
کر گئے حیدر بھی رخصت کا سلام

بچپن میں ایک دفعہ میں نے ضد کی کہ امام حسن علیہ السلام کی شبیہ تابوت کی مناسبت سے مجھے ایک نوحہ لکھ کر دیں میری ضد پر آپ نے ایک نوحہ لکھا جو مجلس میں پڑھا گیا۔ میرے پاس یہ نوحہ بھی محفوظ نہیں چند مصرعے یاد ہیں :

شیعو چلو اٹھاؤ جنازہ امام کا
زہرا کے نور عین کا اپنے امام کا
چل کر بتاؤ ہاتھ شہ تشنہ کام کا
عباس فرطِ غیظ سے تھرائے جاتے ہیں
تیروں سے چھلنی ہو گیا لاشا امام کا

بریلی میں آئمہ کی محافلِ میلاد ہوا کرتی تھیں جن میں قصیدہ خوانی بھی ہوتی تھی۔ اکثر والد صاحب قصیدے لکھ کر کبھی میرے بھائی مرحوم، کبھی اختر مرحوم (جو بعد میں پاکستان آکر صہبا اختر کے نام سے مشہور ہوئے) اور کبھی دیگر حضرات سے پڑھواتے تھے۔

اپنی شہادت سے چند یوم قبل آپ نے ایک نہایت مبارک خواب دیکھا جو انہوں نے خود بیان کیا۔ اور اس کے بیان کرتے وقت آپ کے چہرہ پر بے پایاں مسرت اور کامرانی کا احساس تھا۔ خواب میں انہوں نے جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مسند نشین دیکھا اور جناب رسالت مآبؐ سے کسی شرعی مسئلہ کا بیان اور خود ہی اس کا متوقع جواب بیان کیا۔ اس پر جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسکرا کر تائید کا اظہار فرماتے ہوئے ان کی طرف دیکھا۔ اس کے بعد آپ خواب سے بیدار ہوئے تو چہرہ پر از مسرت تھا۔

تمام علماء کا اس امر پر اتفاق ہے کہ اگر کسی نے سید الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عالم خواب میں مسکراتے ہوئے یا خوشی کا اظہار کرتے دیکھا تو یقیناً اس کی دنیا اور آخرت دونوں میں اعلیٰ درجات کی کامیابی ہے۔

پیش گفتار

بحمد اللہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے میری عرصہ دراز کی دلی تمنا پایہء تکمیل تک پہنچی۔ قبلہ ابا جان کی شہادت کے بعد سے میری یہ شدید تمنا تھی کہ والد مرحوم کی گراں قدر قلمی کاوشیں جو مختلف رسالوں اور کتابچوں کی شکل میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہیں یکجا کر کے ایک کتاب کی صورت میں محفوظ کر کے مومنین اور ابا جان کے مداحوں کی خدمت میں پیش کروں۔ مگر میں اپنی مجبوریوں اور کچھ کوتاہیوں کی وجہ سے عرصہ دراز تک اس خواہش اور دلی تمنا کو عملی جامہ نہ پہنا سکا۔ اس کی ایک وجہ تو ابا جان کی شہادت کے وقت اور شہادت کے بعد بھی کافی عرصہ میرا بیرون ملک قیام تھا۔ پھر پاکستان واپس آکر کچھ عرصہ تلاش روزگار میں سرگرداں رہا اور ملازمت کے سلسلہ میں ایک بار پھر لاہور سے باہر بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان چلا گیا۔ تاخیر کی ایک اہم وجہ یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ میں سائنس کا ایک طالب علم ہوں اور ابا جان کے یہ مضامین کسی سیاق و سباق میں تحریر کئے گئے تھے۔ ان کو ایک کتابی شکل میں مرتب کرنے کے لئے اس میدان کے کسی ماہر فن کی مدد کی ضرورت تھی جو اس محنت طلب اور طویل کام کو بخوشی خلوص و محبت سے انجام دے سکے اور اس کام کی اہلیت بھی رکھتا ہو۔ اس طرح یہ نیک کام ٹلتا ہی رہا۔ اس تاخیر کا مجھے انتہائی افسوس بھی ہے اور پشیمانی بھی۔

جب ریٹائرمنٹ کے بعد لاہور گھر واپس آیا تو میرے مکان کی تعمیر کا سلسلہ جاری تھا پھر نئے مکان میں منتقلی کے مراحل تھے مگر اس میں اہم کارِ نیک کی تمنا دل میں موجود تھی اور بحمد اللہ جذبہ صادق اور ابا جان کے مداحوں کی دعائیں شامل حال تھیں۔

اس کام کو شروع کرنے کے لئے میری بیٹی انجم جبین نے نہ صرف ہمت اور حوصلہ دیا بلکہ عملی قدم بھی اٹھایا یہ حقیقت ہے کہ اس کام کے لئے میرے محسن اور محترم جناب وحید الحسن ہاشمی صاحب کی دریافت اور تلاش بھی انجم ہی کی تھی۔ جناب ہاشمی صاحب نے انتہائی خلوص اور محبت سے اس کام میں بھرپور مدد کرنے کا وعدہ فرمایا اور پھر اپنے وعدہ کو نبھایا بھی۔ اس کتاب کی تیاری میں کچھ مشکل مراحل بھی آئے مگر ہاشمی صاحب نے بڑی ہمت اور محنت سے ان مراحل کو طے کیا۔ ان کے اندر شاعرانہ مزاج بھی ہے ادبی ذوق بھی دینی امور سے بھرپور واقفیت اور انتہائی گہری دلچسپی بھی اور سب سے بڑھ کر دینی خدمت کا جذبہ بھی اس کارِ خیر کا صلہ انشاء اللہ ان کو محمدؐ و آلِ محمدؐ کے در سے ملے گا۔

اس کتاب میں جو مضامین شامل کیے گئے ہیں وہ زیادہ تر امامیہ مشن لاہور اور کچھ ادارہ درسِ عمل لاہور کی مطبوعات سے لئے گئے ہیں۔ میں ان دونوں اداروں کا شکر گزار ہوں کہ ان اداروں نے ان مضامین کی اشاعت کی اجازت دی۔ ان مضامین میں کچھ مضامین اپنی انتہائی مقبولیت کی بناء پر کئی بار مختلف ذرائع سے چھپ چکے ہیں۔ اگرچہ کوشش تو یہی کی گئی ہے کہ یہ مضامین اپنی اصل شکل میں ہی اس کتاب میں آئیں مگر یہاں یہ اعتراف کرنا ضروری ہے کہ بعض مضامین میں مصلحتاً وقت کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے کچھ الفاظ اور ترتیب میں کہیں کہیں طوعاً و کرہاً تبدیلیاں کرنا پڑیں جس کے لئے ہم خصوصاً ان حضرات سے جو پہلے یہ مضامین ان کی اصل شکل میں پڑھ چکے ہیں معذرت خواہ ہیں۔ ابا جان کے کچھ بہت ہی مقبول اور بلند پایہ مضامین چند مجبوریوں کے تحت اس کتاب میں شامل نہیں کیے جا سکے۔ انشاء اللہ کسی اور موقع پر کسی صورت سے یہ مضامین بھی مومنین تک پہنچانے کی کوشش کی جائے گی۔ ابا جان کے چند خطوط بھی جو والد صاحب نے اپنے مداحوں، اپنی والدہ اور ہمشیرہ کے نام تحریر کیے تھے۔ اس کتاب میں شامل کیے گئے ہیں۔ ان خطوط پر ایک ادبی اور تنقیدی تبصرہ بھی جناب وحید الحسن ہاشمی صاحب کے قلم سے شامل ہے۔ اس کتاب میں اُن شعراء کے کچھ وہ کلام بھی شامل ہیں جو انہوں نے ابا جان کی شہادت پر اپنے دلی جذبات کا منظوم

اظہار کیا تھا۔ اس کے علاوہ میری اہلیہ اور میری چاروں بیٹیوں کی ابا جان سے والہانہ محبت اور دلی جذبات کا اظہار بھی شامل ہے۔

ابا جان کی بارہ تقاریر بعنوان 'مجموعہ تقاریر' مرتبہ محترمہ اہلیہ شاہد ذوالفقار صاحب (ناشران مرغوب احمد صاحب اور سید محسن علی شاہ صاحب) کافی عرصہ پہلے شائع ہو چکی ہیں۔ ابا جان کی مجالس کی کچھ اور ٹیپیں ڈاکٹر افضال حسین صاحب سے ملی ہیں۔ میں اس تعاون اور محبت کا ڈاکٹر افضال حسین صاحب اور ان کے اہل خانہ کا دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتا ہوں اور ڈاکٹر صاحب کی صحت کاملہ کے لئے دست بدعا ہوں۔ ان مجالس کی طباعت کا سلسلہ بھی جاری ہے انشاء اللہ جلد ہی مکمل ہو جائے گا۔

اگرچہ اس کتاب کی تکمیل کے سلسلہ میں جن حضرات نے عملاً اور تائیداً حوصلہ افزائی کی ان کی فہرست قدرے طویل ہے تاہم کچھ حضرات کا ذکر کرنا اور خلوص دل سے ان کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ میں اپنے دل کی گہرائیوں سے جناب علامہ طالب جوہری صاحب قبلہ کا ممنون ہوں کہ اپنی عدیم الفرصتی اور ناسازی طبع کے باوجود آپ نے کتاب زیر طبع پر تقریظ تحریر فرمائی۔ خدا آپ کو سلامت رکھے اور عمر طویل عطا کرے۔ سید محسن علی شاہ صاحب کی بھی عرصہ دراز سے یہ خواہش تھی کہ اس کتاب کو ترتیب دیا جائے اور بار بار تقاضا بھی کرتے رہے اور میں ہر بار ان سے شرمندہ ہوتا رہا۔ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان اور کرم ہے کہ شاہ صاحب کی یہ پر محبت اور پر خلوص خواہش پایہ تکمیل تک پہنچ رہی ہے۔ علامہ نیاز محمد ہمدانی صاحب کے مفید مشوروں اور مدد کا بھی شکر گزار ہوں۔ جناب کامران رضا کاظمی صاحب نے بھی عبارات کی تصحیح میں کافی مدد فرمائی ہے۔ خداوند عالم انہیں جزائے خیر عطا فرمائے۔ میں طاہر حسین بٹ صاحب (ادارہ درس عمل) جناب خورشید اکبر زیدی (ادارہ پیام عمل) کی محبت و خلوص اور حوصلہ افزائی کا بھی معترف ہوں۔ اپنی اہلیہ اور چاروں بیٹیوں خصوصاً انجم جبین کی حوصلہ افزائی اور کوششوں کا بھی ممنون ہوں۔

آخر میں اس حقیقت کو واضح کرنا چاہوں گا کہ اس کتاب کی اشاعت کا مقصد

کوئی مالی منفعت حاصل کرنا ہرگز نہیں بلکہ صرف اور محض ابا جان کے علمی خزانہ کو محفوظ کرنا اور علم دوست حضرات خصوصاً علومِ محمدؐ و آلِ محمدؐ کے شیدائیوں کی خدمت میں پہنچانا ہے۔ کتاب کی اشاعت سے کسی کی دل آزاری بھی ہرگز مقصود نہیں۔ محمدؐ و آلِ محمدؐ سے عشق کی حد تک محبت میرے دین کی بنیاد ہے صرف یہی نہیں بلکہ حضور کے جاں نثار اصحاب باوفا سے بھی محبت میرا جزوِ ایمان ہے۔

اللہ تعالیٰ چہاردہ معصومین کے صدقے میں میری اس ناچیز اور ادنیٰ سعی کو قبول فرمائے۔ میرے گناہوں کو معاف کرے اور میرے مرحومین کی مغفرت فرمائے۔ آمین!

مومنین کی دعاؤں کا

محتاج

(ڈاکٹر نصیر عالم زیدی)

تقریظ

علامہ طالب جوہری مدظلہ

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں حوزۂ علمیہ نجف اشرف کا طالب علم تھا اور گاہ گاہ ایام عزا کی تعطیلات میں پاکستان آیا کرتا تھا۔ حسن اتفاق سے ایک سال مجھے لاہور میں محرم الحرام کے عشرۂ اولیٰ میں قیام کا موقع ملا اور مختلف مجالس میں شرکت کی سعادت حاصل ہوئی۔ غالباً محرم کی چوتھی یا پانچویں تاریخ تھی جب میرے میزبان مجھے ایک ایسی مجلس میں لے گئے جس میں بہ ظاہر حالات دوسری مجالس کی نسبت فضلاء اور دانشوروں کا اجتماع زیادہ تھا۔ ایک ایسے بزرگ رونق افروزِ منبر تھے جن پر لباسِ علم پوری طرح سج رہا تھا۔ جلد ہی کوثر و تسنیم کی دھلی ہوئی زبان اور لہجے کی شیرینی نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا۔ مجلس میں خطاب کا عنصر کم تھا لیکن علمیت کا تناسب بہت زیادہ تھا' مدلل گفتگو تھی اور اس آیت پر تھی جس پر ایک ہزار سال سے گفتگو ہو رہی ہے' جسے صاحبانِ علم آیۂ تطہیر کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ وہ آیۂ مبارک جسے منبر سے بہت زیادہ پڑھا گیا ہو اس میں نئے نکات کا پیدا کرنا بہت دشوار ہوتا ہے لیکن میں نے محسوس کیا کہ صاحبِ ذکر نے بعض ایسے نکات اور اچھوتے مطالب پیش کئے جو اس سے قبل سامعین کے لئے ناآشنا تھے جن سے انتہائی گہرے اور وسیع مطالعے کا اظہار ہو رہا تھا۔ یہ میرا پہلا تعارف تھا حضرت مولانا سید محمد جعفر زیدی رضوان اللہ تعالیٰ علیہ سے۔

حوزۂ علمیہ نجف اشرف میں پاکستان سے جو مختلف جرائد و رسائل آیا کرتے تھے ان میں گاہ گاہ حضرت مولانا رضوان اللہ علیہ کی بعض تحریریں بھی دیکھنے کو مل جایا کرتی تھیں۔ مولانا کی علمیت' وسعتِ مطالعہ اور فکری تعمق کا پہلا تاثر جو مجلس کے ذریعے مجھ پر

قائم ہوا تھا' ان کی گراں قدر تحریروں نے نہ صرف یہ کہ اسے باقی رکھا بلکہ اس تاثر میں مسلسل اضافہ کیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب مذہبی رسائل مناظرانہ مباحث کو پیش کرنے میں بہت مستعد ہوا کرتے اور کم و بیش ہر شمارے میں کسی نہ کسی نزاعی مسئلے پر کوئی نہ کوئی مقالہ یا مضمون موجود ہوتا تھا۔ حضرت مولانا نے ان موضوعات پر بھی قلم اٹھایا لیکن اس شان کے ساتھ کہ ان میں مناظرہ کم اور ادلہ و براہین کا امتزاج زیادہ ہوتا تھا البتہ کہیں کہیں آپ کے لہجے میں ذوالفقار کی کاٹ بھی نمایاں ہو جاتی تھی لیکن اس کے باوجود منتخب الفاظ' شائستہ طرز بیان اور محکم استدلال ان مقالوں کا طرۂ امتیاز ہوتا تھا۔

مجھے یہ معلوم کر کے بہت مسرت ہوئی کہ حضرت مولانا کے خلف صالح ڈاکٹر نصیر عالم زیدی صاحب نے آپ کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مقالات کا ایک معتدبہ حصہ شائع کرنے کا ارادہ فرمایا ہے۔ خدا اُن کی توفیقات میں اضافہ فرمائے۔

وہ مقالے جو زیور طبع سے آراستہ ہونے والے ہیں۔ خالص علمی اور تحقیقی ہیں۔ ان میں بعض ایسے اہم موضوعات زیر بحث آئے ہیں جن کی اہمیت گزرتے ہوئے زمانوں میں کبھی کم نہ ہو گی۔ ان مقالوں میں مولانا نے غیر جانبدارانہ علمی و منطقی تحقیقات سے اسلامی حقائق و معارف کو جمع فرما دیا ہے۔ حوالے مستند ہیں' عبارت سلیس اور رواں ہے اور تفسیر و استدلال دل نشیں ہے۔

مجھے اُمید ہے کہ صاحبان علم و طالبان حکمت اس کتاب کی خاطر خواہ پذیرائی کریں گے اور ان مطالب کی قدر کریں گے جن پر یہ کتاب مشتمل ہے۔ میں دست بدعا ہوں کہ رب العزت بہ طفیل محمدؐ و آل محمد علیہم السلام حضرت مولانا سید محمد جعفر زیدی رضوان اللہ علیہ کے درجات عالیہ میں اضافہ فرمائے اور اربابِ فکر و دانش کو ان کے معارف سے استفادے کی توفیق عطا کرے۔

طالب جوہری

۷ ربیع الثانی ۲۲ھ

تاثرات

چچا جان! مجھے آپ کے جذبہ شوق شہادت کے سلسلے میں وہ جملہ یاد آتا ہے جو آپ نے 54 سال کی عمر میں بڑی حسرت سے کہا تھا کہ میں اب اس عمر کا ہو گیا ہوں جس عمر میں مولا سید الشہداءؑ شہید ہوئے تھے۔ اس جملے سے میرے دل پر شدید چوٹ لگی تھی اور میں نے تڑپ کر کہا تھا کہ چچا جان آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں پھر 9 سال بعد جب آپ 63 سال کے ہوئے تو آپ نے کہا میں اب اس عمر میں ہوں جس میں مولائے کائنات حضرت علیؑ کو شہادت کا مرتبہ ملا تھا۔ میں سمجھتی ہوں کہ آپ کا جذبہ آپ کی پوری زندگی کی طرح صادق تھا۔ بالآخر مولا نے آپ کی اس شدید خواہش کو قبولیت کا درجہ بخش دیا۔ لیکن آپ کی جدائی ہم سب کو نڈھال کر گئی۔ کہاں ممکن ہے کہ ہم اب کبھی اس شفیق ہستی کو دیکھ سکیں گے جس کی دلجوئی حسنِ اخلاق اور سیرت پر سیرتِ معصومین علیہ السلام کی گہری چھاپ تھی۔

آپ نے جس تشکر و اخلاص و شفقت سے اپنی بیٹیوں کو پالا اور ایک مضبوط سائباں کی طرح ہماری حفاظت کی بی بی معصومہؑ اس کے صلے میں آپ کے درجات بلند فرمائیں۔ ہماری چھوٹی چھوٹی باتوں کا معترف ہونا اور حوصلہ بڑھانا آپ کی شخصیت کا اہم جزو تھا۔ گھر کا ہر فرد اپنے آپ کو بہت اہم اور چاہا جانے والا سمجھتا تھا۔ چچا جان میں نے صدق دل سے کوشش کی کہ آپ جیسے فرشتہ سیرت بزرگ کی خدمت کروں۔ آپ کے شب و روز کے معمولات دیکھ کر مجھے یقین ہوتا تھا کہ آپ نائب امامؑ ہیں۔ جب

میں اپنی عقیدت کا اظہار کرتی تو آپ نہایت انکساری کے جملے کہتے۔ہاں مجھے یاد ہے کہ آپ اپنے تمام امورِ زندگی میں مجھ سمیت کسی سے بھی خدمت لینا پسند نہ کرتے تھے اور میں اپنی شدید ترین کوشش اور خواہش کے باوجود اس جذبے کے مطابق آپ کی خدمت نہ کرپائی۔ مجھے آپ کی وہ دلجوئی تڑپا دیتی ہے جب میں نے مولا علیؑ کی شان میں چند اشعار کہے تو بہت بلند ذوق رکھنے کے باوجود آپ نے میری اس سعی کو بہت سراہا اور پرزور الفاظ میں میرے اس جذبے کی تعریف کی۔

علیؑ تو شافع روزِ جزا ہیں مرے مولاؑ ہی تو مشکل کشاء ہیں
فلک پر یا علیؑ لکھا ہوا ہے مرے مولاؑ کے جلوے جا بجا ہیں

میری دعا ہے کہ خداوندِ عالم مولا علیؑ کے تصدق میں تمام شہیدان کے ساتھ میرے چچا کو بلند مرتبہ عطا فرمائے اور ان معصومین کے ساتھ انہیں محشور کرے۔آمین ثم آمین۔

(خوشنود فاطمہ۔بہو'بھتیجی)

☆☆☆

میرے عظیم ابا میں وہ ہوں جس کا نام آپ نے بڑے شوق سے بنت جعفر رکھا تھا اور جسے آپ اپنا ولی عہد کہتے تھے۔ میں آپ کی وہی بیٹی ہوں جسے آپ ہمہ وقت مضبوط دل و دماغ رکھنے کی نصیحت کرتے تھے۔ میری والہانہ محبت سے آپ کو خوف تھا کہ کبھی آپ کی جدائی سے میرا دل یہ صدمہ برداشت نہ کر سکے۔

پھر جب جدائی کا وقت آ پہنچا تو آپ بہنوں کو سنبھالنے کی ذمہ داری میرے سپرد کر گئے۔ سوچتی ہوں آپ کی جدائی پر میں کس طرح زندہ رہ گئی اور کیونکر بہنوں کو زندہ رہنے کا حوصلہ دیتی رہی ہوں۔ میں سوچتی ہوں یہ حوصلہ آپ کی اُن دعاؤں کا نتیجہ ہوگا جو آپ نے بی بیؑ کی خدمت میں حاضر ہو کر ہمارے لئے کی ہوگی۔

میرے ابا جان۔ میں نے آپ کا دیا ہوا خطاب نبھانے کی بھرپور کوشش کی۔ نہ خود روئی نہ بے حواس ہوئی۔ بہنوں کو سنبھالتی رہی۔ ڈیڈی کی تنہائی اور اس گراں بار صدمے کا کرب بھی دل پر تھا جو وہ ہزارہا میل دور لیبیا میں سہہ رہے تھے۔ آپ سے کچھ شرمندہ بھی ہوں کہ بہنوں کی بے قراری کو کیسے روکتی۔ آپ کی ایک چہیتی بیٹی کے ہاتھ زخمی تھے ایک پردیسن کا ماتھا زخمی تھا اور ایک انتظار کرنے والی بیٹی کے چہرے پر جدائی کا وحشت ناک کرب تھا۔

ابا جان! بعد شہادت آپ کے چہرے کا اطمینان اور رُخ کی شادابی بالکل وہی تھی جو شہادت سے مہینہ بھر پہلے ایک شام میں نے آپ کے چہرے پر دیکھی تھی۔ جب ظہرین کی نماز پڑھا کر آپ آرام کرنے کے لیے لیٹ گئے تھے۔ کچھ دیر بعد جب میں کمرے میں داخل ہوئی تو آپ کے چہرے پر بے پناہ شادابی اور مسکراہٹ تھی۔ میں نے پوچھا ابا آپ مسکرا کیوں رہے ہیں۔ جواب ملا بیٹی اس وقت میں نے عجیب خواب دیکھا ہے کہ جس کمرے میں میں ہوں اس میں حضورؐ تشریف فرما ہیں اور میں آپؐ سے کوئی مسئلہ دریافت کر رہا ہوں۔ حضورؐ خاموش ہیں پھر میں خود ہی جواب دینا شروع کرتا ہوں اور کہتا ہوں کہ حضورؐ میں تو اس مسئلے کا یہ جواب صحیح سمجھتا ہوں۔ حضورؐ میری

طرف دیکھ کر مسکراتے ہیں گویا کہ میرا جواب پسند آیا ہو۔ یہی شہادت کی بشارت تھی۔ سچ ہے شہید زندہ ہوتے ہیں۔ تبھی تو زخمی ہونے کے بعد جب ڈاکٹروں نے کہہ دیا کہ اب ہمیں زندگی کی کوئی امید نہیں تو ابا آپ اتنے صحیح مخرج سے زیارت امام حسینؑ، استغفار اور درود پڑھ رہے تھے۔ اس تندرست ترین آواز سے مجھے یقین ہو گیا تھا کہ میرے ابا کی جان بچ جائے گی۔

ابا جان! مجھے ابھی تک یاد ہے کہ آپ سے جدائی کی پہلی شب جب نہ جانے کب میری آنکھ لگ گئی تو میں نے آسمان پر ایسا خوبصورت سرسبز و شاداب منظر دیکھا کہ میری روح تک مسرور ہو گئی حتیٰ کہ آنکھ کھلنے کے بعد بھی میں مسکرا رہی تھی۔ پھر مجھے آپ سے جدائی کا کرب ناک خیال آیا کہ آج رات تو بڑی بھیانک رات ہے اور میں مسکرا رہی ہوں۔ میرے دل نے گواہی دی کہ میرے ابا کسی ایسی پر فضا جگہ یعنی آئمہ اطہارؑ کے سائے میں پہنچ چکے ہیں

جب کبھی آپ معمولی علیل بھی ہوتے تو میں تڑپ جاتی اور بہت کم سنی میں بھی یہ دعا کرتی یا اللہ میرے ابا کو تندرستی دے دے۔ بارہا ایسا ہوا کہ جب مسجد میں آپ نماز پڑھاتے میں گھر کی چھت پر جانماز بچھا کر آپ کی صحت کے لیے دعا کرتی اور میرا رب رحیم میری دعا کو قبولیت کا درجہ بخش دیتا۔ تب آپ بہت مسرور ہو کر کہتے میری معصوم بیٹی نے دعا کی ہو گی میں بالکل تندرست ہو گیا اور جب فیصلے کا وقت آ پہنچا اور رب العزت نے آپ کو شہادت کا درجہ دینے کا فیصلہ کر لیا تو میری تمام دعائیں شاید آپ کی اگلی زندگی کے لیے قبول ہو گئیں کیونکہ آپ میرے پاس تو نہ رہے۔ آپ خدا کے حضور حاضر ہو گئے اور میں اپنے بھوئی سے پوچھتی رہ گئی بتائیں میرے ابا کو کہاں چھوڑ آئے جواب ملا ''بہن ہم سورج کو زیرِ زمیں چھپا آئے ہیں'' خدا محمدؐ و آلِ محمدؐ کے صدقے میں میرے ابا کے مزار کو نورِ محمدؐ و آلِ محمدؐ سے پُر نور کر دے۔ آمین ثم آمین!

(شاہانہ اظہر۔ پوتی)

☆☆☆

میرے محسن، شفیق اور قابلِ صد احترام ابا جان! میں وہ بیٹی ہوں کہ جب خدا نے میری گود بھری اور فرزند جیسی نعمت سے مجھے نوازا تو سر سے آسمان کھسک گیا۔ میں خود کو آج تک ہسپتال کے اُس کمرے میں محسوس کرتی ہوں جہاں آپ نے مجھ سے یہ آخری جملہ کہا تھا "بیٹی آج عید مباہلہ ہے۔ میلاد کے بعد رات کو کچھ دیر ہو جائے گی لیکن میں ضرور آؤں گا۔ بیٹی تجھے دیکھے بغیر مجھے نیند نہیں آئے گی"۔ اس دن سے آج تک آپ کی بیٹی حیران ہے۔ یا اللہ میرے ابا کو اتنی گہری نیند کیسے آگئی کہ اب وہ مجھے دیکھنے کے لئے آنکھ ہی نہیں کھولتے۔

لیکن میں جانتی ہوں کہ آپ تمام عمر مولا علیؑ کی سیرت کی پیروی کرتے رہے۔ آپ نے رب کریم اور اس کی نورانی ہستیوں کا حکم مانا ہوگا۔ اُن حضراتؑ کی محبت ہی آپ کو میری جدائی پر آمادہ کر سکتی تھی۔

اب سوچتی ہوں کہ میں کس قابل تھی جو آپ کی اس بے پایاں محبت سے مالا مال ہو سکتی یقیناً حضورؐ کی ذات اور اسوۂ حسنہ سے بے پناہ محبت اور خلوص آپ کو بیٹی سے محبت کرنے پر مائل کرتی تھی اس لئے کہ آپ حضورؐ کی سنت پر عمل پیرا تھے۔ اپنی کم حیثیت ہونے پر نظر کرتی ہوں اور بی بیؑ کی عنایتوں پر غور کرتی ہوں۔ آپ کی شہادت سے دو دن پہلے کا وہ خواب در حقیقت بی بیؑ کی طرف سے تعزیت اور تسلی کا پیغام تھا۔ شب جمعہ کے خواب میں آپ کو امام عالی مقام سید الشہداء کے روضے پر دیکھا اور آپ کہہ رہے ہیں کہ جاؤ اندر روضے میں بی بیؑ تشریف فرما ہیں دعا مانگ کر آؤ۔ میں روضے میں داخل ہوئی۔ امامؑ کے روضے کی جالی کے پاس بی بیؑ جانماز بچھائے مصروف عبادت تھیں۔ میں بی بیؑ کی بائیں جانب انتظار میں بیٹھ گئی کہ بی بیؑ نماز تمام فرمائیں تو دعا مانگوں۔ اسی اثناء میں تسبیح پڑھتے پڑھتے تسبیح سے خون کے قطرے نکل کر میرے ہاتھ پر گرے۔ بی بیؑ نے نماز تمام کر کے میری طرف دیکھا۔ میں نے گھبراہٹ کے عالم میں انہیں یہ ماجرا بیان کیا تو بی بی نے ارشاد فرمایا: "یہ شہیدوں کا

خون ہے اس سے گھبرایا نہیں کرتے۔ جاؤ تمہاری دعائیں قبول ہوں گی''۔ اور دو دن بعد آپ مولا علیؑ کی تقلید میں سر پر ضربت کھا کر تین دن زخمی رہ کر شبِ جمعہ امام عالی مقام کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ میں انتظار کرتی رہ گئی۔

میرے ابا میں نہیں جانتی کہ آپ دینی علوم میں کس درجہ پر فائز تھے۔ لیکن میں آپ کے شب وروز کی عبادتِ ربِ کائنات کی گواہی ضرور دوں گی اور یہ بھی کہوں گی کہ گھر میں یا گھر کے باہر آپ کا وہی طرز عمل تھا جیسا مسجد کے منبر پر نظر آتا تھا۔ کثرت سے مولیٰ علیؑ کا تذکرہ کرتے اور انؑ کی سیرت پر عمل پیرا رہتے تھے۔ آج مجھے ان کا وہ مصرع یاد آ رہا ہے جس میں ان کے نام کا سجع تھا' صادق آل محمدؐ جعفر۔

آپ کتنے مہربان تیمار دار تھے کہ مجھے آپ کے زیر سایہ بیمار ہونا اچھا لگتا تھا۔ جب تک تندرستی نہ آجاتی ہمہ وقت ناز اُٹھاتے اور نرم و متبرک ہاتھ میرے ماتھے پر رکھ کر مصروف دعا ہو جاتے۔ جب کبھی خود علیل ہوتے تو نہایت صبر و ضبط کا مظاہرہ کرتے اور کبھی شدید تکلیف میں بھی آہ نہ کرتے بلکہ درود واستغفار پڑھتے رہتے تھے۔

ابا جان میں کیا میری ساتھی لڑکیاں بھی کبھی وہ منظر نہ بھولیں گی جب مجھے پڑھنے کے سلسلے میں ایک ماہ کے لئے اپنے کالج کی رہائش گاہ میں رہنا تھا۔ جب میں گھر سے رخصت ہوئی تو آپ کراچی گئے ہوئے تھے۔ واپسی پر آپ ایئر پورٹ سے سیدھے گھر جانے کی بجائے پہلے مجھے ملنے کالج آئے۔ آپ کا معصوم چہرہ میری ہم جماعتوں کے دل پر اثر کر گیا اور پھر آپ کا محبت اور بیقراری کے عالم میں بار بار یہ کہنا یاد آتا ہے کہ بیٹا گھر جا کر تمہیں نہیں دیکھوں گا تو گھر جا کر کیا کروں۔ ابا جان کی افسردگی اور میرا گریہ دیکھ کر استانیوں نے بے ساختہ کہا کہ آج تک یہ تو دیکھا تھا کہ بچیاں گھر والوں کو یاد کر کے روتی ہیں زندگی میں یہ منظر پہلی بار دیکھا کہ دادا اور پوتی دونوں کی آنکھیں سرخ ہیں۔ پھر آپ کی وہ بیٹی جس کے بغیر آپ گھر جانا نہیں چاہتے تھے چند دنوں کے بعد ہسپتال سے اس گھر میں کیسے داخل ہوئی ہو گی کہ جس میں نہ اب آپ تھے اور نہ آس تھی کہ آپ آئیں گے۔ وہ تو کہئے بی بی سکینہ کی یاد تھی' میں تھی اور یہ پہاڑ سا غم۔ آپ

بچھڑے بھی تو محرم سے ایک دن پہلے ہیں جب گھر آئی تو عزاخانہ سجا ہوا تھا اور یہ نوحہ پڑھا جا رہا تھا:

جب یاد سکینہ کو تری آتی ہے بابا
سر زنداں کی دیواروں سے ٹکراتی ہے بابا

لاکھوں سلام ہوں اُس عظیم سکینہ بی بی پر جس نے اپنے یکتائے زمانہ پدر کو شہادتِ عظمیٰ کے درجے پر فائز دیکھا، بے پدر ہوئیں اور زندان کی اذیتیں سہیں۔ میری دعا ہے کہ پروردگار عالم میرے ابا کو ان کی خواہش کے مطابق محمدؐ و آل محمدؐ کے ساتھ محشور کرے۔ آمین ثم آمین۔

(انجم مسعود۔ پوتی)

☆☆☆☆

میرے معصوم چہرہ ابا جان! میں آپ کی وہ بیٹی ہوں جس نے آپ کا معصوم چہرہ خون میں نہایا ہوا دیکھا۔ اس مالک بر حق کو آپ کو اسی شان سے اپنے دربار میں طلب کرنا تھا اور تمام اولاد میں صرف مجھے ہی آپ کا حبِ محمدؐ و آلِ محمدؐ سے گلنار رنگین خون دیکھنا تھا تب ہی تو آپ کی شہادت سے دس پندرہ یوم قبل میں جب بھی آنکھیں بند کرتی، سوتے جاگتے اپنے چاروں اطراف خون ہی خون نظر آتا تھا۔ گھبرا کر اٹھ بیٹھتی نماز پڑھ کر اپنے خالق کی بارگاہ میں سب کی خصوصاً اپنی زندگی کا سب سے بیش قیمت سرمایہ یعنی ابا جان کی زندگی، تندرستی اور دونوں جہان میں بلند مرتبہ ہونے کی دعا کرتی۔ اگرچہ یقین محکم ہے کہ آپ تو خدا کی بارگاہ میں سرخرو ہو گئے اور آپ کی شہادت مولا علیؑ کی بارگاہ میں مقبولیت کا درجہ پا گئی۔ لیکن میرا دل آج تک خونا خون ہے۔ دل میں تازیست یہ حسرت باقی رہے گی کہ میں آپ جیسی عظیم ہستی پر قربان کیوں نہ ہو گئی بے شک بندہ حکم خداوندی کے آگے مجبورِ محض ہے۔

ابا جان میرا دل گواہی دیتا ہے کہ میری آپ کے بارے میں دعا رائیگاں نہیں گئی۔ میری پاک بی بی فاطمہ زہراؑ نے اپنے شہید جگر گوشوں کے صدقے میں شہادت سے کچھ عرصہ قبل خواب میں آپ کو درجات کی بلندی کی بشارت عطا فرمائی تھی۔ بہر حال مجھے آپ کی جدائی کی تکلیف تاعمر سہنی ہے۔

میں حیران ہوں کہ میری بہت کم سنی سے آپ مجھ کو پردیسن کہہ کر پیار کرتے رہے۔ کچھ دیر کو بھی میں آپ کی نظروں سے اوجھل ہو جاتی تو فرماتے "بیٹی میرے سامنے رہا کرو کچھ دیر بھی نظر نہ آؤ تو یوں لگتا ہے جیسے تمہارا چہرہ دیکھے ہوئے مہینے برس ہو گئے۔

اب سمجھتی ہوں کہ میری زندگی کے بارے میں آپ کی یہ پیشین گوئی تھی جو بالکل درست ثابت ہوئی۔ آپ کی شہادت کے بعد میں ہی آپ کی وہ بیٹی ہوں جو ہمیشہ پردیس میں (سعودی عرب) رہی اور آج تک پردیسن ہوں۔ تاعمر آپ کی شفقت

بھری آواز سننے کی منتظر رہوں گی۔ دعا کرتی ہوں خداوند کریم آپ کے مزار کو محمدؐ وآل محمدؐ کے نور سے ہمیشہ پُر نور رکھے۔ اسی نور مقدس سے جس کا وجود آپ قرآنی آیات کے حوالے سے ثابت کرتے رہے اور مجھے آپ کی قباء کے سائے میں اُس نورِ مقدس کی دید نصیب ہو۔ (آمین ثم آمین)

(انجمن ہادی، پوتی)

☆☆☆

میرے چاند ابا! میں آپ کی سب سے چھوٹی بیٹی اور خود کو اپنی معصومیت میں آپ کی پہرہ دار سمجھنے والی ہوں۔ یہ بات بہت بچپن سے معلوم تھی کہ آپ میرے اور تمام گھر والوں کے لئے خدا کی طرف سے ایک عظیم نعمت ہیں۔ آپ کے زیر سایہ زندگی بہت پر رونق تھی۔ میں جو ہمہ وقت آپ کے پاس سائے کی طرح رہنا چاہتی تھی اور آپ کی پہرہ دار بنی رہتی تھی اس وقت یہی جذبہ کار فرما تھا کہ کہیں خدا کی دی ہوئی یہ نعمت کوئی چھین نہ لے کوئی میرے ابا کو نقصان نہ پہنچادے۔ یہ چار سال کی عمر سے میری چھٹی حس مجھے آگاہ کر رہی تھی۔ کیا جانتی تھی کہ شہدائے کربلا آپ کے سر پر سایہ فگن ہیں اور شہادت آپ کا مقدر ہے۔

میرا والہانہ پن آپ سے بے پناہ محبت اور آپ کے بنانے سنوارنے کا جنون نہ معلوم کیوں آپ کو رنجیدہ کر دیتا تھا۔ جب میں آپ کی قباء استری کر کے اپنے ہاتھ سے آپ کو پہناتی تو مجھے آپ کے چہرے کا وہ کرب اب بھی تڑپا دیتا ہے اور آپ کا یہ شعر پڑھنا یاد آتا ہے:

سکینہ جھاڑ رہی تھیں قباء کے دامن کو
حسینؑ چپکے کھڑے تھے جھکائے گردن کو

سوچتی ہوں آپ مجھ سے یہ حسن سلوک اور والہانہ محبت یاد امام علیہ السلام میں کرتے تھے۔ میں جانتی ہوں آپ شہید ہیں اور شہید زندہ ہوتے ہیں۔ لیکن دل آپ کی جدائی سے بے حد بیقرار ہے۔

میرے ابا زندگی کے دو مناظر میرے دل پر نقش ہیں۔ پہلا منظر 1973ء میں جب آپ حج بیت اللہ کے لیے عازمِ سفر ہو رہے تھے اور ایک بہت بڑا مجمع درود شریف پڑھتا ہوا اور اللہ اکبر کے نعرے لگاتا ہوا آپ کو رخصت کر رہا تھا اور گلاب کے پھولوں کے ہار آپ کے سینے سے چہرے تک آجاتے پھر اتار دیئے جاتے اور بار بار یہی عمل دہرایا جاتا تھا ہاں گلاب کے پھولوں میں آپ کا چہرہ بھی گلاب کی طرح شاداب لگتا

تھا۔ وہ چہرہ جس پر معصومینؑ کا ذکر کرتے کرتے معصومیت اور حلم و متانت نمایاں تھی اور میں آپ کی گود میں تھی آپ کی شان پر مسرور اور آپ کی جدائی سے مغموم۔ دوسرا وہ منظر جب آپ جامِ شہادت نوش فرما کر رب کے حضور حاضر ہو چکے تھے اور مجھے چھوڑ کر سفرِ آخرت پر چل دیئے تھے۔ وہی ہزار ہا کا مجمع، وہی درود و سلام اور اللہ اکبر کے نعرے۔ علم عباس کے سائے میں آگے آگے تمام علماء کا جلوس اور آپ اور آپ کے چاہنے والے والہانہ انداز میں سر پیٹتے ہوئے۔ مجھے یقین ہے کہ خدا کے فرمان کے مطابق آپ تو زندہ جاوید ہیں لیکن میں حسرت و یاس کی تصویر بنی ہاتھ ملتی رہ گئی آپ نے مجھے گود میں نہ لیا اکیلا چھوڑ دیا۔

میری دعا ہے کہ مولا عباسؑ کے علم کا سایہ ہمیشہ آپ پر سایہ فگن رہے اور آپ سید الشہداءؑ کے ساتھ محشور ہوں۔ آمین ثم آمین!

(بشریٰ امجد۔ پوتی)

☆☆☆☆☆

اہل اور اہلبیت

بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم

الحمد للہ ربّ العلمین والصلوۃ علی اشرف الانبیاء

والمرسلین وآلہ الطیبین الطاھرین

ضرورت تحریر

ہماری تحریر و تقریر پر نظر رکھنے والے بخوبی جانتے ہیں کہ ہم نے قادیانی چرب زبانی اور مرزائی ہرزہ سرائی کے مقابلے میں کچھ لکھنا یا کہنا کبھی پسند نہیں کیا اس لئے کہ عالم ہو یا جاہل' دانا ہو یا نادان' حق پرست ہو یا باطل پرست بات ہر ایک ہی سے ہوتی ہے۔ اور ہو سکتی ہے۔ انبیاء اور خدا نے جاہلوں سے' نادانوں سے بات کی' جو خدا نے ان سے بات کی' جو نبی نے ان سے بات کی۔ جاہل ہو' ابو جہل ہو' مردود ہو' فرعون ہو' نمرود ہو بات ہر ایک سے ہوتی ہے اور ہو سکتی ہے مگر شرط یہ ہے کہ جس سے بات کی جائے اس کے ہوش و حواس بجا ہوں' وہ فاتر العقل اور دیوانہ نہ ہو۔ اجہل ہو مگر پاگل نہ ہو۔

ہمارے خلاف زہر اگلنے کی وجہ

ایک تو یہ ہے کہ شیعوں نے دعوت کفر پر لبیک کہنا تو درکنار کان لگا کر کبھی سننا بھی گوارا نہیں کیا۔ کیونکہ نبوت اور امامت کے لئے شیعہ نقطہ نظر شروع ہی سے اتنا بلند ہے کہ نبی تو نبی وہ کسی غیر معصوم کو نبیؑ کا جانشین اور اپنا امام نہیں مانتے۔ بلکہ امامت و خلافت کے لئے ان کے نزدیک محض عصمت و طہارت بھی کافی نہیں۔ بلکہ امام

کو جامع جمیع صفات حسنہ اور اس کے ساتھ اللہ کی طرف سے منصوص ہونا چاہئے۔ نبیؐ کی جانشینی کا معیار جن کے یہاں اتنا بلند ہو وہ کسی بے اصل اور خودرو کو نبی مان لیں۔

این خیال است و محال است و جنوں

جو لوگ رسول خاتم النبینؐ کے بعد نفس رسول (علیؑ) جیسی عظیم ہستی کو نبی کہنا یا نبی سمجھنا کفر محض سمجھتے ہوں ان کی نگاہ خس و خاشاک پر کیا ٹھہرے گی......

(حدیث کساء کے بارے میں چند حضرات کو شکوک و شبہات ہیں پہلے ان کے دلائل سن لیں پھر ہمارا علمی اور قرآنی جواب دیکھیں اور غور فرمائیں۔)

معترض کے دلائل

اب رہی حدیث کساء تو اس سے استدلال کئی وجوہ سے غلط ہے۔

اول یہ کہ شان نزول کی روایات زیادہ تر وضعی ہیں۔ اور اہل تحقیق کے نزدیک یہ عموماً پایۂ اعتبار سے ساقط ہیں۔

دوسرے یہ حدیث کساء جن جن طرق واسناد سے مروی ہے ان میں ایک سند بھی ایسی نہیں جس کے کسی نہ کسی راوی پر غیر صدوقٍ 'کذّاب لایعبأ به' لیس بشیءٍ متشیّع وغیرہ کی زد نہ پڑ چکی ہو۔ تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں۔

تیسرے اگر یہ روایت صحیح مان بھی لی جائے تو زیادہ سے زیادہ اس کا مطلب صرف یہی ہو سکتا ہے کہ حضورؐ نے جس طرح سلمان منّا اہل البیت فرما کر سلمان کو اہل بیت ہونے کا درجہ دیا اسی طرح ان چار تن کو بھی اہلبیت میں داخل کرنے کی آرزو کا اظہار فرمایا۔ گھر کے خادم کو بھی گھر کا آدمی کہا جاتا ہے۔ لیکن اس سے وہ فی الواقع فرد خانہ نہیں بن جاتا اور وہ بھی اس طرح کہ اصل افراد خانہ کو خارج کر دیا جائے۔

چوتھے یہ کہ ھولاء ''حصر'' کے لئے نہیں آتا۔ لہذا یہ ترجمہ ہی سرے سے غلط ہے کہ اے اللہ بس یہی ہیں میرے اہلبیت اور دوسرا کوئی نہیں۔

پانچویں بیت کے معنی ہیں گھر جسے فارسی میں خانہ کہتے ہیں۔ اہلبیت کے معنے

ہوئے اہل خانہ۔ گھر والی نہ کہ داماد اور بیٹی اور نواسے جن کا گھر ہی الگ ہوتا ہے' اگر جناب فاطمہؑ اہلبیت علی تھیں اور یقیناً تھیں تو امہات المومنین کے اہلبیت رسول ہونے سے کوئی کور قلب ہی انکار کر سکتا ہے۔ سیدھی بات یہ ہے کہ اہل خانہ یا اہلبیت کا حقیقی اطلاق بیوی پر ہی ہوتا ہے۔

مجازاً گھر کے آدمی'' کے معنوں میں اس کا اطلاق ان تمام لوگوں پر ہو سکتا ہے جو لحوق و لزوق اور خصوصی قرب رکھتے ہیں۔ بیوی اصالتاً اہلبیت سے ہے اور اولاد فرعاً اہلبیت ہے۔ ان دونوں کا فرق یہ ہے کہ فرع کے بغیر اصل کا وجود ہو سکتا ہے لیکن اصل کے بغیر فرع کا تصور بھی نہیں ہو سکتا۔ اولاد کے بغیر بیوی کا وجود ہو سکتا ہے لیکن بیوی کے بغیر اولاد ممکن ہی نہیں۔ پس بیوی اصالتاً اہلبیت ہے اولاد فرعاً و مجازاً

یہ میں اپنی طرف سے نہیں کہہ رہا ہوں۔ قرآنی فیصلہ یہی ہے سورۃ ھود کا ساتواں رکوع آیت 69 سے 73 تک باترجمہ ملاحظہ فرمالیجئے۔ سیدنا ابراہیمؑ کے پاس فرشتے قوم پر عذاب لے کر آتے ہیں۔ جناب خلیل اللہ بچھڑے کے بھنے ہوئے گوشت سے ان کی تواضع فرماتے ہیں لیکن وہ نہیں کھاتے.... اس وقت یہ آیتیں نازل ہوئیں :

وامراته قائمة فضحكت فبشرنها باسحٰق و من وراء اسحٰق يعقوب o قالت يٰويلتىٰء الدوانا عجوز و هٰذا بعلى شيخاً ط ان هذا لشئى عجيب o قالوا اتعجبين من امرالله رحمت الله و بركته عليكم اهل البيت انه حميد مجيد o (سورۂ ھود آیت 71, 72, 73)

ان (ابراہیم) کی بیوی (سارہؑ) کھڑی تھیں بس وہ ہنس پڑیں تو ہم (اللہ) نے (انہی فرشتوں کے ذریعہ) انہیں اسحاق کی اور اسحاق کے پیچھے یعقوب کی خوش خبری دی' کہنے لگیں کہ مجھے اولاد ہو گی اور وہ بھی ایسی حالت میں کہ میں بڑھیا ہوں اور میرا یہ شوہر (ابراہیمؑ) بھی بوڑھا ہو چکا ہے' فرشتوں نے کہا کہ اللہ کے حکم پر تم تعجب کر رہی ہو؟ اے (ابراہیم کے) اہلبیت تم پر اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں نازل ہوں وہ بلاشک حمید و مجید ہے۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا؟ بیوی ابھی لادلد ہے اور اسے اہل البیت کے لفظ سے مخاطب کیا جارہا ہے کیونکہ اصالتاً صرف بیوی ہی اہلیت ہوتی ہے۔

سبائیت نواز حضرات اس آیت کو دیکھ کر بے حد چکرا جاتے ہیں کیونکہ اس میں بڑی وضاحت کے ساتھ صرف بیوی کو (جو ایک ہی ہے' اہلبیت کہا گیا ہے اور اس سے گریز کرنے کے لئے یہاں انہیں کوئی حدیث بھی نہیں ملتی۔ یہاں اہلبیت کے معنی بیوی لینے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ یہاں یہ مانتے ہیں' تو سورہ احزاب کی آیت تطہیر میں ازواج النبیؐ ہی کو اہلبیت ماننا پڑتا ہے۔ بیچارے کریں تو کیا کریں۔

اب ان سبائیت نوازوں نے.... جن میں شیعہ اور بعض سنی دونوں ہی ہیں ایک پینترا بدلا۔ ارشاد ہوا کہ دیکھئے سورۃ احزاب کے پورے چوتھے رکوع میں جہاں بھی ازواج رسول کے لئے ضمیریں آئی ہیں وہ سب کی سب جمع مونث کی ضمیریں ہیں۔ یہ تعداد میں بیس ہیں۔ لیکن آیہء تطہیر کے اس ٹکڑے (انمّا یرید اللہ لیذھب عنکم الرّجس اھل البیت ویطھّر کم تطھیراً۔ الاحزاب 32) میں دو جگہ.... عنکم اور یطھر کم میں جمع مذکر کی ضمیر آئی ہے۔ لہذا یہ ثابت ہو گیا کہ آیہ تطہیر نہ سہی لیکن آیہ تطہیر کے اس ٹکڑے سے تو ازواج مطہرات کا کوئی تعلق نہیں۔ اس کا تعلق انہی چار اشخاص سے ہے جنہیں حضور نے چادر اوڑھا کر اللّٰھم ھٰولاء اھل بیتی.... فرمایا تھا۔ جمع مذکر کی ضمیر انہی کے لئے آسکتی ہے۔ ازواج کے لئے اگر یہ ٹکڑا ہوتا تو عنکم اور یطھر کم کی بجائے عنکن اور یطھر کن ہوتا۔

بظاہر تو یہ بات ایسی وزنی معلوم ہوتی ہے جس کا کوئی جواب ہی ممکن نہیں۔ میرے ایک دوست نے ایک مجلس میں یہ نکتہ بیان کیا تو سارا مجمع صلوات اور تحسین کے نعروں سے گونج اٹھا۔ مجھ سے ایک ملاقات کے دوران انہی صاحب نے یہ زوردار نکتہ بیان فرما کر مجھے ہمیشہ کے لئے لاجواب کرنے کی سعی لاحاصل فرمائی۔ میں نے صرف اتنا عرض کیا کہ کسی پڑھے لکھے آدمی کے سامنے یہ نکتہ ہرگز بیان نہ فرمایئے گا۔ کیونکہ مجھ جیسا کم علم ہیچمدان بھی اس مغالطے (FALLACY) اور فریب سے واقف ہے۔

ارشاد ہوا کہ اس کا تو کوئی جواب ہی ممکن نہیں۔ میں نے عرض کیا پھر سنیئے۔

دیکھیئے عربی زبان کا ایک مسلمہ قاعدہ ہے کہ لفظ اہل جس کے لئے آتا ہے اس کے لئے جمع مذکر ہی کی ضمیر آتی ہے۔ وہ واحد ہو' تثنیہ ہو' جمع ہو' مذکر ہو' مونث ہو کچھ بھی ہو جب لفظ اہل سے اسے یاد کریں گے تو لفظ اہل کی رعایت سے اس کے لئے ہمیشہ مذکر ہی کی ضمیر آئے گی۔ پورے کلام عرب میں اس کے خلاف کوئی مثال نہ ملے گی۔ سب سے پہلے قرآن کو دیکھئے:۔

سورۃ ہود کی آیت نمبر 73 کو دیکھئے۔ صرف ایک عورت' (زوجہ ابراہیم) سے فرشتے مخاطب ہیں اور واحد مونث حاضر ہی کے صیغے سے مخاطب کر کے کہتے ہیں: قالوا اتعجبین من امر الله (کیا تو اللہ کے حکم میں تعجب کرتی ہے) لیکن اس کے ساتھ ہی اسی جملے میں جب لفظ اہلبیت کہہ کر مخاطب کرتے ہیں تو اسی آن صیغہ بدل جاتا ہے۔ رحمت الله و برکته علیکم اهل البیت کہتے ہیں۔ علیكِ نہیں فرماتے کیونکہ اس کا مرجع لفظ اہل ہے اسی طرح سیدنا موسیٰ اپنی بیوی کو ساتھ لے کر وادی سینا میں پہنچتے ہیں تو دور سے آگ دیکھ کر اپنی بیوی سے فرماتے ہیں:۔

قال لاهله امكثوا.... لعلى اٰتيكم.... لعلكم تصطلون (سورۂ قصص آیت 29)

اپنی بیوی سے فرمایا ٹھہرو شاید میں تمہارے پاس آگ لے آؤں.... تاکہ تم سینکو۔ یہاں ہر جگہ جمع مذکر کا صیغہ آیا ہے امکثی نہیں امکثوا ہے۔ ایتك کی بجائے ایتکم ہے اور لعلك تصطلین کی جگہ لعلکم تصطلون ہے۔

ایک شاعر زبیدہ خاتون کی مدح میں (نہر زبیدہ بننے کے بعد) کہتا ہے

یااهل بیت خلیفة الله الغنی

بالله انتم زبدة النسوان

یعنی اے خلیفۃ اللہ کی بیوی تم تو عورتوں کا مکھن (خلاصہ) ہو۔ یہاں ایک عورت ہی مخاطب ہے لیکن لفظ اہل سے مخاطب ہونے کی وجہ سے انت نہیں بلکہ انتم کی جمع مذکر کی ضمیر لائی گئی ہے۔ اس کی مثال اردو زبان میں لفظ ''ہم'' ہے بولنے والا

ایک ہو یا زیادہ مذکر ہو یا مونث۔ بہر حال یہ جمع مذکر ہی بولا جائے گا۔ ایک مرد اور ایک عورت بھی یہی کہے گی کہ ہم آتے ہیں "آتی ہیں" غلط ہے۔ اور زیادہ مرد اور زیادہ عورتیں بھی یہی کہیں گی کہ ہم آتے ہیں۔ لفظ لوگ کی بھی یہی شکل ہے۔ صرف عورتیں مخاطب ہوں جب بھی یہی کہیں گے کہ تم لوگ کہاں جا رہے ہو۔ کہاں جا رہی ہو کہنا درست نہیں۔

اچھا ایک بات اور بھی سن لیجئے۔ اگر لفظ اہل نہ بھی ہو اور مخاطب صرف عورتیں ہوں جب بھی بعض مواقع پر ان کو جمع مذکر کے صیغے سے یاد کرنا بالکل درست ہوتا ہے۔ اس کی چند مثالیں احادیث نبوی ؐ سے لیجئے۔ یہ سب مثالیں صحیح بخاری میں موجود ہیں۔

1۔ حضور ؐ جب غار حرا سے لرزاں و ترساں گھر تشریف لائے تو گھر کے اندر مردوں کی جماعت نہ تھی۔ حضور ؐ صرف سیدہ خدیجہ سے مخاطب ہو کر بصیغہ مذکر.... فرماتے ہیں: زمّلونی زمّلونی (مجھے چادر اوڑھا دو) حالانکہ زمّلینی ہونا چاہئے تھا۔

2- مرض وفات میں حضور کو جب تیز بخار چڑھا تو حضور ؐ نے ازواج سے مخاطب ہو کر فرمایا:۔

اریقوا علی سبع قرب لم تحلل اوقیتھن

مجھ پر سات لبریز مشکیزے انڈیل دو۔

مخاطب عورتوں کی رعایت سے جمع مونث کا صیغہ ارقن ہونا چاہئے۔ لیکن حضور ؐ نے جمع مذکر کا صیغہ اریقوا استعمال فرمایا۔

3- ھیت نامی ایک م...نّث کو بعض ازواج مطہرات کے پاس بیٹھا دیکھ کر حضور ؐ نے فرمایا:

لایدخلنّ ھٰذا علیکم

یہ تم لوگوں کے پاس نہ آیا کرے

یہاں اس سے پردے کا حکم صرف عورتوں کو دینا مقصود تھا لیکن ان کو علیکنّ

(بہ صیغہ جمع مونث حاضر) نہیں بلکہ جمع مذکر حاضر علیکم فرمایا۔

پس جب بغیر لفظ اہل کے صرف ایک یا زیادہ عورتوں کے لئے جمع مذکر کا صیغہ آسکتا ہے تو لفظ اہل کے ساتھ تو واحد مونث یا جمع مونث کا صیغہ آنے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کیونکہ لفظ اہل کے لئے جمع مذکر ہی کی ضمیر لائی جاتی ہے اور ہمیں کوئی آیت قرآنی کوئی حدیث نبویؐ، کوئی شعر جاہلیت، کوئی کلام عرب ایسا نہ مل سکا جس میں لفظ اہل کے لئے جمع مذکر کے سوا کوئی دوسرا صیغہ لایا گیا ہو خواہ یہ لفظ واحد کے لئے آیا ہو یا تثنیۓ کے لئے یا جمع کے لئے اور مذکر کے لئے ہو یا مونث کے لئے۔ نیز اہل البیت کو جانے دیجئے، صرف ایک لفظ اہل بھی بیوی کے معنی میں اس کثرت سے عربی زبان میں مستعمل ہے کہ قرآن، حدیث اور فقہ اور لغت کی کوئی کتاب بھی اس سے خالی نہیں الفرائد الدریہ میں اہل اور تاہل کے معنی ہیں To Marry (شادی کرنا) اور اہل الرجل کے معنی ہیں Wife (بیوی)۔ میں یہ نہیں کہتا کہ تنہا لفظ اہل اور کسی معنی میں نہیں آتا۔ میں صرف یہ عرض کر رہا ہوں کہ یہ لفظ جب بیت کے ساتھ مل جائے تو اصالتاً اس کے معنی صرف بیوی کے ہوتے ہیں۔ اہل کے معنی ہیں "والا" بلکہ "والے"۔ اہل العلم "علم والے"۔ اہل حدیث "حدیث والے"۔ اہل قرآن "قرآن والے"۔ اہل فقہ "فقہ والے" اسی طرح ہے اہل بیت "گھر والے"۔ اور کون نہیں جانتا کہ گھر والے سے کون مراد ہوتا ہے۔

آیہ تطہیر میں البیت سے نبیؐ کے گھر کے سوا اور کوئی گھر مراد نہیں ہو سکتا۔ نبیؐ کے گھر وہی تھے جن میں نبیؐ کی بیویاں تھیں۔ انہی گھروں کو ازواج النبیؐ کا گھر کہا گیا ہے جیسا کہ آیہ تطہیر کے فوراً بعد فرمایا گیا ہے واذکرن مایتلی فی بیوتکن اگر اور زیادہ وضاحت مطلوب ہے تو سورۃ احزاب کی آیت نمبر 53 ملاحظہ فرمائیے۔ ارشاد ہوتا ہے:۔

یایھاالذین امنوالا تدخلوابیوت النبی الا ان یوذن لکم.... واذا سالتموھن متاعاً فاسئلوھن من وراء حجاب ....(احزاب53)

ایمان والو نبی کے گھروں میں اس وقت تک نہ داخل ہو جب تک تمہیں اجازت نہ مل جائے.... اور اگر ان بیویوں سے کوئی کام کی چیز مانگنی ہو تو پردے کے باہر سے مانگو....

اس آیت میں نبی کے گھروں میں بلا اجازت داخل ہونے کی ممانعت ہے اور اسی آیت میں ازواج النبی سے پس پردہ سوال کرنے کی ہدایت ہے۔ یعنی جو نبی کا گھر ہے وہی ازواج النبی کا ہے۔ پس گھر والوں (اہل البیت) سے مراد امہات المومنین کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا

اب خود فیصلہ کر لیجئے کہ آخر اس قسم کی لفظی و معنوی' تحریفات کا مقصد کیا ہے ؟ مقصد صرف ایک ہے کہ کسی طرح اسلام کی اصل بنیاد قرآن مجید مشتبہ ہو کر رہ جائے۔ جب یہ مشتبہ ہو جائے گا مہاجرین و انصار کے وہ فضائل و مناقب بھی مشتبہ ہو جائیں گے۔ تو پوری تاریخ اسلام مشتبہ ہو جائے گی۔ اس کے بعد آسانی سے فرضی روایات کے ذریعہ ان لوگوں کو جو نہ مہاجر ہیں نہ انصار.... مثلاً حضرات حسنین اور ان فرضی اماموں کو جن کا نہ کوئی ذکر قرآن میں ہے نہ حدیث میں' ان سب مہاجرین و انصار کی گردن پر سوار کرا دیا جائے گا اور سب سے افضل ثابت کر دیا جائے گا۔ نتیجہ یہ نکلے گا کہ سارے صحابہ کرام علیہم السلام اور تمام ازواج مطہرات صلوٰۃ اللہ علیہن غاصب قرار پائیں گے۔ جنہوں نے سیدنا علی سلام اللہ علیہ کا حق چھین لیا' ان سے جنگ کی۔ یہ ہے سبائی پروگرام کا وہ حصہ جس کی ایک شکل تحریف قرآن کی سعی لاحاصل ہے۔

ہم نے تحریف کی صرف ایک مثال پیش کی ہے۔ باقی امثلہ کا انتظار فرمائیے۔ اور اس دوران یہ بھی سوچتے رہیے کہ سبائیوں کا پروپیگنڈا کیسا زبردست اور منظّم ہے کہ ''فری میسن'' کی تحریک و تنظیم اس کا ایک حصہ نظر آتی ہے۔ حد یہ ہے کہ سُنّی بھی ''اہلبیت'' کے معنی عام طور پر وہی سمجھتے ہیں۔ فرضی اماموں کو بھی امام مانتے ہیں۔ محرم میں کوئی نکاح کرنا نہایت مکروہ جانتے ہیں۔ کچھ امام جعفر صادقؑ کا کونڈا کرنا اتنا

ضروری اور بابرکت سمجھتے ہیں کہ انہیں یقین ہوتا ہے کہ اگر کونڈا نہ کیا تو ہمارا کونڈا ہو جائے گا۔ حالانکہ امام جعفر صادقؑ کی وفات کا وہ دن ہی نہیں۔ وہ دن ہے امیر المومنین سیدنا معاویہؓ کی وفات کا۔ ان کی وفات کی خوشی وہ سنیوں کے ہاتھوں سے امام جعفر صادقؑ کا کونڈا بتا کر منواتے ہیں۔ جس طرح عید غدیر امیر المومنین سیدنا عثمان علیہ السلام کی شہادت کی خوشی میں منائی جاتی ہے۔ سنیوں میں کچھ حضرات ایسے بھی ہیں جو تعزیہ نکالنا بڑا کار ثواب اور باعث برکت سمجھتے ہیں۔ غرض اس قسم کی تمام خرافات سبائیوں کے واسطے سے سنیوں میں گھس آئی ہیں۔ دوسرے فرقے اگر کچھ کرتے ہیں تو وہ شوق سے کریں۔ ہم تو صرف اپنے سنی بھائیوں سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اپنے اندر جھانک کر دیکھیں کہ سبائیت کا کتنا حصہ ان کے اندر سرایت کئے ہوئے ہے۔

تفصیلی جواب سے پہلے اس مضمون پر فنون پر ایک نظر

غلط باتیں بہت سی سنی اور دیکھی ہیں لیکن اس لغوگوئی نے سب کو مات کر دیا۔ ہم اصل جواب سے پہلے ان فریب کاریوں کو واضح کرتے ہیں۔ جن سے ان مہملات کو رنگین کیا گیا ہے۔ نیز یہ بھی دکھاتے ہیں کہ معترض نے رسول پاکؐ اور ان کی آل پاکؑ کے بارے میں کیسی عظیم گستاخیاں کر کے ان سے اپنے بغض و عناد کو بے پردہ کیا ہے۔ اور ان کی پاک روحوں کو اذیت پہنچا کر ان الذین یوذون اللہ و رسولہ لعنھم اللہ فی الدنیا والاخرۃ و اعدّلھم عذاباً مھیناً کے زمرہ میں داخل ہونے سے نہ ڈرے۔ (احزاب :57)

(موصوف نے سب سے پہلا وار آیۂ تطہیر کی شان نزول اور حدیث کساء کے راویوں پر کیا ہے۔

وہ شانِ نزولِ آیت کے روایات اور حدیث کساء کو دو مختلف چیزیں دکھا رہے ہیں۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ آیۂ تطہیر کی شان نزول ہی کا نام حدیث کساء ہے۔ اور

حدیث کساء ہی آیت کی شان نزول ہے۔ جس کسی نے بھی آیۂ تطہیر کی شان نزول بیان کی ہے وہی ایک واقعہ بیان کیا ہے جو حدیث کساء کے نام سے موسوم ہے۔ نہ تو کسی نے اس واقعہ کے سوا کوئی اور واقعہ بیان کیا ہے اور نہ کسی نے بیان واقعہ میں پانچ تن (محمدؐ علیؑ فاطمہؑ حسنؑ اور حسینؑ) کے علاوہ کسی کو زیر چادر دکھایا ہے۔ جن روایات نے اس واقعہ کو بیان کیا ہے وہ اس بناء پر تو روایات ہیں کہ واقعہ کو بیان کرنے والے بہت سے صحابہ اور صحابیات ہیں لیکن بیان واقعہ سب کا ایک ہے لہذا نفس مطلب اور اصل مفہوم کے اعتبار سے روایات نہیں ہیں۔ بلکہ روایت ہے جو صرف ایک ہے۔

معترض کا یہ کہنا کہ "روایات زیادہ تر وضعی ہیں" ایک کھلا فریب ہے کیونکہ زیادہ تر کا لفظ تو اس وقت صحیح ہو سکتا تھا جبکہ روایات میں اختلاف ہوتا۔ کوئی چادر والا واقعہ بیان کرتا' اور کوئی دوسرا کوئی اور واقعہ بیان کرتا۔ کوئی چادر میں آنحضرتؐ کے ساتھ علی فاطمہ و حسن و حسین کو دکھاتا۔ اور کسی روایت میں ان حضرات کے بجائے یا ان حضرات کے علاوہ کسی اور کو دکھاتا۔ لیکن ایسا نہیں اور ہرگز نہیں۔ یہاں ہم کو بلکہ ان کے مضمون کے ہر دیکھنے والے کو یہ پوچھنے کا حق پہنچتا ہے کہ روایات کے زیادہ تر وضعی ہونے کے معنی یہ ہیں کہ ان زیادہ تر وضعی روایات کے مقابلہ میں کچھ روایات صحیح اور واقعی بھی ہیں تو پھر اس نے کیوں ظاہر نہ کیا کہ وہ صحیح روایات کیا ہیں اور ان روایات کا کہنا کیا ہے؟ اگر معترض کے ذخیرۂ معلومات میں کچھ روایات صحیح موجود تھیں تو ان کو پردہ میں کیوں رکھا گیا۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ جن روایات کو وضعی کہا گیا ہے ان کے مقابلہ میں کوئی دوسری روایت کا وجود ہی نہیں۔ اور جن راویوں کو جھوٹا کہا گیا ہے ان کے مقابلہ میں دوسرا کوئی راوی ہی نہیں۔

آیۂ تطہیر کی شان نزول یعنی حدیث کساء میں تمام راوی متفق اللفظ ہیں

اس حدیث مبارک کے چار عناصر ہیں جو ہر روایت میں موجود ہیں۔

1۔ پنجتن پاک (محمدؐ علیؑ فاطمہؑ حسنؑ و حسینؑ) کا ایک جگہ جمع ہونا۔

2۔ سرکارؐ کا اپنے ساتھ ان چاروں حضرات کا اپنی چادر میں لینا۔

3۔ سرکار کا بارگاہ خدا میں عرض کرنا **اللھم ھولاء اھل بیتی و خاصتی فاذھب عنھم الرجس و طھرھم تطھیرا**

4۔ آیۂ تطہیر کا نازل ہونا۔

یہ چاروں عناصر ہر روایت میں موجود ہیں۔ ترتیب کچھ بھی ہو (دعا پہلے یا نزول آیت پہلے) کسی نے بھی اس واقعے کے مقابلے میں کوئی دوسرا واقعہ یا چادر میں ان حضرات کے سوا کسی اور کو بیان نہیں کیا۔ اگر معترض کے علم میں ان وضعی روایات کے مقابلہ میں کچھ صحیح روایات تھیں (جیسا کہ ان کے الفاظ ''زیادہ تر روایات وضعی ہیں'' سے ظاہر ہوتا ہے) تو ان کو عیب کی طرح کیوں چھپایا؟ ہم دکھا چکے ہیں کہ روایت مفہوم کے اعتبار سے صرف ایک ہے۔ جس کے بیان کرنے والے بہت سے صحابہ و صحابیات ہیں۔ یہاں تک کہ جن حضرات نے ازواج نبیؐ کو اس آیت کا مخاطب و موصوف بتایا ہے۔ انہوں نے بھی کسی اور روایت کا حوالہ نہیں دیا نہ یہ کہا کہ چادر میں ان پانچ حضرات کے سوا کوئی اور تھا۔ ازواج نبی کی شان میں آیت کا آنا صرف اس بناء پر کہا گیا ہے کہ یہ آیت ان آیات کے درمیان میں ہے جو ازواج نبیؐ کے بارے میں ہیں۔ یا دوسرا استدلال ان حضرات کا یہ ہے کہ لفظ اہل البیت (گھر والے) کے معنی میں ازواج داخل ہوتی ہیں۔ ان دونوں استدلال کی حقیقت ہم آئندہ ظاہر کریں گے۔

معترض نے روایات کے وضعی اور راویوں کے جھوٹا اور شیعہ ہونے کا کوئی ثبوت نہیں دیا

ہر ایک دعویٰ محتاج دلیل و ثبوت ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ انبیاء و مرسلین کو بھی ثبوت رسالت و امامت کے لئے منجانب اللہ معجزات و کمالات دیئے گئے۔ اور قدرت نے یہ ہرگز پسند نہ کیا کہ ثبوت کے بغیر کسی دعوے کو قبول کیا جائے۔ لیکن معترض نے اتنا بڑا دعویٰ تو کر دیا کہ شان نزول آیۂ تطہیر جو حدیث کساء ہے اس کے

راوی جھوٹے اور شیعہ ہیں مگر اتنے بڑے دعوے کی کوئی دلیل نہ دی جس کی زد میں اکابر صحابہ اور وہ امہات المومنین بھی آگئیں۔ جن کی ظاہری حمایت میں یہ مضمون لکھا گیا۔ دعویٰ مذکور (راویان حدیث کساء جھوٹے اور شیعہ ہیں) کے بعد جب دلیل و ثبوت کا وقت آیا تو انہوں نے لکھ دیا کہ ''تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں''۔ اس جملے میں تفصیل کا لفظ بڑی ہوشیاری سے کہا گیا ہے۔ لکھنا تو یہ تھا کہ ثبوت اور دلیل کے دینے کا یہ موقع نہیں۔ لیکن ان کو یہ کہتے ہوئے شرم آئی۔ اور انہوں نے محسوس کیا کہ اگر دلیل و ثبوت نہ دینے کا خود ہم نے اعتراف کر لیا تو ہر شخص کہے گا کہ دلیل تھی تو وہ دی کیوں نہ گئی۔ اگر دلیل دینا نہ تھی تو دعویٰ کیوں کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کے پاس ان کے مدعا کے لئے کوئی دلیل ہی نہ تھی۔ اگر وہ دلیل و ثبوت کی طرف کچھ بھی رخ کرتے۔ تو ان کا دعویٰ فوراً باطل ہو جاتا۔

معترض نے شیعوں کو سبائی بتایا ہے

اس مضمون پُر جنون میں جابجا شیعت کو سبائیت اور شیعوں کو سبائی کہا گیا ہے۔ لیکن اس کی نشان دہی نہ کی کہ ان کے کس عقیدہ میں انہوں نے سبائیت دیکھی نہ یہ بتایا کہ سبائیت ہے کیا چیز؟ اس کی وضاحت بقدر ضرورت ہم کئے دیتے ہیں۔ وہ یہ کہ عبداللہ بن سباء کا اگر کوئی وجود تھا تو اس کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ اس نے حضرت علی مرتضیٰؑ کو خدا اور اپنے آپ کو نبی کہا تھا۔ اب کوئی بتائے کہ اس عقیدہ کا کوئی شائبہ بھی شیعہ عقائد میں ہے؟ ہرگز نہیں اور مطلقاً نہیں۔ شیعہ حضرت علی مرتضیٰؑ کو خدا تو کیا نبی بھی نہیں مانتے۔ ان کا مذہب تو یہ ہے کہ خاتم النبینؐ کے بعد جو کسی کو بھی نبی مانے وہ کافر اور نجس العین ہے۔ ان کے یہاں نبی صرف وہ ہے جو منجانب اللہ اور برحق ہو اور اس سلسلہ کے آخری نبی حضرت محمد مصطفیٰؐ ہیں۔ انؐ کے بعد لفظ نبوت کسی بھی ہیر پھیر سے کسی کے لئے کہا نہیں جاسکتا۔

آنحضرتؐ کے بعد الٰہی منصب صرف امامت اور نبی کی جانشینی ہے۔ وہ کسی بھی

سخن سازی سے کسی کو ظلی، بروزی اور مجازی نبی کہنا بے دینی سمجھتے ہیں۔ لیکن معترض صاحب اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھیں کہ عبداللہ بن سباء کی طرح نبوت کا جھوٹا دعویٰ کس نے کیا اور کن لوگوں نے سبائی آواز پر لبیک کہا اور کونسا فرقہ سبائی ہوا؟ اپنی بلا دوسروں کے سر ڈالتے ہوئے شرم آنا چاہیئے۔

علی مرتضیٰؑ کے بارہ میں شیعہ عقیدہ اور کہیں سے نہیں تو ان کی آوازِ اذان ہی سے سن لیجئے وہ علی مرتضیٰ کو امیر المومنینؑ، امام المتقین ولی اللہ اور وصی رسول خدا مانتے ہیں۔ اس عقیدے سے کسی بھی مسلمان کو انکار نہیں ہو سکتا۔ اب رہا یہ امر کہ خلافت و امامت کے بارہ میں شیعہ نقطہ نظر یہ ہے کہ وہ منجانب اللہ ہے اور بعد رسولؐ آئمہ اثناعشر کے لئے مخصوص و منصوص ہے۔ اور ان بارہ میں علی مرتضیٰؑ پہلے اور حسنؑ و حسینؑ دوسرے اور تیسرے ہیں۔ تو یہ چیز خود احادیث مذکورہ کتب اہل سنت سے ثابت ہے جس کا ذکر ہم آئندہ کریں گے۔ یہاں صرف اتنا کہنا ہے کہ اگر معترض نے سبائیت کا لقب شیعوں کو اس بناء پر دیا ہے کہ شیعہ علی مرتضیٰؑ کے مقابلہ میں اور کسی کو مستحق خلافت نہیں سمجھتے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ جو بھی خلفاء راشدین میں سے کسی کی خلافت سے اختلاف رکھتا ہو وہ سبائی ہے۔ اور مومن صرف وہ ہے جو ان چاروں کی خلافت کو حق بجانب سمجھتا ہو تو میں کہوں گا کہ اس معیار پر قرون اولیٰ کے تمام ہی مسلمان (صحابہ و تابعین) باری باری سبائی قرار پاتے جائیں گے۔ کیونکہ ان چاروں حضرات خلفاء میں سے کوئی بھی ایک ایسا نہیں جس کو بلا استثناء ہر ایک فرد مسلم نے مانا ہو اور کسی نے اس کی خلافت سے اختلاف نہ کیا ہو۔

مجھے تاریخ کی روشنی میں ایسا کوئی بھی نظر نہیں آتا جس نے چاروں خلافتوں کا زمانہ پایا ہو اور اس نے ان چاروں کو تہ دل سے مستقل طور پر مانا ہو۔ حقیقت یہ نظر آتی ہے کہ کسی نے کسی سے اختلاف کیا اور کسی نے کسی سے۔ یہ امر تو مسلم اور حقیقت واضحہ ہے کہ سعد بن عبادہ انصاری جو رئیس انصار اور آنحضرتؐ کے علمدار تھے انہوں نے نہ تو خلافت اولیٰ کو تسلیم کیا نہ خلافت ثانیہ کو یہاں تک کہ اسی انکار پر ان کی وفات ہو گئی

خلافت اولیٰ کی بیعت کے وقت اہل بیتؑ بلکہ تمام بنی ہاشم نے اور بنی ہاشم کے ساتھ صحابہ کی ایک جماعت نے جن میں زبیر' مقداد بن عمرو' سلمان فارسی' ابوذر' عمار بن یاسر اور براء بن عاذب وغیرہم ہیں' ان لوگوں نے خلیفہ اول کی بیعت سے انکار کیا یہاں تک کہ بنت رسولؐ کے جنازہ پر بھی خلیفہ اول و ثانی کی شرکت نہ ہو سکی۔ حضرت عمر کا وہ مکالمہ جو حضرت عبداللہ بن عباس سے ہوا جس مکالمہ کا حوالہ علامہ شبلی نے الفاروق میں تاریخ طبری سے دیا ہے اس مکالمے سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت عمر یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ بنی ہاشم مجھ کو (حضرت عمر کو) اور میرے پیش رو کو (حضرت ابوبکر کو) خلیفہ بر حق نہیں سمجھتے بلکہ بنی ہاشم یہ سمجھتے ہیں کہ مسئلہ خلافت میں ہم پر ظلم و حسد کیا گیا ہے (دیکھئے الفاروق' تاریخ طبری' تاریخ احمدی) تیسری خلافت کے انعقاد کے وقت حضرت علی مرتضیٰؑ کا سیرت شیخین کی شرط پر خلافت کا قبول نہ کرنا اور یہ فرمانا کہ میں آج ہی نہیں بلکہ وفات رسول ہی کے وقت سے مظلوم رہا ہوں۔ اور حضرت عثمان کی بیعت لینے کے وقت حضرت مقداد بن اسود اور عمار بن یاسر کا حضرت عبدالرحمان بن عوف سے کہنا کہ اہل بیت کو ان کے حق سے محروم کیا جا رہا ہے اور اہل بیت کو اذیت پہنچائی جا رہی ہے۔ (از تاریخ احمدی' بحوالہ مروج الذہب مسعودی و تاریخ ابن جریر طبری و تاریخ کامل و تاریخ ابو الفداء و شرح فقہ اکبر ملا علی قاری)

ان تمام واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ ان تینوں خلافتوں میں سے ایک خلافت بھی ایسی نہیں کہ جو بلا اختلاف و انکار ہو پھر یہ واقعہ تو الم نشرح ہے کہ حضرت ام المومنین عائشہ جس قدر پہلی دو خلافتوں سے خوش تھیں اسی قدر تیسری اور چوتھی خلافت سے ناخوش تھیں اور آخری دونوں خلیفوں کی سخت مخالف تھیں۔ اس کے علاوہ جن ہزاروں آدمیوں نے حضرت عثمان کی خلافت بلکہ ان کی جان کے دشمن ہو کر بالآخر ان کو قتل کر دیا۔ ان کے بارے میں یہ کون باور کر سکتا ہے کہ انہوں نے حضرت عثمان کو خلیفہ بر حق مان کر قتل کیا۔ رہی چوتھی خلافت تو یہ کون نہیں جانتا کہ حضرت علیؑ کی خلافت سے لاکھوں مسلمانوں نے اختلاف کیا اور محض اختلاف ہی نہیں کیا بلکہ صف

آرائی اور شمشیر زنی ہوئی اور ہزار ہا افراد فریقین کے تیغ بے دریغ کی نذر ہو گئے۔ کیا یہ اصحاب جمل جن میں ام المومنین عائشہ' حضرت طلحہ اور حضرت زبیر بھی ہیں یہ لوگ علیؑ کو خلیفہءبرحق مانتے تھے؟ کیا یہ اصحاب صفین جو حضرت معاویہ کے ساتھ تھے ان لاکھوں مسلمانوں نے علیؑ کو خلیفہءبرحق مانا تھا۔ اس کے بعد خوارجِ نہروان ہیں۔ یہ سب وہ لوگ ہیں جو علیؑ مرتضٰی کی خلافت کے یا تو شروع ہی سے منکر تھے یا اقرار کے بعد منکر ہو گئے۔ علی مرتضٰی کی بیعت سے اور تو اور حضرت سعد بن وقاص اور حضرت عبداللہ بن عمر نے بھی انکار کیا۔ تو اگر کسی کہی جانے والی خلافت راشدہ سے مخالفت یا انکار ہی کا نام سبائیت ہے تو قرون اولیٰ میں سبائی ہونے سے کون بچا اور مسلمان کون رہا۔

معترض نے اہلبیتؑ نبی کی شان میں کھلی ہوئی گستاخیاں کی ہیں

اس شخص نے جس کا نہ کوئی دین ہے نہ کوئی آئین برگزیدگان خدا اور عترت رسول خداؐ کی انتہائی توہین کر کے اپنے سیاہ نامہ عمل کو سیاہ تر کیا۔ اس کے قلم سے وہ کلمات لکھے گئے جن کو نہ کوئی مسلمان سن سکتا ہے اور نہ کوئی کافر بچا کہہ سکتا ہے۔ کفر در دل بر زبان اللہ اکبر داشتن۔ دیدہ دلیری ملاحظہ فرمایئے۔

"اگر یہ روایت صحیح مان بھی لی جائے تو زیادہ سے زیادہ اس کا مطلب صرف یہی ہو سکتا ہے کہ حضورؐ نے جس طرح سلمان منّا اہل البیت فرما کر جناب سلمان کو اہل بیت ہونے کا درجہ دیا اسی طرح ان چار تن کو بھی اہل بیت میں داخل کرنے کی آرزو کا اظہار فرمایا گھر کے خادم کو بھی گھر کا آدمی کہا جاتا ہے۔ لیکن اس سے وہ فی الواقع فرد خانہ نہیں بن جاتا"۔

موصوف پہلے کہہ چکے ہیں کہ حدیث کساء کے راوی جھوٹے اور یہ روایت وضعی ہے۔ جس قلم اور منہ سے یہ الفاظ نکل چکے ہوں اب کس منہ سے یہ کہا جا رہا ہے کہ اگر یہ روایت صحیح مان بھی لی جائے ہم کہتے ہیں کہ جن راویوں کو اور جن کی روایت کو

آپ صریحاً جھوٹا کہہ چکے اب ان کو اور ان کی روایت کو صحیح ماننے کا خیال بھی آپ کو کیوں آیا؟ صرف اس لئے کہ جو بات بے لگام ہو کر ہم نے کہی ہے آخر کوئی ہمارے منہ میں لگام دے گا اور حدیث کساء کو روز روشن کی طرح ثابت کر کے دکھائے گا۔ لہذا ہم پہلے ہی سے پینترا بدل دیں۔

مخاطب نے حضرت سلمان کے بارہ میں تو یہ کہا کہ ''حضورؐ نے جس طرح سلمان منّا اہل البیت کہہ کر جناب سلمان کو اہل بیت ہونے کا درجہ دیا۔'' اسی طرح ان چار تن کو بھی اہل بیت میں داخل کرنے کی آرزو کا اظہار فرمایا''۔ ان دونوں جملوں کا مقابلہ کیجئے۔ سلمان کو تو حضور نے اہل بیت ہونے کا درجہ بااختیار خود دے دیا۔ لیکن بیٹی، داماد اور نواسوں کو سرکار اپنے اختیار سے اہل بیت میں داخل نہ کر سکے۔ ان کے بارے میں صرف یہ آرزو ہی کر کے رہ گئے کہ کسی نہ کسی طرح یہ بھی اہل بیت میں داخل ہو جائیں۔ یہ بات محض آرزو کی حد تک رہی جو پوری نہ ہو سکی۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔ ''گھر کے خادم کو بھی گھر کا آدمی کہا جاتا ہے لیکن اس سے وہ فی الواقع فرد خانہ نہیں بن جاتا''۔

مخاطب نے نبی کے جگر گوشوں کو حضرت سلمان کے برابر بھی نہ رکھا ان کے گھر کے نوکر چاکر سے تشبیہ دی مگر وہ پھر بھی (علیؑ فاطمہؑ حسنؑ حسینؑ) فرد خانہ یعنی اہل بیت نہ بن سکے۔

اہل بیت کے معنی معترض کے نزدیک صرف ازواج کے ہیں پھر خود ہی سلمان مِنّا اہل البیت (سلمان ہم اہل بیت سے ہے) دکھا کر فرما رہے ہیں کہ حضور نے جناب سلمان کو اہل بیت ہونے کا درجہ دیا تو ان کے نزدیک اس کے معنی یہ ہوئے کہ حضور نے سلمان کو معاذ اللہ اپنی ازواج میں شامل کر لیا۔ پھر لکھتے ہیں کہ سرکار نے ان چار تن کو اہل بیت میں داخل کرنے کی آرزو کا اظہار فرمایا، اس آرزو کے معنی ان کے نزدیک وہی ہوئے۔ معاذ اللہ۔ اور ان چار تن کے لئے اہل بیت میں داخل ہو جانے کی نبیؐ کی آرزوئے بے حاصل بھی وہ اس حالت میں مان سکتے ہیں جب کہ یہ روایت (حدیث کساء) صحیح مان لی جائے۔ لیکن وہ فیصلہ کر چکے ہیں کہ نہ روایت صحیح ہے نہ

راوی سچے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ ان چار تن کے لئے نبی کی یہ آرزو کہ یہ بھی اہل بیت میں شامل ہو جائیں بس آرزو ہی کی حد تک رہی۔

توہین اہل بیت کی ایک اور کفر پرور مثال

کہتے ہیں ''اس کے بعد آسانی سے فرضی روایات کے ذریعہ ان لوگوں کو (آئمہ اہل بیتؑ کو) جو نہ مہاجر ہیں نہ انصار.... مثلاً حضرات حسنینؑ اور ان فرضی اماموں کو جن کا ذکر نہ قرآن میں ہے نہ حدیث میں ان کو مہاجرین وانصار کی گردن پر سوار کرا دیا جائے گا۔ اور سب سے افضل ثابت کرا دیا جائے گا''۔

اسی طرح فرضی نبی کا ماننے والا حضرات حسنینؑ اور آئمہ اہل بیت اطہارؑ کو جو حقیقی امام ہیں فرضی امام بتا رہا ہے اور ان کو مہاجرین وانصار کے مقابلہ میں ہیچ سمجھ رہا ہے۔ یہ حضرات (حسن و حسین و آئمہؑ) کسی شمار ہی میں نہیں۔ کیونکہ یہ نہ اہل بیت میں ہیں نہ مہاجرین میں نہ انصار میں.... آگے چل کر رقمطراز ہیں۔

''سبائیوں کا پروپیگنڈا کیسا زبردست اور منظّم ہے.... کہ سُنّی حضرات بھی اہل بیت کے معنی عام طور پر وہی (علی فاطمہ حسن حسین اور ان کا خاندان) سمجھتے ہیں۔ فرضی اماموں کو بھی مانتے ہیں''۔

معترض کے نزدیک مرزا صاحب تو واقعی نبی ہیں، مسیح موعود ہیں، مہدی معہود ہیں، امام زمان ہیں، ان کے تمام مراتب اصلی ہیں لیکن حسنین علیہما السلام اور آئمہ اہل بیتؑ یہ سب فرضی امام ہیں۔ جس کی نظر میں جھوٹ سچ ہو جائے اس کی نظر میں سچ لامحالہ جھوٹ ہی ہو گا جو فرضی کو اصلی کہے گا وہ اصلی کو تو فرضی ہی کہے گا۔

مخاطب رقمطراز ہیں کہ ھٰؤلاء کلمہ حصر نہیں ہے

لکھتے ہیں ''ھٰولاء حصر کے لئے نہیں آتا لہٰذا اس کا یہ ترجمہ ہی سرے سے غلط ہے کہ اے اللہ بس یہی میرے اہل بیت ہیں''۔ مخاطب نے لفظ ھٰولاء کہہ کر یہ کچھ نہ بتایا کہ یہ کس جملے کا لفظ ہے اور کس متکلم کا یہ کلام ہے کس نے کہا اور کس موقعے پر

کہا؟ نہ یہ بتایا کہ مذکورہ ترجمہ غلط ہے تو صحیح ترجمہ کیا ہے۔ اگر اس وادی میں قدم رکھا تھا تو کچھ دیر تو ٹھہرتے۔ لیکن کیسے ٹھہرتے؟ ٹھہرتے اور کھل کر بات کرتے توریت کی دیوار فوراً گر جاتی۔ یہاں بھی وہی بات رہی کہ تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں۔ اب ہم بتاتے ہیں کہ یہ لفظ ھٰولاء اسی حدیث مبارک کساء کا جزء ہے جس کو انہوں نے وضعی بتایا ہے۔ جب وہ پوری حدیث کساء ہی وضعی ہے تو ترجمہ کی بحث کا کیا فائدہ؟ اور اگر بحث ہی کرنا ہے تو سنیئے آنحضرت ؐ نے چادر میں علیؑ و فاطمہؑ حسنؑ و حسینؑ کو لے کر بارگاہ خدا میں عرض کیا ہے:۔

اللّٰھم ھٰولاء اھل بیتی و خاصّتی فاذھب عنھم الرّجس و طھّر ھم تطھیراً

(یا اللہ یہی ہیں میرے اہل بیت اور یہی ہیں میرے خاص اپنے۔ دور رکھ ان سے ہر نجس کو اور پاک رکھ ان کو جو حق ہے پاک رکھنے کا)

اسی موقع پر آیت تطہیر نازل ہوئی۔

رہی حصر کی بحث تو انبیاء کے کلمات عین حق و صداقت ہوتے ہیں حضرت ابراہیمؑ کے دو فرزند تھے۔ ایک اسماعیلؑ اور دوسرے اسحاقؑ ۔ حضرت اسحاقؑ کو انہوں نے اپنے وطن میں رکھ کر صرف حضرت اسماعیلؑ کو سرزمین مکہ پر لیجا کر آباد کیا تو خدا سے یہ نہیں کہا کہ خدایا میں نے اپنی ذریت کو تیرے گھر کے پاس آباد کیا۔ یعنی ربّنا انّی اسکنت ذرّیتی .... نہیں کہا بلکہ ربّنا انّی اسکنت من ذریتی (سورۃ ابراہیم آیت نمبر 37) کہا جس کے معنی یہ ہیں کہ میں نے اپنی اولاد میں سے کچھ کو یعنی ایک کو یہاں آباد کیا ہے چونکہ اسماعیل آپ کی کل ذریت نہ تھے بلکہ ان کے علاوہ بھی اسحاق ان کی ذریت تھے۔ اس لئے حضرت ابراہیم نے لفظ ذریت پر تبعیض کا (مِن) داخل کیا۔ اسی طرح اگر ہمارے نبی ؐ کی نظر میں ان چار تن کے علاوہ آیۂ تطہیر کے موصوف اور بھی افراد ہوتے تو آپ بھی ھولاء اھل بیتی نہ کہتے ھٰولاء من اھلبیتی و خاصّتی کہتے جس کے معنی یہ ہوتے کہ خداوندا یہ لوگ بھی میرے اہل بیت میں سے ہیں۔ لیکن کسی بھی راویؒ حدیث نے من اھل بیتی نہیں کہا جس نے بھی کہا ھٰولاء

اھل بیتی کہا اور اس طرح ان ہی حضرات میں ھٰولاء منحصر رہا۔

معترض کے نزدیک اہل بیت کے معنی صرف ازواج کے ہیں

فرماتے ہیں "اہل بیت کے معنی ہوئے اہل خانہ۔ گھر والی۔ نہ کہ داماد اور بیٹی اور نواسے" پھر فرماتے ہیں۔

"سیدھی بات یہ ہے کہ اہل خانہ یا اہل بیت کا حقیقی اطلاق بیوی پر ہی ہوتا ہے"۔ اس کے بعد فرماتے ہیں۔

"بیوی اصالتاً اہل بیت ہے۔ اور اولاد فرعاً اہل بیت ہے۔ ان دونوں کا فرق یہ ہے کہ فرع کے بغیر اصل کا وجود ہو سکتا ہے۔ لیکن اصل کے بغیر فرع کا تصور بھی نہیں ہو سکتا۔ اولاد کے بغیر بیوی کا وجود ہو سکتا ہے لیکن بیوی کے بغیر اولاد ممکن ہی نہیں۔ پس بیوی اصالتاً اہل بیت ہے اور اولاد فرعاً اور مجازاً"۔

اس پوری تقریر کا مطلب یہ ہے کہ اہل بیت (گھر والوں میں) حقیقتاً صرف بیوی یا بیویاں ہوتی ہیں اولاد حقیقتاً گھر والوں میں نہیں ہوتی۔ اگر اولاد کو گھر والوں میں کہہ دیا جاتا ہے تو یہ محض مجاز ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں۔ دنیا میں ہوگا کوئی ایسا جو جگر کے ٹکڑوں کو اور آنکھوں کے تاروں کو اور حاصلِ زندگانیٔ دنیا کو یعنی اولاد کو اہل خانہ اور گھر والے نہ سمجھے اور صرف بیوی ہی کو ساری کائنات سمجھ لے۔ خدا جانے یہ لغو گوئی کرنے والے مخاطب صاحب اولاد ہیں یا نہیں؟ کیونکہ دنیا میں کوئی صاحب اولاد تو کم از کم یہ نہیں کہہ سکتا کہ میری اولاد میرے گھر والوں میں نہیں ہے۔ بلکہ جو لوگ بے اولاد رہ جاتے ہیں وہ بھی اپنی کم نصیبی پر زندگی بھر ملول رہتے ہیں اور زبان حال سے کہتے ہیں۔

گھر قبر سے بدتر ہے جو فرزند نہیں ہے

ہمارے مخاطب کی منطق یہ ہے کہ بیوی پہلے ہوتی ہے اور اولاد بعد میں لہذا جو پہلے ہے وہ ہے حقیقتاً اہل بیت اور جو بعد میں ہے اس کو فرعاً اور مجازاً تو اہل بیت کہہ سکتے

ہیں مگر حقیقتاً نہیں۔ ہم اس لغو گوئی کا پول کھولے دیتے ہیں اور بتائے دیتے ہیں کہ معترض اپنے منطقی جال میں خود پھنس گئے۔ ہم ان سے سوال کرتے ہیں کہ جن بیویوں سے پہلے اولاد موجود ہو اور جو اولاد ان بیویوں سے پہلے گھر میں آچکی ہو اور موجود ہو وہاں آپ کس کو اہل بیت کہیں گے اس اولاد کو جو پہلے سے ہے یا ان بیویوں کو جو بعد میں آئیں؟ مخاطب کی یہ ساری سخن سازی اس مقصد کے لئے تھی کہ بنت رسول (فاطمہ زہراؑ) کو سرکار کے اہل بیت سے (نعوذباللہ) نکال دے اور اس لفظ اہل بیت کو ان ازواج نبی کے لئے مخصوص کر دے جن کو آیۂ تطہیر سے پہلے اور بعد میں پکارا گیا ہے۔ اس لغو مدعا کو اس طرح ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ بیوی گھر میں پہلے آتی ہے اور اولاد بعد میں لہذا جو پہلے ہے وہ حقیقتاً اہل بیت ہے اور جو بعد میں ہے وہ مجازاً اہل بیت ہے مگر حقیقتاً نہیں۔ لیکن دروغ گو را حافظہ نباشد جس منطق سے وہ موجودہ ازواج نبی کو اہل بیت اور فاطمۃ الزہراؑ کو غیر اہل بیت دکھا رہے ہیں ان کی اسی منطق نے فاطمۃ الزہراؑ کو اہل بیت اور ازواج موجودہ کو غیر اہل بیت ثابت کر دیا کیونکہ یہ بات الم نشرح ہے کہ جن ازواج نبی کی نمائشی حمایت کی جا رہی ہے وہ سب فاطمۃ الزہراء کے بعد آئی ہیں۔ اور فاطمۃ الزہراء ان سب سے پہلے خانۂ رسول میں بیٹی کی حیثیت سے موجود تھیں۔

حقیقتاً یہ پہلے اور بعد کی منطق ہی بالکل اسی طرح لغو ہے جس طرح مرزا صاحب کی نبوت مسیحیت اور امامت۔ کیونکہ ہر مقصد کے حاصل کرنے کے لئے کچھ مقدمات ہوا کرتے ہیں۔ یہ مقدمات پہلے ہوتے ہیں اور اصل مقصد ان کے بعد میں آتا ہے۔ مناکحت (بیاہ شادی) قدرت نے بقاء نسل اور حصول نعمت اولاد کے لئے رکھی ہے۔

بقاء نسل ہے اصل مقصد اور اس کا مقدمہ ہے تزویج و نکاح۔ دنیا میں کون ایسا بیوقوف ہوگا جو اصل مقصد کو مجاز کہے اور مقدمہ مقصد کو حقیقت سمجھ لے۔ بیشک بیوی کے بغیر اولاد ممکن نہیں ہوتی تو اسی لئے بیوی کی جاتی ہے کہ حصول مقصد اس کے بغیر

نہیں ہو سکتا۔ جس طرح نماز بغیر وضو کے نہیں ہو سکتی، جس طرح روزہ غسل جنابت کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ جس طرح حج بغیر احرام باندھے نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح اولاد بغیر بیوی کئے نہیں ہو سکتی لیکن وضو کے پہلے ہونے اور نماز کے بعد میں ہونے سے یا غسل کے پہلے اور روزہ کے بعد میں ہونے سے یا احرام پہلے باندھنے اور حج بعد میں کرنے سے کیا کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ عبادت تو حقیقتاً وضو ہے نماز مجاز ہے۔ غسل عبادت روزہ مجاز احرام عبادت اور حج مجاز۔ لاحول ولا قوة الا باللہ مخاطب زوجہ اور اولاد کا فرق دکھانے بیٹھے تو ایسا کہ روتے ہوئے ہنس پڑیں۔ زوجہ اور اولاد کا فرق دیکھنا ہو تو اس طرح دیکھیں کہ جس زوجہ کو معترض حقیقی اہل بیت اور جس اولاد کو مجازی کہہ رہے ہیں وہ زوجہ اسی بیت اور مافی البیت میں سے اولاد کے مقابلے میں وراثتاً صرف آٹھواں حصہ پاتی ہے اور باقی سات حصے بقول معترض مجازی اہل بیت کے ہیں۔

دوسرا فرق یہ ہے کہ زوجہ کبھی کسی کی زوجہ ہو کر پیدا نہیں ہوتی بعد میں کسی وقت دو لفظوں سے کسی کی زوجہ ہو جاتی ہے۔ اور پھر یہ ضروری نہیں کہ جس کی زوجہ ہو گئی ہمیشہ اسی کی زوجہ رہے۔ ہو سکتا ہے کہ کبھی کسی کی زوجہ اور کبھی کسی کی۔ خود ازواج نبی میں کئی محترمات ہیں جو آنحضرت سے پہلے دوسروں کی زوجیت میں تھیں۔ لیکن کیا اولاد کے لئے بھی یہ صورت ہے کہ وہ پہلے اولاد نہ ہو بعد میں اولاد ہو جائے۔ اور اولاد ہو جانے کے بعد پھر اولاد نہ رہے؟ کیا اولاد کے لئے بھی یہ صورت ہے کہ وہ کبھی کسی کی اولاد ہو اور کبھی کسی کی۔

ہمارے مخاطب کو امام جعفر صادقؑ کے کونڈوں پر بھی اعتراض ہے

کتنے تعجب اور افسوس کی بات ہے کہ جس شخص کے یہاں ساری کی ساری باتیں بے عقلی اور بے دینی کی ہوں وہ آئمہ برحق کے بھی خلاف بولے اور ان سے نسبت رکھنے والے امور کی بھی مخالفت کرے۔ جو لوگ حسنؑ و حسینؑ کو امام برحق، جوانان جنت کا سردار، شہید راہ خدا اور پاک و پاکیزہ سمجھتے ہوں۔ جن کی امام جعفر صادق علیہ السلام کی نذر و نیاز سے اور امام مذکور کے وسیلہ سے مشکلیں آسان ہوتی ہوں اور حاجتیں

رواہوتی ہوں وہ کسی فاسد العقیدہ کے کہنے سے آئمہ برحق کی یادگاروں کو کیسے بند کرسکتے ہیں۔ نہ ان امور (تعزیہ داری اور امام جعفر صادقؑ کے کونڈوں) کو کوئی کسی کے کہنے سے شروع کرتا ہے نہ کسی کے کہنے سے بند کرسکتا ہے۔

صاحب غرض اور حاجتمند جب ہر پھر کر اس درگاہ پر آتا ہے اور ان پاک ہستیوں کے وسیلے سے اس کی بگڑی بن جاتی ہے تو وہ دل و جان سے شیدا ہو جاتا ہے۔ ایسا کہ اب لاکھ کوئی زور لگائے اس کی عقیدت مندی میں فرق نہیں آسکتا۔ یہ بالکل غلط ہے کہ سُنّی حضرات ان امور کو شیعوں کے بتانے سے کرتے ہیں۔ شیعہ اگر بتائے گا تو وہ محض یہی امور کیوں بتائے گا وہ اصولی اور اہم امور کیوں نہ بتائے گا۔ جن پر اس کے مذہب کی اساس ہے۔ مخاطب موصوف تعزیہ داری پر معترض اور امام جعفر صادقؑ کے کونڈوں کی مخالفت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ

”وہ دن ہے امیر المومنین سیدنا معاویہ رضی اللہ کی وفات کا ان کی وفات کی خوشی میں وہ (شیعہ) سنیوں کے ہاتھوں سے جعفر صادقؑ کا کونڈا بتا کر منواتے ہیں۔ جس طرح عید غدیر امیر المومنین سیدنا عثمانؓ کی شہادت کی خوشی میں منائی جاتی ہے“

کتنا غلط انداز فکر ہے کہاں امام جعفر صادقؑ اور کہاں حضرت معاویہ یہ دونوں ہم عصر نہیں۔ ایک زمانہ میں نہیں۔ امام جعفر صادقؑ سے حضرت معاویہ کی کوئی جنگ نہیں ایک نے دوسرے کو دیکھا تک نہیں امام کے کونڈے کو حضرت معاویہ کی وفات کی خوشی سے ربط کیا ہے۔ حضرت معاویہ کی حضرت علیؑ اور امام حسنؑ سے تو ضرور جنگ ہوئی تھی اگر باہمی جنگ کی وجہ سے حضرت معاویہ کی وفات کی خوشی میں کونڈے ہی کرنا ہوتے تو علی مرتضیٰؑ یا حسن مجتبیٰؑ کے کونڈے ہوتے۔ شیعوں کا یہ شعار ہی نہیں کہ کسی کی وفات کی خوشی کریں۔ یہ بات بھی اگر پائی جاتی ہے تو ان کے کہے ہوئے ”امیر المومنین سیدنا معاویہ رضی اللہ“ ہی کے یہاں ملتی ہے۔ حضرت علی مرتضیٰؑ اور حضرت حسن مجتبیٰؑ اور ان کے فدائی حضرت مالک اشتر کی شہادت پر حضرت معاویہ کا [illegible] مسرور ہونا ثقات علماء و مورخین نے جابجا بیان کیا ہے۔ شیعوں کو ہر خلیفہ کی

وفات کی تاریخ معلوم ہے۔ خلیفہ اول کی وفات بائیس جمادی الاخریٰ کو ہوئی۔ 29 ذی الحجہ کو خلیفہ ثانی کی وفات ہوئی۔ 17 رمضان المبارک کو حضرت عائشہ کی وفات ہوئی۔ 14 ربیع الاول کو یزید نے سفر سقر اختیار کیا۔ کیا معترض ان تاریخوں میں بھی کسی امام کا کونڈے بھرنا یا شیعوں کا کوئی جشن مسرت بتا سکتے ہیں۔ یہ بھی انتہائی نادانی ہے کہ عید غدیر حضرت عثمان کی وفات کی خوشی میں ہے۔ جو لوگ یزید کے مرنے یا مارے جانے کی خوشی اور عید نہیں کرتے وہ حضرت عثمان کے قتل ہونے کی کیا خوشی کرتے۔ موصوف خود عید غدیر کہہ رہے ہیں اور اس پر نظر نہیں کرتے کہ غدیر کے معنی کیا ہیں اور یہ کس جگہ کا ذکر ہے اور وہاں کیا اہم واقعہ پیش آیا۔ غدیر کے معنی ہیں تالاب کے۔ اور یہاں ذکر ہے اس تالاب کا جو وادی خم میں تھا جو مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ کے راستہ پر ہے۔ اس تالاب کے قریب جب سرکارؐ آخری حج سے فارغ ہو کر مدینہ منورہ کی طرف مراجعت فرما رہے تھے تو حکم خدا آیا یاایّھا الرّسول بلّغ ماانزل الیك.... سورۃ مائدہ آیت نمبر 67۔ سرکارؐ نے فوراً اس وادی میں نزول فرمایا اور تمام حجاج کو جمع کر کے خطبہ فصیح و بلیغ فرمایا اور ارشاد فرمایا الست اولیٰ بکم من انفسکم کیا میں تمہارے نفسوں پر تم سے زیادہ حکومت کا حق رکھنے والا نہیں، مجمع نے کہا کہ کیوں نہیں تب آپؐ نے فرمایا الامن کنت مولاہ فعلی مولاہ اس تبلیغ حکم خدا کے بعد آیت نازل ہوئی الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دیناً۔ (سورۃ مائدہ آیت نمبر 3)

یعنی آج میں نے تمہارے دین کو کامل اور اپنی نعمت کو تم پر تمام کیا اور تمہارے لئے اسلام کو بطور دین پسند کیا۔

مخاطب کو دعوائے مسلمانی ہے تو وہ بتائیں کہ جس روز اللہ تعالیٰ نے دین کو کامل اور اپنی نعمت کو تمام کیا اور دین اسلام کو پسند کیا وہ دن کوئی سا بھی ہو وہ دن مسلمانوں کے علم میں ہونا چاہئے یا نہیں۔ اور وہ دن پوری امت مسلمہ کے لئے روز عید اکبر ہونا چاہئے یا نہیں؟ لیکن افسوس کہ اس دن کو روز عید اور روز مسرت قرار دینا تو

در کنار عامتہ المسلمین کو یہ بھی خبر نہیں کہ وہ دن کونسا اور کس مہینہ کا ہے۔ لیکن شیعہ اس دن کو آج تک نہیں بھولے اور نہ کبھی بھول سکتے ہیں۔ وہ 18 ذی الحجہ ہے اور اصل مقام کے نام سے عید غدیر کہتے ہیں۔ اس تالاب سے یا اس تالاب کے نام سے حضرت عثمان کے قتل سے کیا واسطہ جو شیعوں پر یہ تہمت لگائی گئی۔ سبحانك هذا بهتان عظيم۔

اس تقریر سراپا تزویر سے معترض کا اصل مقصد کیا ہے

مخاطب نے ظاہر تو یہ کیا ہے کہ وہ ازواج نبی اور اصحاب نبی کی حمایت و عقیدت میں رسول کے گھرانے کی بات کر رہے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ جو شخص اولاد رسول کا دشمن ہو وہ ازواج واصحاب نبی کا کیا محب ہو سکتا ہے۔ خصوصاً وہ جس پر فرضی اور نمائشی مسیحیت و مہدویت کا بھوت سوار ہو۔ ان کے اصل مقصد کی طرف ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں۔ اور بالآخر مخاطب نے اپنا اصل مقصد خود اپنے الفاظ میں ظاہر کر دیا۔ ان کے آخری جملے ملاحظہ فرمایئے۔ فرماتے ہیں۔

"دوسرے فرقے اگر کچھ کرتے ہیں تو وہ شوق سے کریں۔ ہم تو صرف اپنے سنی بھائیوں سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اپنے اندر جھانک کر جائزہ لیں کہ سبائیت کا کتنا حصہ ان کے اندر سرائیت کئے ہوئے ہے"؟

معترض اپنے منہ خود بول اٹھے اور بتا گئے کہ دنیا اور آخرت کی یہ ساری رسوا کن مصیبت انہوں نے محض اس لئے برداشت کی ہے کہ وہ کسی طرح سُنّی حضرات کے بھائی اور سُنّی حضرات ان کے بھائی ہو جائیں اور جس دائرہ دین داری سے ان کو نکال دیا گیا ہے۔ اس دائرہ میں بغض اہل بیت کا صلہ قرار دے کر پھر داخل کر لیں۔ اور اپنے سینہ سے لگا لیں۔ اس پوری مہمل تقریر کا مدعا سُنّی حضرات کو اپنا بھائی کہنا تھا تاکہ اس کے جواب میں وہ بھی ان کو اپنا بھائی کہہ دیں۔ لیکن ہوشمندوں کو بیوقوف بنانا خود بیوقوف بننا ہے۔ ہر مسلمان کے سامنے حکم قرآنی موجود ہے۔

لا یتخذ المئومنون الکافرین اولیاء من دون المئومنین۔(سورۃ آل عمران آیت نمبر28)

مومنین کبھی مومنین کو چھوڑ کر کفار کو دوست نہ بنائیں

معترض اور تو اور اس تقریر میں اپنے مسیح موعود اور مہدی معہود سے بھی منحرف ہو گئے

ناظرین دیکھ چکے ہیں کہ معترض کے نزدیک آیۂ تطہیر سے (علیؑ و فاطمہؑ و حسنؑ و حسینؑ اور آئمہ طاہرینؑ) نبیؐ کے گھرانے کا کوئی واسطہ نہیں۔ یہ حضرات نبیؐ کے اہل بیت بھی نہیں، منجانب اللہ پاک و پاکیزہ اور معصوم نہیں۔ یہ محض فرضی امام ہیں، مہاجرین و انصار سے کمتر ہیں بقیہ آئمہ اہل بیت جن کو کہا جاتا ہے ان کا قرآن و حدیث میں کوئی ذکر نہیں۔ وہ سب فرضی امام ہیں۔ حدیث کساء غلط اور راویان حدیث جھوٹے ہیں۔

ان لغویات کا جواب اور دنداں شکن جواب دینے میں تو ہم کو کسی غیر کے سہارے کی مطلق ضرورت نہیں۔ اللہ اور ید اللہ کا سہارا کافی ہے۔ یہاں صرف یہ دکھانا ہے کہ معترض نے سچوں اور پاکوں کو تو چھوڑا ہی تھا' انہوں نے اس مضمون کو سیاہ کر کے اپنے پیر و مرشد (مرزا صاحب) کو بھی چھوڑ دیا اور ان سے بھی منحرف ہو گئے۔ اور وہ اس مد میں آ گئے۔

نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے

معترض کا نظریہ تو دیکھا جا چکا' اب ان کے پیر و مرشد (مرزا صاحب) کا نظریہ دیکھئے

ہمارے سامنے تائید الٰہی سے اچانک ایک رسالہ آ گیا۔ یہ رسالہ ضیاء الاسلام پریس ربوہ میں مہتمم نظارت اشاعت لٹریچر و تصنیف صدر انجمن ربوہ کی جانب سے چھپا

ہے اور اس کے ٹائیٹل پیج پر تحریر ہے "حضرت امام حسین علیہ السلام کا مقام حضرت مرزا غلام احمد صاحب مسیح موعود و مہدی معہود علیہ السلام کے اپنے الفاظ میں"

مرزا صاحب آنجہانی کے اس رسالہ کے صفحہ 4 پر یہ جملے ہیں۔

"مگر حسین رضی اللہ عنہ طاہر و مطہّر تھا اور بلاشبہ ان برگزیدوں سے تھا جن کو اللہ تعالیٰ اپنے ہاتھ سے صاف کرتا ہے اور اپنی محبت سے معمور کرتا ہے اور بلاشبہ وہ سرداران بہشت میں سے ہے۔ اور ایک ذرہ کینہ رکھنا اس سے موجب سلب ایمان ہے۔ اور اس امام کا تقویٰ اور محبت اور صبر اور استقامت اور زہد اور عبادت ہمارے لئے اسوۂ حسنہ ہے۔ اور ہم اس معصوم کی ہدایت کی اقتداء کرنے والے ہیں جو اس کو ملی تھی۔ تباہ ہو گیا وہ دل جو اس کا دشمن ہے۔ اور کامیاب ہو گیا وہ دل جو عملی رنگ میں اس کی محبت ظاہر کرتا ہے اور اس کے ایمان اور اخلاق اور شجاعت اور تقویٰ اور استقامت اور محبت الٰہی کے تمام نقوش انعکاسی طور پر کامل پیروی کے ساتھ اپنے اندر لیتا ہے جیسا کہ ایک صاف آئینہ ایک خوبصورت انسان کا نقش۔ یہ لوگ دنیا کی آنکھوں سے پوشیدہ ہیں۔ کون جانتا ہے ان کی قدر مگر وہی جو ان ہی میں سے ہے۔ دنیا کی آنکھ ان کو شناخت نہیں کر سکتی کیونکہ وہ دنیا سے بہت دور ہیں۔ یہی وجہ حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کی تھی۔ کیونکہ وہ شناخت نہیں کیا گیا۔ دنیا نے کس پاک اور برگزیدہ کی اس کے زمانہ میں محبت کی یا حسین سے بھی محبت کی جاتی غرض یہ امر نہایت درجہ کی شقاوت اور بے ایمانی میں داخل ہے کہ حسین رضی اللہ عنہ کی یا کسی اور بزرگ کی جو آئمہ مطہرین میں سے ہے تحقیر کرتا ہے یا کوئی کلمہ استخفاف ان کی نسبت اپنی زبان پر لاتا ہے وہ اپنے ایمان کو ضائع کرتا ہے کیونکہ اللہ جلّ شانہٗ اس شخص کا دشمن ہو جاتا ہے جو اس کے برگزیدوں اور پیاروں کا دشمن ہے"۔

معترض کے امام اور مسیحا تو حسین علیہ السلام کو امام بھی مانتے ہیں۔ معصوم بھی مانتے ہیں برگزیدۂ خدا بھی مانتے ہیں جوانان جنت کا سردار بھی اور اللہ کی جانب سے اور اللہ کے ہاتھ سے پاک و پاکیزہ اور صاف کیا ہوا بھی مانتے ہیں اور صرف حسین ہی کو نہیں

بلکہ ان کے گھرانے کے اماموں کو بھی آئمہ مطہرین تسلیم کرتے ہیں اس کے معنی صاف یہ ہوئے کہ وہ حدیث کساء اور شان نزول آیۂ تطہیر کو صحیح اور درست تسلیم کرتے ہیں کیونکہ اگر آیۂ تطہیر ان کے حق میں نہیں اور حدیث کساء صحیح نہیں تو پھر حسین طاہر و مطہّر و معصوم کیسے ہوئے۔ اور اللہ کے ہاتھ سے صاف کئے ہوئے کیسے قرار پائے۔

یہاں من چہ می سرائیم و طبنورہ من چہ می سراید والی بات ہے۔

اب معترض بتائیں کہ وہ خاندان رسالت ؐ کو فرضی امام کہہ کر آیۂ تطہیر سے بے تعلق کہہ کر 'اہل بیت نبیؐ' سے خارج کہہ کر۔ ان کو مہاجرین وانصار سے کم تر کہہ کر اپنے مسیحا کے بقول لعنتی اور خارج از ایمان ہوئے کہ نہیں اور ان کا ایمان سلب ہوا یا رہا اور خدا ان کا دشمن ہوا کہ نہیں ؟

لفظ اہل اور لفظ اہل بیت پر تحقیقی نظر

معترض تو بیک جنبش قلم یہ طے کر گئے کہ اہل نور اہل بیت یہ الفاظ جب کسی کے نام سے منسوب ہوں گے تو صرف اس کی زوجہ یا ازواج ہی مقصود ہوں گی۔ یہاں تک کہ اولاد بھی ان لفظوں کے معنی میں حقیقتاً نہیں آسکتی ان کے نزدیک اہل اور اہل بیت کے معنی ہی زوجہ کے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

اھل اور تاھل کے معنی ہیں شادی کرنا اور اھل الرجل کے معنی ہیں Wife (بیوی)

اھل اور تاھل کے معنی تو بیشک صحیح بیان کئے ہیں کیونکہ تاھل کے معنی ہیں اہل بنانا اس کو جو پہلے سے اہل نہیں ہے اور ظاہر ہے کہ یہ وصف زوجہ ہی کا عموماً ہوتا ہے کہ اس غیر اہل کو نکاح کے ذریعہ سے اہل میں داخل کر لیا جاتا ہے۔ اس لئے اھل اور تاھل کے لفظ اولاد یا دوسرے اقرباء کے لئے آنہیں سکتے۔ کیونکہ وہ اہل بنائے نہیں جاتے بلکہ وہ ہوتے ہی اہل ہیں۔ لیکن اہل کے معنی طے کرنے کے لئے جو ایک اسم ہے اھل اور تاھل کو جو فعل ہیں پیش کرنا فاش غلطی اور علمی خیانت اور انتہائی چالاکی ہے۔

یہ تو ایسی ہی بات ہوئی کہ بحث ہے لفظ رجُل کی اور اس کو طے کیا جائے ارتَجَلَ سے محض اس بناء پر کہ مادہ دونوں جگہ ایک ہے۔ معترض دنیا بھر کو جاہل اور بے وقوف نہیں بنا سکتے۔ البتہ دوسرا لفظ اهل الرجُل یہ صحیح لفظ ہے اور اسی لفظ کی تحقیق مطلوب ہے۔ یہ لفظ معترض نے خود بھی دکھایا ہے لیکن اس کے معنی وہ لکھتے ہیں Wife (بیوی) یہ معنی کس لغت سے لکھے ہیں؟ اس کو وہ گول کر گئے۔ ان کو اگر کچھ بھی اپنی عزت اور آبرو کا لحاظ اور پاس ہے تو وہ دنیائے عربیت کی اس لغت کا نام اور پتہ دیں جس میں اهل کے معنی صرف Wife (بیوی) کے لکھے ہوں۔ ہم دعوے سے کہتے ہیں کہ عربی کی کوئی لغت نہیں جو لفظ اہل کو صرف زوجہ کے لئے مخصوص کر دے۔ اور اگر لغت کے نام سے کسی نے اہل کے معنی صرف زوجہ کے لکھ مارے ہیں تو وہ کسی جاہل ہی کی کتاب ہو سکتی ہے اور وہ جاہل محض اپنی کتاب سے کتاب خدا کی تکذیب کر رہا ہے۔ کیونکہ اگر اہل کے معنی صرف Wife کے ہیں تو اہل موسیٰ ہوئیں صرف زوجہ ءموسیٰ اور اہل نوح ہوئیں صرف زوجہءنوح اور اہل لوط ہوئیں صرف زوجہءلوط اور اہل ایوب ہوئیں صرف زوجہءایوب لیکن قرآن مجید میں ان تمام حضرات کا اہل خدائے تعالیٰ نے ان کی ازواج کے علاوہ ان حضرات کے اقرباء کے لئے ارشاد فرمایا ہے بلکہ کئی آیتوں میں حضرت نوح اور حضرت لوط کی بیویوں کو بالکل الگ تھلگ کر کے ان حضرات کے اقرباء خاص ہی کو ان کا اہل کہا گیا ہے اور ان دونوں کی ازواج کو لفظ اہل میں شامل ہی نہیں کیا گیا۔ ہم قرآن مجید سے ان بیّن مثالوں کو پیش کرتے ہیں۔ ہر آیت کو پڑھ کر معترض کا یہ جملہ یاد کرتے جایئے اهل الرجل کے معنی ہیں Wife

(1) جناب موسیٰؑ بارگاہ خدا میں عرض پرداز ہیں۔

واجعل لی وزیرا من اهلی هارون اخی (سورہ طٰہٰ آیت نمبر 29-30)

یعنی اے خداوند میرے اہل میں سے میرے بھائی ہارون کو میرا وزیر بنادے۔

مخاطبِ موصوف تو اولاد کو بھی اہل اور اہل بیت سے نکال رہے تھے لیکن یہاں تو بھائی بھی اہل میں سے ہے۔

(2) حضرت نوح بارگاہ خدا میں عرض پرداز ہیں۔

ان ابنی من اھلی (سورہ ھود آیت نمبر 45)

یعنی خداوندا میرا بیٹا میرے اہل سے ہے۔

(3) حضرت نوح سے خطاب الٰہی ہے۔

قلنا احمل فیھا من کل زوجین اثنین و اھلك الا من سبق علیه القول و من اٰمن و ما اٰمن معه الا قلیل (سورۂ ھود آیت نمبر 40)

یعنی ہم نے کہا کہ نوح تم کشتی میں ہر جانور کا ایک ایک جوڑا رکھ لو اور اپنے اہل کو سوار کر لو۔ مگر اس کو نہیں جس کے خلاف فیصلہ ہو چکا ہے اور ان کو سوار کر لو جو ایمان لائے ہیں اور نوح پر ایمان لائے ہی تھے تھوڑے سے۔

آیت میں جو کہا گیا ہے کہ اپنے اہل کو سوار کر لو مگر اس کو نہیں.... اس کو نہیں سے مراد نوح کی زوجہ ہیں۔ یہاں لفظ اہل حضرت نوح کے پورے خاندان کو کہا گیا ہے جس میں ان کی زوجہ کو شامل بھی نہیں کیا گیا۔ جیسا کہ سورہ تحریم آیت نمبر 10 میں فرمایا گیا ہے۔

ضرب الله مثلا للذین کفروا امرات نوح و امرات لوط کانتا تحت عبدین من عبادنا صالحین فخا نتھما فلم یغنیا عنھما من الله شیئا وقیل ادخلاالنا رمع الداخلین

یعنی اللہ کفار کے لئے زوجہؑ نوح اور زوجہؑ لوط کی مثال دیتا ہے۔ وہ دونوں ہمارے نیک بندوں کی زوجیت میں تھیں۔ پس دونوں نے اپنے شوہروں کی خیانت کی پس نوح اور لوط ان دونوں کو حکم خدا کے مقابلے میں کوئی فائدہ نہ پہنچا سکے۔ اور ان دونوں سے کہہ دیا گیا کہ دوسروں کے ساتھ جہنم میں جاؤ۔

(4) جناب لوط سے خطاب قدرت ہے۔

انا منجوك و اھلك الا امراء تك كانت من الغابرین (سورۂ عنکبوت آیت نمبر 33)

یعنی اے لوط ہم تم کو بھی نجات دیں گے اور تمہارے اہل کو بھی لیکن تمہاری عورت کو نہیں وہ پیچھے رہ جانے والوں میں سے ہے۔

یہاں بھی لوط کی زوجہ کو الگ کر کے باقی اقرباء کو اہل لوط کہا گیا ہے۔

(5)　حضرت لوطؑ کے بارے میں حضرت ابراہیم سے کہا جارہا ہے۔

لنجیبنه واهله الا امراته کانت من الغابرین (سورہ عنکبوت آیت نمبر 32)

یعنی ہم لوط کو بھی ضرور ضرور نجات دیں گے اور اس کے تمام اہل کو بھی مگر پیچھے رہ جانے والی بوڑھیا کو نہیں۔

یہ بوڑھیا وہی زوجۂ لوط ہے۔ یہاں بھی اہل لوط زوجہ کو نکال کر اقرباءِ حضرت لوط کو کہا گیا ہے۔

(6)　حضرت لوط کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے۔

اذنجینه واهله اجمعین الاعجوزاً فی الغابرین (صافات آیت 134, 135)

یعنی جبکہ نجات دی ہم نے اس (لوط) کو اور اس کے تمام کے تمام اہل کو سوائے بوڑھیا کے جو پیچھے رہ جانے والوں میں تھی۔

یہاں بھی زوجۂ لوط کو چھوڑ کر دوسرے ان کے افراد خاندان کو اہل لوط کہا گیا ہے۔

(7)　فانجینه واهله الا امراته قدرنها من الغابرین (سورہ نمل آیت 57)

پس ہم نے اس کو نجات دی اور اس کے اہل کو نجات دی مگر اس (لوط) کی زوجہ کو نہیں۔ اس کو ہم نے پیچھے رہ جانے والوں میں سے قرار دیا۔

یہاں بھی لفظ اہل زوجہ کو چھوڑ کر دوسرے ہی اقرباء کے لئے ہے۔

(8)　قالوا یا لوط انا رسل ربك لن یصلوا الیك فاسر باهلك بقطع من اللیل ولا یلتفت منکم احد الا امراتك انه مصیبها ما اصابهم (سورہ ھود آیت 81)

یعنی فرشتوں نے کہا کہ اے لوط ہم تمہارے رب کے فرستادہ ہیں۔ یہ لوگ (بدکار) تم تک ہرگز نہ پہونچ سکیں گے۔ پس تم رات گئے اپنے اہل کو لے کر چلے جاؤ اور کوئی پیچھے مڑ کر نہ دیکھے لیکن تمہاری زوجہ تمہارے ساتھ نہ ہو وہ دوسروں کی طرح مبتلاء عذاب ہوگی۔

یہاں بھی زوجہ کو چھوڑ کر دوسرے ہی افراد خاندان کو اہل کہا گیا ہے۔

(9) وایوب.... فاستجبنالہ فکشفنا مابہ من ضر و ایتنٰہ اہلہ و مثلہم معہم (انبیاء' آیت 84)

یعنی ایوب کی دعا کو ہم نے قبول کیا اور ان کے دکھ کو ہم نے دور کیا اور ان کو ان کے اہل (بیٹے) ہم نے دیدیئے۔ اور ان (بیٹوں) کے ساتھ ہم نے اتنے ہی اور دیدیئے۔ یہاں بھی لفظ اہل بیٹوں کے لئے فرمایا گیا ہے۔ کیونکہ حضرت ایوب کا امتحان بیوی کے مرنے سے نہیں لیا گیا۔ اولاد ہی کے داغ مفارقت سے لیا گیا تھا۔ بیوی تو ان کی حضرت یوسف کی نسل سے تھیں اور صاحبۂ حسن و جمال تھیں۔ (رحمہ) وہ تو حضرت ایوب کے دورِ ابتلا میں اپنے شوہر کی خدمت میں مصروف رہیں۔

ان صریحی آیات قرآنیہ کی موجودگی میں کوئی لغت یا کوئی مسلمان یہ کیسے کہہ سکتا ہے کہ اہل کے معنی صرف بیوی کے ہیں اور اگر کہتا ہے تو ارشادات الہیہ کی صریحی تردید و تکذیب ہوتی ہے یا نہیں ؟ مسلمان تو مسلمان عیسائی لغت نے بھی اہل کے معنی وہ نہیں لکھے' جس سے مخاطب صاحب کی طرح قرآن کریم کی تردید لازم آئے۔ چنانچہ المنجد جو عیسائی عالم کی مرتبہ عربی لغت ہے اس میں دیکھ لیجئے۔

الاھل۔ العشیرۃ و ذو والقربیٰ.... (المنجد صفحہ نمبر 20)

یعنی اہل کے معنی خاندان اور قرابت داران۔ اسی معنی میں قرآن کریم نے جابجا اس لفظ کو استعمال کیا ہے۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ عیسائی کے قول سے قرآن کریم کی تصدیق ہوتی ہو اور مسلمان کے قول سے قرآن کریم کی تکذیب ہو رہی ہو۔ ایسے ہی نام نہاد مسلمانوں کے لئے کسی نے سچ کہا

ہیچ کافر نکند آنچہ مسلماں کروند

اب مسلم لغت کی بھی سیر کر لیجئے۔ منتھی الارب عربی کی نہایت مبسوط' مکمل اور مشہور لغت ہے۔ جس کو سُنّی عالم نے مرتب کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

اھلُ الرجُل کسان و خویشانِ مرد۔ یعنی کسی شخص کے اہل اس کے خویش و اقارب کو کہتے ہیں۔ پھر یہی صاحبِ منتہی الارب لکھتے ہیں۔

اھلُ البیت کسانِ خانہ و ساکنانِ آن۔ یعنی اہل البیت گھر کے آدمیوں اور گھر کے رہنے والوں کو کہتے ہیں۔ پھر بیان کرتے ہیں۔

اھلُ النبیؐ ازواج و دختران و صہرِ آنحضرت کہ علی بن ابی طالب ست (منتہی الارب) یعنی نبی ؐ کے اہل آنحضرتؐ کے ازواج اور ان کی دختران اور اُن کے داماد صرف علیؑ بن ابی طالب ہیں۔ پھر فرماتے ہیں یا زنانِ آنحضرت و اولیائے وے از مردان (منتہی الارب) یا اہل نبی سے مراد آنحضرتؐ کے ازواج اور مردوں میں سے آنحضرت کے اقرباء ہیں۔

اب لغتِ صُراح سے بھی دیکھ جائیے۔ کہتے ہیں۔

اہل۔ کسان و کسان سرائے و جائے۔ یعنی اہل کے معنی ہیں اشخاص اور کسی گھر اور جگہ کے آدمی۔

غرضیکہ قرآن کریم اور ہر لغت سے ثابت ہے کہ لفظ اہل صرف زوجہ سے ہرگز مخصوص نہیں۔ بلکہ یہ لفظ عام ہے اور پورے خاندان کے لئے بولا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے عرب اپنے مہمان سے کہتا ہے اھلاً و سھلاً یعنی تم کسی اجنبی اور غیر کے یہاں نہیں بلکہ اپنے یگانوں اور قرابت داروں میں پہنچے ہو۔ ہم لوگ تمہارے اہل ہیں۔ لیکن معترض کے بقول اہل کے معنی Wife کے ہوں تو اھلاً و سھلاً کے معنی یہ ہوئے کہ تم اپنی Wife کے پاس پہنچ گئے۔ لاحول ولاقوۃ الاّ باللّٰہ۔

یہی حیثیت لفظ اہل بیت کی ہے۔ اس کا اطلاق تمام گھر والوں پر ہوتا ہے۔ جو سب اہل خانہ ہیں۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ گھر والے جب تک گھر کی دیواروں کے

اندر ہیں اسی وقت تک گھر والے ہیں اور گھر سے باہر نکلے تو گھر والوں سے خارج ہو گئے۔ گھر کا لفظ بطور محاورہ بولا جاتا ہے۔ ورنہ نسبت گھر سے نہیں بلکہ ذات سے ہوتی ہے۔ گھر والے کہیں بھی ہوں گھر والے ہیں۔ جن کا کوئی بھی گھر نہیں صحرا نشیں ہیں انکے بھی گھر والے ہیں۔ گھر والے کسی کے ہزاروں میل دور چلے جائیں پھر بھی وہ اس کے گھر والے ہیں۔ لیکن مخاطب موصوف نے اہل بیت کا ترجمہ اپنا غلط منصوبہ ثابت کرنے کے لئے "گھر والی" کیا ہے جو بالکل غلط ہے۔ لغت کے 'قرآن کریم کے اور واقعے کے بالکل خلاف ہے۔ ہم قرآن کریم سے ایک مثال پیش کرتے ہیں۔ خواہر جناب موسیٰ فرعون کے یہاں کہہ رہی تھیں۔

هل ادلّكم على اهل بيتٍ يكفلونه لكم و هم له ناصحون (سورۃ قصص آیت 12)

ہم اس آیت کا ترجمہ مخاطب کے نظریہ کے مطابق کر کے دکھاتے ہیں کہ کتنا مہمل ہو جاتا ہے۔ ان کے نزدیک اس کا ترجمہ یہ ہوگا۔ "کیا میں تم کو ایک ایسی زوجہ کا پتہ دوں جو سب اس (موسیٰ) کو تمہارے لئے پرورش کریں اور وہ سب اس کی دیکھ بھال کریں"۔

اس ترجمہ میں لفظ زوجہ کتنا مہمل ہے۔ پھر ایک عورت (مادر موسیٰ) کے لئے لفظ جمع کتنا غلط ہے؟ زوجہ کا لفظ اضافت کے بغیر آہی نہیں سکتا۔ زوجہ کہا جائے تو صرف زوجہ نہیں کہا جا سکتا بلکہ یہ دکھانا پڑے گا کہ کس کی زوجہ ہے؟ لہذا یہ جملہ ہی غلط ہے کہ میں ایک زوجہ کا پتہ بتائے دیتی ہوں۔

صحیح ترجمہ مذکورہ آیت کا یہ ہے۔

"کہ میں تم کو ایک ایسا گھرانہ بتادوں جو تمہاری خاطر اس بچے کی پرورش کریں اور اس کی دیکھ بھال رکھیں"۔ گھرانے کا اور جمع کا لفظ اس لئے آیا کہ دودھ بچے کو اگرچہ ایک ہی عورت پلائے گی لیکن بچے کی ہر وقت اور ہر حالت کی دیکھ بھال گھر کا چھ بڑا سب مل کر ہی کرتے ہیں۔

نبی یا غیر نبی تنہا کسی کی بھی زوجہ کو قرآن کریم میں کہیں اہل بیت نہیں کہا گیا

ہمارے مخاطب نے تو اہل بیت اور زوجہ ان دونوں لفظوں کو، ہم معنی اور مترادف قرار دے دیا۔ لیکن ہم دعوے سے کہتے ہیں کہ قرآن کریم میں بہت سی جگہ نبی اور غیر نبی کی ازواج کا ذکر موجود ہے لیکن ایک جگہ بھی کسی کی تنہا زوجہ کو اہل بیت نہیں کہا گیا۔ بلکہ ہر جگہ فلاں کی زوجہ یا فلاں کی عورت کہا گیا ہے۔ اگر فلاں کی زوجہ اور فلاں کی عورت کہنے کے بجائے فلاں کے اہل بیت کہنا درست ہوتا تو کہیں تو کسی کی زوجہ اور کسی کی عورت کہنے کے بجائے اس کو اہل بیت کہا جاتا۔ ہم ذیل میں ان آیات قرآنیہ کو پیش کرتے ہیں۔ جن میں کسی کی صرف زوجہ یا ازواج کا ذکر ہے۔ ناظرین دیکھیں کہ کہیں بھی کسی کی زوجہ یا ازواج کو اہل بیت کہا گیا ہے؟

1۔ یایها النبی قل لازوا جك ان كنتن تردن الحيوة الدنيا (سورۃ احزاب آیت 28)

یعنی اے نبی اپنی ازواج سے کہہ دو کہ اگر تم دنیا کی طلب گار ہو

(نوٹ) یہاں صرف ازواج کا ذکر ہے لیکن ازواج کہا اہل بیت نہیں کہا۔

2۔ اذ قالت امرات عمران رب انی نذرت (سورۃ آل عمران، آیت 35)

یعنی عمران کی عورت نے کہا کہ میرے پروردگار میں نے نذر کی ہے۔

یہاں بھی عمران کی صرف زوجہ کا ذکر ہے لیکن عمران کی عورت کہا اہل بیت نہیں کہا۔

3۔ قالوا لاتخف انّا ارسلنا الیٰ قوم لوطٍ وأمرته قائمة (سورۃ ہود، آیت 70-71)

یعنی فرشتوں نے ابراہیم سے کہا کہ آپ ڈریں نہیں ہم تو قوم لوط کی طرف بھیجے گئے ہیں۔ اس وقت ابراہیم کی عورت بھی وہاں کھڑی تھی۔

اس آیت میں بھی ابراہیم کی صرف زوجہ کا ذکر ہے جس کو ابراہیم کی عورت کہا گیا ہے اہل بیت نہیں۔

4۔ فاسر باهلك بقطع من الليل ولا يلتفت منكم احد الا امراتك

(ھود آیت 81)

یعنی فرشتوں نے حضرت لوط سے کہا کہ آپ کچھ رات گئے اپنے اہل کو لے کر چلے جائیں اور کوئی پیچھے پھر کر نہ دیکھے مگر اپنی عورت کو ساتھ نہ لیجانا۔

یہاں بھی زوجہٴ لوط کو لوط کی عورت کہا گیا ہے اہل بیت نہیں کہا۔

5۔ فانجینہ و اھلہ الا امراتہ کانت من الغابرین (سورہ اعراف آیت 83)

پس ہم نے اس (لوط) کو نجات دی اور اس کے اہل کو مگر اس کی عورت کو نہیں وہ پیچھے رہنے والوں میں تھی۔

یہاں بھی زوجہٴ لوط کو لوط کی عورت کہا اہل بیت نہیں کہا۔

6۔ قال رب انی یکون لی غلام وقد بلغنی الکبر وامراتی عاقر (سورہ آل عمران آیت 40)

یعنی ابراہیم نے کہا کہ میرے رب میرے لڑکا کہاں سے ہوگا۔ حالانکہ میں ضعیف ہوں اور میری عورت بانجھ ہے۔

یہاں بھی زوجہٴ ابراہیم کو ابراہیم کی عورت کہا اہل بیت نہیں کہا۔

7۔ النبی اولیٰ بالمئومنین من انفسھم و ازواجہ امھا تھم (سورہ احزاب آیت 6)

یعنی نبی مومنین سے زیادہ ان کی جانوں پر حق تصرف رکھتے ہیں۔ اور ازواجِ نبیؐ مومنین کی مائیں ہیں۔

یہاں بھی نبی کی بیویوں کو ازواج نبیؐ کہا گیا ہے۔ اہل بیت نبی نہیں کہا

8۔ ینساء النبی من یات منکن بفا حشۃ مبینۃ (سورۃ احزاب' آیت 30)

یعنی اے نبی کی عورتو! جو تم میں سے کسی کھلی بے حیائی کی مرتکب ہوگی'

یہاں بھی ازواجِ نبی کو نبی کی عورتیں کہہ کر پکارا ہے۔ ان کو اہل بیت کہہ کر نہیں پکارا۔

9- یانساء النبی لستنّ کاحدٍ من النّساء (سورۃ احزاب 'آیت 32)
یعنی اے نبی کی عورتو! تم اور عورتوں کے برابر نہیں ہو۔
یہاں بھی ازواج نبی کو اہل بیت نبی کہہ کر نہیں پکارا بلکہ نبی کی عورتیں کہہ کر پکارا ہے۔

10- یاایھا النبی انا احللنا لك ازواجك (احزاب آیت 49)
یعنی اے نبیؐ ہم نے تمہارے لئے تمہاری ازواج کو حلال کیا ہے۔
یہاں بھی نبیؐ کی بیویوں کو ازواج ہی کہا گیا ہے اہلبیت نہیں کہا

11- ولا ان تنکحوا ازواجه من بعده ابداً (احزاب آیت 53)
یعنی تم لوگ ازواج نبی سے بعد نبیؐ کبھی نکاح نہ کرنا۔
یہاں بھی ازواج نبی کو اہل بیت نبی نہیں کہا۔

12- یاایھا النبی قل لا زواجك و بناتك و نساء المئومنین (احزاب آیت 59)
یعنی اے نبیؐ اپنی ازواج سے اور اپنی بیٹی اور بیٹی کی بیٹیوں سے اور مومنین کی عورتوں سے کہہ دو۔
ازواج نبیؐ کو اس آیت میں بھی ازواج نبی ہی کہا گیا ہے اہل بیت نبی نہیں۔

13- تبتغی مرضات ازواجك (تحریم آیت 1)
یعنی اے نبیؐ کیا تم اپنی ازواج کی مرضی چاہتے ہو۔
ازواج نبی کو یہاں بھی اہل بیت نہیں کہا۔

14- اذ اسر النبی الی بعض ازواجه حدیثاً (تحریم آیت 3)
یعنی جبکہ نبی نے اپنی ازواج سے راز کی بات کی

15- ضرب الله مثلاً للذین کفروا امرات نوح و امرات لوط (تحریم آیت 10)
یعنی اللہ نوح اور لوط کی عورت کی مثال دیتا ہے۔

16۔ فاقبلت امراته فی صرة فصکت وجهها (ذاریٰت آیت 29)
یعنی ان لوگوں میں ابراہیم کی عورت بھی آگئی اور اس نے اپنا منہ پیٹ لیا۔
یہاں بھی ابراہیم کی زوجہ کو اہل بیت ابراہیم نہیں کہا بلکہ ابراہیم کی عورت کہا۔

17۔ فانجینه و اهله الا امراته قدرنها من الغابرین (نمل آیت 57)
ہم (اللہ) نے اس (لوط) کو نجات دی اور اس کے اہل کو مگر اس کی عورت کو نہیں
زوجہ لوطؑ کو لوط کی عورت کہا اہل بیت لوط نہیں کہا۔

18۔ لننجینه واهله الا امراته کانت من الغابرین (عنکبوت آیت 32)
یعنی ہم لوط کو بھی نجات دیں گے اور اس کے اہل کو بھی مگر اس کی عورت کو نہیں۔
یہاں بھی زوجہ لوطؑ کو اہل بیت لوط نہیں کہا

19۔ انا منجوك و اهلك الا امراتك (عنکبوت آیت 33)
ہم تم (لوط) کو بھی نجات دینے والے ہیں اور تمہارے اہل کو بھی سوائے تمہاری عورت کے۔
یہاں بھی زوجہ لوطؑ کو لوط کی عورت کہا گیا ہے۔

20۔ اذنجینه و اهله اجمعین ٥ الا عجوزاً فی الغابرین (صافات آیت 135-134)
یعنی جبکہ ہم نے لوط کو اور اس کے تمام اہل کو نجات دی مگر پیچھے رہنے والی بوڑھیا کو نہیں۔
زوجہ لوطؑ کو یہاں بھی اہل بیت لوط نہیں کہا

یہ بیس مثالیں قرآن کریم سے ایسی پیش کی گئی ہیں جن میں صرف زوجہ یا ازواج کا ذکر ہے۔ مگر کہیں بھی اور کسی کی بھی زوجہ یا ازواج کو اہل بیت نہیں کہا گیا۔

کیا لفظ اھل یا اہل بیت کی وجہ سے عورتوں کو مذکر کی ضمیروں سے پکارا جا سکتا ہے

معترض نے آیۂ تطہیر میں مذکر کی ضمیروں کی بابت کہا ہے کہ پکارا عورتوں

(ازواج نبی) کو جارہا ہے۔ مگر ضمیریں چونکہ لفظ اہل بیت کی طرف راجع ہو رہی ہے اور لفظ اہل بیت خود مذکر ہے اس لئے ضمیریں بھی مذکر کی لائی گئی ہیں۔ اسی طرح وہ حضرت ابراہیمؑ کے یہاں فرشتوں کی زبانی **قالو اتعجبین من امر الله رحمت الله وبرکته علیکم اهل البیت انه حمید مجید۔** سورۃ ھود کی آیت 73 کے بارے میں کہہ رہے ہیں کہ اہل البیت حضرت سارہ کو کہا گیا ہے اور علیکم کی ضمیر مذکر کو لفظ اہل البیت کی وجہ سے بتاتے ہیں۔ یہ بھی بتاتے ہیں کہ حضرت موسیٰؑ نے صرف اپنی زوجہ سے کہا تھا امکثوا یہاں بھی عورت ذات کو مذکر کی ضمیر سے پکارا ہے۔ کیونکہ ان کے بقول امکثوا سے پہلے لفظ اہل آیا ہے۔ ہم ہر چیز کا جو لغویت ہی لغویت ہے جواب الگ الگ دیں گے۔

سب سے پہلے ہم یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ عورتوں کو لفظ اہل کی وجہ سے مذکر کی ضمیروں سے پکارا جانا یہ ایجاد معترض صاحب کی اپنی نہیں ہے بلکہ صدیوں پہلے کسی نے بے سوچے سمجھے حق اور حقداروں پر پردہ ڈالنے کے لئے یہ بات ایجاد کی تھی۔ اس کے بعد مکھی پر مکھی ماری جاتی رہی اور جو بھی پہلوان بن کر میدان میں آیا اس نے وہی سیکھی سکھائی بات کہہ دی تمام تر قابلیتوں کے باوجود نا قابلیت ہی کی اختیار کی۔

جیسے شام کے دربار حکومت میں کسی غریب کی اونٹنی چھیننے کے لئے مدعی اور اس کے گواہ یہی کہتے رہے کہ یہ اونٹ دعویدار کا ہے مدعی کا دعویٰ ڈگری ہو گیا تو غریب مالک نے کہا سرکار یہ اونٹ کہاں ہے یہ تو اونٹنی ہے۔ مگر اب کیا ہوتا فیصلہ تو ہو چکا تھا۔ مجھے انتہائی افسوس ہوتا ہے یہ دیکھ کر کہ یہ لغو اور بے اصل توجیہہ کیسے کیسے قابل و فاضل حضرات پیش کرتے رہے اور یہی کہتے رہے کہ ضمیر کا مرجع چونکہ لفظ مذکر (اھل) تھا اس کی وجہ سے عورتوں کے لئے مذکر کی ضمیریں کہی گئی ہیں۔ کسی نے اتنا سوچنے سمجھنے کی زحمت نہ اٹھائی کہ جس ضمیر کا مرجع عبارت کا کوئی لفظ ہوتا ہے۔ وہ صرف غائب کی ضمیر ہوتی ہے۔ لیکن ضمیر حاضر کا مرجع کوئی لفظ نہیں ہوتا بلکہ ضمیر حاضر کا مرجع مخاطب کی ذات ہوتی ہے۔ حاضر کی ضمیر میں وہ لفظ نہیں دیکھا جاتا جس

سے اس کو یاد کیا ہے بلکہ مخاطب کی ذات دیکھی جاتی ہے۔ اگر مخاطب مرد ہے تو مذکر کی ضمیر لائی جائے گی اور اگر عورت ہے تو مونث کی۔ البتہ اگر عورت کا ذکر صیغۂ غائب میں ہو تو ضمیر اس لفظ کی رعایت سے لائی جائے گی جس کی طرف وہ ضمیر راجع ہو رہی ہے۔ اس صورت میں جائز ہے کہ عورت کے لئے مذکر کی ضمیر لائی جائے۔ لیکن جب کسی کو پکارا جائے گا تو لفظ کو نہیں بلکہ ذات کو دیکھا جائے گا۔

ضمیر حاضر کا مرجع کوئی لفظ نہیں ہوتا بلکہ مخاطب کی ذات ہوتی ہے

چنانچہ غائب کی ضمیر اس وقت تک لائی ہی نہیں جا سکتی جب تک کہ ضمیر غائب سے پہلے اس کا نام نہ لے دیا گیا ہو۔ تاکہ وہ لیا ہوا نام ضمیر غائب کا مرجع ہو سکے۔ لیکن حاضر کی ضمیر کے لئے یہ کوئی ضروری امر نہیں ہے کہ مخاطب کا نام پہلے لیا جائے۔ کیونکہ یہاں ضمیر کا مرجع لفظ ہوتا ہی نہیں بلکہ جو مخاطب سامنے ہے اور حاضر ہے وہی ضمیر کا مرجع ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ارشادات نبویہ میں نیز ہماری روزمرہ کی بول چال میں اکثر خطابات مخاطب کا نام لئے بغیر ہیں۔ اور جس ضمیر سے مخاطب سے خطاب کیا گیا ہے اس ضمیر کا مرجع کوئی بھی لفظ نہیں۔ بلکہ مخاطب کی ذات ہے۔

سورۂ نصر میں فرمایا جا رہا ہے :۔

اذاجاء نصراللّٰہ والفتح ورایت الناس یدخلون فی دین اللّٰہ افواجا فسبّح بحمدربّك واستغفرہُ انّہ کان توّابا

یعنی جب اللہ کی نصرت اور فتح آگئی اور تم نے دیکھ لیا کہ لوگ دین خدا میں فوج در فوج داخل ہو رہے ہیں پس تم اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کرو اور اس سے استغفار کرو وہ بہت زیادہ توبہ کا قبول کرنے والا ہے۔

اس سورہ میں نبیؐ کو مخاطب کر کے حاضر کی ضمیریں چار جگہ آئی ہیں رءیت میں فسبح میں ربك میں اور واستغفر میں ان ضمیروں کا مرجع ذاتِ نبی کے سوا کوئی بھی ایسا لفظ نہیں جو نبی کے لئے علیحدہ کہا گیا ہو۔ چاروں قل والی سورتیں ہیں جن میں

قل کہہ کر نبیؐ سے خطاب کیا گیا کہ تم کہو ان میں قل سے پہلے کوئی بھی ایسا لفظ نہیں جو ضمیر قل کا مرجع ہو۔ قرآن مجید میں ایسی صدہا مثالیں ہیں۔ اب حدیث نبوی کی مثال بھی لیجئے۔ سرکار نے حاضرین سے فرمایا ایتونی بدواۃ و قرطاس مجھے دوات اور کاغذ دو یہاں بھی ایتو کی ضمیر حاضر کا مرجع کوئی لفظ نہیں پھر آپ نے فرمایا قوموا عنی میرے پاس سے چلے جاؤ۔ حاضر کی ضمیر کا یہاں بھی کوئی لفظی مرجع نہیں کفار مکہ سے سرکار نے فرمایا اذھبوا فانتم الطلقاء جائو تم آزاد ہو۔ ان جملوں میں بھی پکارے جانے والوں کے لئے کوئی لفظ نہیں جو اذھبو اور انتم کی ضمیروں کا مرجع ہو۔ خود معترض نے بھی نبیؐ کا یہ قول دکھایا ہے کہ آپ نے زملونی فرمایا یعنی تم لوگ مجھے چادر اڑھادو۔ یہاں بھی ضمیر حاضر ہے جس کا لفظوں میں کوئی مرجع نہیں۔ اسی وجہ سے ان کو اس غلط بیانی کا ایک موقع ہاتھ آگیا کہ سرکار نے جمع مذکر حاضر کے صیغہ میں صرف حضرت خدیجۃ الکبریٰ کو پکارا۔ پھر خود انہوں نے آنحضرت کا یہ قول دکھایا ہے کہ سرکار نے فرمایا ھریقوا اس خطاب کی ضمیر کے لئے بھی کوئی لفظی مرجع نہیں ہے اور مرجع عبارت میں نہ ہونے ہی کی وجہ سے ان کو یہ بات بنانے کا موقع ملا کہ مذکر حاضر کی ضمیر سے سرکار نے اپنی ازواج کو پکارا تھا۔ حضرت موسیٰ کا قول بھی انہوں نے دکھایا ہے کہ آپ نے راستے میں' دور سے آگ دیکھ کر فرمایا امکثوا۔ تم لوگ ٹھہرو یہاں بھی پکارے جانے والوں کے لئے کوئی پیشگی لفظ نہیں جو ضمیر امکثوا کا مرجع ہو۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ ضمیر حاضر سے جب کسی کو پکارا جائے گا تو اس ضمیر کا مرجع پکارے جانے والی کی ذات ہوگی۔ عبارت کا کوئی لفظ مرجع نہ ہوگا۔ یہ بات صرف ضمیر غائب کے لئے ہے کہ اس کا مرجع کوئی نہ کوئی لفظ ہوتا ہے۔ وہ لفظ اگر مذکر ہوتا ہے تو عورت کے لئے بھی ضمیر غائب مذکر ہی کی آتی ہے لیکن پکارے جانے میں لفظ کو مطلق نہ دیکھا جائے گا بلکہ پکارے جانے والے کی ذات کو دیکھا جائے گا۔ وہ مذکر ہے تو ضمیر مذکر کی آئے گی اور مونث ہے تو ضمیر مونث کی آئے گی۔ یہ دونوں باتیں یعنی غائب کی ضمیر مونث کے لئے بھی کسی لفظ مذکر کی وجہ سے مذکر کی اور حاضر کی ضمیر مخاطب کے مونث ہونے کی

وجہ سے فی الفور مونث کی۔ مثال قرآن کریم سے ملاحظہ فرمائیے۔

ازواج نبیؐ کا ذکر ہے جو مونث ہیں ان کا ذکر غائب کے صیغہ میں ہو رہا ہے۔ مرجع ضمیر غائب کا ہے۔ لفظ مَن (یعنی جو) یہ لفظ مَن ہے عربی میں مذکر۔ اس لئے مستورات کے لئے صیغہ مذکر غائب کا فرمایا گیا مگر جب فوراً ان ہی ازواج نبیؐ کو پکارا تو وہاں مذکر کی ضمیر نہیں آئی بلکہ مونث کی ہی آئی۔

یانساء النبی من یات منکنّ بفاحشۃٍ مبیّنتہٖ(احزاب' آیت 30)

یعنی اے نبی کی عورتو جو تم میں سے کسی کھلی بے حیائی کا کام کریگی .

یہاں یَأتِ صیغہ ہے مذکر غائب کا جو ازواج نبی کے لئے محض لفظ مَن کی وجہ سے مذکر قرار دیا گیا مگر اس کے بعد جب ازواج نبی کو پکارا گیا تو حاضر کی ضمیر اب مذکر نہیں آئی بلکہ مونث ہی آئی۔ منکنّ کہا گیا منکم نہیں کہا گیا۔

اسی طرح فرمایا جاتا ہے :۔

ومن یقنت منکنّ للہ و رسولہ(سورۃ احزاب' آیت 31)

یعنی جو تم میں سے اللہ اور رسول کی فرمانبرداری کرے گی

یہاں بھی محض مَن کی وجہ سے ازواج نبیؐ کے لئے یقنت مذکر غائب کا صیغہ فرمایا مگر اس کے بعد جب ازواج نبی سے فوراً خطاب کیا گیا تو ضمیر حاضر مونث کی آئی مذکر کی نہیں یعنی منکن کہا گیا منکم نہیں کہا گیا۔

ان تمام بیّن مثالوں سے جو آیات بینات ہیں روز روشن کی طرح عیاں ہو رہا ہے کہ ضمیر غائب کی تذکیر و تانیث تو اس لفظ کی بناء پر ہوتی ہے جو اس ضمیر کا مرجع ہے لیکن ضمیر حاضر کسی لفظ کو نہیں دیکھتی بلکہ ضمیر حاضر کے لئے مذکر یا مونث ہونے کا دارومدار اس شخص حاضر و مخاطب کے مذکر یا مونث ہونے پر منحصر ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ عورتوں کو مذکر کی ضمیر سے پکارا جائے اور مردوں کو مونث کی ضمیر سے پکارا جائے۔ لہذا اگر آیۂ تطہیر میں خطاب ازواج نبی سے ہوتا تو عنکم ہرگز نہ ہوتا عنکن ہوتا اور یطھر کم ہرگز نہ ہوتا یطھر کن ہوتا۔ لیکن خطاب چونکہ ان حضرات سے ہے

جن میں عنصر غالب اور اکثریت مردوں کی ہے خاتون (فاطمة الزهرأ) صرف ایک ہیں اسی لئے بقاعدۂ تغلیب مذکر کی ضمیریں فرمائی گئی ہیں۔

یہ غلط ہے کہ صرف حضرت سارہ (زوجہ حضرت ابراہیم) کو علیکم اہل البیت کہا گیا ہے

ہمارے مخاطب نے بڑے نازو انداز کے ساتھ قرآن مجید کی اس آیت کو پیش کیا ہے۔ چونکہ اس آیت کو موصوف نے بڑے فخر سے پیش کیا ہے اور اس آیت کو اپنے ہاتھ میں ایک سیف قاطع اور شمشیر براں سمجھ کر کہا ہے کہ "سبائیت نواز (شیعہ) حضرات اس آیت کو دیکھ کر چکرا جاتے ہیں کیونکہ اس میں بڑی وضاحت کے ساتھ صرف بیوی کو (جو ایک ہی ہے) اہل البیت کہا گیا ہے"۔

ہم بحمد اللہ تعالیٰ ایک ضرب حیدری سے ان کے بت پندار کو پاش پاش کر کے دکھاتے ہیں کہ چکرا کر کون گرتا ہے؟ ہم پہلے اس پوری آیت کو نقل کرتے ہیں تاکہ ناظرین آیت کی ابتداء اور انتہا کو دیکھ سکیں۔

قالو الا تخف انا ارسلنا الى قوم لوط و امراته قائمته فضحكت فبشر نها باسحق و من وراء اسحاق يعقوب قالت يويلتىء الدوانا عجوز وهذا بعلى شيخا ان هدا لشىء عجيب قالوا اتعجبين من امرالله رحمت الله و بر كته عليكم اهل البيت انه حميد مجيد (سورہ ھود آیات 70-73)

(فرشتے حضرت ابراہیمؑ سے کہہ رہے ہیں) آپ ڈریں نہیں ہم تو قوم لوط کی طرف بھیجے گئے ہیں۔ اس وقت حضرت ابراہیم کی عورت بھی کھڑی تھی (سارہ) وہ ہنس پڑیں پس ہم نے اس کو اسحاق کی خوش خبری دی اور اسحاق کے بعد یعقوب کی۔ (ابراہیم کی عورت) نے کہا ہائے افسوس کیا میں بوڑھی ہو کر جنوں گی جبکہ میرا یہ شوہر بھی بوڑھا ہے یہ تو یقیناً عجیب بات ہے۔ فرشتوں نے کہا کہ کیا تو امر خدا پر تعجب کر رہی ہے۔ تم لوگوں پر تو اے اہل بیت اللہ کی رحمت اور برکات ہیں اور وہ (اللہ) لائق حمد اور بزرگی والا ہے۔

اس آیت میں ابراہیم کی عورت کہہ کر حضرت سارہ کا ذکر ہے جنہوں نے

ولادت فرزند کی خبر سن کر تعجب اور افسوس کیا تو فرشتوں نے صرف تعجب کرنے والی بی بی (سارہ) سے واحد مونث حاضر کے صیغہ میں کہا کہ کیا تو امر خدا پر تعجب کر رہی ہے۔ یہ کہہ کر فرشتوں نے تمام افراد خاندان ابراہیم سے خطاب کر کے کہا کہ تم لوگوں پر اے اہل بیت' اللہ تعالیٰ کی مخصوص عنایات ہیں۔

معترض نے محض یہ دیکھ کر کہ اتعجبین من امر اللّٰہ کے بعد بلا فاصلہ رحمت اللّٰہ و برکاته علیکم اهل البیت کہا گیا ہے یہ مغالطہ دینے کی کوشش کی ہے کہ بعد کا خطاب بھی صرف جناب سارہ سے ہے اور تنہا ایک عورت کو اہل بیت کہا گیا ہے اور ایک ہی عورت کو جمع مذکر کی ضمیر سے پکارا گیا ہے جو سراسر غلط ہے۔ ہم پہلے دکھا چکے ہیں کہ حاضر کی ضمیر کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہر حالت میں مخاطب کی ذات کے مطابق ہو۔ یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ عورتوں کو مذکر کی ضمیر سے پکارا جائے۔ موصوف نے بات تو بنادی مگر یہ نہ دیکھا کہ حضرت سارہ کا ذکر شروع ہوا ہے تو ان کے لئے وامرته کہا گیا ہے یعنی ابراہیم کی عورت' اگر اس کے بعد لفظ اہل بیت بھی صرف ان ہی کے لئے کہا گیا ہے تو یہ لفظ شروع میں بھی آسکتا تھا لیکن شروع میں تو ان کو ابراہیم کی عورت کہا گیا ہے پھر اگر اللہ کی رحمت اور برکات صرف حضرت سارہ ہی کے لئے مخصوص تھیں اور ان رحمتوں اور برکتوں سے حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل اور ہاجرہ والدہ اسمٰعیلؑ جو موجود تھے قطعاً محروم تھے اور حضرت ابراہیم کی آئندہ نسل سے بھی ان الٰہی رحمتوں کا کوئی تعلق نہ تھا تو اس طول طویل عبارت کی ضرورت ہی کیا تھی؟ رحمت اللّٰہ و برکاته علیك کافی تھا۔ یہ کس قدر غلط اور مہمل بات ہے کہ ایک ہی جلسہ میں اور ایک ہی سلسلۂ گفتگو میں حضرت سارہ کو واحد مونث حاضر کے صیغہ میں پکارا جائے (کیا تو تعجب کر رہی ہے) اور پھر فوراً اس ہی ایک بی بی کو جمع مذکر حاضر کے صیغہ میں علیکم اهل البیت کہہ کر پکارا جائے۔ پھر یہ بات کتنی عقل اور ایمان سے بعید ہے کہ اللہ کی وہ ساری مخصوص رحمت اور برکتیں جناب سارہ ہی پر ہوں۔ حضرت ابراہیم' حضرت اسماعیل اور حضرت ہاجرہ ان سے بے تعلق اور محروم ہوں۔ حالانکہ یہ

ظاہر ہے کہ حضرت سارہ پر یہ تمام تر الٰہی رحمت اور الٰہی برکات حضرت ابراہیمؑ اور ان کے خاندان رسالت ہی کی بدولت تھیں۔ ابراہیمی وساطت کے بغیر تو ان کا یہ ذاتی شرف نہ تھا۔ جیسا کہ ایک موقع پر حضرت عبداللہ بن عباس نے ام المومنین بی بی عائشہ سے کہا تھا کہ تمہارا یہ شرف باپ کی بیٹی ہو کر نہیں ہے بلکہ شوہر (نبیؐ) کی زوجہ ہو کر ہے۔ یہ شرف تم اپنے باپ کے گھر سے لے کر نہیں آئیں۔ بلکہ ہمارے گھر آکر ملا۔

اللہ کی تمام تر رحمت اور برکت تو اس کے خلیل پر تھی اور ان کی وساطت سے ان کے خاندان پر تھی۔ ان کے خاندان میں جتنا جس کو ان سے تقرب تھا اتنا ہی وہ ان فیوض و برکات میں حصہ پا رہا تھا جو اس کے خلیل پر برس رہے تھے۔ لیکن نزول رحمت کی اصل منزل اور صدور برکات کا اصل مرکز حضرت ابراہیم تھے نہ کہ ان کی زوجہ لہٰذا حقیقت بالکل واضح ہے کہ جب تنہا حضرت سارہ کا ذکر آیا تو (وامراته) ابراہیم کی عورت کہہ کر خطاب ہوا جس نے تولد فرزند پر تعجب کیا تو فرشتوں نے صرف حضرت سارہ سے خطاب کر کے کہا (اتعجبین) کیا تو تعجب کرتی ہے۔ اس کے فوراً بعد فرشتوں نے پورے خاندان ابراہیمی سے خطاب کرتے ہوئے کہا (رحمت الله و برکاته علیکم اهل البیت) تم لوگوں پر اے اہل بیت اللہ کی مخصوص رحمت و برکات ہیں۔

پہلا خطاب تنہا حضرت سارہ سے ہے اور دوسرے خطاب میں دائرۂ تخاطب کو بڑھا کر پورے خاندان ابراہیم کو مخاطب کیا گیا۔ جس کی بیّن مثال قرآن کریم میں دوسری جگہ موجود ہے جس سے معترض اور ان کے ہم نواؤں کی ملمع کاری بالکل کھل جاتی ہے۔ اب دیکھیں کہ کون چکراتا ہے۔

یاایها النبی اذا طلقتم النساء فطلقوهن لعدتهن واحصوا العدة واتقوا اللّٰہ ربکم لاتخرجوهن من بیوتهن (سورہ طلاق آیت 1)

یعنی اے نبی جب تم لوگ عورتوں کو طلاق دو تو ان کے عدہ طلاق کا لحاظ رکھ کر طلاق دو۔ اور عدہ کے دنوں کا شمار رکھو اور اللہ سے ڈرو جو تمہارا رب ہے اور ان کو

(عدہ کے اندر) ان کے گھروں سے نہ نکالو۔

آیت مذکورہ میں پہلا خطاب (یاایھا النبی) صرف تنہا نبیؐ سے ہے۔ پھر فوراً اذا طلقتم النساء کہہ کر خطاب کی وحدت کو جمع سے بدل دیا۔ یعنی نبیؐ کے ساتھ پوری امت کو شامل کر کے اذا طلقتم فرمایا جو جمع مذکر ہے پھر اس کے بعد جتنے بھی صیغے آئے وہ سب جمع مذکر حاضر کے ہیں۔

کیا کوئی معمولی سمجھ والا بھی یہ کہہ سکتا ہے کہ جس طرح پہلا خطاب صرف نبیؐ سے تھا اسی طرح طلقتم' فطلقوھن' واحصوا' واتقوا ربکم اور لاتخرجوھن ان چھ جگہوں میں بھی جمع حاضر کے صیغوں میں تنہا نبیؐ ہی کو پکارا جارہا ہے؟ ہرگز نہیں۔

یاایھا النبی کے خطاب میں نبی کے سوا کوئی مخاطب نہیں لیکن فی الفور دوسرے خطاب میں تنہا نبی ہرگز نہیں بلکہ ان کے ساتھ پوری امت مخاطب ہے بلکہ ان خطابات سے اصل مراد ہی امت ہے۔ اسی طرح اتعجبین (کیا تو تعجب کررہی ہے) یہ خطاب صرف حضرت سارہ سے ہے۔ اس خطاب میں حضرت سارہ کے سوا کوئی بھی مخاطب نہیں۔ دوسرا خطاب علیکم اھل البیت یہ پورے خاندان ابراہیمی سے کیا گیا ہے۔ ضمیروں کا واحد سے جمع کی طرف آنا اور مونث سے مذکر کی طرف آجانا صاف بتا رہا ہے کہ خطاب کا رخ جو پہلے محدود تھا وہ وسیع ہوگیا۔ پہلا خطاب صرف اس ایک سے تھا جس کو ابراہیم کی عورت کہا تھا۔ دوسرا خطاب پورے خاندان سے ہے جن کو اہل البیت کہہ کر پکارا ہے۔

کیا حضرت موسیٰؑ نے تنہا اپنی زوجہ کو امکثوا جمع مذکر حاضر کے صیغہ میں پکارا تھا

مخاطب موصوف نے اپنی غلط اور بالکل غلط بات کے صحیح بنانے کے لئے انبیاء کرام پر بھی غلط گوئی کی تہمت رکھ دی اور کہہ دیا کہ موسیٰؑ نے اثناء سفر اور وادی سینا میں جب دور سے آگ دیکھی تو صرف اپنی زوجہ سے فرمایا امکثوا (تم لوگ ٹھہرو) اس

طرح وہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ایک عورت کو بھی جمع مذکر حاضر کے صیغہ میں پکارا جا سکتا ہے۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ عورت کو اور مذکر کے صیغے میں ایک کو اور جمع کے صیغے میں یہ اتہام بھی اور کسی پر نہیں نبی ؐ پر۔ ہمیں یاد آیا کہ ان کے اسی ماہنامہ روح اسلام میں خود ان کے نبی (مرزا صاحب) پر بھی مونث ہی کے صیغہ میں الہام ہونا بیان کیا گیا ہے۔ اور ان کے نبی کو بھی اسی مونث کے صیغہ میں پکارا گیا ہے جس طرح حضرت مریم کو پکارا گیا ہے۔

وھزّی الیكِ بجذع النخلۃ تسٰقط علیك رطباً جنیاً۔ (سورۃ مریم آیت 25)

لیکن اس آیت کو لکھتے وقت مضمون نگار کو مرزا صاحب کے مرد ہونے کا خیال آگیا تو انہوں نے ھزی کی ی کو اور الیك اور علیك میں کاف کے زیر کو چھپا دیا تاکہ ضمیریں مونث سے مذکر کی ہو جائیں۔ آیت کی تحریف کو گوارا کر لیا مگر یہ پسند نہ کیا کہ ان کے نبی کو عورت کہہ کر پکارا جائے حالانکہ معترض کے نزدیک تو یہ غلطی انبیاء تک نے کی ہے کہ عورت کو مرد کہہ کر پکارا ہے تو پھر مرد کو عورت کے صیغہ میں کیوں نہ پکار لیا جائے۔

حضرت موسیٰؑ کے واقعہ کے متعلق جو آیت ہے وہ یہ ہے۔

ھل اتٰك حدیث موسی اذ راٰی ناراً فقال لاھلہ امکثوا (سورۃ طٰہٰ آیت 9-10)

یعنی کیا تمہارے پاس موسیٰ کی بات آئی ہے جب کہ موسیٰ نے آگ دیکھی پس موسیٰ نے اپنے اہل سے کہا کہ تم لوگ ٹھہرو۔

معترض نے اس آیت کو پیش کر کے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ لفظ اہل کی رعایت سے جناب موسیٰ نے تنہا اپنی زوجہ کو جمع مذکر حاضر کے صیغہ میں پکارا تھا تاکہ آیۂ تطہیر کے بارے میں یہ باور کیا جا سکے کہ وہاں بھی لفظ اہل کی رعایت سے عورتوں کو مذکر کے حاضر کے صیغے میں پکارا گیا ہے۔

ہم لغت عربی اور قرآن حکیم کی بہت سی آیات سے یہ بات مکمل طور پر ثابت کر چکے ہیں کہ لفظ اہل کو صرف زوجہ کے لئے مخصوص قرار دینا علم اور ایمان سے غداری ہے۔ ہم یہ بھی دکھا چکے ہیں کہ لفظ کی رعایت صیغہء غائب میں ہوتی ہے کیونکہ صیغہ غائب کا مرجع عبارت کا کوئی نہ کوئی لفظ ہوتا ہے لیکن صیغہء خطاب سے جب کسی کو پکارا جائے تو ضمیر حاضر کا مرجع لفظ نہ ہوگا بلکہ مخاطب کی ذات ہوگی اور ذات کی تذکیر و تانیث دیکھ کر اس کے مطابق ضمیر لائی جائے گی۔ عورت کو مردوں کی ضمیر سے یا مردوں کو عورتوں کی ضمیر سے نہیں پکارا جا سکتا۔

اس کے علاوہ اس آیت میں لفظ اہل کا سہارا لینا ہی بالکل غلط ہے کیونکہ فقال لاهله (پس موسیٰ نے اپنے اہل سے کہا) حضرت موسیٰ کا قول ہی نہیں۔ یہ لفظ تو خداوند عالم کا ہے۔ وہ واقعہ کو بیان کرتے ہوئے فرما رہا ہے کہ موسیٰ نے اپنے اہل سے کہا تھا کہ تم لوگ ٹھہرو۔ حضرت موسیٰ کی بات میں تو لفظ اہل کا نام بھی نہیں ان کی بات توامکثوا سے شروع ہوئی ہے۔ لیکن

دروغ گو را حافظہ نباشد

واقعہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ ؑ کے ساتھ آپ کی زوجہ کے علاوہ متعدد اشخاص تھے اُمکثوا کا خطاب ان سب سے تھا۔

کیا حضرت موسیٰ کے ساتھ اس سفر میں صرف ان کی زوجہ تھیں؟

معترض کا یہ دعویٰ کہ اس سفر میں جناب موسیٰ ؑ کے ساتھ آپ کی زوجہ کے سوا اور کوئی نہ تھا انتہائی لغو، غلط اور دعوائے بے دلیل ہے۔ اگر مخاطب کے پاس اس کا کوئی ثبوت تھا تو کیوں نہ پیش کیا۔ دلیل وہ چیز نہیں ہو سکتی جو خود محتاج دلیل ہو۔ وہ حضرت مسلمانی کے دعویدار ہونے کے باوجود اپنے جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کی لئے قرآن کریم کو جھٹلا رہے ہیں۔ کیا قرآن حکیم کا لفظ امکثوا، اتیکم، لعلکم اور تصطلون یہ پے در پے چار جگہ جمع مذکر حاضر کی ضمیروں کا استعمال اس امر کی بیّن دلیل

نہیں ہے کہ حضرت موسیٰ کا تخاطب کسی فردِ واحد (جو ہو بھی عورت) سے نہ تھا بلکہ ان تمام افراد سے تھا جو آپ کے ساتھ تھے؟ قرآن حکیم تمام صیغے جمع مذکر حاضر کے استعمال کرے اور اس کے مقابلہ میں کسی شخص کا جو کسی شمار میں نہیں یہ رٹ لگانا کہ موسیٰؑ کے ساتھ ایک عورت کے سوا کوئی تھا ہی نہیں یہ قرآن حکیم کی صریحی تردید و تکذیب ہے یا نہیں؟

وادی سینا والے سفر میں حضرت موسیٰ کے ساتھ ان کی زوجہ کے علاوہ اور لوگ بھی تھے۔

1۔ اس کی قوی ترین دلیل تو یہی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بقول قرآن حکیم جن لوگوں کو دور سے آگ دیکھ کر ٹھہرنے کے لئے ان کے لئے چار مرتبہ جمع کے صیغوں میں خطاب فرمایا اور جمع بھی مذکر کی اس کے صاف یہ معنی ہیں کہ آپ کے ساتھیوں میں مرد عورتوں سے زیادہ تھے جیسے کہ موصوفین آیۂ تطہیر میں مردوں کی تعداد زیادہ ہے اور خاتون صرف ایک تھیں۔

2۔ اہل بیت اطہار جو نبیؐ کے بعد حقیقی مفسر قرآن ہیں، قرآن ان سے اور وہ قرآن سے کبھی جدا نہیں ہو سکتے۔ ان کا ارشاد ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے ساتھ آپ کے عیال کے علاوہ خادم، غلام اور کنیزیں تھیں۔

3۔ یہ رات کا وقت تھا اور موقع جنگل، بیابان کا تھا آگ جو حضرت موسیٰ نے دیکھی تھی وہ قریب نہ تھی خود معترض نے بھی لکھا ہے۔

"اسی طرح سیدنا موسیٰ اپنی بیوی کو ساتھ لے کر وادی سینا میں پہنچتے ہیں تو دور سے آگ روشن دیکھ کر" اور یہ ظاہر ہے کہ جنگل بیابان میں دس، بیس، پچاس قدم کے فاصلے پر جو چیز ہو اس کو دور نہیں کہہ سکتے اس کے معنی یہ ہیں کہ آگ دور اور کافی فاصلے پر تھی، اگر آپ کے ساتھ آپ کی زوجہ کے علاوہ کوئی متنفس نہ تھا تو اتنی دور جانے کے لئے وہ بھی رات کے سناٹے میں اور ہو کے عالم میں آپ اپنی جواں سال زوجہ کو تن تنہا کیسے چھوڑ سکتے تھے۔ اور وہ خود بھی اکیلا رہ جانا کیسے گوارا کر سکتی تھیں۔

4۔ حضرت موسیٰ اپنے خوشحال اور کثیر الافراد خاندان والے سسرال سے مع بیوی کے رخصت ہو کر جا رہے تھے۔ یہ سفر اطمینان کا تھا کسی خوف و خطر کی وجہ سے اچانک درپیش نہیں ہوا تھا ایسی حالت میں کون یہ باور کر سکتا ہے کہ رخصت کرنے والوں نے اور رخصت ہونے والوں نے یہ گوارا کر لیا کہ صرف دو میاں بیوی راتوں رات دور دراز کا یہ سفر اس حالت میں کریں کہ ان کے ساتھ کوئی متنفس نہ ہو جبکہ بیوی حاملہ بھی ہو اور وضع حمل قریب ہو اور یہ بیوی بھی اس باپ (شعیب) کی بیٹی ہو جس کے خاندان کی دھاک بقول قرآن کفار کے دلوں پر بیٹھی ہوئی ہو۔ معترض تو میاں' بیوی کا بغیر کسی متنفس کے راتوں رات جنگلوں اور بیابانوں کو بھاگم بھاگ طے کرنا اس انداز سے دکھا رہے ہیں جیسے کہ معاذاللہ کوئی شخص کسی عورت کو اغوا کر رہا ہو۔

5۔ قرآن حکیم سے تو یہاں تک ظاہر ہوتا ہے کہ اس سفر میں حضرت موسیٰؑ کے ساتھ حضرت ہارون بھی تھے۔ چنانچہ جو گفتگو وادی سینا میں منجانب قدرت ہوئی ہے سورۃ طٰہٰ میں اس طرح بیان کی گئی ہے

اذهبا الی فرعون انه طغی فقولا له قولاً لعله يتذكر اويخشیٰ (سورہ طٰہٰ آیت 43-44)

یعنی تم دونوں فرعون کی طرف جاؤ وہ سرکش ہو گیا ہے اور اس سے تم دونوں نرم گفتگو کرنا ہو سکتا ہے کہ وہ نصیحت کو مانے یا ڈر جائے۔

قالا ربنا اننا نخاف ان يفرط علينا او ان يطغیٰ (سورہ طٰہٰ آیت 45)

موسیٰ اور ہارون دونوں نے کہا کہ اے ہمارے رب ہم ڈرتے ہیں کہ فرعون ہم پر زیادتی کرے یا ظلم کرے۔

اس گفتگو میں ارشاد الٰہی (اذھبا دونوں جاؤ) اس کے متعلق تو کہا جا سکتا ہے کہ صرف موسیٰ سے ارشاد ہوا تھا کہ تم اور ہارون دونوں جاؤ لیکن اس کے جواب میں قالا یعنی دونوں نے کہا کہ اے ہمارے رب ہم کو ڈر ہے الخ صاف بتا رہا ہے کہ ہارون وہاں موجود تھے۔ اور ارشاد الٰہی کا جواب دونوں نے دیا ہے۔ اب قرآنی آیت کی

موجودگی میں کسی روایت کی حاجت ہی نہیں رہتی۔ نفسیاتی طور پر بھی یہ بات سمجھ میں نہیں آسکتی کہ حضرت موسیٰ مصر سے اچانک نکل کر مدین میں آٹھ دس برس تک اطمینان اور آسائش کی زندگی گزاریں وہیں شادی بھی ہو جائے۔ اس طویل مدت میں آپ کے گھر والے آپ سے اور آپ اپنے گھر والوں سے بالکل بے تعلق اور جدا رہیں۔ اگر حضرت موسیٰ مصر نہیں جا سکتے تھے تو اپنے گھر والوں کو اپنے پاس کیوں نہیں بلا سکتے تھے۔

غرضیکہ قرآن' حدیث روایت اور درایت ہر چیز سے یہ ثابت ہے کہ اس سفر میں جناب موسیٰ کے ساتھ آپ کی زوجہ کے علاوہ دوسرے اشخاص ذکور و اناث بھی تھے جن سے حضرت موسیٰ نے فرمایا امکثوا یعنی تم لوگ ٹھہرو۔

مخاطب موصوف نے حضرت موسیٰ پر تو یہ تہمت لگائی ہی تھی کہ انہوں نے ایک عورت کو جمع مذکر حاضر کے صیغہ میں پکارا تھا۔ اب سید الانبیاء کو بھی اپنے تیر خطا کا نشانہ بنالیا کہتے ہیں کہ آنحضرت نے غار حرا سے واپس ہو کر صرف جناب خدیجہ سے جمع مذکر حاضر کے صیغہ میں خطاب فرمایا زملونی یعنی تم لوگ مجھے چادر اڑھادو پھر کہتے ہیں کہ آنحضرت ؐ نے مرض الموت میں اپنی ازواج کو جمع مذکر حاضر کے صیغہ میں پکار کر فرمایا تھا ھریقونی یعنی تم لوگ میرے اوپر مشکیں انڈیل دو۔ میں پوچھتا ہوں۔ پھر یہ کس بناء پر کہہ دیا گیا کہ پہلا خطاب صرف حضرت خدیجہ سے تھا اور دوسرا صرف ازواج سے تھا؟

یہ مکمل فریب نہیں تو اور کیا ہے؟ عربی میں جب کہ تذکیر و تانیث کی الگ الگ دیواریں کھڑی ہیں۔ مرد کو مونث کے صیغے میں اور عورت کو مذکر کے صیغے میں پکارا ہی نہیں جا سکتا تو یہ خیال بھی کیسے آیا کہ صادق اللہجہ صحیح الکلام اور افصح العرب پیغمبر معاذ اللہ ایسی فاش غلطی کریں۔ غار حرا سے واپسی یہ اس زمانہ کا ذکر ہے جس زمانے میں علی مرتضیٰؑ دن رات نبی ؐ کے گھر میں رہتے تھے ان کا سونا جاگنا' اٹھنا' بیٹھنا' کھانا پینا سب وہیں تھا گھر میں کنیزیں اور غلام موجود تھے۔ اقرباء خاص جن کے گھر

متصل تھے ان کی آمدورفت رہتی تھی۔ ان حالات میں یہ خیال بھی دل میں لانا انتہائی کج فہمی ہے کہ تنہا ایک عورت کو جمع مذکر کے صیغہ میں پکارا گیا۔ مرض الموت میں تو تمام ہی اہل بیت' اقرباء اور اصحاب باصفا ہر خدمت کے لئے حاضر رہتے تھے۔ بلکہ خدمت تو رہی ایک طرف جوش محبت ان کو نبیؐ سے جدا ہونے ہی نہ دیتا تھا۔ یہ کیوں اور کیسے سمجھا جائے کہ پانی کی مشکیں انڈیلنے کے لئے ازواج کے سوا اور کوئی نبیؐ کے پاس نہیں تھا۔ اگر بالفرض ایسا ہوتا بھی تو کیا سرکار کو صیغۂ مونث آتا نہ تھا کہ مستورات کو صیغۂ تانیث سے پکارتے۔

قرآنی لفظ اہل البیت پر ایک نظر

اس میں تو کوئی شک نہیں کہ حضرات علیؑ و فاطمہؑ و حسنؑ و حسینؑ اور آئمہ طاہرین اہل بیت نبیؐ ہیں۔ اور متعدد احادیث نبویہ میں ان کو اہل بیت نبی فرمایا گیا ہے۔ سرکارؐ نے اپنے بہت سے ارشادات میں ان کو اھل بیتی (میرے اہل بیت) فرمایا ہے جس کو ہم آئندہ مفصلاً بیان کریں گے۔ اس صریحی واقعیت کی بناء پر عام طور پر یہ خیال قائم ہو گیا ہے کہ آیۂ تطہیر میں بھی لفظ اہل البیت بمعنائے اہل بیت نبیؐ ہے اور بیت سے مراد بیت نبی ہے۔ لیکن نظر غائر سے دیکھا جائے تو صاف ظاہر ہے کہ آیۂ مذکورہ میں البیت سے مراد بیت نبیؐ نہیں بلکہ بیت اللہ ہے اور ان پاکیزہ ہستیوں کو وارثان کعبہ کہہ کر پکارا گیا ہے۔ اس کی صراحت کے لئے چند چیزیں پیش کی جاتی ہیں۔

1۔ لفظ اہل البیت مرکب ہے اہل اور البیت سے لفظ کا لفظ ہی میں ترجمہ کیا جائے تو معنی ہوئے اے البیت کے اہل

قرآن مجید میں جہاں کہیں بھی لفظ البیت آیا ہے اس سے مراد ہر جگہ کعبہ ہے۔ مثلاً چند آیات پر نظر ڈالیئے

اذیرفع ابراھیم القواعد من البیت و اسماعیل (سورۃ بقرہ 127)

یعنی جبکہ ابراہیم واسماعیل البیت کی بنیادیں اٹھا رہے تھے

وللہ علی الناس حج البیت (سورہ آل عمران آیت 97)

یعنی اللہ کے لئے لوگوں پر البیت کا حج ہے۔

فمن حج البیت او اعتمر (سورہ بقرہ آیت 158)

یعنی جس نے البیت کا حج یا عمرہ کیا

و اذ جعلنا البیت مثابۃ للناس و امنا (سورہ بقرہ آیت 125)

یعنی ہم نے البیت کو انسانوں کے لئے ثواب اور امن کی جگہ قرار دیا ہے۔

2۔ المنجد جو عربی کی مشہور لغت عیسائی عالم نے لکھی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں :۔

البیت اسم من اسماء الکعبۃ

یعنی البیت کعبہ کے ناموں میں سے ایک نام ہے

3۔ متکلمین عرب نے البیت ہمیشہ کعبہ ہی کو کہا ہے۔ چنانچہ فرزدق مشہور شاعر عرب نے جو تاریخی قصیدہ امام زین العابدینؑ کی شان میں کہا ہے اس کا مطلع یہ ہے

ھذا الذی تعرف البطحاء وطئتہ

البیت یعرفہ والحل والحرم

یعنی یہ وہ ہیں کہ جن کے نشان قدم کو مکہ کے سنگریزے پہچانتے ہیں۔ ان کو البیت (کعبہ) پہچانتا ہے اور حل و حرم پہچانتے ہیں۔

4۔ اگر اہل البیت سے مراد یہاں اہل بیت نبیؐ ہوں تو ظاہر بظاہر اس خطاب میں نبیؐ شامل نہ ہوں گے حالانکہ یہ مسلم ہے کہ خود آنحضرتؐ بھی اس خطاب میں شامل ہیں۔ معترض کا یہ لکھنا کہ یہ آیت چار تن کے لئے بتائی جاتی ہے بالکل غلط ہے۔ چار تن (علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ و حسینؑ) ہی کے لئے نہیں بلکہ پانچوں تن کے لئے ہے جو زیر چادر تھے اور حاضرین چادر کے ساتھ ان نو غائبین کے لئے ہے جو زمانہ کے امام ہوئے۔ خداوند عالم نے پنجتن پاک کے ساتھ جو اس وقت موجود تھے ان بعد میں آنے والوں کو بھی آیۂ تطہیر میں اسی طرح پکارا ہے جس طرح بہت سی آیات میں قدرت نے حاضرین کے ساتھ غائبین کو بھی مخاطب قرار دیا۔ مثلاً : **اقیموا الصلوۃ و اتوا**

الزکوۃ یا کتب علیکم الصیام یا اتموا الحج یا واللہ غنی و انتم الفقراء یا واللہ یعلم و انتم لاتعلمون۔

ان تمام آیات میں حاضر اور خطاب ہی کے صیغے ہیں لیکن یہ ظاہر ہے کہ ان میں خطاب صرف ان ہی مومنین سے تو نہیں ہے جو اس وقت موجود تھے۔ بلکہ حاضرین کے ساتھ وہ مومنین بھی مخاطب ہیں جو اس وقت نہ تھے بلکہ بعد میں قیامت تک پیدا ہوں گے۔ اس آیت سے چہاردہ معصومینؑ کی عصمت و طہارت ثابت ہے۔ جیسا کہ آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا۔

اصبغ بن نباتہ نے عبداللہ بن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ میں نے رسولؐ اللہ کو فرماتے ہوئے سنا کہ میں خود، علی، حسن، حسین اور حسین کے نو فرزند، پاک اور معصوم ہیں۔ (ینابیع المودۃ باب 56 مودت 10 و مودۃ القربیٰ مؤلفہ سید علی ھمدانی سُنّی المذھب)

غرضیکہ لفظ اہل البیت وہ جامع لفظ ہے جس میں آنحضرتؐ خود بہ نفس نفیس شامل و داخل ہیں۔ چنانچہ آنحضرتؐ نے اپنے متعدد ارشادات میں اپنی ذات کو بھی اس لفظ (اہل البیت) میں شامل کر کے پیش کیا ہے چنانچہ آنحضرتؐ کا مشہور ارشاد ہے جس کو معترض نے خود بھی بیان کیا ہے۔ **السلمان منّا اھل البیت** یعنی سلمان ہم اہل بیت سے ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ آنحضرتؐ نے خود کو بھی منجملہ اہل البیت فرمایا ہے۔

"اسی طرح امام احمد بن حنبل نے بیان کیا ہے کہ رسولؐ اللہ نے فرمایا کہ تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جس نے دانائی کو ہم اہل بیت میں قرار دیا"۔ (ینابیع المودۃ باب 59)

آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا :۔

المھدی منا اھل البیت

یعنی مہدی ہم اہل بیت میں سے ہے۔

نیز ارشاد فرمایا :۔

نحن اهل البيت لايقاس بنا احد

یعنی ہم اہل البیت ہیں ہماری کوئی برابری نہیں کر سکتا (باب 56 ینابیع المودۃ و مودۃ القربیٰ)

آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا کہ :۔

"جو شخص ہم اہل بیت کو دوست رکھتا ہے وہ اپنی ولادت کے پاکیزہ ہونے پر اللہ کی بہترین نعمت پر شکر ادا کرے کیونکہ ہم کو صرف وہی شخص دوست رکھے گا جس کی ولادت پاکیزہ ہو گی۔ (ینابیع المودہ باب 56 حدیث 43)

صاحب روضۃ الاحباب نے تحفۃ الاحباء میں فرمایا ہے :

"بتحقیق پیوستہ کہ ایں آیہ (آیۂ تطہیر) در شان این پنج تن ست لہذا ایشاں را آل عبا گویند"۔

یعنی تحقیق سے ثابت ہو چکا ہے کہ آیۂ تطہیر ان ہی پانچ حضرات کی شان میں ہے۔ اسی وجہ سے ان کو آل عبا کہتے ہیں۔ ابن حجر مکی نے بھی صواعق محرقہ میں کہا ہے کہ مفسرین میں زیادہ تعداد ان کی ہے جن کے نزدیک آیۂ تطہیر پنجتن کے بارے میں ہے۔

آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا :

نزلت انمايريد الله ليذهب عنكم الرجس اهل البيت ويطهركم تطهيرا فی و فی علی و الحسن و الحسين والفاطمة

یعنی آیۂ انمایریداللہ نازل ہوا ہے میرے بارے میں اور علیؑ و حسنؑ حسینؑ و فاطمہؑ کے بارے میں (صاحب تفسیر ثعلبی نے اور ینابیع المودۃ وغیرہا نے) آنحضرتؐ کا ارشاد حضرت ابو سعید خدری صحابی رسول کی زبانی بیان کیا ہے۔ ان تمام چیزوں سے دو باتیں الم نشرح ہو گئیں۔

(1) یہ کہ جب آنحضرت خود آیۂ تطہیر میں اہل البیت کہہ کر پکارے گئے اور

آنحضرتؐ نے جا بجا اپنی ذات کو اہل البیت فرمایا تو ثابت ہو گیا کہ آیۂ تطہیر میں اہل البیت سے مراد اہل بیت نبیؐ نہیں بلکہ اہل کعبہ وارثان حرم خدا، مراد ہیں۔ کیونکہ کسی شخص کے اہل بیت میں خود وہ شخص شامل نہیں ہوتا۔ اور اگر کسی شخص کو یہ وہم پیدا ہو کہ کوئی انسان خدا کے گھر کا اہل کیسے ہو سکتا ہے تو وہ سورۃ بقرہ رکوع 27 کی یہ آیت دیکھ لے جس میں فرمایا گیا ہے۔

واخراج اهله منه اکبر عندالله (سورہ بقرۃ، آیت 217)

یعنی جو لوگ اللہ کے گھر کے اہل ہیں ان کو وہاں سے نکالنا اللہ کے نزدیک گناہ کبیرہ سے بھی کہیں زیادہ ہے۔

آیت صاف بتا رہی ہے کہ کچھ حضرات ایسے ہیں جن کو اللہ اپنے گھر کا اہل فرما رہا ہے۔

(2) جب خطاب قدرت میں آنحضرتؐ، علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ و حسینؑ، پانچوں تن ہیں اور لفظ اذہاب رجس و لفظ تطہیر ان پانچوں کے لئے ایک ہے تو اذہاب رجس اور تطہیر کے معنی بھی ان سب کے لئے ایک ہیں۔ یعنی اگر یہ سمجھا جائے کہ ان میں رجس تھا جو دور کیا جا رہا ہے یا معاذ اللہ یہ ناپاک تھے اب پاک کیا جا رہا ہے تو یہی معنی آنحضرتؐ کے لئے بھی ہوں گے۔ معاذ اللہ من ذالک۔ دنیا میں کون مسلمان ہو گا جو آنحضرتؐ کو مرتبۂ رسالت کے باوجود اور حسنؑ و حسینؑ کو ان کی کم سنی کے باوجود گنہگار اور ناپاک سمجھے۔ یہ تینوں افراد تو یقیناً پہلے سے بے گناہ اور معصوم تھے ایک نبیؐ رسول ہونے کی بناء پر اور وہ دونوں (حسنؑ و حسینؑ) نہایت کم سن ہونے کی بناء پر لفظوں کی وحدت بتا رہی ہے کہ اذہاب رجس اور تطہیر کے معنی پانچوں کے لئے ایک ہیں۔ یعنی پاک ہستیوں کو پاک رکھنے اور آئندہ بھی ان کے بے گناہ اور معصوم رہنے کا اعلان ہو رہا ہے۔ جس طرح اللہ پاک رسول پاک قرآن پاک سے مراد ہوتی ہے ہمیشہ سے پاک۔

عصمت کوئی وقتی چیز نہیں ہوتی بلکہ ذاتی اور دائمی ہوتی ہے

کفر چھوڑ کر ایمان لے آنے سے یا گناہوں کو چھوڑ کر پرہیز گار ہو جانے سے کسی کو معصوم نہیں کہا جا سکتا اگر چہ اس کی آئندہ زندگی پوری کی پوری بے گناہی میں گزرے کیونکہ عصمت کا تعلق کسی وقت سے نہیں بلکہ ذات سے ہے جب تک کسی ذات کو وہ عرفان کامل اور ملکہ قدسیہ حاصل نہ ہو جو مہد سے لحد تک اس کو بے گناہ رکھ سکے اس وقت تک اس کو معصوم نہیں کہا جا سکتا۔ اگر عصمت کا تعلق خاص خاص اوقات سے ہو تو دنیا میں کوئی بھی غیر معصوم نہ رہے گا۔ جس نے ایک منٹ کوئی گناہ نہ کیا وہ ایک منٹ کے لئے معصوم اور جس نے ایک گھنٹہ بغیر گناہ کے گزارا وہ ایک گھنٹہ کا معصوم اور جس نے ایک دن کوئی گناہ نہ کیا وہ ایک دن کے لئے معصوم تو اس طرح ساری خدائی معصوم ہو جائے گی۔

اذہاب رجس اور تطہیر سے مراد ظاہری اور باطنی ہر نجاست سے محفوظ رکھنا ہے

ظاہری نجاسات کو تو سب ہی سمجھتے ہیں اور ان سے آنحضرتؐ اور آپ کے اہل بیت کا منزہ ہونا متفق علیہ حدیث سدّ ابواب (دروازوں کا مسجد نبیؐ سے بند کرا دینا) سے بخوبی ثابت ہے۔ یعنی آنحضرتؐ نے بحکم خدائے تعالیٰ علی مرتضیٰؑ کے سوا تمام دروازے اپنی مسجد کی جانب سے بند کرا دیئے اور فرمایا کہ اس مسجد میں میرے اور علیؑ کے سوا کوئی جنب داخل نہیں ہو سکتا اس حدیث کو اجلہ علماء اہل سنت نے جا بجا ثقہ رواۃ سے نقل کیا ہے۔ چنانچہ صاحب ینابیع المودۃ نے ایک مستقل باب 17 قائم کر کے نو طریقے سے اسی حدیث کو بیان کیا ہے۔ حضرت احسن جائسی نے بھی اپنے قصیدے میں فرمایا ہے۔

منم سُنّی ولیکن از تعصب الاماں گویم
پسند خاطرم انصاف از دنیا و مافیہا
برائے سدِ ہر باب از پیغمبر حکم شد نافذ
مگر دروازۂ حیدر بحکم خالق دانا

رہی باطنی نجاست تو ہم دکھا چکے ہیں کہ آنحضرتؐ نے اپنی ذات کو شامل فرما

کر چودہ حضرات کو معصوم فرمایا ہے۔

آیۂ تطہیر کو ازواج نبی کی شان میں کیوں سمجھا گیا

جس مضمون کو سامنے رکھ کر ہم تردید کر رہے ہیں اور نقل کفر کفر نباشد کی بناء پر ہم اس کو حرف بحرف نقل بھی کر چکے ہیں اس پورے مضمون پر نظر ڈالئے دعویٰ تو کیا گیا ہے کہ اس آیت (تطہیر) سے مراد ازواج نبی ہیں۔ لیکن آیات قرآنی کے حقیقی مفسر سرکار رسالت کا کوئی ارشاد جو قولاً ہو یا عملاً ہو کیا کہیں دکھایا گیا ہے جس سے اظہار ہوتا ہو کہ یہ آیت میری ازواج کے بارے میں ہے؟ ہرگز نہیں اور مطلقاً نہیں۔ مخاطب پیش نظر ہوں یا کوئی بھی ہو جس نے بھی یہ دعویٰ کیا محض دعویٰ کیا نہ سرکار کا کوئی قول پیش کیا نہ تائید دعویٰ میں کوئی تاریخی واقعہ پیش کیا اور حد یہ ہے کہ نہ خود ازواج نبی کا کسی موقع پر یہ کہنا دکھایا کہ یہ آیت ہماری شان میں نازل ہوئی ہے۔ کتنے تعجب کی بات ہے کہ جو بات نہ تو نبی نے فرمائی نہ ازواج نے فرمائی نہ اصحاب نے فرمائی۔ وہ بات مدعی سست گواہ چست کے طور پر کہاں سے آئی اور کیوں آئی؟ بات یہ ہے کہ صحیح ہو یا غلط وجہ ہر چیز کی ہوتی ہے۔ غلطی یا غلط فہمی بھی وجہ کے بغیر نہیں ہوتی جہاں تک ہماری نظر کام کرتی ہے اس غلط فہمی یا مغالطہ دہی کی دو وجوہ ہیں۔

ایک یہ کہ یہ آیت موجودہ صورت میں ان آیات کے درمیان میں ہے جو ازواج نبی کے بارے میں ہیں۔

دوسرے یہ کہ لفظ اہل البیت میں جو البیت ہے۔ اس لفظ البیت کے الف لام کو تو نظر انداز کر دیا اور یہ بات بھلا دی کہ قرآن کریم البیت کہتا ہے تو کون سا گھر مراد ہوتا ہے۔ اس لفظ کو صرف بیت کی نظر سے دیکھنا اور بیت نبی قرار دے کر صرف اس بات پر زور دینا شروع کر دیا کہ کسی کے اہل بیت میں اس کی زوجہ یا ازواج ضرور داخل ہیں۔

ہم ان دونوں صورتوں کو پورے طور پر نمایاں کئے دیتے ہیں۔

پہلی صورت کہ یہ آیت کس مقام پر ہے ہر گز دلیل نہیں ہو سکتی کیونکہ قرآن کریم کی اور قرآن کی سورتوں کی ترتیب اور آیات کی ترتیب نہ تو نبی کی دی ہوئی ہے نہ کسی معصوم عن الخطاء کی۔

کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ اس آیت کا یہ ٹھکانہ اس ہی بناء پر بنایا گیا ہو کہ آئندہ اس خلط مبحث سے اس مدعا کے حصول میں آسانی ہو؟ لیکن کوشش کے باوجود بھی بات بے جوڑ ہی رہی کیونکہ آیت یہاں بھی اپنی انفرادیت کو نمایاں کر رہی ہے۔ قبل وبعد کی آیات جو ازواج نبی کے متعلق ہیں ان میں تمام صیغے تانیث کے اور آیۂ تطہیر میں ضمیریں مذکر کی اس کے علاوہ قبل وبعد کی آیات میں تاکید' تشدید اور تہدید ہے جن میں عذاب تک کی دھمکی دی گئی ہے۔ لیکن آیۂ تطہیر میں سوائے خیر وبرکت' شرف و فضیلت ور حمت کے اور کوئی بات نہیں۔

تیسرے آنکھ کھول کر ایسا کہنے والوں نے یہ بھی نہ دیکھا کہ ازواج نبیؐ کے گھر کئی تھے۔ اس واقعیت کی بناء پر آیۂ تطہیر سے قریبی آیات میں بھی ان کے گھر کو بیت نہیں کہا گیا بلکہ دو جگہ بیوت کہا گیا اور یہاں کے کچھ بعد بھی لا تدخلوا بیوت النبی کہہ کر بیوت ہی دکھائے گئے ہیں۔ (سورہ احزاب' آیت 52) اس طرح ایک ہی سورہ احزاب میں ازواج نبی کے لئے تین جگہ بیوت ہی کا لفظ آیا جو بیت کی جمع ہے۔ سورہ حجرات میں ان الذین ینادونك من وراء الحجرات (حجرات-4) کہہ کر قدرت نے دکھادیا کہ ازواج نبیؐ کے رہنے کے کئی حجرے ہیں۔ لیکن اس کے برعکس آیۂ تطہیر میں نہ اہل البیوت ہے نہ اہل الحجرات ہے بلکہ اہل البیت ہے۔ تو پھر یہ جوڑ ملائے کہاں ملا؟

اب رہی دوسری بحث کہ اہل بیت (گھر والے) کے لفظ میں ازواج بھی آجاتی ہیں وہ بھی اہل بیت اور اہل خانہ ہیں۔ ہم پہلے دکھا چکے ہیں کہ لفظ اہل بیت نہیں بلکہ اہل البیت ہے اور البیت کے اہل کو پکارا گیا ہے اور البیت خانہؑ خدا کا نام ہے۔ اس لئے ازواج کی بحث ہی بیکار ہے۔

اگر تھوڑی دیر کے لئے اس سے قطع نظر بھی کر لی جائے اور اس لفظ کو اہل البیت کے بجائے صرف اہل بیت ہی کی حیثیت سے دیکھا جائے اور یہ بھی مان لیا جائے کہ لفظ اہل بیت ازواج کے لئے بھی بولا جاتا ہے اور بولا جا سکتا ہے تو خدارا کوئی انصاف سے بتائے کہ کیا دنیا میں کسی متکلم کو اس بات پر کوئی مجبور کر سکتا ہے کہ جو لفظ جس جس کے لئے بولا جا سکتا ہے۔ بولتے وقت وہ ان سب ہی کو مراد لے؟ کیا متکلم کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ لاکھوں مولویوں میں سے کسی ایک کو مولوی کہہ کر پکارے اور لاکھوں ڈاکٹروں میں سے کسی ایک کو ڈاکٹر کہہ کر پکارے۔ ظاہر ہے کہ پکارنے والا جس کو جس لفظ سے پکار رہا ہے اس وقت اس لفظ سے وہی مراد ہوگا۔ دوسروں کے لئے لاکھ وہ لفظ بولا جا سکے لیکن ان میں سے کوئی بھی مخاطب نہیں۔ کسی لفظ کا کسی کے لئے بولا جا سکنا اور چیز ہے اور بولا جانا اور چیز ہے۔ دنیا میں لاکھوں مولوی' وکیل' ڈاکٹر' حکیم' مرزا' زیدی' شیخ' خان' رضوی' نقوی وغیرہم موجود ہیں۔ لیکن ہم جس کو مولوی کہہ کر پکاریں اس کے سوا کوئی مولوی مخاطب نہیں جس کو مرزا کہہ کر پکاریں اس کے سوا کوئی مرزا مراد نہیں۔ جس کو زیدی کہہ کر پکاریں اس کے سوا کسی زیدی سے ہمارا سروکار نہیں۔ لفظ جب تک بولا نہیں جاتا اس وقت تک عام ہوتا ہے لیکن جب بولا جاتا ہے تو متکلم کے ارادہ کا تابع ہو جاتا ہے۔ اگر بولنے والے نے صرف فرد واحد کے لئے بولا تو وہ لفظ اسی سے مخصوص ہو گیا۔ اور اگر مخصوص افراد کے لئے بولا تو لفظ ان ہی افراد سے مخصوص ہو گیا۔ لہذا یہ دیکھنا اور دکھانا ہی بیکار ہے کہ لفظ اہل بیت کس کس کے لئے بولا جا سکتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ بولنے والے نے یہ لفظ بولا کس کس کے لئے اور پکارنے والے نے اس لفظ سے پکارا کس کس کو ہے؟ آنحضرتؐ نے بقول ام المومنین عائشہ اپنی اوڑھی ہوئی چادر میں ایک کو لیا' دوسرے کو لیا' تیسرے کو لیا چوتھے کو لیا۔ چاروں (علیؑ' فاطمہؑ' حسنؑ' حسینؑ) کو ایک کے بعد ایک کو لے کر یہ آیت قرآنی (آیۂ تطہیر) پڑھ کر سنائی۔ انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت و یطھر کم تطھیرا۔ اس روایت کو صحیح بخاری جزء چہارم میں حضرت عائشہ سے بیان کیا ہے۔ اسی روایت کو ان ہی حضرت

عائشہ سے تفسیر کشاف میں آیۂ مباہلہ کے تحت بیان کیا گیا۔ ان ہی حضرت عائشہ سے یہی روایت صحیح مسلم جزء چہارم میں بیان کی گئی ہے۔ ان ہی حضرت عائشہ سے یہی روایت صحیح ابی داؤد میں آیۂ تطہیر کے تحت بیان کی گئی ہے۔ ان ہی حضرت عائشہ سے جمع بین الصحیحین حمیدی میں یہی مضمون صحیح مسلم و صحیح بخاری کے حوالے سے متفق علیہ بیان کیا گیا ہے۔ اور شمار میں اس حدیث کا نمبر 64 دکھایا گیا ہے (ینابیع المودۃ و سفینۂ نجات)

غرض کہ آنحضرت ؐ کا ان چاروں حضرات کا پے در پے چادر میں لینا یہ کوئی معاذ اللہ بچوں کا کھیل تو نہیں کھیلا جا رہا تھا یہ کوئی آنکھ مچولی تو نہ تھی۔ سرکار ؐ کو جو کچھ ان حضرات سے کہنا تھا سامنے بٹھا کر چادر میں لئے بغیر بھی فرما سکتے تھے۔ یہ اہتمام کیوں کیا جا رہا تھا؟ صرف اس لئے کہ خطاب الٰہی کی تخصیص کو اور مکمل حد بندی کو پورے طور پر ظاہر فرما دیں اور جب بھی کوئی شخص یہ معلوم کرنا چاہے کہ آیۂ تطہیر کے مخاطب کون کون ہیں۔ تو وہ یہ معلوم کر لے کہ چادر میں کون کون ہیں۔

اس کے بعد بھی یہ دیکھنا اور دکھانا کہ یہ لفظ (اہل بیت) کس کس کے لئے بولا جا سکتا ہے اور اس لفظ کے معنی میں کون کون آسکتا ہے بے کار ہے۔ قدرت نے حاضرین اور حاضرات میں سے جس جس کو پکارا ان ہی کو نبی نے چادر میں لے کر ظاہر کر دیا۔ اب اگر کوئی آیت کے خطاب میں کسی اور کو دکھانا چاہتا ہے تو اس کا فرض ہے کہ وہ اس کو چادر میں دکھائے۔

کیا کوئی بھی اور کہیں بھی کوئی روایت ایسی ہے جو آنحضرت ؐ کے ساتھ کساء نبوی میں ان چار افراد کے علاوہ کسی اور کا ہونا بتاتی ہے۔ ایسی کوئی روایت تو کیا ہوتی روایات تو یہ بتاتی ہیں کہ بعض ازواج نبی ؐ نے چاہا کہ وہ بھی اس چادر میں آجائیں۔ لیکن سرکار ؐ نے روک دیا اس سلسلے میں حضرت ام سلمہ اور حضرت عائشہ کے نام لئے گئے ہیں چنانچہ صاحب سفینۂ نجات نے بیان کیا ہے کہ امام احمد بن حنبل نے مسند میں حضرت ام سلمہ سے متعدد طریقوں سے اس واقعہ کو بیان کیا ہے۔ بی بی ام سلمہ بیان

کرتی ہیں کہ سرکارؐ میرے گھر میں تھے فاطمۃ الزھراء آنحضرت کے لئے حریرہ پکا کر لائیں۔ سرکارؐ نے ان سے فرمایا کہ اپنے شوہر اور فرزندوں کو بھی بلاؤ۔ فاطمۃ الزھراءؑ نے علی و حسن حسین کو بلایا۔ سرکار کے نیچے خیبری چادر تھی جس کو کساء کہتے ہیں۔ میں حجرہ کے در پر نماز پڑھ رہی تھی کہ اللہ نے آیۂ تطہیر نازل کی آنحضرتؐ نے وہی چادر اپنے ساتھ سب کو اڑھادی اور اپنا دست مبارک چادر سے نکال کر دعا کے لئے اٹھایا اور کہا:

اللھم ھولاء اھل بیتی و خاصتی فاذھب عنھم الرجس وطھرھم تطھیراً میں نے بھی چاہا کہ اپنا سر اندر کر سکوں اور میں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ میں بھی آپ حضرات کے ساتھ ہوں۔ آنحضرت نے فرمایا کہ انکِ علیٰ خیر۔ تم نیکی پر ہو۔

اس سلسلے کی دوسری روایت میں اس تمام واقعہ مذکورہ کے بعد حضرت ام سلمہ کا بیان یہ ہے کہ جب میں نے چادر اٹھا کر چادر میں جانا چاہا تو آنحضرتؐ نے چادر میرے ہاتھ سے کھینچ لی اور فرمایا کہ تم نیکی پر ہو (لیکن اس آیت کی مخاطب نہیں ہو) (ینابیع المودۃ باب 56)

پھر اس ہی سلسلۂ بیان میں حضرت ام المومنین عائشہ کا بیان ہے وہ فرماتی ہیں کہ قسم خدا میں نے دیکھا کہ آنحضرتؐ نے علیؑ و فاطمہؑ و حسنؑ و حسینؑ کو اپنی چادر میں جمع کیا اور اس کے بعد کہا اللھم ان ھولاء اھل بیتی و خاصتی فاذھب عنھم الرجس وطھرھم تطھیرا اس پر میں نے کہا کہ یارسول اللہ میں بھی تو آپ کے اہل سے ہوں تو آنحضرتؐ نے فرمایا تنحیّ انکِ علی خیر۔ یعنی تم اس چادر سے الگ رہو البتہ شرف زوجیت تمہارے لئے بھی ہے۔

کیا حدیث کساء موضوع اور اس کے راوی کذاب ہیں؟

معترض جیسا کہ ہم دکھا چکے ہیں اپنے پیرومرشد، اپنے مسیح و مہدی سے بھی

منحرف ہو کر حدیث کساء کو موضوع اور اس کے راویوں کو مہا جھوٹا اور شیعہ بتا رہے ہیں۔

ہم جواباً کہتے ہیں کہ اگر حدیث کساء موضوع اور اس کے راوی کذاب ہیں تو مسلمانوں کے دامن میں نہ کوئی حدیث صحیح ہے نہ کوئی راوی سچا ہے نہ کوئی کتاب حدیث درست ہے نہ کوئی صحابی سنی ہے نہ کوئی زوجۂ نبی ہے جو شیعہ نہ ہو۔ کیوں اس لئے کہ اس حدیث کو جن کتب صحاح نے بکثرت بیان کیا ہے ان سے بہتر کیا برابر بھی کوئی کتاب نہیں جو مسلمانوں کے پاس ہو۔ پھر اس حدیث کو جن راویوں نے بیان کیا ہے ان سے بہتر بلکہ ان کے برابر بھی مسلمانوں میں کوئی راوی نہیں۔ جس کثرت اور تواتر سے یہ حدیث بیان ہوئی ہے اس سے زیادہ تواتر اور کثرت بیان کسی اور حدیث کے لئے نہیں۔ اس حدیث کے راوی مشہور و معروف اصحاب نبیؐ اور ازواج نبیؐ ہیں۔ اگر ان ہی کو کذاب اور شیعہ کہہ دیا جائے تو سچا اور سنی کون رہے گا۔ یہی وجہ تھی کہ مضمون نگار نے یہ کچھ نہ بتایا کہ ان کے دعوے کے مطابق یہ موضوع حدیث کس کس غیر صحیح کتاب میں بیان ہوئی۔ وہ جھوٹے راوی کس کس نام کے ہیں۔

جو بات معترض مصلحتاً چھوڑ گئے ہم اس کو پورا کیئے دیتے ہیں۔ دل تو چاہتا تھا کہ ہم ان کثیر روایات کو لفظ بلفظ بیان کرتے۔ راویوں کا اور کتابوں کا الگ الگ نام لے کر ان کے بیانات کو حرف بحرف دکھاتے لیکن طوالت کے خیال سے ہم ان کتابوں کی فہرست دیئے دیتے ہیں۔ جنہوں نے اس حدیث کساء کو پیش کیا۔ اسی طرح ان راویوں کی فہرست دیئے دیتے ہیں جنہوں نے اس حدیث کو بیان کیا اگر چہ پیش کی جانے والی یہ فہرست بھی گلے از گلزار یے و مشتے نمونہ از خروارے کی حیثیت میں ہے۔

ان کتابوں کے نام جن میں یہ حدیث موجود ہے۔

(۱) صحیح مسلم (۲) صحیح بخاری (۳) صحیح ابو داؤد (۴) صحیح ترمذی (۵) موطأ امام مالک (۶) مسند امام احمد بن حنبل (۷) جمع بین الصحیحین حمیدی (۸) جمع بین الصحاح الستۃ (۹) مستدرک حاکم (۱۰) معجم طبرانی (۱۱) صواعق محرقہ (۱۲) تفسیر ثعلبی (۱۳) تفسیر کشاف تحت آیۂ مباہلہ (۱۴) کتاب مصابیح (۱۵) وسیلۃ المتعبدین

(۱۶) ذخائر العقبیٰ محب الدین طبری (۱۷) تحفۃ الاحباء مصاحبِ روضۃ الاحباب جمال الدین محدث (۱۸) شرح الکبریت الاحمر (۱۹) کتاب الشفاء قاضی عیاض (۲۰) بیہقی الامام الحافظ ابی بکر احمد بن الحسین (۲۱) مودۃ القربیٰ الامام السید علی ہمدانی (۲۲) ینابیع المودۃ المفتی الاعظم سلیمان قندوزی (۲۳) مناقب (امام احمد بن حنبل) (۲۴) اسد الغابہ (۲۵) استیعاب (حاشیہ اصابہ) (۲۶) نسائی (۲۷) تفسیر طبری (۲۸) تفسیر دُرّمنثور (۲۹) الفصول المہمّہ (۳۰) فتاویٰ ابن تیمیہ (۳۱) نیل المراد (۳۲) ابن کثیر۔

ہم یہ مختصر سی فہرست کتب پیش کر کے مخاطب اور ان کے ہم نواؤں سے سوال کرتے ہیں کہ مذکورہ کتب سے بہتر ان کی نظر میں کوئی کتاب ہو تو اس کا نام لیں اور کہیں کہ ان کتابوں پر ہم کو اعتبار نہیں۔ اگر حدیث ان کتابوں کے علاوہ فلاں کتاب میں ہوتی تو ماننے کے لائق ہوتی۔

راویان حدیث کساء کی مختصر فہرست

1۔ ام المومنین حضرت عائشہ
2۔ ام المومنین حضرت ام سلمہ
3۔ انس بن مالک صحابی وخادم نبیؐ
4۔ ابو سعید خدری صحابی نبیؐ
5۔ سعد بن ابی وقاص صحابی نبیؐ
6۔ واثلہ بن اسقع صحابی نبیؐ
7۔ ابو العمراء صحابی نبیؐ
8۔ زینب بنت ابی سلمہ صحابیہ وپروردۂ رسولؐ۔ یہ حضرت ام سلمہ زوجہ نبیؐ کی دختر تھیں۔
9۔ عمر بن ابی سلمہ صحابی وپروردۂ رسولؐ۔ یہ حضرت ام سلمہ زوجہ نبیؐ کے فرزند تھے۔

10۔ زید بن ارقم صحابی رسول (وغیر ہم)

مخاطب اور ان کے ہم نوا بتائیں کہ ان کی نظر میں اگر مذکورین اور مذکورات سچے نہیں ہیں اور شیعہ ہیں تو وہ ان کے نام بتائیں جو سچے ہوں اور سنی ہوں۔

ہم واضح طور پر بتائے دیتے ہیں کہ اس حدیث کساء کی کثیر تر روایات حضرت ام المومنین عائشہ اور ام المومنین ام سلمہ ہی سے ماخوذ ہیں زیادہ تر ان دونوں بیبیوں نے اس حدیث کو بیان کیا ہے۔ یہ کس قدر افسوسناک بات ہے کہ مخاطب جن ازواج نبی سے اپنی عقیدت کی نمائش کر رہے ہیں اور بظاہر جن کی خاطر علیؑ و فاطمہؑ و حسنؑ و حسینؑ کی عداوت پر تلے بیٹھے ہیں۔ ان ہی ازواج نبی پر دروغ گوئی کی تہمت لگا رہے ہیں اور ان کو حدیث کساء بیان کرتے رہنے کے جرم میں شیعہ بتا رہے ہیں۔ جو بیبیاں معترض کی منطق سے خاکم بدہن دروغ گو قرار پا رہی ہیں ان ہی کو آیۂ تطہیر کا موصوف نایا جا رہا ہے۔ ابنائنا نساءنا' انفسنا۔

آیۂ تطہیر کے لفظ اہل البیت کی تفسیر آیۂ مباہلہ (سورۃ آل عمران آیت 61) سے ہو رہی ہے

قدرت نے جن افراد اہل البیت کی مکمل تطہیر کا اعلان فرمایا ان ہی پاک و پاکیزہ ہستیوں کو مباہلۂ نصاریٰ میں ساتھ لیجانے کا نبیؐ کو حکم دیا اور ان ہستیوں کو ایسے واضح الفاظ میں یاد کیا جن سے ان کا اہل البیت ہونا ثابت ہو۔ ابنائنا' نسائنا' انفسنا یہ الفاظ اہل البیت کے سوا اور کس کے لئے کہے جاسکتے ہیں؟

ان ہی حضرات کے ساتھ آنحضرتؐ نصاریٰ پر غالب ہوئے چنانچہ حضرت ام سلمہ کے غلام ابو ریاح بیان کرتے ہیں کہ:۔

رسول اللہ نے فرمایا کہ اگر اللہ تعالیٰ کو علم ہوتا کہ روئے زمین پر علیؑ ' فاطمہؑ ' حسنؑ اور حسینؑ سے کوئی زیادہ عزت والے بندے ہیں تو اللہ تعالیٰ مجھے ضرور حکم دیتا کہ میں ان کو لے جا کر مباہلہ کروں۔ لیکن اللہ تعالی نے مجھے ان ہی حضرات کے ساتھ جا

کر مباہلہ کا حکم دیا۔ یہ لوگ تمام مخلوق سے افضل ہیں اور ان ہی حضرات کے ساتھ میں نصاریٰ پر غالب ہوا۔

(دیکھئے ینابیع المودۃ باب 56 مودت 2 و مودۃ القربیٰ سید علی بن شہاب ہمدانی)

آنحضرتؐ نے موصوفین آیۂ تطہیر کو ہر طریقہ سے بار بار پہچنوایا

1۔ آنحضرتؐ نے بار بار ان چاروں افراد (علیؑ فاطمہؑ حسنؑ و حسینؑ) کو اپنی چادر میں لے کر اور آیۂ تطہیر کی تلاوت فرما کر اور بارگاہ قدس میں یہ عرض کر کے اللھم ھولاء اھل بیتی ظاہر کیا کہ مخاطبین آیۂ تطہیر یہی ہیں۔ آنحضرتؐ کا ان حضرات کو چادر میں لینے کا واقعہ کئی مرتبہ کا ہے۔ چنانچہ صاحب ینابیع المودۃ نے باب 33 میں علامہ محبّ الدین طبری (جن کی کتاب ذخائر العقبیٰ اور کتاب ریاض النضرہ مشہور کتابیں ہیں) کا یہ قول بیان کیا ہے۔

فرماتے ہیں :۔

محبّ الدین طبری نے کہا ہے کہ آنحضرت کا ان حضرات (علیؑ فاطمہؑ حسنؑ و حسینؑ) کو چادر میں لینے کا جو مشہور واقعہ ہے۔ یہ واقعہ کئی بار صادر ہوا ہے۔ ایک مرتبہ جناب ام سلمہ کے گھر میں دوسری مرتبہ جناب فاطمۃ الزھراء کے گھر میں۔

2۔ مباہلۂ نصاریٰ کے موقع پر آیۂ تعالوا ندع ابنائنا کا نزول ہوا تو آنحضرتؐ نے علیؑ و فاطمہؑ و حسنؑ و حسینؑ کو بلا کر کہا اللھم ھولاء اھل بیتی

چنانچہ صاحب ''سفینۂ نجات'' نے بیان کیا ہے کہ صحیح مسلم جزء چہارم باب فضائل امیر المومنین میں حضرت سعد بن وقاص صحابی مشہور کا بیان ہے کہ آنحضرت پر جب آیۂ فقل تعالوا ندع ابنائنا نازل ہوا تو آنحضرت نے علیؑ و فاطمہؑ و حسنؑ و حسینؑ کو بلایا اور کہا : اللھم ھولاء اھل بیتی بعینہ یہی حدیث رسول حضرت سعد بن وقاص کی زبانی صاحب ینابیع المودۃ نے بھی باب 56 مودت 2 میں بیان کی ہے۔ نیز مودۃ القربیٰ میں بھی سید علی ہمدانی نے بیان کی ہے۔

3۔ آنحضرتؐ نے ان حضرات کو بار بار اپنی چادر میں لے کر آیۂ تطہیر پڑھ کر اللھم ھولاء اھل بیتی کہہ کر تو ظاہر کیا تھا کہ مخاطب آیۂ تطہیر یہی حضرات ہیں۔ لیکن سرکار رسالت نے اسی پر اکتفاء نہ فرمائی بلکہ آیۂ تطہیر کے نزول کے بعد مہینوں یہ اہتمام فرمایا کہ آپ نماز صبح کے لئے اپنے مصلے پر جانے سے پہلے در فاطمہ زہراؑ پر تشریف لاتے تھے اور فرماتے تھے کہ اے اہل البیت تم پر اللہ کی رحمت و برکت ہو نماز ادا کرو پھر اس آیت سے تخاطب فرماتے تھے۔ **انما یرید اللّٰہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت و یطھرکم تطھیرا۔**

چنانچہ کتاب موطائے امام مالک بن انس میں خود امام مالک نے اپنے باپ انس بن مالک (صحابی و خادم رسول) کی زبانی بیان کیا ہے کہ جب آیۂ تطہیر نازل ہوا تو آنحضرتؐ تقریباً چھ ماہ تک صبح کی نماز کے لئے جاتے ہوئے درخانۂ فاطمہؑ پر آ کر کہتے تھے :۔

الصلٰوۃ یا اھل البیت انما یریداللّٰہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت و یطھرکم تطھیرا

یہ روایت صحیح ابی داؤد میں بھی انس بن مالک سے بیان کی گئی ہے۔

صاحب ینابیع المودۃ نے بھی کتاب ذخائر العقبٰی (محبّ الدین طبری) سے نمبر 42 پر اس حقیقت کو بیان کیا ہے جس کے الفاظ اردو ترجمہ میں یہ ہیں۔

"انس روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ چھ ماہ تک جناب فاطمہ کے دروازے پر نماز صبح کی خاطر گزر فرماتے رہے اور فرماتے تھے اے اہل بیت **انما یریداللّٰہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت ویطھرکم تطھیرا**۔ نماز ادا کرو"

پھر اسی کتاب میں نمبر 43 پر مندرج ہے۔

ابو الحمرا (صحابی رسولؐ) نے بھی اسی طرح حدیث کو بیان کیا ہے مگر انہوں نے چھ ماہ کے بجائے نو ماہ بیان کئے ہیں"۔

پھر اسی کتاب (ینابیع المودۃ) میں باب 33 کی ساتویں حدیث کا مضمون یہ

ہے۔

''امام احمد بن حنبل اور ابن ابی شیبہ نے انس بن مالک سے روایت کی ہے کہ جب رسول اللہ جناب فاطمہ کے دروازے سے صبح کی نماز کے لئے گزرتے تھے تو فرمایا کرتے تھے۔اے اہل بیت اللہ تم پر رحمت نازل کرے نماز کا وقت قریب آگیا ہے۔آپ تین مرتبہ ایسا فرمایا کرتے تھے اور چھ ماہ حضرت کا یہی معمول رہا''۔

مخاطب اور ان کے ہم نوا بتائیں کہ ان راویوں میں سے کونسا راوی ہے جس کو وہ جھوٹا اور شیعہ کہہ سکتے ہیں۔اور ساتھ ساتھ یہ بتائیں کہ اس حقیقت کے اظہار کے لئے آنحضرت ؐ نے کونسی کسر اٹھار کھی؟ کیا اظہار حقیقت اور تعین اہل بیت کے لئے اس سے بھی زیادہ کوئی صورت ہو سکتی تھی اس کے بعد یہی کہا جا سکتا ہے۔

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم
چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

آیۂ تطہیر کا لفظ اہل البیت اور آیۂ مباہلہ کا لفظ نسائنا

اگر لفظ اہل البیت کی لغوی حیثیت کو دیکھ کر اس لفظ میں ازواج نبی ؐ کو شامل سمجھا جاتا ہے تو آیۂ مباہلہ کے لفظ نسائنا میں کیوں ان کو داخل نہیں کیا جاتا حالانکہ قرآن کریم میں یا نساء النبی کہہ کر ازواج نبی ؐ کو ہی پکارا گیا ہے۔لیکن اس کے باوجود آیۂ مباہلہ کے لفظ نسائنا میں ازواج نبی کو کسی نے نہ بتایا اور کسی نے بھی نہ کہا کہ اس حکم خدا کی تعمیل میں سرکار ؐ اپنی ازواج کو بھی مباہلہ میں لے گئے تھے۔

کیا کوئی مسلمان یہ خیال بھی دل میں لا سکتا ہے کہ اللہ نے نسائنا کہہ کر مباہلے میں ازواج کو لے جانے کا حکم دیا تھا۔اور سرکار نے ازواج کو چھوڑ کر صرف بیٹی کو ساتھ لیا۔معاذاللہ من ذالك حقیقت یہ ہے کہ کلام الہی کا مفہوم نبی سے بہتر کوئی نہیں سمجھ سکتا نسائنا سے مرادِ الٰہی آپ کی بیٹی ہی تھی ازواج نہ تھیں۔اسی طرح آیۂ تطہیر میں اہل البیت سے مرادِ الٰہی علیؑ فاطمہؑ حسنؑ حسینؑ ہی تھے جن کو سرکار نے چادر میں

لیااور ازواج میں سے جس نے آنا چاہا اس کو روک دیا۔

قادیانی مضمون نگار نے علیؑ فاطمہؑ حسنؑ حسینؑ کے اہل بیت نبی ہونے سے انکار کر کے صدہا نبوی ارشادات کی تکذیب کی

بطور نمونہ ہم چند احادیث نبویہ کو دکھاتے ہیں جن میں سرکارؐ نے ان حضرات کو اہل بیت فرمایا ہے۔

1۔ عن انس بن مالك قال بعث النبیؐ ببرائة مع ابی بکر ثم دعاه فقال لاینبغی ان یبلغ هذا الا رجلا من اهلی فدعا علیا و اعطاه ایاه۔

اس حدیث کو صحیح ترمذی کے حوالے سے ینابیع المودۃ باب 18 اور اسوۃ الرسول صفحہ 308 پر بیان کیا گیا ہے۔

یعنی انس بن مالک نے بیان کیا کہ آنحضرتؐ نے حضرت ابو بکر کو سورۂ برأت دے کر بھیجا۔ اس کے بعد فرمایا کہ اس کو مناسب نہیں ہے کہ اس شخص کے علاوہ جو میرے اہل بیت سے ہو کوئی اور پہنچائے۔ پس آپ نے علی کو بلایا اور صرف ان کو وہ سورہ دیا۔

2۔ پھر اسی حدیث کو انہی امام نسائی کے حوالہ سے بیان کیا

عن انس بن مالك قال بعث النبی ببرائة مع ابی بکر ثم دعاه فقال لاینبغی ان یبلغ هٰذا الا رجل من اهلی فدعا علیاً و اعطاه ایاه۔

انس بن مالک کا بیان ہے کہ آنحضرت نے حضرت ابو بکر کو سورۃ برأت دے کر بھیجا پھر ان کو واپس بلا لیا۔ اور فرمایا کہ اس کو میرے اہل کے سوا کوئی اور نہیں پہنچا سکتا پس آپ نے علیؑ کو بلا کر خاص ان کو وہ سورہ دیا۔

نوٹ:۔ ہر حدیث کو دیکھتے وقت ناظرین اس پر نظر رکھیں کہ معترض کا قول ہے کہ اہل بیت کے معنی ہیں ازواج کے اور اہل کے معنی ہیں wife

3۔ پھر اسی حدیث کو انہی امام نسائی کے حوالے سے مندرجہ ذیل عبارت میں بیان

کیا گیا ہے۔

ان رسول اللّٰہ بعث ببرائة الی اهل مكة مع ابی بكر ثم اتبعه بعلی فقال له خذ الكتاب فامض به الیٰ اهل مكة قال فلحقته و اخذ الكتاب منه فانصرف ابوبكر وهو كسئيبٌ فقال يا رسول اللّٰه انزل فی شی قال لا الا انیّ امرت ان ابلغه انا او رجل من اهل بيتی

یعنی رسول اللہ نے حضرت ابو بکر کو سورہ برأت دے کر اہل مکہ کی طرف بھیجا کچھ عرصہ بعد ان کے پیچھے علی کو روانہ کیا اور حکم دیا کہ ابو بکر سے وہ نوشتہ لے کر تم اہل مکہ کی طرف جاؤ علی نے بیان کیا کہ میں ابو بکر سے چل کر مل گیا اور ان سے وہ نوشتہ لے لیا۔ پس حضرت ابو بکر رنجیدہ ہو کر واپس آئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ کیا میرے بارے میں کوئی چیز نازل ہوئی ہے؟ آنحضرتؐ نے فرمایا اور تو کچھ نہیں نازل ہوا مگر مجھے حکم دیا گیا ہے کہ اس کو یا تو میں خود پہنچاؤں یا وہ شخص پہنچائے جو میرے اہل بیت سے ہو۔

4۔ پھر عمدۃ القاری شرح صحیح بخاری سے اسی واقعہ کو الفاظ ذیل میں بیان کیا گیا ہے۔ جس کے آخری جملے لکھے جاتے ہیں۔

ثم اردف بعلی فخرج ابوبكر ابی النبی فقال هل نزل فی قران قال لاولكن اردت ان يبلغ عنی من هو من اهل بيتی۔

یعنی پھر آنحضرتؐ نے حضرت ابو بکر کے پیچھے علی کو روانہ کیا حضرت ابو بکر نبیؐ کی طرف آئے اور پوچھا کہ کیا میرے بارے میں کوئی قرآنی آیت آئی ہے۔ آنحضرت نے فرمایا کہ نہیں لیکن میں نے چاہا کہ میری طرف سے وہ پہنچائے جو میرے اہل بیت سے ہو۔

5۔ پھر اسوۃ الرسول جلد سوئم صفحہ 213 پر تاریخ ابن کثیر شامی اور صحیح ترمذی کے حوالہ سے بیان کیا ہے۔

قال الامام احمد حدثنا غفان حدثنا حماد عن سماكٍ عن انس بن مالك انّ رسول اللّٰہؐ بعث ببرائة مع ابی بکر فلمّا بلغ ذالحلیفة قال لایبلّغها الا انا اورجلٌ من اهل بیتی فبعث بها مع علی بن ابی طالب وقد رواه الترمذی۔

یعنی انس بن مالک نے بیان کیا کہ رسول اللہ نے سورۂ برأت دے کر ابو بکر کو بھیجا۔ جب ابو بکر مقام ذوالحلیفہ پہنچے تو آنحضرت نے فرمایا کہ سورۂ برأت کو میرے یا اس مرد کے سوا جو میرے اہل بیت سے ہے کوئی نہیں پہنچا سکتا۔ پس آپؐ نے سورۂ برأت دے کر علی بن ابی طالبؑ کو بھیجا۔ اس واقعہ کو ترمذی نے بھی بیان کیا ہے۔

6۔ حمید بن عبداللہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ کی خدمت میں علی علیہ السلام کے صادر کردہ ایک فیصلہ کا ذکر ہوا رسول اللہ نے اس فیصلہ کو نہایت پسند فرمایا اور کہا کہ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے جس نے ہم اہل بیت میں حکمت کو ودیعت کیا۔ (ینابیع المودۃ باب 14 حدیث 52)

7۔ آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا

اثبتکم علی الصراط اشدّ کم حبّا لاهل بیتی (ینابیع المودۃ باب 56 از کنوز الدقائق)

یعنی صراط حشر پر زیادہ سے زیادہ ثابت قدم وہ ہوگا جو میرے اہل بیت سے زیادہ سے زیادہ محبت رکھتا ہوگا۔

8۔ آنحضرتؐ نے فرمایا:

احبّ اهل البیت الحسن والحسین۔ للطبرانی (ینابیع المودۃ باب 56 حدیث 4)

یعنی مجھے اہل بیت میں سب سے زیادہ پیارے ہیں حسنؑ و حسینؑ۔

9۔ آنحضرتؐ نے فرمایا:

من آذانی فی اهل بیتی فقدا ذی الله۔ (ینابیع المودۃ حدیث 105)
یعنی جس نے میرے اہل بیت کے بارہ میں مجھے اذیت دی اس نے اللہ کو اذیت دی۔

10۔ آنحضرت نے فرمایا:
المهدی طاوس اهل الجنة المهدی منا اهل البیت یصلح له الله فی لیلة واحدة۔ رواہ الاحمد' (ینابیع المودۃ)
یعنی مہدی اہل جنت کے لئے زینت ہیں۔ مہدی ہم اہل بیت سے ہے۔ اللہ ایک رات میں اس کے لئے سامان درست کردے گا۔ اس روایت کو امام احمد نے بیان کیا ہے۔

11۔ المهدی من ولد فاطمة۔ (ینابیع المودۃ)
سرکارؐ نے فرمایا کہ مہدی فرزندانِ فاطمہ سے ہے۔

12۔ نحن اهل البیت لا یقاس بنا احد۔ (ینابیع المودۃ)
آنحضرتؐ نے فرمایا ہم اہل البیت کے برابر کوئی نہیں ہو سکتا۔

13۔ خطیب بغدادی نے حضرت علیؑ سے روایت کی ہے کہ شفاعت کرنے والی بروز قیامت پانچ چیزیں ہیں۔ (۱) قرآن (۲) صلہ رحمی (۳) امانت (۴) تمہارا نبی (۵) نبی کے اہل بیت (ینابیع المودۃ میں یہ حدیث الجامع الصغیر علامہ جلال الدین سیوطی کے حوالے سے بیان کی گئی ہے۔

14۔ بزاز اور طبرانی قرۃ المزنی سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ نے فرمایا تم لوگ ضرور زمین کو ظلم و ستم سے بھر دو گے پھر ضرور ایک مرد میرے اہل بیت سے نکلے گا جو زمین کو عدل و انصاف سے بھر دے گا جس طرح وہ ظلم وجور سے بھری ہو گی۔ (ینابیع المودۃ)

15۔ ابن عباس سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا کہ اگر زمانہ کا صرف ایک دن بھی باقی رہ جائے گا تو ضرور اللہ تعالیٰ میرے اہل بیت سے ایک مرد کو

مبعوث کرے گا جو زمین کو عدل وانصاف سے بھر دے گا جس طرح وہ ظلم و جور سے بھری ہوگی۔ (ینابیع المودۃ)

16۔ ترمذی نے انس بن مالک سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا کہ مہدی میری اولاد سے ہوگا جو فاطمہ کے فرزندوں میں سے ہوگا۔ (ینابیع المودۃ)

17۔ ابوداؤد، ابن ماجہ اور حاکم نے ام سلمہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا مہدی ہم اہل بیت سے ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اس کے انتظامات کو ایک رات میں درست کردے گا۔

18۔ رسول اللہ نے فرمایا میں تم لوگوں میں دو چیزیں چھوڑنے والا ہوں اگر ان کا دامن پکڑو گے تو ہرگز ہرگز گمراہ نہ ہوگے۔ ایک ان میں سے دوسری سے بڑی ہے وہ کتابِ خدا ہے وہ مضبوط رسی کی طرح آسمان سے لے کر زمین تک کھچی ہوئی ہے۔ دوسری چیز میری عترت ہے جو میرے اہل بیت ہیں۔ یہ ایک دوسرے سے اس وقت تک جدا نہ ہوں گے حتیٰ کہ میرے پاس حوضِ کوثر پر پہنچیں گے۔ دیکھو ان کے بارے میں میرا کیا لحاظ رکھتے ہو۔ (ینابیع المودۃ از ذخائر العقبیٰ امام محب الدین طبری)

قولِ مولف ان (اہل بیت) کے بارہ میں نبیؐ کا لحاظ یہ رکھا جارہا ہے کہ ان کی محبت واطاعت تو کجا ان کی امامت وولایت کا اقرار تو درکنار اُن کے اہل بیتِ نبیؐ ہونے سے بھی انکار ہے۔

19۔ زید بن ارقم صحابیٔ رسولؐ نے بیان کیا کہ رسول اللہ نے فرمایا اور کھڑے ہو کر خطبہ دیا اللہ کی حمد وثنا بیان کی پھر فرمایا کہ اے لوگو! میں ایک انسان ہوں عنقریب میرے پاس رب عزوجل کی طرف سے بلاوا آجائے گا۔ اور میں اس کو قبول کروں گا۔ میں تم میں دو گراں قدر چیزیں چھوڑنے والا ہوں۔ پہلی چیز کتابِ خدا ہے جو ہدایت اور نور پر مشتمل ہے۔ کتابِ خدا کو مضبوطی سے پکڑو اور اس پر عمل کرو.......... دوسری چیز میرے اہل بیت ہیں۔ تین بار فرمایا کہ

میں تمہیں اپنے اہل بیت کے متعلق نیک سلوک کرنے کے بارے میں اللہ تعالیٰ کو یاد دلاتا ہوں۔ آپؐ سے دریافت کیا گیا کہ زید آپ کے اہل بیت میں شامل ہیں۔ فرمایا کہ میرے اہل بیت وہ ہیں جن پر صدقہ حرام ہے۔ (ینابیع المودۃ)

20۔ ابو سعید خدری صحابی ؑرسول کہتے ہیں کہ رسول اللہ نے فرمایا عنقریب میرے پاس بلاوا آجائے گا اور میں اس کو قبول کروں گا میں تم میں دو گرانقدر چیزیں چھوڑنے والا ہوں۔ اللہ کی کتاب جو ایک مضبوط رسی کی طرح آسمان سے زمین تک کھچی ہوئی ہے اور میری عترت جو میرے اہل بیت ہیں مجھے لطیفِ خبیر نے خبر دی ہے کہ یہ دونوں جدا نہ ہوں گے حتیٰ کہ میرے پاس حوض کوثر پر وارد ہونگے۔ دیکھو ان کے بارے میں میرا کیا لحاظ رکھتے ہو۔ اس حدیث کو امام احمد بن حنبل نے بھی مسند میں بیان کیا ہے۔ (ینابیع المودۃ)

21۔ عبدالعزیز نے بیان کیا کہ نبی نے فرمایا کہ ہر زمانے میں میری امت میں میرے اہل بیت میں سے عدل وانصاف کرنے والے افراد موجود ہوں گے۔ (ینابیع المودۃ)

22۔ حضرت علیؑ نے بیان کیا کہ رسول اللہ نے فرمایا کہ ستارے آسمان والوں کے لئے امان ہیں۔ جب ستارے ختم ہو جائیں گے تو آسماں والے بھی ختم ہو جائیں گے۔ میرے اہل بیت زمیں والوں کے لئے امان ہیں اگر میرے اہل بیت ختم ہو جائیں گے تو زمین والے بھی ختم ہو جائیں گے۔ (ینابیع المودۃ)

23۔ عبداللہ بن منصور نے بیان کیا کہ رسول اللہ نے فرمایا ہم لوگ اہل بیت ہیں۔ اللہ نے ہمارے لئے دنیا کے مقابلے میں آخرت کو پسند کیا ہے۔ میرے بعد عنقریب میرے اہل بیت تکلیف اور مصائب میں گرفتار ہوں گے اور شہروں میں مارے مارے پھریں گے۔ (ینابیع المودۃ)

24۔ حضرت علیؑ نے بیان کیا کہ رسول اللہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اس شخص پر

جنت کو حرام قرار دیا ہے جس نے میرے اہل بیتؑ پر ظلم کیا۔ ان سے جنگ کی یا ان پر غارت گری کی یا ان کو گالیاں دیں۔ (ینابیع المودۃ)

25۔ ابو الحمراء (صحابی رسول) نے بیان کیا کہ آیۂ تطہیر کے نزول کے بعد ۹ ماہ تک سرکار رسالت کو فریضہ ءِ صبح ادا کرنے سے پہلے میں نے دیکھا کہ آپ فاطمۃ الزہراؑ کے دروازے پر بعد سلام فرماتے تھے انما یرید اللّٰہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت ویطھرکم تطھیراً۔ (یہ ذکر ینابیع المودۃ میں بھی ہے اور اس کے علاوہ جا بجا مذکور ہے)

26۔ ابن عباس سے روایت ہے کہ جب آیۂ قل لا اسئلکم علیہ اجراً الا المودۃ فی القربیٰ نازل ہوا تو لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ وہ کون لوگ ہیں جن کے ساتھ محبت رکھنا ہم پر فرض ہے؟ فرمایا علیؑ فاطمہؑ اور ان کے دونوں فرزند۔ اللہ تعالیٰ نے میرا اجر تم پر یہ مقرر کیا ہے کہ تم میرے اہل بیت سے محبت رکھو۔ کل بروز قیامت میں تم سے ان کے بارے میں سوال کروں گا۔ (ینابیع المودۃ وغیرہا)

27۔ امام حسنؑ نے اپنے خطبہ میں فرمایا:

نحن حزب اللّٰہ المفلحون وعترۃ رسول اللّٰہ واھل بیتہ الطاھرون الطیبون۔

یعنی ہم اللہ کا وہ گروہ ہیں جو نجات یافتہ ہے۔ ہم رسول اللہ کی عترت اور رسول اللہ کے طیب و طاہر اہل بیت ہیں۔ (ینابیع المودۃ از مروج الذہب مسعودی)

28۔ صحیح مسلم اور صحیح ترمذی نے سعید بن وقاص سے روایت کی ہے کہ جب آیۂ مباہلہ فقل تعالوا ندع ابنائنا وابنائکم الخ نازل ہوا تو رسولؐ اللہ نے علیؑ فاطمہؑ حسنؑ و حسینؑ کو بلایا اور کہا اے میرے اللہ یہ میرے اہل بیت ہیں۔ (ینابیع المودۃ مترجم ص66)

29۔ یہی روایت بعینہ سعد بن وقاص مشہور صحابیٔ رسول سے بھی مروی ہے۔

(ینابیع المودۃ ص 386)

30۔ جامع ترمذی نے حضرت ام سلمہ سے حدیث کساء کو بیان کر کے کہا ہے کہ اس حدیث کی صحت میں شبہ نہیں ہے۔ (ینابیع المودۃ)

31۔ امام حاکم نے بھی اسی حدیث کساء کو مستدرک میں بیان کر کے کہا ہے یہ حدیث صحیح ہے۔ (ینابیع المودۃ)

32۔ امام احمد بن حنبل نے مسند میں اسی حدیث کساء کو کئی طریقوں سے ام سلمہ زوجہ نبیؐ کی زبانی بیان کیا ہے۔

33۔ علامہ طبرانی نے معجم میں روایت کی ہے کہ آیۂ تطہیر انہی پانچ افراد (محمدؐ، علیؑ فاطمہؑ، حسنؑ حسینؑ) کی شان میں نازل ہوا ہے۔

علماء اور آئمہ اہل سنت نے ہمیشہ لفظ اہل بیت ان ہی حضرات کے لئے استعمال کیا ہے

ارشادات نبویہ بطور نمونہ ہم دکھا چکے ہیں۔ اب علماء کرام کے بھی چند کلمات پیش کئے دیتے ہیں۔ جن سے ثابت ہے کہ لفظ اہل بیت آنخضرت کے ان ہی نسبی قرابت داروں کے لئے علماء اور آئمہ اہل سنت نے جا بجا استعمال کیا ہے چنانچہ امام شافعی جو آئمہ اربعہ اہل سنت میں سے ایک امام ہیں۔ جا بجا ان ہی حضرات (علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ حسینؑ) کو اہل بیت نبیؐ کہتے ہیں۔ ان کے اشعار مندرجہ ذیل مشہورِ عالم ہیں۔ صاحب ینابیع المودۃ نے بھی کتاب معراج الوصول فی معرفت آلِ الرسول سے امام شافعی کے یہ اشعار بیان کئے ہیں۔

یا اهل بیت رسول الله حُبّکمُ
فرض من الله فی القران انزله

اے رسول اللہ کے اہل بیت آپ حضرات کی محبت اللہ کی جانب سے فرض ہے اس قرآن میں جس کو اس نے نازل کیا۔

کفاکم من عظیم القدر انکم
من لم یصل علیکم لاصلوٰة له

آپ کے عظیم مراتب میں سے آپ کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ جس نے آپ پر درود نہ بھیجا اس کی نماز ہی نہیں۔

امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری مشاہیر علماء اہل سنت سے ہیں۔ جو فقہ، تفسیر، تاریخ اور حدیث ان تمام فنون میں امام اور مجتہد مانے جاتے ہیں اور بقول علامہ شبلی یہ بزرگوار اہل سنت کے امام اعظم وغیرہ چار مشہور مجتہدین کے ساتھ درجۂ اجتہاد پر فائز مانے جاتے ہیں۔ امام مذکور نے اپنی تاریخ (طبری) میں جنگ حنین کے سلسلہ میں لکھا ہے:

انه بقی مع رسول الله نفر من المهاجرین والانصار و اهل بیته وممن ثبت معه من اهل بیته علی بن ابی طالب والعباس بن عبدالمطلب وابنه الفضل الخ۔

یعنی جنگ حنین میں رسول اللہ کے ساتھ چند نفر مہاجرین انصار اور آنحضرت کے اہل بیت سے باقی رہ گئے تھے۔ آگے چل کر کہتے ہیں کہ آنحضرت کے اہل بیت میں سے جو لوگ ثابت قدم رہے وہ علیؑ بن ابی طالب ہیں اور عباسؓ بن عبدالمطلب (عم رسولؐ ہیں) اور عباسؓ (عم رسول) کے فرزند فضلؓ بن عباسؓ وغیرہ ہیں۔ (طبری مطبوعہ جرمن ص 1661 از اسوۃ الرسول)

کیا اب بھی کوئی جرأت کر سکتا ہے یہ کہنے کی کہ اہل بیت کے معنے صرف ازواج کے ہیں؟

کیا اب بھی کوئی جرأت کر سکتا ہے یہ کہنے کی کہ آیۂ تطہیر پنجتن پاک کے علاوہ ان کے غیر کے حق میں آیا؟

وآخر دعوٰنا ان الحمدللّٰه رب العالمین
والصلوٰة والسلام علی خیر خلقه محمد
وآله الطاهرینO

☆☆☆☆☆

حیات حضرت عیسیٰ مسیح علیہ السلام

ہر مسئلہ کا ثبوت قرآنِ حکیم سے طلب کرنا اس مسلک و ملت سے تو جا ہو سکتا ہے جس کا یہ دعویٰ ہو کہ تنہا قرآن کافی ہے اور قرآن ہر مسئلے کو تنہا حل کر سکتا ہے اور اس کے ساتھ حدیثِ معصوم کا ضمیمہ کوئی ضروری چیز نہیں ہے۔ لیکن شیعہ مسلک یہ ہرگز نہیں ہے کہ تنہا قرآن کافی ہے ہمارا تو دعویٰ یہ ہے کہ اکیلا قرآن کافی نہیں ہے جب تک کہ اس کی شرح اور اس کا بیان زبانِ معصوم سے نہ ہو۔ یہ کیسی غلط بات ہے کہ کوئی شخص اپنے مسلک کا ثبوت ان لوگوں سے چاہے جو خود اس مسلک کو غلط سمجھتے ہوں یعنی مسلک تو ہو خود آپ کا اور اس کو ثابت کریں ہم۔ قرآنِ کریم سے ہر مسئلہ کو حل کرنا تو فرض اُن کا ہے جو ضمیمۂ حدیث کے بغیر تنہا قرآن کریم کے کافی ہونے کے مدعی ہیں اور اس دعوے میں خود فرقہ احمدی بھی داخل و شامل ہے۔ یہ کتنی الٹی بات ہے کہ دعویٰ آپ کا اور اس کا بارِ ثبوت ان پر جو اس دعوے کو غلط سمجھتے ہیں۔ ہم سے یہ مطالبہ تو صحیح ہو سکتا ہے کہ قرآن کریم سے ثابت کرو کہ تنہا قرآن کافی نہیں ہے اور اس کے ساتھ ضمیمہ حدیث ضروری ہے اگر ہم سے یہ مطالبہ ہو تو ہم قرآنِ کریم کی ایک ایک آیت سے ثابت کر کے دکھا دیں گے کہ آیات متشابہات تو ہیں ایک طرف' آیات محکمات بھی حدیثِ معصوم سے بے نیاز نہیں ہو سکتیں۔ قرآنِ کریم جس کو سورہ یاسین میں ذکر کہا گیا ہے اس نے کہاں کہا ہے کہ جس کو جو پوچھنا ہو وہ قرآن (ذکر) سے پوچھ لے۔ قرآن کریم نے کہا یہ ہے کہ **"فاسئلوا اهل الذکر ان کنتم لاتعلمون"** جبکہ تم نہیں جانتے ہو تو جو ذکر کے یعنی قرآن کے اہل ہیں ان سے پوچھو۔ قرآن کریم

تو صاف کہہ رہا ہے مایعلم تاویلہ الا اللّٰہ والراسخون فی العلم" یعنی قرآن کی تاویل کوئی نہیں جانتا سوائے اللہ کے اور ان کے جو علم میں پختہ ہیں۔ ظاہر ہے کہ راسخون فی العلم سے مراد حضرات محمدؐ و آلِ محمدؐ کے سوا اور کون ہو سکتا ہے۔ قرآن کریم نے تو باوجودیکہ وہ رسالتِ رسول کی شہادت دے رہا ہے لیکن وہ (قرآن) خود کو نبیؐ کی شہادت کے لیے کافی نہیں کہتا بلکہ یہ کہتا ہے کہ رسولؐ کہہ دو کہ اے انکار کرنے والو میرے اور تمہارے درمیان میں میری شہادت کے لیے کافی ہے۔ اللہ اور وہ جس کے پاس علم ہے کتاب کا۔ ہم سے تو آپ کا یہ مطالبہ بالکل غلط ہے کہ یہ مسئلہ قرآن سے ثابت کیجئے اور وہ مسئلہ قرآن سے ثابت کیجئے۔ ہم نے تو تنہا قرآن کو کبھی کافی کہا ہی نہیں۔ یہ دعویٰ تو آپ کا ہے لہذا ہم آپ سے یہ مطالبہ کر سکتے ہیں کہ قرآنِ کریم سے ثابت کیجئے کہ نمازیں روزانہ پانچ ہیں اور ہر نماز کی رکعتیں اتنی ہی ہیں جتنی کہ پڑھی جا رہی ہیں۔ آپ قرآنِ کریم کی روشنی میں صرف کسی ایک نماز کی ترتیب اور اجزاء ثابت کر کے دکھائیں۔ آپ قرآن کریم سے ثابت کریں کہ زکوٰۃ کس کس نقد و جنس پر ہے اور کتنی نقدی اور جنس پر ہے۔ اور نقدی پر کتنی مدت گزر جانے کے بعد ہے اور نقد و جنس پر جو زکوٰۃ ہے اس کی مقدار کیا ہے یعنی نقدی اور جنس کا کتنا حصہ زکوٰۃ میں دینا ہے۔ آپ قرآن سے ثابت کیجئے کہ کتا، بلی، ہاتھی وغیرہ حرام ہیں بلکہ قرآن کریم سے ثابت کیجئے کہ خنزیر کی چربی، ہڈی اور کھال غرض کہ وہ تمام چیزیں جو گوشت کے سوا ہیں وہ بھی خنزیر کے گوشت کی طرح حرام ہیں کیونکہ قرآن کریم نے صرف خنزیر کے گوشت کو حرام کہا ہے۔ چربی، ہڈی، کھال اور دوسری چیزوں کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ جن لوگوں نے قرآن کو تنہا کافی سمجھا وہ آہستہ آہستہ ہر پرندہ کو ہر چوپائے اور ہر دریائی جانور کو حلال قرار دیتے رہے۔ کسی نے کسی چیز کو حلال کہہ دیا، کسی نے کسی چیز کو، یہاں تک کہ کسی نے تمام فتوؤں کو یکجا کر کے آخر یہ کہہ دیا کہ اب چوپایوں میں فقط ایک چارپائی حرام رہ گئی اور دریائی چیزوں میں صرف ایک کشتی حرام رہ گئی اور ہوائی چیزوں میں جو اڑا کرتی ہیں صرف ایک پتنگ (گڈی) حرام ہے۔ باقی سب حلال ہیں۔ کتنے افسوس کی

بات ہے کہ جس چیز کو آپ ماننا نہیں چاہتے اس کا ثبوت قرآن سے مانگتے ہیں۔ وہاں حدیث کوئی چیز نہیں اور جہاں آپ خود کچھ طے کیے بیٹھے ہیں وہاں قرآن لاکھ آپ کے خلاف کہے اس کی آپ ایک نہیں سنتے۔ وہاں آپ نام نہاد احادیث کا سہارا لیتے ہیں اس وقت حسبنا کتاب اللہ کو بالکل بھول جاتے ہیں۔ ایمان سے کہیے کہ صدیقہ طاہرہ جناب فاطمہ زہراؑ کا دعویٰ میراثِ پدر کس آیتِ قرآنی کی رو سے خارج کیا گیا۔ قرآنِ کریم کی کس آیت میں ہے کہ انبیاء کی میراث نہیں ہوتی۔ قرآن کریم تو آپ کے خلاف یہ بتا رہا ہے کہ انبیاء میراث پاتے بھی ہیں اور وارث بناتے بھی ہیں۔ ورث سلیمان داوٗد سلیمان اپنے باپ داوٗدؑ کے وارث ہوئے۔ جو وارث ہوا وہ بھی نبی ہے اور جس کا وارث ہوا وہ بھی نبی۔ یعنی نبی وارث ہوا بھی اور نبی نے وارث بنایا بھی۔

قرآنِ کریم تو نامِ محمدؐ لے کر صاف کہہ رہا ہے کہ وہ خاتم النبیین ہیں۔ پھر آپ ختمِ نبوت کا کیوں انکار کر رہے ہیں۔ یہاں آپ قرآن کریم کو بھول جاتے ہیں۔ ہم سے آپ کہتے ہیں کہ عیسیٰ کے آسمان پر ہونے کا قرآن سے ثبوت دیں۔ بندہ نواز آپ کو مرزا کے نبی ہونے کا کس قرآن سے ثبوت ملا ہے۔ آپ قرآن سے مرزا صاحب کی نبوت کا ثبوت کیوں نہیں دیتے؟ قرآنِ کریم تو احمدؐ کے نبی ہونے کی خبر دے رہا ہے نہ کہ کسی غلام احمد کی۔

عبرت کا مقام ہے کہ حضرت خلیفہ اول کی خلافت پر تو صرف معدودے چند حضرات کے متفق ہو جانے کو تو اجماع امت کہہ کر حجت قرار دے دیا جائے حالانکہ اس اجماع میں نہ تو بنی ہاشم شامل ہیں نہ سقیفہ میں انعقادِ بیعت کے وقت تمام صحابہ ہی ہیں نہ تمام مسلمان مدینہ اور دیگر مقامات کے ہیں لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں احمدی حضرات یہی رٹ لگائے جاتے ہیں کہ وہ طبعی موت مر چکے ہیں اور زندہ نہیں ہیں حالانکہ نصاریٰ سے اگر قطع نظر کر بھی لی جائے تو تمام مسلمانوں کا اس پر اجماع اور بلا استثناء سب کا اتفاق ہے کہ وہ زمین سے اٹھا لیے گئے ہیں اور زندہ ہیں۔ اور حضرت امام مہدیؑ کے تشریف لانے کے وقت نازل ہوں گے اور امام مہدیؑ کی

اقتداء میں نماز پڑھیں گے۔ اسی طرح تمام مسلمانوں کا اس پر اجماعِ کامل رہا ہے کہ حضرت محمد مصطفیٰ آخری نبی ہیں ان کے بعد قیامت تک کوئی نبی نہ ہوا ہے نہ ہو گا نہ ہو سکتا ہے لیکن احمدی حضرات جہاں اجماع کامل ہے اس سے انکاری ہیں اور جہاں نام نہاد اجماع ہے اور جس اجماع کی ابتداء ہی سے مخالفت رہی ہے اس کو مستند اور پختہ سمجھتے ہیں۔ اس طرز عمل کو ڈھٹائی نہ کہا جائے تو کیا دانائی کہا جائے۔

مرزا صاحب کے نام نہاد الہام سے پہلے دنیا میں کون تھا جو حضرت عیسیٰؑ کی طبعی موت کا قائل تھا۔ یہود ہوں یا نصاریٰ یا مسلمان حضرت عیسیٰ کی طبعی موت کا کوئی بھی قائل نہ تھا۔ اسلام اور نزولِ آیات قرآن سے پہلے یہود و نصاریٰ دونوں کا اس پر اتفاق تھا کہ حضرت عیسیٰ کو صلیب دی گئی اور قتل کیا گیا۔ اس مسئلے میں دونوں متفق تھے۔ فرق اتنا تھا کہ نصاریٰ قتل اور صلیب کے قائل ہونے کے ساتھ یہ کہتے تھے کہ قتل کے بعد اللہ نے ان کو دوبارہ زندہ کر کے آسمان پر اٹھالیا۔ قرآن نے اس واقعہ کو اس طرح بیان کیا کہ صلیب ضرور دی گئی اور قتل ضرور کیا گیا لیکن اسے جس کو عیسیٰ کا ہمشکل اور ہم صورت بنا دیا گیا تھا اور نہ عیسیٰ کو نہ صلیب پر چڑھایا گیا نہ قتل کیا گیا۔ اس کو تو اللہ اپنی طرف بلند کر چکا تھا۔ قرآنی جملے صاف بتا رہے ہیں کہ جس وقت ایک شخص کو عیسیٰ سمجھ کر صلیب پر چڑھایا گیا اور قتل کیا گیا اس سے پہلے پہلے اللہ تعالیٰ عیسیٰؑ کو اپنی طرف بلند کر چکا تھا۔ یہاں بلند کرنے سے موت مراد ہو ہی نہیں سکتی کیونکہ زمین پر رہتے ہوئے کسی کی موت کوئی مخفی چیز نہیں ہوتی۔ موت کے بعد جسم مردہ سب کے سامنے ہوتا ہے اگر عیسیٰؑ کی موت واقع ہو چکی ہوتی تو یہود کس کو سولی دے کر قتل کرتے۔ پھر لفظ رفع (بلند کرنا) جو دو جگہ قرآنِ مجید میں حضرت عیسیٰ کے لیے فرمایا گیا ہے۔ رافعك الیّ، بل رفعه الله الیه. یہ لفظ رفع موت کے لیے کہیں استعمال ہی نہیں ہوا۔ اب کسی کا یہ شبہ پیدا کرنا کہ یہاں لفظ سماء (آسمان) تو آیا ہی نہیں تو پہلے وہ بتائیں کہ سماء کہتے کس کو ہیں۔ لفظ سماء کے معنی خود بلندی ہی کے ہیں جیسا کہ فرمایا جاتا ہے۔ وانزل من السماء ماءً اللہ نے سماء سے پانی برسایا یعنی بلندی سے۔ ظاہر ہے کہ

بارش اور پانی بادلوں سے برستا ہے اور بادل زمین سے صرف اتنے اونچے ہوتے ہیں کہ پہاڑوں سے ٹکراتے ہیں۔ اس بلندی کو بھی سماء کہا گیا ہے اس سے ظاہر ہے کہ زمین کے اوپر جو بھی بلندی ہے وہ کم ہو یا زیادہ سب ہی سماء ہے پرندے جس اونچائی پر اڑتے ہیں اس کو بھی قرآن کریم نے فی جو السماء کہا ہے یعنی پرندے اونچی فضا میں اڑتے ہیں۔ جب سماء کے معنی ہی بلندی کے ہیں اور یہاں لفظ رفع آچکا ہے (بلند کرنا) تو اب لفظ سماء کی ضرورت ہی کیا تھی۔ معصومینؑ کے ارشادات جو قرآن کی شرح میں بکثرت موجود ہیں۔ قرآن کریم کا کام ہے اشارہ و کنایہ اور راسخون فی العلم کا کام ہے اس کی تصریح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اس آسمانی رفعت کی طرف قرآن کریم نے چار جگہ اشارے کیے ہیں سب سے پہلے اشارہ تو اس طرف خود حضرت عیسیٰؑ نے اپنے اس کلام میں فرمایا ہے کہ جو آپ نے گھوارہ میں کیا ہے۔ فرماتے ہیں انی عبداللّٰہ اتانی الکتاب وجعلنی نبیاً وجعلنی مبارکاً این ما کنت الخ یعنی میں بندۂ خدا ہوں اللہ نے مجھے کتاب (علم) عطا کیا ہے اور اس ہی نے مجھے نبی قرار دیا ہے اور اس نے مجھے بابرکت قرار دیا ہے جہاں بھی میں ہوں۔ یہاں یہ جملہ کتنا معنی خیز ہے کہ جہاں بھی میں ہوں بابرکت ہوں یعنی زمین پر ہوں تب بابرکت ہوں آسمان پر ہوں تب بابرکت ہوں' دوسرا اور تیسرا اشارہ مقامِ بلند کی طرف رافعك الی یعنی اے عیسیٰ میں تم کو اپنی طرف بلند کرنے والا ہوں۔ بل رفعه اللّٰہ الیه بلکہ عیسیٰ کو اللہ نے اپنی طرف بلند کر لیا۔ چوتھا اشارہ مطهرك من الذین کفروا۔ اے عیسیٰؑ میں تم کو اپنی طرف بلند کر کے کفار سے بالکل الگ تھلگ رکھوں گا۔ کیا ان ارشاداتِ قرآنیہ اور آیاتِ ربانیہ سے حضرت عیسیٰؑ کی زندگی کا اور ان کے فلک مقام ہونے کا پتہ نہیں چل رہا ہے اور اگر اب بھی کوئی ابہام اور اجمال رہتا ہے تو کیا اس ابہام کو دور کرنے کے لیے اور اجمال کی تفصیل کے لیے ارشادات محمدؐ و آل محمدؐ کافی نہیں؟

۱۔ ذخائر العقبیٰ: عن جابر بن عبداللّٰہ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم لاتزال طائفة من أمتی یقاتلون علی الحق حتیٰ

ینزل عیسیٰ بن مریم عند طلوع الفجر ببیت المقدس ینزل علیٰ المهدی فیقال تقدّم یا نبی الله صل بنا فیقول هذه الامّة أمراء بعضهم علی بعض أخرجه الا مام أبوعمرو عثمان بن سعید المقبری فی سنة" یعنی امام ابو عمرو عثمان بن سعید مقبری نے اپنی کتاب سنن میں جابر بن عبداللہ سے روایت کیا ہے کہ جابر نے کہا کہ رسول اللہ نے فرمایا کہ میری امت کا ایک گروہ حق پر قتال کرتا رہے گا یہاں تک کہ عیسیٰؑ بن مریم طلوعِ فجر کے وقت بیت المقدس میں نازل ہوں گے اور ان کا یہ نزول حضرت مہدیؑ پر ہوگا پس عیسیٰؑ سے کہا جائے گا کہ نبی خدا آپ آگے بڑھ کر ہم کو نماز پڑھائیے وہ کہیں گے کہ اس امت کے لیے امرا مقرر ہو چکے ہیں یہ منصب امت کے امیر کا ہے۔

۲۔ وعن کعب الاحبار (بعد ذکر الدجال)

فاذا عیسیٰ بن مریم علیه السلام قال فیقام فیرجع امام المسلمین المهدی فیقول عیسیٰ علیه السلام تقدم فلک اقیمت الصلوٰة فیصلی بهم تلك أخرجه الحافظ ابو عبدالله نعیم بن حماد فی کتاب الفتن" یعنی ابو عبداللہ نعیم بن حماد نے کتاب الفتن میں کعب الاحبار سے روایت کیا ہے جس میں پہلے تذکرہ ہے دجال کا بیت المقدس میں مسلمانوں پر سختی کرنے کا اور مسلمانوں کی انتہائی بھوک کا۔ پس ناگہاں عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کا نزول ہوگا اور امام المسلمین حضرت مہدیؑ کی رجعت ہوگی پس عیسیٰ علیہ السلام حضرت مہدیؑ سے کہیں گے کہ امامتِ نماز کے لیے آپ آگے بڑھیے کیونکہ یہ نماز آپ ہی کے لیے قائم کی گئی ہے پس حضرت مہدیؑ نماز پڑھائیں گے۔

۳۔ قال الشیخ عبدالوهاب الشعرانی فی الیواقیت والجواهر وهو باق الیٰ أن یجتمع بعیسیٰ بن مریم علیه السلام۔ شیخ عبدالوہاب

شعرانی نے کتاب الیواقیت والجواھر میں بیان کیا ہے کہ وہ مہدی باقی رہیں گے تا آنکہ مہدیؑ اور حضرت عیسیٰؑ ایک ہی وقت میں ساتھ ساتھ اس دنیا میں آئیں گے غرضیکہ نزول عیسیٰؑ بن مریم اور ظہور مہدیؑ کے لیے بکثرت احادیث موجود ہیں اور وہ سب مطابق قرآن ہیں۔

آخر میں یہ نکتہ کتنا لطیف ہے کہ آنحضرتؐ سے پہلے کے انبیاء کا اس دنیا سے اٹھ جانا جہاں قرآن کریم نے بیان فرمایا ہے وہاں انبیاء سابقین کے لیے لفظ ماتت (مر گئے) نہیں استعمال فرمایا بلکہ اس طرح کہا ہے۔

وما محمد الّا رسول قد خلت من قبله الرسل یعنی محمدؐ نہیں ہیں لیکن رسول۔ اس رسول سے پہلے کے انبیاء اس دنیا کو چھوڑ چکے ہیں اور یہاں سے فارغ ہو چکے ہیں۔

اگر یہاں لفظ ماتت کہا گیا ہوتا تو یہ لفظ موت سب کے لئے ہو جاتا جبکہ تمام انبیاء کے لئے موت واقع نہیں ہوئی تھی بلکہ ان میں سے بعض کی موت ہوئی تھی بعض کی شہادت اور بعض زندہ ہی اٹھائے گئے اس لئے قرآن نے لفظ ماتت کو ترک کر کے خلت کہا یعنی وہ اس دنیا کو چھوڑ کر فارغ ہو چکے ہیں یہ لفظ خلت اتنا جامع ہے کہ زندہ مردہ سب پر صادق آرہا ہے۔

☆☆☆

ذبح عظیم

تمثیل

بڑی سے بڑی بات مثال سے بآسانی ذہن نشین ہو جاتی ہے۔ اس لئے ابتدا" ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔ ننھے بچے جو ابھی بول نہیں سکتے۔ بڑے ان کو کھانے کھیلنے کی چیزیں لاکر دیتے ہیں۔ بچہ ان چیزوں کو لے کر بہت خوش ہوتا ہے۔ یکایک وہی بزرگ اپنا ہاتھ پھیلا کر بچے سے وہی اپنی دی ہوئی چیز مانگتا ہے یہ مانگنا کسی اپنی ضرورت اور حاجت کی بنا پر نہیں ہوتا۔ بلکہ صرف یہ دیکھنے کے لئے کہ یہ بچہ ہم سے کتنا انس رکھتا ہے۔ اور ہمیں خوش کرنے کا جذبہ اس کے چھوٹے سے دل میں کہاں تک موجود ہے۔ بچہ اپنے شوق کی چیز اپنے ہاتھوں کیوں دے دے اگر مانگنے والے بزرگ پر اس کو یہ اعتماد نہیں ہے کہ یہ مجھ سے لے کر پھر مجھ ہی کو دے دیں گے۔ تو وہ ہرگز نہ دے گا۔ لیکن اگر اس کو یہ اندازہ ہو گیا ہے کہ یہ مجھ سے لے کر مجھ ہی کو واپس دے دیں گے ان کا یہ مانگنا صرف ایک وقتی بات ہے تو بچہ اپنی چیز دے دے گا۔ اور دوبارہ اپنی چیز کا امیدوار ہو گا۔ ادھر بچے نے اپنی چیز دی ادھر وہ بزرگ بچہ سے انتہائی خوش ہوا۔ بچہ کے ایثار اور جذبہ محبت و رضاجوئی کی انتہائی قدر ہوئی۔ بزرگ نے وہ چیز کسی اپنی ضرورت سے تو لی ہی نہ تھی۔ صرف ایک آزمائش تھی فورا" اس چیز میں اپنی خوشی اور دعاؤں کی نقدی شامل کر کے وہ چیز بچہ کو دے دی بچہ کو پھر اس کی چیز مل گئی۔ لیکن اب اس چیز کے ملنے کی حیثیت ہی بدل گئی۔ پہلی مرتبے میں وہ چیز تھی صرف ایک عطا۔ اور اس مرتبہ ہے وہ چیز اس بچہ کے طرز عمل کی قیمت اور جزا پہلی مرتبے میں وہ فطرت نا: ک شکر

گزار تھی اپنے بزرگ کی اور اب وہ بزرگ شکر گزار ہو گیا اس بچہ کا
انّ ھذا کان لکم جزاءً و کان سعیکم مشکورًا

الٰہی عطا اور عطا کے بعد آزمائش

گوہر جان ہو یا دولت مال و اولاد سب کچھ خدا ہی کا دیا ہوا ہے۔ ہر چیز سے بے نیاز اور غنی اسے کسی کی حاجت نہ کسی کی چیز کی پھر اس کی طرف جسے حقیقتا" کسی چیز کا سوال ہو اور وہ اپنی کسی ضرورت سے اپنے بندہ سے کچھ مانگے غنی بالذات کے لئے اس کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ وہ اگر کسی سے کسی چیز کا طالب ہو تو فورا" سمجھ لینا چاہئے کہ وہ ہمیں آزمارہا ہے۔ اور دیکھ رہا ہے کہ ہم کو کہاں تک اس کی ذات پر اس کے غنی اور بے نیاز اور بہترین امین ہونے پر بھروسہ ہے وہ کبھی اپنے دیئے ہوئے مال میں سے کسی جزوی حصہ کا طلبگار ہوتا ہے۔ کبھی اپنی دی ہوئی جان اور اولاد کو اپنی راہ میں پیش کرنے کا مطالبہ کرتا ہے جو لوگ ایمان و اطمینان کا سرمایہ نہیں رکھتے جن کو خدا پر بھروسہ نہیں ہوتا جو لوگ خدا کو غنی تو کہہ دیتے ہیں لیکن سمجھتے نہیں ہیں۔ وہ ایسے موقعوں پر ہچکچا جاتے ہیں۔ لیکن جو بندے اس راز کو سمجھ جاتے ہیں کہ حقیقتا" یہ مانگنا نہیں بلکہ ہم کو اور ہمارے ایمان و اطمینان کو آزمانا ہے۔ یہ ہم سے لینا نہیں بلکہ اس بہانہ سے کچھ اور بہت کچھ بڑھا کر دینا ہے۔ عطا کو جزاو بے استحقاق اور مدحت سرا کو ممدوح بنانا ہے۔ وہ اس طلب کو صد ہزار غنیمت سمجھتے ہیں اور اس تجارت کو یقینی اور غیر احتمالی نفع بخش سمجھ کر خندہ پیشانی سے اختیار کر لیتے ہیں (لئن شکرتم لازیدنّکم) سب سے زیادہ آسان اور مرتبے کے اعتبار سے کم درجہ وہ امتحان ہے جو مال کے بارے میں ہو جیسے زکوٰۃ خمس اور ادائے کفارات وغیرہ کے احکام' اس آسان تر آزمائش میں بہت کم ہیں و لوگ جو کامیاب ہوتے ہیں اس سے زیادہ سخت آزمائش ہے وہ جس میں جان کا مطالبہ ہو جیسے میدان جہاد میں ثابت قدمی اور عزم سر فروشی۔ مالی آزمائش ہی میں جب کامیاب ہونے والے کم ہوں تو جانی آزمائش میں تو لامحالہ کم سے کم ہوں گے کامیاب ہونے والے۔

چنانچہ اُحد اور حنین کے میدان سامنے ہیں۔ آخری اور سخت ترین آزمائش ہے اولاد اور فرزندوں کی قربانی جو اپنی مرضی اور اختیار سے ہو اور خداوند عالم کو امتحاناً" یہ منظور ہو کہ انسان مجبوراً" نہیں بلکہ اپنی مرضی اور خوشی سے اپنی اولاد کو قربان گاہ میں پیش کردے۔ یہ آخری اور سخت ترین آزمائش ایسی نہیں کہ اس میں ہر کس و ناکس کو مبتلا کیا جاسکے۔ اور اس ہولناک طریق آزمائش سے ہر ایک کو آزمایا جاسکے۔ اولاً" تو اس لئے کہ آخری آزمائش اس ہستی کی ہوسکتی ہے جو پہلے تمام امتحانات میں کامیاب ہوچکا ہو۔ چنانچہ اذ ابتلی ابراھیم ربّہ بکلمات میں کلمات کا بصورت جمع آنا صاف بتا رہا ہے کہ جناب ابراہیمؑ کی آزمائش کئی بار ہوئی فاتمھّن کے معنی یہی ہیں کہ وہ ایک امتحان میں کامیاب ہوئے تو دوسری آزمائش آگئی۔ تدریجاً" معیار امتحان بلند ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ اس آخری اور سخت ترین امتحان کی بھی نوبت آگئی اور خدائے جلیل نے چاہا کہ خلیل اپنے فرزند کو منیٰ کے میدان میں لاکر اپنے ہاتھ سے ذبح کرکے دکھائیں۔ ظاہر ہے کہ اس سے کمتر امتحانات میں اگر خلیل پہلے سے کامیاب نہ ہوچکے ہوتے تو اس آخری امتحان کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ دوسرے یہ کہ اگر کوئی شخص مال اور جان کی آزمائش میں کامیاب بھی ہوچکا ہو تب بھی یہ ضروری نہیں ہے کہ اس کو اس آخری آزمائش میں مبتلا کیا جائے۔ اس لئے کہ کسی کی قوت صبر اور ہمت برداشت کو خالق سے زیادہ کوئی نہیں جان سکتا۔ ہوسکتا ہے کہ پہلے امتحانات میں کامیاب ہونے والوں کی قوت صبر و تحمل اپنے آخری نقطہ پر پہنچ چکی ہو۔ اور اب اس سے زیادہ کے لئے قوت موجودہ وفا نہ کررہی ہو۔ اگر اس حالت میں یہ سخت ترین امتحان لیا جائے گا تو لامحالہ یہ امتحان اس بندہ مومن کی شرمساری اور خفت کا موجب ہوگا اور پچھلی کامیابیاں بھی ماند پڑ جائیں گی۔ لہذا یہ آخری اور شدید ترین امتحان عوام کے لئے تو کیا خواص کے لئے بھی عام نہیں کیا گیا۔

آخری اور شدید ترین طریقہ آزمائش

قدرت نے اس آخری آزمائش کے لئے بس دو ہستیوں کو چنا ایک اپنے خلیل کو

دوسرے اپنے حبیب کو۔ رب جلیل نے اپنے خلیل کو آزمایا۔ اور معبود مطلق نے جو کچھ وہ دیکھنا چاہتا تھا خواب میں اپنے خلیل کو دکھایا۔ خلیل سمجھ گئے کہ میرا خدا میرے فرزند کا حاجت مند تو نہیں ہے کہ مجھ سے میرا فرزند وہ اپنی کسی ضرورت سے لے رہا ہے بلکہ یہ میری الٰہی محبت کا امتحان ہے جس میں کامیاب ہونے پر کوئی گراں بہا عطا منظور ہے۔ میدان منیٰ میں آگئے اور جو واقعہ خدا نے خلیل کو خواب میں دکھایا تھا۔ وہی واقعہ بعینہ بیداری میں خلیل نے خدا کو دکھایا خلیل نے ذرہ بھر اپنی طرف سے کوئی کوتاہی نہ کی اور یہ ٹھان لیا کہ محبوب ترین فرزند کو جو زندگی بھر کی تمناؤں اور دعاؤں کے بعد ملا ہے ذبح کروں گا۔ اور ذبح کرنے کے بعد آنکھوں کی پٹی کھول کر اسماعیل کو بشان مذبوحی سر بریدہ خون آلودہ دیکھوں گا اور چونکہ تیسرا کوئی شخص یہاں ہے ہی نہیں خود ہی لاش اٹھاؤں گا اور مرضی معبود کے مطابق دفن کر دوں گا۔ مگر قدرت کو یہ آخری مراحل منظور نہ ہوئے۔ کیوں اس کا جواب کس کی جرات و جسارت ہے کہ دے سکے۔ ممکن ہے کہ قدرت کی نظر کسی انتہا پر ہو اور اس بنا پر اس منزل کو ابتداء سے آگے نہ بڑھایا گیا ہو۔ یا یہ کہ لا یکلّف اللّٰہ نفساً الّا وسعھا۔ اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی قوت برداشت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔ ممکن ہے کہ خداوند عالم نے ان آخری مراحل کو اپنے خلیل کے لئے ایک ایسا شدید بار گراں پایا ہو جس کا اپنے خلیل پر ڈالنا قدرت نے گوارا نہ کیا ہو۔ البلاء للولاء (دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر)۔ جناب خلیل سید انبیاءؑ کے علاوہ تمام انبیاء سے افضل و برتر ہیں ممکن ہے یہی برتری اس شدید ترین امتحان کی موجب ہو۔ اب وہ پیغمبر آتا ہے جو خلیل کی طرح تمام انبیاء سے افضل ہونے کے علاوہ خود خلیل سے بھی افضل و برتر ہے۔ بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر۔ لیکن وہ برتری جو خداوند عالم کی طرف سے ہو وہ برائے نام تو نہیں ہو سکتی۔ جب تک کمالات میں برتری نہ ہوگی۔ سید انبیاءؑ ہونا صرف کہہ دینے کی بات تو نہیں کمالات نبوت میں تمام انبیاء سے برتری نہ ہو تو سید انبیاءؑ ہونے کے کیا معنی؟ ابراہیمؑ تمام انبیاء سے فائق تو ان کی آزمائش بھی تمام انبیاء سے زیادہ شدید اب یہ پیغمبر ہیں خلیل سے برتر تو ان کی آزمائش

بھی خلیل کی آزمائش سے بھی زیادہ سخت اور دشوار ہو جس سے ان کے مراتب کا دفور و ظہور منظر عام پر آسکے۔ لیکن یہاں نسل باقی میں کوئی فرزند نہیں۔ صرف نواسے ہیں اور انسان کو فطرۃً جو محبت بیٹے سے ہوتی ہے نواسے سے نہیں ہوتی۔ خلیل کا امتحان بیٹے کی قربانی سے ہوا تھا یہاں امتحان نواسوں کی قربانی سے ہوتا ہے۔ تو معیار امتحان بلند ہونے کے بجائے پست ہوا چاہتا ہے۔ مقلب القلوب نے سب سے پہلے اسی کا انتظام کیا اور نانا کے دل میں نواسوں کی محبت بیٹوں سے زیادہ رکھدی۔ دل کا حال کون جانتا۔ قدرت نے اس محبت کے ظہور کا بھی موقع دیا۔ اور ثابت کر دیا کہ دنیا میں کسی کو اپنے بیٹے سے بھی وہ محبت نہیں جو میرے حبیبؐ کو اپنے نواسوں سے ہے۔ عین اس وقت جب کہ 'ایک آغوش رسالت میں فرزند (حضرت ابراہیم فرزند رسولؐ) اور نواسہ (حسینؑ) دونوں شفقت رسولؐ سے بہرہ اندوز ہیں۔ ارشاد الٰہی ہوتا ہے کہ ان میں سے ایک کو رکھ لو اور دوسرے کو ہمارے سپرد کر دو۔ ابراہیم بھی بے حد پیارے تھے۔ مگر پیغمبرؐ خدا نے نواسے پر فرزند کو نثار کر دیا اس لئے کہ حسینؑ ظاہر میں نواسے تھے مگر محبت میں بیٹوں سے زیادہ اگر حقیقت پوچھئے تو خلیلؑ کو اپنے اسماعیلؑ سے جو محبت تھی اس سے کہیں زیادہ اس پیغمبر کو اپنے حسنؑ اور حسینؑ سے ہے۔ کس نے سنا ہے کہ خلیل نے اثنائے نماز میں بھی اسماعیل کی ناز برداری کی۔ کون کہتا ہے کہ خلیل نے اسماعیل کی خاطر سجدہ کو طول دیا۔ کب ایسا ہوا کہ خلیل نے منبر وعظ پر بیٹھے ہوئے اسماعیل کو مسجد میں آتے دیکھا تو منبر سے اتر کر ان کا خیر مقدم کیا ہو اور منبر پر بیٹھ کر ان کو اپنے زانو پر بٹھالیا ہو۔ اور صرف بٹھا ہی نہیں لیا ہو بلکہ اب وعظ و بیان کو صرف اپنے فرزند کی بزرگیوں کی اشاعت کے لئے منحصر کر دیا ہو۔ کون کہہ سکتا ہے کہ خلیل اپنے فرزند کے لئے مرکب اور ناقہ بنے۔ خلیل نے کب کہا کہ اسماعیل مجھ سے ہے اور میں اسماعیل سے ہوں۔ ان میں سے کوئی بات اسماعیل کے لئے نہیں سنی گئی۔ مگر حسینؑ کے لئے ان میں کی کونسی بات ہے جو دیکھی نہ گئی ہو۔ پھر ان چند باتوں ہی پر کب انحصار ہے۔ یہ تو مشتے از خروارے نمونہ ہیں ورنہ حسنؑ و حسینؑ کے لئے سرکار ایک مجسمۂ محبت اور ایک دریائے

ناپیدا کنار الفت تھے۔ اب یہ فیصلہ ارباب ذوق کے ذوق پر چھوڑتا ہوں کہ رسولؐ کو حسنینؑ سے یہ محبت اپنے لئے تھی یا خدا کے لئے تھی لہذا اپنے لئے تھی یا لوجہ اللہ تھی۔ بہر حال محبت تھی۔ اور ایسی تھی کہ دنیا میں کسی باپ کو بیٹوں سے ایسی محبت نہیں ہوتی۔ وحی الٰہی میں لفظ ابنائنا حسنین کے لئے اسی مستحکم اور محبت قویہ کی ضمانت کرتا ہوا آیا۔ اسی قرار داد قدرت کا احترام تھا کہ علیؑ مرتضیٰ نے ہمیشہ ان صاحبزادوں کو فرزند رسول کہا۔ اور صرف کہا ہی نہیں سمجھا اور خود ہی نہیں سمجھا بلکہ دوسروں کو سمجھایا۔ دنیا میں کس باپ نے اپنے بیٹوں میں یہ کہہ کہہ کر امتیاز قائم کیا کہ یہ بیٹا ہے میرا (محمد حنفیہ) اور یہ بیٹے ہیں رسول کے (حسنؑ اور حسینؑ) خود باپ ہیں مگر حسنینؑ کو اپنا نہیں رسولؐ ہی کا فرزند کہتے ہیں قرآن سے اتنی وابستگی تو ہو قرآن نے حسنینؑ کو فرزند رسول کہا تھا۔ تو علیؑ نے باپ ہونے کے باوجود قرآن ہی کا ساتھ دیا علی مع القرآن و القرآن مع علی۔ علیؑ کی نظر میں اپنے تمام فرزند اپنے لیکن حسنینؑ فرزند رسول اس نظریہ کا نفسیاتی طور پر یہ نتیجہ ہو سکتا تھا اور بیٹوں سے ان کو اپنا سمجھنے کی بنا پر زیادہ محبت ہو۔ اور حسنینؑ کو فرزند رسولؐ سمجھنے کی بنا پر ان سے محبت میں کمی ہو لیکن یہاں معاملہ برعکس ہو گیا کیوں اس لئے کہ علیؑ کو اپنی جان اتنی محبوب نہیں جتنی کہ جان رسولؐ کی ہر مہلکہ میں اپنی جان کو بڑھاتے رہے اور رسولؐ کی جان کو بچاتے رہے شب ہجرت کی تاریکیاں اور ایام جہاد کی تابانیاں گواہی دے رہی ہیں کہ علیؑ ہمیشہ رسولؐ پر اپنی جان نثار کرتے رہے پھر جس کو اپنی جان سے زیادہ پیاری ہو گی رسولؐ کی جان اس کو اپنے بیٹوں سے زیادہ پیارے ہوں گے رسولؐ کے بیٹے۔ النبی أولیٰ بالمومنین من انفسھم مومنین کی جانوں پر مومنین سے زیادہ حق تصرف ہے پیغمبرؐ کو۔ حضور سرکار دو عالمؐ نے فرمایا ہے کہ کوئی شخص مومن قرار نہیں پا سکتا جب تک کہ وہ مجھے اپنی جان سے زیادہ محبوب نہ رکھے۔ اور ظاہر ہے کہ جان رسولؐ اگر اپنی جان سے زیادہ محبوب ہو گی تو فرزند رسولؐ بھی اپنے فرزند سے زیادہ محبوب ہو گا۔ اگر امیر شام کم سے کم اسی ایک نظریہ پر فائز ہوتے تو اپنے بعد کے لئے یزید کو حسینؑ پر ترجیح دینے کے بجائے حسینؑ کو یزید پر ترجیح دیتے

اور کہتے کہ سزاوار خلافت یزید نہیں حسینؑ ہیں۔ اور علیؑ مرتضیٰ کے نظریہ کی طرح کہ یزید میرا بیٹا ہے اور حسنینؑ رسولؐ کے فرزند ہیں۔ لیکن محبت رسول میں اپنے آپ کو گم کر دینا یہ ہر ایک کا کام نہیں۔ بہر حال علیؑ مرتضیٰ نے ہمیشہ جان رسولؐ کے لئے اپنے آپ کو سپر بنائے رکھا اور اسی طرح اپنے فرزندوں کو فرزندان رُسول کی سپر بنایا یہی وجہ ہے کہ جب تک ان میں کی ایک ایک سپر باقی رہی سر حسینؑ محفوظ رہا حسینؑ شہید ہوئے تو اس وقت جب کوئی سپر باقی نہ رہی۔ غرضیکہ ہر ایک پیغمبرؑ نے اپنے اپنے زمانہ میں واقع ہونے والے حالات اور اپنی اپنی حیثیت کے مطابق امتحانات دیئے اور کامیاب ہوئے جس مقام پر نبوت کی انتہا ہو رسالت کا کمال ہو۔ محبوبیت الٰہی کی معراج ہو اس منزل پر امتحان بھی اتنا بلند پایہ ہو کہ پچھلے تمام امتحانات پست نظر آنے لگیں۔ جس پر تمام عالم کے کمالات اور درجات اس پیغمبر کے کمالات اور درجات کا مقابلہ نہیں کر سکتے اسی طرح یہاں معیار امتحان بھی اتنا اہم ہو کہ کل عالم کے امتحانات مل کر بھی اس امتحان کی ہمسری نہ کر سکیں۔ چنانچہ سید عالم وعالمیان کا جو امتحان آپ کی ذرّیت طاہرہ اور آپ کے لخت ہائے جگر کی قربانیوں کے ساتھ لیا گیا وہ انتہائی اہمیت کے اعتبار سے تاریخ عالم کا پہلا اور آخری امتحان ہے۔

امتحان کے سہل اور دشوار ہونے کی صورتیں

تین چیزیں ہیں جو بالمقابل آکر امتحان کو سہل تر یا دشوار تر بنا دیتی ہیں۔

(1) وہ امتحان جس میں امتحان دینے والے کے ساتھ اس کے افراد خاندان کو کم سے کم شریک امتحان قرار دیا جائے گا سہل ہوگا لیکن وہ امتحان جس میں امتحان دینے والے کے ساتھ اس کے زیادہ سے زیادہ افراد خاندان کو شریک امتحان قرار دیا جائے گا۔ دشوار تر ہوگا یہی وجہ ہے کہ قربانی فرزند کی اطلاع خلیل اللہ نے اپنے اور کسی قرابت دار کو تو کیا مادر اسماعیل تک کو نہ کی ورنہ دائرہ امتحان کی وسعت شدت امتحان کو اور بڑھا دیتی۔

(2) وہ امتحان جس میں امتحان دینے والے کے لئے مصائب و آلام کم سے کم ہوں گے سہل تر ہوگا۔ بہ نسبت اس امتحان کے جس میں مصائب و آلام زیادہ سے زیادہ ہوں۔ وہ امتحان یقیناً دشوار تر ہوگا۔

(3) وہ امتحان جس کے لئے وقت امتحان کم سے کم ہو اور جلد سے جلد گزر جانے والا ہو سہل ہوگا۔ بر خلاف اس امتحان کے جو زیادہ سے زیادہ دیر تک سالہا سال تک بلکہ صدہا سال تک جاری رہے۔ کتنا اشتداد ہوگا ایسے امتحان میں۔

امتحان سید انبیاءؐ کتنا سخت ترین امتحان ہے

سید انبیاءؐ کا امتحان جو آپ کے فرزندوں اور آپ کی ذرّیت طاہرہ کی قربانیوں سے ہوا کتنا سخت ترین امتحان ہے اس کا اندازہ ہر سہ نکات متذکرہ بالا سے بخوبی ہو سکتا ہے اس امتحان میں کتنے کچھ افراد خاندان رسولؐ کو شریک امتحان قرار دیا گیا اور کس کس فرد نے اپنی اپنی جگہ ہولناک مصائب جھیل جھیل کر اپنی عظیم الشان قربانی بارگاہ خدا میں پیش کی۔ اللہ اللہ کس قدر وسعت ہے اس امتحان میں کہ خاندان کی کوئی ایک فرد بھی اس امتحان سے مستثنیٰ نہ رہی۔ مردان اہل بیتؑ زنان اہل بیتؑ بچے جوان بوڑھے حتیٰ کہ طفل شیر خوار سب ہی کی منزل صبر و رضا آزمائی گئی اور یہ سلسلہ آزمائش اور دور ابتلا نسلاً "بعد نسلٍ قائم ہی رہا۔ دختر رسولؐ پر کیا گزر گئی۔ چشم گریاں دل بریاں اور پہلوئے شکستہ لے کر دنیا سے اٹھیں۔ نفس رسولؐ تیس برس تک مصائب و آلام میں زندگی بسر کر کے سر شگافتہ لے کر گئے۔ حسن مجتبیٰؑ نے برسوں اتنا کچھ دیکھا اور سنا اور بالآخر نانا کے روضہ سے دور جسم سبز اور لاش تیر باریدہ کے دفن ہونے کی نوبت آئی۔ حسینؑ پر کیا گزری خدا جانے اور ارض کربلا جانے حقیقت مصائب تک کون پہنچ سکتا ہے ہم نے تو جتنا سنا وہ بھی اتنا ہے کہ سنا نہیں جاتا۔ اولاد عقیل پر کیا گزری اولاد جعفر طیار پر کیا گزری۔ فرزندان امیر المومنینؑ پر کیا گزری۔ فرزندان حسنؑ اور فرزندان حسینؑ پر کیا گزری۔ زینبؑ دل خستہ کے بیٹوں پر کیا گزری۔ اقربائے رسول

کے ساتھ انصار دین خدا پر کیا گزری "حکایتیست که در دفتری نمی گنجد" رسولؐ کی نواسیاں چھوٹے بچے اور حسینؑ کا فرزند بیمار ہجوم مصائب میں عصر عاشورہ تک یہ سب کے سب حسینؑ کے ساتھ رہے۔ لیکن بعد عصر عاشورہ ان بے کسوں اور لاوارثوں پر مصائب و آلام کا وہ ہجوم کہ خدا کی پناہ اور اب حسینؑ ان کے ساتھ نہیں بالآخر ختم ہو گئی ایک دن زنان اہل بیتؑ کی اسیری اور لٹ کر واپس آ گیا یہ قافلہ مدینے میں۔ لیکن ختم ہو گیا محمدؐ و آل محمدؐ کا دور ابتلا۔ نہیں۔ آئمہ اہل بیتؑ اولاد اہل بیت فدائیان اہل بیت اور مقصد اہل بیت غرضیکہ اہل بیت اور اہل بیت سے نسبت رکھنے والی جو ہستی اور جو چیز بھی جس زمانہ میں پائی گئی اس ہی پر ظالمانہ حملے ہوتے رہے۔ اتنی وسعت اور ہمہ گیری کے ساتھ کس پیغمبرؑ کا امتحان ہوا؟

(4) امتحان کی شدت موقوف ہے مصائب و آلام کی شدت پر کیا تاریخ عالم میں کوئی مثال ہے آل محمدؐ کے مصائب و آلام کی کیا ان شہیدوں اسیروں اور تشنہ لبوں کے مصائب و آلام کی انتہا اب بھی تشنہ بیان ہے۔ کتنا حقیقت سے لبریز ہے امام شافعی کا یہ شعر

تزلزلت الدنیا لآل محمد ...... وکادت لھم صم الجبال تذوب

(ترجمہ) آل محمدؐ کے مصائب سے دنیا ہل گئی ہے عجب نہیں کہ ٹھوس پہاڑ بھی ان کے مصائب کے تصور سے پگھل جائیں۔

(5) وقت امتحان کی درازی امتحان کو شدید بنا دیتی ہے خاصان خدا اور انبیاء ہدیٰ سب ہی نے امتحان دیئے۔ کون ہے جس نے راہ امتحان کو قدم ثبات و صبر سے طے نہ کیا ہو۔ لیکن ایک مخصوص شہرت ہے۔ صبر یعقوبؑ اور صبر ایوبؑ کو کیوں اس لئے کہ ان کا دور ابتلا اور وقت امتحان سالہا سال تک چلتا رہا۔ برسوں کے بعد یہ نوبت آئی کہ یعقوبؑ سے ان کا بچھڑا ہوا فرزند ملا۔ برسوں کے بعد ایوبؑ کو پھر سے بیٹے ملے اور دھن دولت کی واپسی ہوئی۔ لیکن ان کا زمانہ امتحان کتنا ہی دراز اور طولانی سہی یہ طے شدہ ہے کہ یعقوبؑ اور ایوبؑ نے اپنی اسی زندگی میں ہر کھوئی چیز کو پا لیا۔ اور باحسن وجوہ پالیا۔ دور

ابتلا ختم ہو گیا۔ آسودگی پلٹ آئی۔ خلیلؑ کا وہ امتحان جس کو بلا مبین کہا گیا ہے یعنی قربانی اسماعیلؑ امتحان تھا اور شدید آزمائش تھی۔ آخر وہ ختم ہو گیا اور اس کے متعلق پھر کوئی خلش باقی نہ رہی۔ لیکن محمدؐ و آل محمدؐ کا امتحان اور وقت امتحان کتنا دراز اور طولانی ہے دس بیس برس نہیں بلکہ صدیاں گزر گئیں۔ مگر امتحان کا سلسلہ نہ رکا۔ آج تیرہ سو برس سے زیادہ گزر گئے لیکن حقیقت بین نگاہیں دیکھ رہی ہیں کہ ان کا دور ابتلا اور وقت آزمائش ختم نہیں ہوا کل کی بات ہے کہ جناب سیدہؑ اور ان کے فرزندان طاہرین کے روضے خاک کے برابر ہو گئے اور اب تک اسی حالت میں پڑے ہیں۔ آج وہ نیزہ و شمشیر کے منظّم حملے نہیں اور صرف اسی لئے نہیں کہ ان مظلوموں تک دست ظلم کی رسائی نہیں۔ لیکن نوک نیزہ قلم اور تیغ زبان سے اب بھی ان کو مجروح کیا جارہا ہے۔ یزید اور اس کے دست وبازو اب بھی سرا ہے جارہے ہیں۔ آل محمدؐ کی تنقیص و توہین کا دروازہ اب بھی کھلا ہوا ہے۔ خلافت معاویہ و یزید کے عنوانات سے اب بھی ان کی جناب میں گستاخیاں ہو رہی ہیں۔ ان حضرات کا دور ابتلا آج تک موجود ہے اور قائم آل محمدؐ تک رہے گا۔ زمانہ غیبت امامؑ کو جتنا طول ہوا اور ہو گا اتنا ہی زمانہ امتحان محمدؐ و آل محمدؐ طولانی قرار پائے گا۔ اور جتنا ان کا زمانہ امتحان طولانی ہو گا۔ اتنا ہی ان کا امتحان شدید تر قرار پائے گا اور جتنا ان حضرات کا امتحان شدید تر ہو گا اتنا ہی ان کا موقف اور اصل مقام بلند تر ثابت ہو گا۔ جناب مفتی میر عباس صاحب اعلی اللہ مقامہ کا یہ شعر اسی مفہوم کی توضیح ہے "خانۃ ایوبؑ و یعقوبؑ بمافا تھما. وبنو حیدرۃ فی بھظات النصب" یعنی ایوبؑ اور یعقوبؑ سے جو کچھ لیا گیا تھا۔ وہ ان کی زندگی میں ان کو واپس مل گیا۔ لیکن اولادِ رسولؐ اور فرزندان علیؑ و بتولؑ کے لئے رنج و غم کا ہجوم آج بھی اسی طرح موجود ہے کہ محمدؐ و آل محمدؐ کے امتحان میں امتحان دینے والے افراد کی وہ وسعت و کثرت ہے جو بے مثال ہے۔ مصائب و آلام کا وہ ہجوم ہے جو بے مثال ہے زمانہ امتحان بھی اتنا کچھ دراز اور طویل ہے جو اپنی جگہ بے مثال ہے اس لئے ماننا پڑے گا کہ ایسا امتحان نہ کبھی ہوا نہ ہو گا۔ کیوں اس لئے کہ ایسے امتحان دینے والے بھی نہ ہوئے نہ ہونگے۔ امتحان بھی بے مثال امتحان

دینے والے بھی بے مثال۔

اللہ کی جانب سے ہونے والے امتحان کے معنی

دنیاوی امتحانات کی عموماً" یہ صورت ہوتی ہے کہ ممتحن پہلے سے ایک شخص کی قابلیت یا نا قابلیت سے لاعلم ہوتا ہے۔ اس لاعلمی کو علم سے بدلنے کے لئے اور ایک امر مخفی کے انکشاف کے لئے امتحان لیا جاتا ہے۔ امتحان کے نتیجہ سے پہلے ممتحن پھر دوسرے لوگ باخبر ہو جاتے ہیں لیکن پروردگار عالم کی طرف سے جو امتحانات ہوتے ہیں ان کی غرض و غایت یہ نہیں کچھ اور ہے۔ وہ عالم الغیب ہے۔ کسی کی قابلیت اور نا قابلیت اس سے مخفی نہیں۔ وہ پہلے سے جانتا ہے کہ اگر حکم دوں گا تو یہ بندہ تعمیل کرے گا یا نہیں اگر کسی بات سے روکوں گا تو یہ رکے گا یا نہیں۔ اس علم کے باوجود قدرت نے یہ گوارانہ کیا کہ صرف اپنے علم کو جزا یا سزا کا سبب قرار دے اور کسی کو یہ کہہ کر آخرت کی نعمتیں دے کہ تجھے اگر حکم دیتا تو میرا عمل میری مرضی کے مطابق ہوتا اور کسی کو یہ کہہ کر سزا دے کہ تجھے اگر حکم دیتا تو اس کی تعمیل تو ہرگز نہ کرتا اس صورت میں بندہ کو یہ کہنے کا موقع ہوتا کہ حکم دے کر تو دیکھ لیا ہوتا۔ اگر حکم دینے پر میں تعمیل نہ کرتا تو مجھے صبر آجاتا۔ کہ مجھے حکم کی تعمیل نہ کرنے سے سزا اور دوسرے کو تعمیل کرنے کی جزا مل رہی ہے۔ خداوند عالم نہیں چاہتا کہ بندوں کی حجت اپنے اوپر قائم کرے اس لئے وہ عمل کا موقع دیتا ہے تاکہ نیک کی نیکی بد کی بدی۔ صابر کا صبر۔ ظالم کا ظلم۔ مومن کا ایمان کافر و منافق کا کفر و نفاق منظر عام پر آجائے اور کسی کو اپنے یا دوسرے کے بارے میں حمایت بے جا یا تشدد بے جا کا شبہ نہ ہو سکے۔ لہذا خاصان خدا کے امتحان کی غرض و غایت ہے ان کے کمال ایمان کمال معرفت اور عزائم اطاعت الٰہیہ کا عام نگاہوں کے سامنے لانا اور دنیائے بے خبر کو باخبر کرنا تاکہ ان کا اصل مقام اہل عالم پر ظاہر ہو جائے اور جو درجات عالیہ نبوت و امامت و ولایت ان کو دیئے گئے ہیں ان درجات کو اہل عالم تہ دل سے قبول کر لیں۔ اور یقین کر لیں کہ واقعاً" یہ حضرات ان ہی

درجات کے مستحق ہیں اور یہ درجات ایسے ہی حضرات کے لئے زیبا ہیں بشرطیکہ قلب سلیم اور عقل فہیم موجود ہو۔

قضاو قدر کے لفظوں سے مجرمین کو بری کرنے کی کوشش

بے شک پروردگار عالم کا اپنے فرماں برداروں کو ہمیشہ یہی حکم ہے کہ اگر تم کو میری راہ میں ستایا جائے وطن چھوڑنے پر مجبور کیا جائے قید وبند میں مبتلا کیا جائے۔ تلوار کے گھاٹ اتارا جائے۔ اور مصائب و آلام کے تیروں کا نشانہ بنایا جائے۔ تو ہمت نہ ہار بیٹھنا۔ میری راہ کو نہ چھوڑ دینا۔ بلکہ تمام تر مصائب و آلام کا صبر و سکون سے مقابلہ کرنا مدافعت کر سکو تو صابرانہ عزم لے کر میدان جہاد میں آنا جان و مال و اولاد پر بن جائے تو صبر کرنا اور میری راہ میں لٹا دینا اور سمجھ لینا کہ یہ سب کچھ ہم نے اپنے معبود کی امانت میں دے دیا۔ لیکن اس کے یہ معنی تو نہیں کہ دوسروں کو خداوند عالم نے ظلم و ستم کرنے کی اجازت دے دی اور ان کے لئے روا ہو گیا کہ وہ صابرین کو قتل کر دیں اور ان پر جو ظلم و ستم چاہیں کریں۔ فرماں برداروں کو تو ایسے موقعوں پر صبر کا حکم ہے۔ لیکن خون ناحق بے جا ظلم و ستم اور تشدد کی تو اس نے کسی کو اجازت نہیں دی۔ بعض لوگ مجرمین کو بری کرنے یا ان کے جرم کو ہلکا کرنے کے لئے ایسے جملے کچھ گومگو شکل میں استعمال کرتے ہیں خصوصاً "اس شہادت عظمٰی کے سلسلہ میں کہ قضاو قدر میں یوں ہی گزرا تھا۔ یہ ایک شدنی امر تھا۔ یہ ازل ہی سے طے ہو چکا تھا۔ علم الہی میں پہلے ہی گزر چکا تھا کوئی پوچھے کہ آخر ان جملوں کا مطلب کیا ہے جتنے بھی انبیاء خدا قتل ہوئے جس قدر بھی مومنین شہید ہوئے ان کا قتل و شہید ہونا علم خدا میں تو سب ہی کچھ تھا ہر کافر کا کفر اس کے علم میں تھا۔ ہر ظالم کا ظلم اس کے علم میں تھا۔ ہر بدکردار کی بدکرداری اس کے علم میں تھی پھر جہنم میں کون جائیں گے اور وہ کافر و منافق و فاسق و فاجر جہنم میں جانے کے لئے کہاں سے آئیں گے جن کے کفر و نفاق و فسق و فجور کا خداوند عالم کو پہلے سے علم نہ ہو۔ بیشک ہمارے اچھے اور برے کردار کا خداوند عالم کو

ازل سے علم ہے کیونکہ وہ علیم و خبیر ہے۔ لیکن علم خدا ہماری نیک کرداری یابد کرداری کا سبب نہیں بلکہ اس کا علم ہمارے ہونے والے کردار کی بنا پر ہے مقابلے کے دو جملے ہیں جن میں ایک غلط اور دوسرا صحیح ہے۔ پہلا جملہ ہماری یہ نیکی اور بدی علم خدا میں گزر چکی تھی تو کیوں نہ واقع ہوتی۔ دوسرا جملہ ہم سے یہ نیکی اور بدی ہونے والی تھی تو کیوں نہ علم خدا میں گزرتی۔ غیب کی ہزاروں باتیں ہیں جو وسائل اور دلائل اور تجربات سے خود ہمارے علم میں ہیں ہم کو یقین ہے کہ ہر ذی حیات مرے گا۔ ہم جانتے ہیں کہ ہر چیز فنا ہو گی۔ بچہ کا بچپن نہ رہے گا۔ جوان کی جوانی۔ بوڑھے کا بڑھاپا نہ رہے گا جو درخت اب سبز ہے اسے مرجھانا ہے۔ جو چیز اس وقت حرکت میں ہے اسے ٹھہرنا ہے حساب سے پتہ چل جاتا ہے کہ فلاں روز چاند گہن اور فلاں روز سورج گہن ہو گا۔ ماہرین موسمیات بتا دیتے ہیں کہ فلاں روز اور فلاں وقت فلاں مقامات پر بارش ہو گی یا آسمان ابر آلود رہے گا۔ مئی کے بعد جون اور جون کے بعد جولائی ہو گی۔ سردی کے بعد گرمی اور گرمی کے بعد سردی آئے گی۔ کیا یہ سب کچھ ہمارے علم کی وجہ سے ہو گا یا یہ کہ ہونے والا ہے۔ اس لئے ذرائع سے ہم کو معلوم ہو گیا ہمارا علم ذاتی نہیں ہے۔ ذرائع اور تجربات کی مدد سے ہے اور اسی حد میں محدود ہے۔ خداوند عالم کا علم ذاتی ہے۔ اور وہ عین علم ہے۔ جب ہم لوگ ذرائع اور وسائل سے اتنا کچھ جانتے ہیں تو وہ ذاتا" علیم و خبیر ہو کر ہمارے اعمال وافعال کا کیوں نہ عالم ہو۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ ہم اپنے نیک و بد اعمال کے لئے علم الٰہی کی وجہ سے مجبور ہیں تو پھر خداوند عالم کا نیکیوں کے لئے حکم دینا۔ برائی سے روکنا۔ وعظ و نصیحت کرنا۔ ہدایت کے لئے انبیاء اور آئمہ کا مبعوث کرنا کتاب کا نازل کرنا نافرمانوں پر خود اس کا نفرین اور لعنت کرنا اور ان کے لئے جہنم کا معین کرنا فرماں برداروں کی مدح کرنا اور ان کے لئے جنت کا معین کرنا زانی کو دُرّے لگوانا۔ سارق کا ہاتھ کٹوانا یہ سب مہمل اور کھیل تماشا ہو جائے گا۔ اور تمام عالم میں سوائے خدا کے کوئی بھی ظالم نہ قرار پائے گا۔ اور واقعا" اس سے زیادہ ظلم اور کیا ہو گا کہ خود ہی برائی کرائے اور خود ہی اس برائی پر جہنم جھونکے۔ جن سے خود برائی کرائے۔ اور برائی کرنے پر مجبور کرے۔

ان پر خود ہی لعنت کرے۔ان اللہ لیس بظلاّمٍ للعبید اللہ اپنے بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں۔

ذبح عظیم کی یادگار

وہ قربانی جو میدان منیٰ میں خلیلؑ نے پیش کی خداوند عالم نے ابد الآباد تک اس کی یادگار کو قائم کر دیا۔ مناسک حج میں اس کی یادگار رکھی۔ حج کے لئے مستطیع نہ ہو تو گھر بیٹھے اس قربانی کی یادگار میں قربانی پیش کرے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ فرزند خلیل کی یادگار تو مطلوب الٰہی ہو اور فرزند حبیب کی یادگار کا کوئی مطالبہ نہ ہو۔ دسویں ذی الحجہ عید اور خوشی کا دن ہے کیونکہ خلیل خدا اس روز میدانِ منیٰ سے خوش خوش آئے تھے تو ملت ابراہیم اور مسلمین کے لئے روز عید قرار پایا۔ رنجیدہ اور ملول آتے تو رنج و ملال کا دن ہو جاتا۔ ابراہیمؑ کیوں خوش ہوئے۔ اسی لئے تو کہ کامیاب امتحان ہوئے اور فرزند بھی ذبح ہوتے ہوتے بچ گیا۔ دل داغدار ہونے والا تھا' داغ فرزند سے محفوظ رہا۔ اگر اسمٰعیلؑ ذبح ہو جاتے اور خلیل اپنے فرزند کو خاک میں ملا کر آتے یا لاش پسر سینے سے لگائے ہوئے آتے تو کیا اس صورت میں بھی اسی طرح خوش خوش آتے جس طرح اسمٰعیلؑ کو ساتھ لے کر خوش خوش آئے ہرگز نہیں فطرت پر دو متضاد پہلوؤں کا ایک ہی اثر ہو یہ محال ہے۔ اسماعیلؑ کے ذبح ہو جانے کی صورت میں دل خلیل پر کیا گزرتی۔ آپ مسرور ہوتے یا ملول اس کا معلوم کر لینا کچھ مشکل نہیں۔ مفارقت فرزند سے ابراہیمؑ کا بھی امتحان ہوا اور ان کے پوتے یعقوبؑ کا بھی پہلی منزل میں مفارقت کی نوبت نہ آئی۔ دوسری منزل میں پدر سے فرزند بچھڑ گیا۔ اب یہ معلوم کر لینا آسان ہو گیا کہ اگر پہلی منزل میں باپ سے بیٹا بچھڑ جاتا تو کامیابی امتحان تو اپنی جگہ اور چیز ہے بیٹے سے جدائی باپ کے لئے موجب غم ہوتی یا سبب شادمانی اس وقت قلب خلیل پر وہی گزرتی جو قلب یعقوبؑ پر گزری بلکہ اس سے زیادہ۔ وہاں امید دید تھی یہاں ناامیدی ہوتی یوسفؑ کے بچھڑنے پر اگر یعقوبؑ شادمان ہوتے تو ابراہیم بھی ذبح اسمٰعیل

کے بعد شادمان ہوتے اور اگر یعقوبؑ فراق پسر میں روتے رہے تو ابراہیمؑ بھی زندگی بھر اسمٰعیلؑ کی یاد میں روتے دونوں کی آزمائش تھی۔ دونوں باپ تھے۔ دونوں مزاج عصمت اور مرتبہ نبوت پر فائز تھے دسویں ذی الحجہ کے ایک ماہ بعد ہے دسویں محرم۔ دسویں محرم کو ایک نبی کا بلکہ سید انبیاؑ کا فرزند ذبح ہو گیا اور ایک ہی فرزند کیوں فرزندوں کے فرزند تو اسی کے فرزند تھے۔ رسولِ اکرم کی تمام ہی اولاد ذبح ہو گئی۔ ایک بیمار فرزند بچا بھی تو اسیری دربدری اور طوق و زنجیر کے لئے اب یہ دن خوشی کا ہوا یا رنج و ملال کا۔ دَسویں ذی الحجہ ہے۔ خلیل کی شادمانی کا دن اگر ہم اس روز عید کو رو کر گزاریں تو کیا خلیل ان رونے والوں سے خوش ہوں گے اور اپنا سمجھیں گے ہرگز نہیں اسی طرح دسویں محرم ہے۔ ہمارے پیغمبرؑ کے دل فگار اور اشکبار بلکہ انتہائی ملول اور بے قرار ہونے کا دن اگر ہم اس روز عاشور کو خوش ہو کر گزاریں اور عید سمجھیں تو کیا رسول اکرمؐ ہم سے خوش ہوں گے اور ہم کو اپنا سمجھیں گے۔ چنانچہ حاکم بیہقی نے جو اجلّہ علمائے اہل سنت سے ہیں اپنی کتاب مستدرک دلائل النبوۃ میں بیان کیا ہے کہ ام سلمہؓ سے مروی ہے کہ میں نے خواب میں رسول اللہؐ کو اس حالت میں دیکھا کہ آپ کا سر انور اور ریش مبارک خاک آلود ہے اور سرکار رو رہے ہیں میں نے عرض کیا کہ سرکار یہ کیا' ارشاد ہوا کہ میں اس وقت قتل گاہِ حسینؑ میں تھا۔ ابنِ عباس نے بھی اسی حالت حزن و ملال میں سرکار دو عالمؐ کو خواب میں دیکھا۔ اس خواب ابنِ عباس کا بھی قریب قریب وہی مضمون ہے جو خواب ام سلمیٰؓ کا ہے۔ ابن عباس کا یہ خواب مسند احمد بن حنبل اور دلائل النبوۃ بیہقی میں مندرج ہے غرضیکہ امت مسلمہ کے لئے جب قربانی خلیلؑ و اسماعیلؑ کی یادگار ضروری ہے تو خود اس پیغمبر کی اور اس کے فرزند اور بھرے گھر کی قربانی کی یادگار بدرجہ اولیٰ ضروری ہوئی جس کی یہ امت ہے اور جس کے نام سے اس امت کا قیام ہے۔ اگر کوئی شخص کہے کہ یادگار خلیلؑ و اسماعیلؑ کے لئے تو شریعت کے احکام مقررہ موجود ہیں مثلاً نماز عید قرباں' قربانی روز عید اور حجاج کے لئے مناسک حج لیکن قربانی فرزند رسولؐ اکرم کے لئے تو منضبط احکام شریعت نہیں ہیں جن

کی رو سے یادگار حسینی کے لئے کوئی مخصوص طریقہ متعین ہو سکے۔ تو میں عرض کروں گا کہ قرآنی آیت مودّت نے ہر مسلمان پر محبت آل محمد کو فرض عین بلکہ اجر رسالت قرار دے کر کل امت کو آل محمد کا شریک شادی و غم کر دیا محبت کا کم سے کم درجہ ہے یہ کہ محبّ اپنے محبوب کی مسرت سے مسرور اور غم سے مغموم نظر آئے۔ روز عاشورہ غم اہل بیت کا دن ہے تو امت کو لامحالہ شریک غم ہونا ہے اور کسی نہ کسی طرح اپنے رنج و ملال کو ظاہر کرنا ہے یہاں اظہار ملال کا طریقہ کیا ہو شریعت نے اس کے متعلق کوئی مخصوص ضابطہ پیش کر کے ہم کو اس کا پابند نہیں کیا۔ بے شک یادگار ابراہیم و اسماعیل کے لئے شریعت نے ایک محدود اور مخصوص ضابطہ معین کیا جو یادگار حسینی کے لئے ایک قانون عام کی حیثیت سے نہیں ہے۔ آخر یہ فرق کیوں ہے کیا اس لئے کہ شریعت کی نظر میں یادگار اسمٰعیل زیادہ اہم ہے یادگار حسینیؑ سے یا قربانی فرزند خلیل زیادہ اہم ہے قربانی فرزند رسولؐ سے ہرگز نہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ یہاں اظہار غم کے عنوان کا غیر معین ہونا ایسے عظیم مصالح پر مبنی ہے جن کو شارع اسلام نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ بلکہ اس واقعہ عظمٰی کی انتہائی عظمت ہی اس کی مقتضی تھی کہ اس کی یادگار کے لئے اور اس غم کے اظہار کے لئے کوئی مخصوص عنوان مقرر ہی نہ کیا جائے۔ سب سے پہلی چیز تو یہ ہے کہ قربانی اسماعیل کسی معاذ کے عناد اور کسی دشمن کی دشمنی کا نتیجہ نہ تھی اسماعیل کے لئے کسی کے ظلم و جور کا کوئی سوال نہیں اگر ذبح ہو بھی جاتے تو ذبیح ضرور کہا جا سکتا تھا۔ لیکن ذبح' کے بعد مظلوماً نہیں کہا جا سکتا تھا کیونکہ وہاں ظالم تو کوئی تھا ہی نہیں۔ جس نے ظلم و ستم سے اسمٰعیلؑ کو ذبح کر دیا ہو اس بنا پر حضرت اسماعیلؑ کی یادگار ایک پر سکون یادگار ہے جس میں نہ کسی کی مخالفت ہے نہ کسی کی شکایت ہے۔ نہ کسی پر الزام نہ اس میں کسی کی بدنامی اور رسوائی کوئی بھی حکومت ہو اس یادگار کو کیوں روکے۔ کوئی قوم، کوئی قبیلہ اس یادگار سے کیوں بگڑے شریعت نے قربانی اسماعیل کی قدردانی کرتے ہوئے اس کی یادگار کے لئے ایک ہلکا سا لائحہ عمل مرتب کر دیا جو اپنے معینہ وقت کے لئے عملیہ بنا۔ اور پھر سال بھر کے لئے ملتوی ہو گیا لیکن فرزند رسولؐ کی قربانی

اس سے بدرجہا اہم ہے۔ یہ قربانی شدید ترین ظلم و ستم کا نتیجہ اور اس ظلم و ستم کا نتیجہ جو ایک مستحکم اور مضبوط حکومت کی جانب سے ہوا۔ حکومت نے اپنی بھرپور طاقت سے آلِ محمدؐ پر ظلم و ستم کے پہاڑ گرادئے۔ اور اپنی دانست میں آلِ محمدؐ کا نام و نشان مٹادیا۔ حکمران بدلتے رہے آج یزید کل مروان پرسوں عبدالملک مگر یہ تبدیلی صرف برائے نام تھی حکمرانوں کے نام بدل رہے تھے کام سب کا ایک تھا۔ عداوت اہل بیتؑ کا نصب العین نہ بدل سکا۔ بنی امیہ کے بعد بنی عباس آگئے۔ مگر آل محمدؐ کی مہمان نوازی کے لئے وہی قید خانے اور ان کی تواضع کے لئے وہی زہر قاتل واقعہ کربلا کے تقریباً چھ سو برس کے بعد ۶۵۶ ہجری میں حکومت بنی عباس کا اگرچہ خاتمہ ہوا لیکن کون اس کا یقین کرسکتا ہے کہ چھ سو برس تک دشمنان اہل بیتؑ کی حکومتوں نے ملت اسلامیہ کا مزاج اہل بیتؑ کے بارے میں اعتدال پر چھوڑ دیا ہوگا۔ اور ان حکومتوں نے اپنے شاہی خزانوں کے ساتھ سرمایہ عداوت اہل بیتؑ عوام میں تقسیم نہ کیا ہوگا۔ چھ سو برس تک جس عداوتِ اہل بیتؑ کی کھیتی لہلہاتی رہی اس کے کتنے بیج ہر طرف منتشر ہو چکے ہوں گے۔ انصاف سے بتایئے کہ اس عظیم ترین قربانی کی یادگار کے لئے شریعت نے اگر کوئی مخصوص ضابطہ معین کیا ہوتا تو وہ اس مسموم فضا میں کیونکر لائق عمل ہوتا۔ وہ حکومتیں جو جان اہل بیت ہی کی دشمن نہ تھیں بلکہ نام و نشان اہل بیت کی دشمن تھیں ان کے مسکن ہی کی نہیں بلکہ ان کے مدفن کی دشمن وہ یادگار حسینؑ منانے دیتیں جس میں براہ راست ان پر حملہ تھا۔ اور پورا پورا ان پر الزام تھا جس میں ان کی انتہائی رسوائی اور بدنامی تھی اور ان کے ظلم و ستم کی اشاعت تھی۔ حقیقۃً شریعت کا یہ انتہائی پہلوئے رحمت ہے کہ اس نے حسینی یادگار کو کسی مخصوص طریقہ اور عنوان میں منحصر نہ کیا۔ ورنہ فدایان اہل بیتؑ جو کمتر کمزور اور منتشر تھے اگرچہ جوش ہمت سے مجبور ہو کر اس یادگار کے منانے کے لئے کھڑے ہوتے بھی تو یہ حکومتیں ان کو صفحہ ہستی سے مٹا کر چھوڑتیں۔ یہ مصالح تھے شریعت کی نظر میں کہ اس نے یادگار حسینؑ اور اظہار غم آل محمدؐ کا کوئی مخصوص عنوان نہ مقرر کر کے ہوا خواہان آل محمدؐ کو یہ موقع دے دیا کہ جو

شخص جس زمانہ میں جس مقام پر اپنی استطاعت اور امکان کے بقدر اظہار غم اہل بیت اور یادگار قربانی آل محمدؐ کا جو عنوان بھی اختیار کر سکے اختیار کر لے لہذا اب کسی کا یہ سوال کرنا کہ آپ کے یہاں جو مراسم تعزیت اب ہیں یعنی یہ تعزیئے یہ علم یہ ماتم یہ تابوت اور ان کے جلوس یہ سبیلیں یہ نذر و نیاز کیا آئمہ اہلبیتؑ کے زمانہ میں اور قرون اولیٰ میں تھیں کتنا بے محل ہو جاتا ہے۔ یزید مروان اور ان کے امثال کے دور حکومت میں ایسی کسی بھی یادگار حسینی کا کوئی سوال پیدا ہو سکتا تھا۔

نوٹ (ہمارا مطلب بھی یادگار حسینؑ اور اظہار غم آلِ محمدؐ سے ایسی اجتماعی یادگار ہے جسے منظر عام پر لایا جا سکے۔ ورنہ انفرادی اور محدود حیثیت میں یادگار منانے اور اظہار غم آلِ محمدؐ کے سلسلہ میں ہدایات آئمہ طاہرینؑ موجود ہیں)۔

ہم زندہ و جاوید کا ماتم نہیں کرتے

مظلوم کربلاؑ پر گریہ و بکا اور ماتم عزا کے مقابلہ میں کبھی کبھی یہ جملہ بھی سننے میں آتا ہے کہ ہم زندۂ جاوید کا ماتم نہیں کرتے۔ یوں تو ہر ایک انسان فاعل مختار ہے جس عمل کو چاہے اختیار کرے جس کو نہ چاہے نہ کرے۔ کون کسی کو مجبور کر سکتا ہے خالق ہی نے اپنے احکام کی تعمیل کے لئے مجبور نہ کیا تو اور کسی کو کیا حق لیکن بعض کلمات بظاہر ایسے خوش آئند ہوتے ہیں کہ سادہ لوح انسان ان کلمات کی خوش نمائی کی وجہ سے آسانی سے قبول کر لیتے ہیں۔ اور بعض اوقات محروم سعادت ہو جاتے ہیں۔ جملہ مذکورہ اس لئے زیادہ خطرناک ہے کہ متکلم ماتم حسینؑ کی مخالفت کی بنا حسینؑ سے کنارہ کشی اور بے تعلقی کی بجائے حسینؑ سے وابستگی اور خوش عقیدتی کو قرار دے رہا ہے۔ وہ مان رہا ہے کہ حسینؑ شہید راہ خدا ہیں یہ ہوا حسینؑ کا ماننا پھر وہ مان رہا ہے کہ شہدا راہ خدا زندۂ جاوید ہیں یہ ہوا قرآن کا ماننا اب وہ حسینؑ اور قرآن سے خوش عقیدتی کا جامہ پہن کر ماتم کی مخالفت کرتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ حسین تو زندہ ہیں۔ تم ماتم کیوں کر رہے ہو بتایئے اس دل کش تقریر کو کون نہ مانے اور کیوں نہ مانے۔ مجھے سب سے پہلے تو یہ دریافت

کرنا ہے کہ کیا گریہ وزاری اور انداز ماتم صرف موت ہی کے لئے مخصوص ہے کیا فطرت انسانی موت کے علاوہ اور کسی حادثہ پر گریاں ونالاں نہیں ہوتی۔ تاریخ عالم اور مشاہدہ روزگار کی طرف سے اس کا جواب نفی میں ملے گا۔ اور کسی دقت نظر کے بغیر ہر انسان یہ کہنے پر مجبور ہوگا کہ موت کے علاوہ ہزاروں حادثات اور حالات ہیں جو انسان کو رلاتے رہتے ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ موت کے علاوہ کسی بات پر چشم فطرت غمناک اور اشک بار نہیں ہوتی۔ فطرت صالحہ کے اعلیٰ نمونوں کو دیکھ لیجئے۔ انبیا خدا کو اور ان کا فیض صحبت حاصل کرنے والوں کو دیکھ لیجئے۔ حالات غم کا تو کیا ذکر اور کسی سطحی انسان کا تو کیا تذکرہ حضرت سارہ جو خلیل اللہ جیسے پیغمبر کی زوجہ اور صحابیہ ہیں اور اسحاق جیسے مخزن نبوت کی ماں ہیں صرف ولادتِ فرزند کی خبر سن کر خلیل اللہ اور ملائکہ مقربین کی موجودگی میں حیرت زدہ ہو کر اپنا منہ پیٹ لیتی ہیں نہ معصوم فرشتے روکتے ہیں نہ معصوم پیغمبر ٹوکتے ہیں۔ قرآن مجیدہ پارہ ۲۶ سورہ ذاریات میں ارشاد الٰہی ہوتا ہے فاقبلت امراتہٗ فی صرّۃٍ فصکت و جھھا وقالت عجوزٌ عقیم یعنی زوجہ خلیل نے حیرت زدہ ہو کر اپنا منہ پیٹ لیا اور کہا کہ میں تو نہایت ضعیفہ اور بانجھ ہوں۔ اب مورث انبیاء بنی اسرائیل حضرت یعقوبؑ کو دیکھئے کس قدر روئے اور سامنے کی بات ہے کہ یہ رونا مفارقت یوسفؑ پر تھا کسی کی موت پر نہ تھا۔ آپ کو معلوم تھا کہ یوسفؑ زندہ ہیں اور بفرض محال یوسفؑ کا زندہ ہونا بھی اگر معلوم نہ تھا ہر صورت میں حضرت یعقوبؑ کا یہ رونا کسی کی موت سے کوئی تعلق نہ رکھتا تھا حالانکہ آپ کو بعلم نبوت یوسف کا صرف زندہ ہونا ہی معلوم نہ تھا بلکہ یوسفؑ کا تمامتر مستقبل معلوم تھا چنانچہ جب برادران یوسفؑ نے اپنے باپ سے آکر کہا کہ یوسف کو بھیڑیئے نے کھالیا تو آپ نے جواب دیا بل سولت لکم انفسکم امرا یہ بات تمہاری خود کی بنائی ہوئی ہے انی اعلم من اللہ مالا تعلمون اور میں بہ تعلیم ربانی وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے (سورہ یوسف) اور کسی پیغمبر کا کیا ذکر خود سرور کائناتؐ نے جب علیؑ مرتضٰی کے متورم اور زخمی پیروں کو سفر ہجرت طے کرنے کے بعد دیکھا تو سرکار رونے لگے۔ علامہ ابن

اثیر جزری المتوفی ۶۳۰ ہجری جو اکابر علماء اہل سنت سے ہیں اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ میں تحریر فرماتے ہیں وخرج علی" من مكة فى طلب رسول الله بعد ما اخرج اليه اهله' يمشى الليل و يمكن النهار حتىٰ قدمه المدينة فلما بلغ النبى قدومه قال ادعوالىّ علياً قيل يا رسول الله لا يعتدان يمشى فاتاه النبى فلما رآه اعتنقه وبكى ارحمة لمابقدميه من الوده وكانتا تقطران دماً فتفل النبى فى يديه و مسح برجليه و دعاله' بالعافية فلم يستكهما حتىٰ استشهد رضى الله عنه یعنی علیؑ مرتضیٰ مکہ سے اہل و عیال پیغمبرؐ کو ساتھ لے کر رسول اللہ کی جانب چلے رات کو سفر اور دن میں قیام فرماتے تھے تا اینکہ مدینہ پہنچے جب سرکار رسالتؐ کو آمد علیؑ کی اطلاع ہوئی تو فرمایا کہ علیؑ کو میرے پاس بلاؤ عرض کیا گیا کہ یا رسولؐ اللہ اب ان میں چلنے کی طاقت نہیں ہے۔ پس نبیؐ خدا خود علیؑ کے پاس آئے اور جیسے ہی آپ نے علیؑ کو دیکھا گلے سے لگالیا اور جب علیؑ کے پیروں کو دیکھا کہ ان پر ورم ہے اور خون ٹپک رہا ہے تو رحمت للعالمین غمگین ہو کر رونے لگے اپنا لعاب دہن علیؑ کے پیروں کو لگایا اور علیؑ مرتضیٰ کے پیروں میں پھر کوئی تکلیف نہیں ہوئی یہاں تک کہ شہید ہو گئے۔ ملاحظہ فرمایا آپ نے محض صعوبت سفر سے علیؑ مرتضیٰؑ کے پیر متورم اور زخمی ہو گئے تھے جن کو دیکھ کر رسولؐ رونے لگے اس رونے کا تعلق کس کی موت سے ہے' یہاں موت کا کون سا واقعہ ہے' لہذا رونا صرف موت ہی پر نہیں ہوتا بلکہ دوسرے حالات و حادثات بھی رلا دیتے ہیں خود بخود یاد آگیا کہ کہاں علیؑ مرتضیٰ کے پیروں کا زخم اور ورم اور کہاں اس مظلوم کربلا کے زخم جس کے زخموں کا شمار نہ رہا۔ کہاں علیؑ مرتضیٰ کے پیروں سے خون کا ٹپکنا اور کہاں مظلوم کربلا کا خون میں نہانا السلام علیٰ من دمه' غسله'

حضرت حمزہ جنگ احد میں شہید ہوئے پیغمبرؐ خدا جب مدینہ واپس تشریف لائے طبقات ابن سعد میں مذکور ہے کہ سرکار نے جب زنان بنی عبدالاشہل کا اپنے مقتولین کے لئے رونا سنا تو فرمایا کہ حمزہ کا کوئی رونے والا نہیں سعد بن معاذ صحابی یہ سنتے

ہی ان مستورات کو دروازہ پیغمبرؐ پر لائے ان مستورات نے حضرت حمزہ پر گریہ و بکا کی سرکار نے سنا تو ان کو دعا دی پھر تو زنان انصار نے حضرت حمزہ پر گریہ کئے بغیر اپنے کسی مقتول پر گریہ ہی نہ کیا۔ شہید بلکہ سید الشہداء ہیں حمزہ لیکن پیغمبرؐ چاہتے ہیں کہ اور شہیدوں کی طرح حمزہ کو بھی رویا جائے اصحاب چاہتے ہیں کہ پیغمبرؐ کی خواہش بہت جلد پوری ہو کیا حیات شہدا کے بارے میں ان لوگوں کا ایمان پیغمبرؐ اور اصحاب پیغمبر سے بھی زیادہ ہے جو زندہ جاوید کا ماتم نہیں کرتے۔ شہدائے راہ خدا کی زندگی میں کس کو شبہ ہو سکتا ہے لیکن ہماری زندگی ان کی زندگی کا مقابلہ نہیں کر سکتی ہماری اس دنیاوی زندگی کے احکام اور قیود ان کی زندگی پر عائد نہیں ہو سکتے وہ زندہ ہیں لیکن ہماری طرح کی ان کی زندگی نہیں۔ ہماری اس زندگی کے بارے میں احکام شریعت کیا ہیں یہی تو کہ اگر کوئی شخص زندہ ہے تو اس کی نماز جنازہ نہیں ہو سکتی زندہ کو دفن کرنا حرام ہے کسی کی زوجہ اپنے شوہر کی زندگی میں طلاق کے بغیر کسی سے عقد نہیں کر سکتی۔ کسی زندہ کے املاک و اموال اس کے ہونے والے ورثہ پر تقسیم نہیں کئے جا سکتے اسی طرح ہم عموماً کسی زندہ کا ماتم بھی نہیں کرتے۔

لیکن کیا یہ سب امور شہدا کے لئے بھی ہیں وہ زندہ ہیں تو کیا ان کی بھی نماز جنازہ نہیں پڑھی جا سکتی۔ وہ زندہ ہیں تو کیا اُن کا بھی دفن کرنا حرام اور موجب جہنم ہے وہ زندہ ہیں تو کیا ان کی بھی ازواج کسی سے عقد کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتیں۔ وہ زندہ ہیں تو کیا ان کے املاک بھی ان کے وارثوں کو نہیں دیئے جا سکتے اگر یہ سب کچھ نہیں ہو سکتا تو بے شک ان کا ماتم بھی نہ کیجئے لیکن اگر شہدا کا جنازہ پڑھنا جائز ہی نہیں بلکہ فرض ہے اگر شہدا کا دفن کرنا حرام نہیں بلکہ دفن نہ کرنا حرام ہے اگر اموال شہدا کا ان کے وارثوں تک پہنچانا فرض ہے تو پھر ان کو رونا اور ان کا ماتم کرنا کیوں نادرست ہے اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ شہداء صرف ماتم نہ کئے جانے کے لئے زندہ ہیں اور کسی بات کے لئے زندہ نہیں۔ خداوند عالم ہمیں توفیق دے کہ ہم کبھی ان طاہرینؑ کے دامن کو نہ چھوڑیں دامن کو چھوڑ دینے والوں کے لئے نجات نہیں۔

محسنۂ اسلام

عطاءِ منصبِ رسالت پر قدرت نے منت واحسان کا بار اپنے محبوب پیغمبر پر نہیں رکھا بلکہ آپ کو تبلیغ رسالت اور ارشاد و ہدایت کے لئے کھڑا کر کے بار منت و احسان افراد امت پر رکھتے ہوئے فرمایا۔ ''لقد منّ اللّٰہ علی المئومنین اذ بعث فیھم رسولاً منھم الخ''، یعنی اللہ نے مومنین پر احسان کیا کہ اُن کی ہدایت وارشاد کے لئے نوعِ انسانی میں سے ایسا رسول بھیجا۔ اس کے مقابلہ میں جو ارشاد ربانی حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ہوا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قدرت نے اُس ذوالعزم صاحبِ کتاب و شریعت پیغمبر (موسیٰؑ) کو بار بار اپنے کرم کا واضح الفاظ میں ممنون قرار دیا۔ حضرت موسیٰ جب بارگاہ قدس میں عرض کرتے ہیں رب اشرح لی صدری ویسرلی امری واحلل عقدۃ من لسانی یفقھوا قولی واجعل لی وزیراً من اھلی ھارون اخی الخ یعنی میرے رب تو میرے سینہ میں وسعت پیدا کر دے اور میرے کام کو میرے لئے سہل کر دے اور میری زبان کی گرہ کو کھول دے کہ لوگ میری بات کو سمجھیں اور میرا ایک وزیر بنا دے جو میرے اہل سے ہو یعنی میرے بھائی ہارون کو الخ تو جواب قدرت ہوتا ہے قد اوتیت سئولك یا موسیٰ ولقد مننا علیك مرۃ اخریٰ۔ یعنی اے موسیٰ تمہارا سوال تم کو دے دیا گیا اور ہم نے آج ہی نہیں بلکہ اس سے پہلے بھی ایک اور بار تم پر احسان کیا تھا۔ اس تقابل سے صاف طور پر نمایاں ہو رہا ہے کہ حضرت موسیٰؑ نبی مرسل، صاحب کتاب اور ذوالعزم ہونے کے

باوجود کچھ اور ہیں اور یہ عظیم القدر آخری نبی اپنے علوءِ مرتبت کے اعتبار سے کچھ اور ہے۔ وہاں خود موسیٰ کو پے در پے ممنون قرار دیا جارہا ہے لیکن یہاں بارِ منت خود اس نبیؐ پر نہیں بلکہ امت پر رکھا جارہا ہے جس ذات احدیت نے عطاء منصب رسالت پر اس نبی کو ممنون کرم نہ قرار دیا اُس نے سورہ والضحیٰ میں اپنی اُن تین مہربانیوں کا ذکر ضرور فرمایا جو آپ کی یتیمی کی حالت سے شروع ہو کر بالترتیب آپ کی خانہ آبادی پر منتہی ہوتی ہیں۔

یہ امر بھی ذہن نشین کرنا ضروری ہے کہ یہ سورہ مکی ہے اور ہجرت نبیؐ سے پہلے نازل ہوا ہے اس میں نبیؐ پر اللہ کی اُن ہی مہربانیوں کا ذکر ہے جو ہجرت سے پہلے پہلے مکہ میں پے در پے ہوتی رہیں۔

پہلی مہربانی : الم یجدك یتیماً فاٰوٰی یعنی کیا یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو یتیم پایا تو فوراً آرام و آسائش کی جگہ دی۔

دوسری مہربانی : ووجدك ضالاً فھدیٰ۔ یعنی تم پر اُس نے روزی کمانے کا راستہ بند پایا تو روزی کمانے کا راستہ بتادیا۔

تیسری مہربانی : ووجدك عائلاً فاغنیٰ۔ (یعنی) اور اس نے تم کو تنگدست پایا تو غنی اور تونگر کر دیا۔ اب ہم ان تینوں مہربانیوں کی بقدر ضرورت تفصیل کرتے ہیں۔

پہلی مہربانی یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو یتیم پا کر فوراً آپ کی پرورش کا لائق ذکر انتظام کر دیا۔ یہاں دو چیزیں لائق تحقیق ہیں ایک یہ کہ آپ کی یتیمی سے مراد کونسی اور کس وقت کی یتیمی ہے۔ دوسرے یہ کہ قدرت نے مذکورہ یتیمی پر آپ کی پرورش کا جو مناسب اور لائق ذکر انتظام فرمایا اس سے مراد کونسا انتظام ہے۔

یہ بات نظر میں رکھنا چاہیے کہ الفاظ قرآنی ناقص اور نامکمل معنی میں نہیں بلکہ کامل اور اکمل معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔

سرکار کی یتیمی کے کئی درجے ہیں۔ پہلے آپ یتیم پدر ہوئے پھر یتیم مادر بھی ہو

گئے لیکن دونوں طرف سے یتیم ہونے کے باوجود یتیمی کا ایک درجہ اور باقی تھا کیونکہ آپ کے دادا (حضرت عبدالمطلب) موجود تھے۔ دادا اپنے پوتے کا ولی شرعی ہے جو باپ کا باپ ہونے کی بناء پر اپنے پوتے کا حقیقی مربی ہے اس لئے سرکار کی مکمل یتیمی دادا کی وفات پر ہوئی لہذا الم یجدك یتیماً سے مراد یہی یتیمی ہے جو آپؐ کے دادا کی وفات پر ہوئی۔

اسی طرح فآوئ پر نظر کرنا ہے۔ آپ کے یتیم پدر و مادر ہونے کے بعد آپ کی پرورش کا ٹھکانہ یقیناً آپ کے جد نامدار تھے لیکن آپ ابھی تقریباً آٹھ ہی برس کے تھے کہ دادا کا سایہ بھی اُٹھ گیا اور آپ پھر بے ٹھکانہ ہو گئے مکمل ٹھکانہ وہی ہو سکتا ہے جس کے بعد پھر کسی مربی کی ضرورت نہ رہے لہذا ادھر مکمل یتیمی اور ادھر مکمل ٹھکانہ دیکھا جائے تو بات بالکل واضح ہے کہ قدرت کی طرف سے اپنے حبیب پر جس مہربانی کا ذکر ہو رہا ہے اس سے مراد یہی اور صرف یہی ہے کہ ہم نے تم کو ہر طرف سے یتیم پا کر ابو طالب کے ظلِ عاطفت اور دامانِ تربیت میں دے دیا۔ جس کے زیر سایہ پرورش پا کر تم جوان ہوئے تمہاری خانہ آبادی ہوئی، اور تم غنی اور مستغنی ہو گئے۔

دوسری مہربانی: ووجدك ضالاً فهدیٰ۔ بہت ممکن ہے کہ آیت میں لفظ ضال دیکھ کر عموماً یہ سمجھا جائے کہ یہاں معاذ اللہ سرکار کی بے دینی یا دین سے بے خبری مراد ہے اور ہدیٰ سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وحی اور اپنا پیغام بھیج کر تم کو دین داری کی ہدایت کی حالانکہ دنیا میں کوئی بھی نبی ایسا نہیں جو کہ کسی وقت بھی گمراہ یا بے دین یا دین سے بے خبر رہا ہو۔ حضرت موسیٰؑ رضاعت کے بالکل آغاز میں ہی حلال و حرام کو جانتے اور سمجھتے تھے چنانچہ آیت قرآنی ہے حرمنا علیه المراضع من قبل۔ ہم نے موسیٰؑ پر دودھ پلانے والیوں کا دودھ پہلے ہی سے حرام کر دیا تھا۔ موسیٰ نے حرام جان کر ہی کسی کا دودھ نہ پیا۔ حضرت عیسیٰؑ گہوارہ میں کہہ رہے ہیں ''اتانی الکتاب وجعلنی نبیاً'' اللہ نے مجھے کتاب بھی دی ہے اور نبی بھی قرار دیا ہے پھر اس نبی کو جو سیدِ انبیاء ہے معاذ اللہ بے دین کیسے سمجھا جا سکتا ہے جو حدیث متفق علیہ بین الفریقین میں

فرمارہاہے۔ کنت نبیاً و آدم بین الماء والطین یعنی میں خلقتِ آدم کے پہلے سے نبی تھا۔ اس تمام بحث کے علاوہ ان تینوں مہربانیوں کی ترتیب پر پھر ایک نظر کی جائے تو حقیقت سامنے آجائے گی۔ پہلی مہربانی یہ کہ یتیمی میں آپ کو پناہ دی' دوسری مہربانی جو زیرِ بحث ہے ابھی اس کو نہ چھیڑیئے' تیسری مہربانی یہ کہ تم کو تنگدست پاکر مالدار کر دیا۔ ظاہر ہے کہ مکہ میں آپ مالدار کب اور کس طرح ہوئے صرف اس وقت جب کہ انتظام قدرت نے ملکہ حجاز حضرت خدیجۃ الکبریٰ کو آپ کی زوجیت میں دیااور مقلب القلوب نے حضرت خدیجۃ الکبریٰ سے اُن کا سارامال و متاع شوہر کی نذر کر دیا۔ اس ایک صورتِ تونگری کے سوادوسری کوئی صورتِ تونگری جو مکہ میں ہجرت سے پہلے ہو دنیامیں کوئی بھی متنفس نہیں بتاسکتا۔ اب جبکہ تیسری یہ مہربانی حضرت خدیجۃ الکبریٰ سے تزویج کے زمانہ کی ہے تو وہ دوسری مہربانی جس کا ذکراس سے پہلے ہے وہ مہربانی آنحضرت کی تزویج سے پہلے ہی کی ہوئی اور یہ ظاہر ہے کہ آنحضرت کے اس عقد سے پہلے تو آپ پر نزول وحی نہیں ہواجو یہ کہا جاسکے کہ خداوندعالم نے آپ کی شادی سے پہلے وحی بھیج کر آپ کی دینداری کو صحیح کر دیا تھا۔ وحی تو آپ پر اس شادی کے پندرہ سال بعد آئی ہے۔ اگر ضالاً سے مراد دینی گمراہی ہوتی اور ہدیٰ سے مراد وحی کے ذریعہ سے رہنمائی ہوتی تو یہ جملہ آنحضرت کی شادی اور شادی کے نتیجہ میں مالداری کے ذکر کے بعد ہوتا لیکن ترتیبِ بیانِ قدرت تو صاف بتارہی ہے کہ اللہ اپنے نبیؐ پر ان مہربانیوں کا ذکر کر تارہاہے جن میں کی آخری مہربانی یہ ہے کہ قدرت نے ملکہ حجاز سے آپ کے گھر کو آباد کر کے آپ کو متمول اور غنی کر دیا۔ یہ ہے وہ اللہ کی مہربانی جو پہلی دونوں مہربانیوں کے بعد ہوئی اور وہ پہلی دونوں مہربانیاں اس آخری مہربانی سے پہلے ہوئیں۔

اس کے ساتھ ساتھ ہم صحیح مفہوم کو تولنے کے لئے ایک اور ترازو پیش کرتے ہیں یعنی یہاں پہلے تو قدرت نے اپنے نبیؐ پر اپنے تین قسم کے فضل و کرم کا ذکر کیا پھر اُسی ترتیب سے ہر مہربانی کے مقابلہ میں نبیؐ کو تین باتوں کا حکم دیا۔

تیسری مہربانی اور اس کے مقابلہ میں تیسرا حکم۔

پہلی مہربانی کیا تھی ؟ ''الم یجدك یتیماً فاٰوٰی'' اس کے مقابلہ میں پہلا حکم ''فامّا الیتیم فلا تقھر '' یعنی ہم نے تم کو یتیم پاکر پناہ دی تو تم بھی یتیم پر سختی نہ کرنا۔

دوسری مہربانی۔ تم روزی کمانے والے نہ تھے ہم نے روزی کمانے کا راستہ دے دیا اس کے مقابلہ میں امّا السائل فلا تنھر تم بھی کسی نادار سوالی کو نہ جھڑکنا۔

تیسری مہربانی : ووجدك عائلاً فاغنیٰ اس کے مقابلے میں امّا بنعمة ربك فحدّث یعنی ہم نے تم کو تنگدست پاکر غنی کر دیا لہٰذا تم بھی اپنے رب کی دی ہوئی نعمت کو (راہ خدا میں) صرف کرو یہاں ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ قدرت نے جس ترتیب سے اپنے فضل و انعام کا ذکر کیا ہے اسی ترتیب سے ایک ایک حکم بھی دیا ہے۔

اگر ووجدك ضالاً فھدیٰ کے معنی یہ لئے جاتے ہیں کہ ہم نے تم کو بے دین پاکر دین کا راستہ دکھایا تو اس کے مقابلہ میں یہ جملہ بالکل بے ربط ہو جاتا ہے کہ تم بھی کسی فقیر و محتاج سائل کو نہ جھڑکو کیونکہ دوسری مہربانی کے مقابلہ میں حکم کا یہی دوسرا جملہ ہے اگر ضالاً فھدیٰ سے مراد یہ ہوتی کہ ہم نے تم کو بے دین سے دیندار کر دیا تو اس کے مقابلے میں جملہ ایسا آنا چاہیے تھا کہ تم بھی بے دینوں کو ہدایت کر کے صحیح راستے دکھاؤ۔ لیکن ایسا نہیں فرمایا۔

اصل میں ضلال کے معنی صرف دینی گمراہی کے سمجھنا ہی غلطی ہے۔ یہ لفظ جہاں دینی گمراہی کے لئے استعمال ہوتا ہے وہاں اس لفظ کے اور بھی بہت سے مفہوم ہیں۔ قرآن مجید میں یہ لفظ دوسرے مفاہیم میں بھی جا بجا استعمال ہوا ہے۔ الم یجعل کیدھم فی تضلیل یہاں ضلال کے معنی بربادی اور تباہی کے ہیں۔ ضللنا فی الارض یہاں اجسام کا زیر زمین خاک ہو جانا مراد ہے غرضیکہ یہ لفظ ہر قسم کی تباہ حالی کے لئے اور ہر قسم کے مقصد کا راستہ نہ پانے کے لئے استعمال ہوتا ہے وہ مقصد خواہ دنیا کا ہو یا دین کا ہو۔ سرکار کو یتیمی کی حالت میں بہترین ٹھکانہ مل جانا' یہ قدرت کا آپ پر پہلا کرم ہے۔

جوان ہونے پر ذریعہ معاش کا اختیار کرنا ایک ضروری اور فطری خواہش ہے۔ جوان ہونے پر انسان ماں باپ کا بھی دست نگر رہنا گوارا نہیں کرتا۔ سرکار کو ذریعہ معاش اختیار کرنا تھا قدرت نے اپنے تصرف سے آپ کو خدیجۃ الکبریٰ کے کاروبار تجارت کے لئے ان کا سربراہ اور مختار بنا دیا آپ کی برکت سے پہلے سے زیادہ اس تجارت میں منفعت ہوئی آپ کے معینہ حقوق آپ کو ملنے لگے اور اس طرح آپ اپنی روزی خود کمانے لگے۔

روزی کمانے کا راستہ جو بند تھا وہ کھل گیا لیکن ظاہر ہے کہ اس سلسلہ میں جو آپ کو ملتا گیا وہ اس حیثیت کا نہ تھا کہ آپ کو تونگر یا مالدار کہا جا سکے۔ قدرت نے جو تیسری مہربانی کی وہ یہ تھی کہ آپ کی صداقت اور دیانت خوش خلقی اور صفاءِ باطن کے پاکیزہ اثرات حضرت خدیجہ کے دل صافی پر قائم ہوتے رہے۔ معظّمہ اپنے غلام میسرہ کی زبانی آپ کے کرامات کا بھی ذکر سنتی رہیں بالآخر جب انہوں نے ایک سفر سے آتے ہوئے بچشم خود دیکھ لیا کہ آپ کے سر اقدس پر ابر سایہ کئے ہوئے آپ کے ساتھ ساتھ حرکت کر رہا ہے تو سمجھ گئیں کہ یہ اللہ کا مخصوص اور محبوب بندہ ہے۔ طے کر لیا کہ جیسے کفوِ کریم کی مجھے تمنا تھی یہ میری خواہش اور آرزو سے بھی کہیں زیادہ بلند و برتر ہیں۔ بعنوانِ شائستہ اپنی پسندیدگی ظاہر کی۔ سرکارؐ نے اپنے بہترین مربی اور شفیق ترین چچا حضرت ابو طالب سے ذکر کیا اور بالآخر سرکار کے اس مبارک اور مقدس بزرگ نے خود جا کر فصیح و بلیغ خطبہ نکاح پڑھ کر طاہر کا طاہرہ سے عقد پڑھا۔ وفادار زوجہ نے اپنا وہ تمام تر تمول جس کے لئے وہ ملکہ حجاز کہی جاتی تھیں شوہر کی نذر کر دیا گویا زبانِ حال سے کہہ رہی تھیں کہ میرا جو کچھ تھا وہ سب آپ کا ہے میرے لئے یہی کافی ہے کہ آپ میرے ہیں یہ ہے ووجدك عائلاً فاغنیٰ۔ خدیجۃ الکبریٰ کے کثیر المال اور صاحب دولت ہونے کا اب کوئی اظہار کرے یا نہ کرے قدرت کا فاغنیٰ کہہ دینا بہترین شہادت ہے جس کے بعد کسی شاہد کی ضرورت ہی نہیں۔ یہ خدیجۃ الکبریٰ ہی کی دولت تھی جو تبلیغ اسلام کی راہ میں پانی کی طرح بہتی رہی۔ تفصیل سے بیان کرنے کا موقع نہیں

پا تا ورنہ فریقین کے بیانات سے جن کو کتاب اسوۃ الرسول میں کتب معتمدہ سے نقل کیا گیا ہے پتہ چلتا ہے کہ معظّمہ خلائق کی وہ دولت اُن کی وفات کے بعد اور تین سال بعد آنحضرتؐ کی ہجرت کی مہم میں صرف ہوئی۔ یمن سے آئے ہوئے دو اونٹ امیر المومنین نے خریدے راستہ بتانے والوں کا انتظام کیا کھانا اور ہر قسم کی ضرورتوں کو پورا کر کے آنحضرت کی خدمت میں ارسال کیا۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام مصارف اسی معظّمہ کی بقیہ دولت سے پورے ہوئے۔ خدا بُرا کرے حق پوشی کا کہ اس محسنہ اسلام اور سابقۃ الاسلام کو بھی معاندانہ جذبات نے نہ چھوڑا۔ خدا جانے کہ کب اور کس نے شانِ معظّمہ کی تنقیص کے لئے اور نظر سے گرانے کے لئے یہ تصنیف کیا کہ یہ معظّمہ آنحضرت کی زوجیت میں آنے سے پہلے دو مرتبہ بیوہ ہو چکی تھیں۔ کسی نے یہ نہ سوچا کہ جس پاکیزہ صدف میں گوہر فاطمی آنے والا ہو قدرت یہ کیسے گوارا کر سکتی ہے کہ وہ انتہائی پاک و پاکیزہ نہ رہے پھر خداوند عالم اپنے حبیب و محبوب پیغمبر کے لئے یہ کیسے پسند کر سکتا ہے کہ اس کی پہلی رفیقہ حیات اُس سے پہلے دوسرے گھروں میں رہ چکی ہو۔ اس پر طرہ یہ کہ اس تصنیف کو اتنا پھیلایا گیا کہ غیر تو غیر اپنے بھی یقین کرنے لگے۔ حالانکہ مذہب و ملت کے بہترین علماء جو تحقیق حق کے شہنشاہ ہیں صاف کہہ رہے ہیں کہ خاتون مذکورہ باکرہ (کنواری) تھیں۔ یہ بالکل غلط ہے کہ وہ بیوہ تھیں۔

علامہ مجلسیؒ حیات القلوب میں لکھ رہے ہیں کہ جناب سید مرتضیٰ علم الہدیٰ اور محقق طوسی کی تحقیق ہے کہ خدیجۃ الکبریٰ باکرہ تھیں۔ آنحضرت سے پہلے کوئی ان کا شوہر نہیں ہوا۔ کیا ان دونوں بزرگوں کے مقابلہ میں کسی محقق کو ترجیح دی جا سکتی ہے؟ کیا ان حضرات کے سامنے کسی کو محقق کہا جا سکتا ہے۔

ام المؤمنین ہونا ہر زوجہ نبیؐ کے لئے شرف ہے لیکن اس بی بی کا مقام اس مقام سے کہیں بلند ہے کیونکہ وہ اُم المعصومہ بھی ہیں۔ آخر میں اس کا اظہار بھی مناسب ہوگا کہ سورہ مذکورہ میں ساتھ ساتھ جن دو ہستیوں کا ذکر ہے یعنی وہ عم رسول جو پناہ گاہ رسول قرار پائے (حضرت ابو طالب) اور وہ زوجہ رسول جس کے مال و دولت سے سرکار غنی

ہو گئے (حضرت خدیجہ) ان دونوں محسن اسلام کی وفات بھی بعثت نبی کے دس سال بعد ایک ہی سال میں ہوئی جس سال کا نام آنحضرت نے عام الحزن رکھا۔ جناب خدیجۃ الکبریٰ کی وفات ماہ رمضان المبارک کی دسویں تاریخ کو ہوئی۔ ہزاروں برکتیں ہوں ان دونوں محسنانِ اسلام پر اور ان کے پاکیزہ گھرانے پر۔

☆☆☆

سورۂ دہر کے بارے میں

بعض محبانِ اہل بیت علیہم السلام عرصہ سے ہم کو ترجمان القرآن نومبر ۱۹۷۰ء کے اس مضمون کی طرف متوجہ کر رہے ہیں جس میں فاضل مضمون نگار نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ سورۂ دہر (ہل اتی) مستقل طور پر براہِ راست اہل بیت رسولؐ کی شان میں نازل نہیں ہوا۔

حالانکہ جمہور علماء ملت اسلامیہ نے وہ سنی ہوں یا شیعہ اس کا اعتراف ہی نہیں بلکہ اعلان کیا ہے کہ سورہ مذکورہ اہل بیتؑ کی شان میں نازل ہوا جبکہ اہل بیتؑ نے ایفاء نذر کرتے ہوئے تین روز روزے رکھے اور ہر روز اپنا کھانا بالترتیب مسکین ویتیم واسیر کو دیا۔ امام شافعیؒ جو حضراتِ اہل سنت کے آئمہ اربعہ میں سے ایک جلیل القدر امام ہیں ببانگِ دھل فرمارہے ہیں :

الام الام وحتّی متٰی اعاتب فی حبّ ھذالفتیٰ
فھل زوّجت فاطمة غیرہٗ وفی غیرہ ھل اتیٰ ھل اتیٰ

یعنی کب تک اور کب تک اور آخر کب تک مجھ پر اس فتیٰ (علیؑ) کی محبت کی وجہ سے عتاب کیا جاتا رہے گا۔ میں پوچھتا ہوں کہ فاطمہ زہراؑ کی تزویج علیؑ کے سوا کسی اور سے ہوئی اور کیا سورۂ ہل اتی علیؑ کے سوا کسی اور کے بارہ میں آیا۔

امام شافعیؒ ہی کا یہ کلام ہے جس کو علامہ میبدی نے فواتح میں تحریر کیا ہے :

انا عبد لفتٰی نزل فیہِ ھل اتیٰ الی متیٰ اکتمه الی متیٰ

یعنی میں تو اس فتیٰ کا غلام ہوں جس کی شان میں ہل اتیٰ آیا۔ میں کب تک

چھپاؤں اس کو اور اس کو چھپاؤں کب تک ؟

فرید الدین عطار کا یہ شعر مشہور ہے جو علی مرتضیٰؑ کی شان میں ہے اور تجنیس لفظی سے مرصّع ہے۔

از سنانش لافتی آمد پدید وزسہِ نانش هل اتی آمد پدید

یعنی علیؑ کی تلوار کے بارہ میں لافتیٰ آیا اور علیؑ کی تین روٹیوں کے متعلق سورۂ ہل اتی آیا۔

اس کے علاوہ حضرات اہل سنت کی نہایت مشہور و معروف کتابوں میں جا بجا یہی دکھایا گیا ہے کہ اس سورۂ کا نزول اہل بیت اطہارؑ کے ایفاء نذر اور اطعام مسکین و یتیم واسیر کے سلسلہ میں ہوا۔ تفسیر کشاف اور بیضاوی وغیرہ موجود ہیں جو عام طور پر درس و تدریس میں رہتی ہیں جس کا دل چاہے بچشم خود دیکھ لے۔

یہ بات کس قدر افسوس ناک ہے کہ جو آیات آل محمدؐ کے ایفاء نذر اور ان کے جود و سخا کی مدح میں آئیں۔ اُن میں براہ راست نہ کوئی خلافت کی بحث نہ امامت کا قضیہ نہ کسی پر کوئی طعن نہ تشنیع ایسی مرنجاں مرنج آیات کو بھی حق اہل بیتؑ دیکھنا اور دکھانا گوارا نہ ہو۔ خود ترجمان القرآن کی بھی مختلف عبارتوں سے ثابت ہو رہا ہے کہ آلِ محمدؐ کے اس ایفائے نذر اور اطعام کے واقعہ کو اور ان کی مدح میں آیاتِ سورہ ہل اتیٰ کے نازل ہونے کو متعدد رواۃ اور متعدد کتبِ اہل سنت نے بیان کیا ہے۔

چنانچہ (ترجمان القرآن میں) فرماتے ہیں :

”دراصل جس بنا پر اس سورۃ کے یا اُس کی بعض آیات کے مدنی ہونے کا خیال پیدا ہوا ہے وہ ایک روایت ہے جو عطاء نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے وہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ حسن و حسین رضی اللہ عنہما بیمار ہو گئے“ الخ

واقعہ کا آخری حصہ ترجمان القرآن میں عطا اور ابن عباس کی زبانی اس طرح ہے :

”چوتھے روز حضرت علیؑ دونوں بچوں کو لئے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ

علیہ و آلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حضورؐ نے دیکھا کہ بھوک کی شدت سے تینوں باپ بیٹوں کا برا حال ہے۔ آپؐ اٹھ کر ان کے ساتھ حضرت فاطمہؓ کے گھر پہنچے تو دیکھا کہ وہ بھی ایک کونے میں بھوک سے نڈھال پڑی ہیں۔ یہ دیکھ کر حضورؐ پر رقت طاری ہو گئی۔ اتنے میں جبریل علیہ السلام حاضر ہوئے اور انہوں نے عرض کیا کہ لیجئے اللہ تعالیٰ نے آپ کے اہل بیت کے معاملہ میں آپ کو مبارک باد دی ہے۔ حضورؐ نے پوچھا وہ کیا ہے؟ انہوں نے جواب میں یہ پوری سورۃ آپ کو پڑھ کر سنائی۔ ابن مہران کی روایت میں ہے کہ آیت ان الا برار یشربون سے لیکر آخر تک کی آیات سنائیں اور ابن مردویہ نے ابن عباس سے جو روایت نقل کی ہے اس میں صرف یہ بیان کیا گیا ہے کہ آیت یطعمون الطعام..... حضرت علی اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہما کے بارے میں نازل ہوئی ہے اس قصہ کا اس میں کوئی ذکر نہیں) یہ پورا قصہ علی بن احمد الواحدی نے اپنی تفسیر البسیط میں بیان کیا ہے اور غالباً اسی سے زمخشری، رازی اور نیشاپوری نے اسے نقل کیا ہے"۔(ترجمان القرآن ۱۴۲،۱۴۳)

ترجمان القرآن کی پوری عبارتِ بالا سے یہ بات صاف ظاہر ہو رہی ہے کہ اہل بیتؑ کے ایفاء نذر اور اطعام کے واقعہ کو اور اس واقعہ کی مدح میں آیات سورہ ہل اتیٰ کے نازل ہونے کو اہل سنت کے متعدد رواۃ اور متعدد علماء و مفسرین نے بیان کیا ہے۔ سب سے اوپر کی اُن کی عبارت میں یہ جملہ "اس سورۃ کے یا اس کی بعض آیات کے مدنی ہونے کا خیال پیدا ہوا ہے"۔ اس لفظ خیال کے متعلق عرض ہے کہ خیال نام ہے یقین سے کم درجہ کا جس میں شبہ کا وجود ہو اب امام شافعیؒ کا وہ جملہ جس کو ہم بیان کر چکے پھر دیکھئے وفی غیرہ ہل اتی ہل اتی کیا کوئی ہے علیؑ کا غیر جس کے بارہ میں ہل اتیٰ آیا اسی کے ساتھ امام شافعیؒ کا یہ جملہ انا عبد لفتی' نزل فیہ ہل اتی میں اس فتیٰ کا غلام ہوں

جس کی شان میں ہل اتی آیا۔ ان جملوں میں امام شافعیؒ اس اپنے نظریہ کو محض ایک خیال کی حیثیت دے رہے ہیں یا حق الیقین کی ؟

اسی طرح ترجمان القرآن کی عباراتِ مذکورہ میں ابن مردویہ کی ابن عباس سے یہ روایت دکھا کر یطعمون الطعام۔ حضرت علیؑ اور حضرت فاطمہؑ کے بارہ میں نازل ہوئی ہے۔ فاضل مضمون نگار کا یہ جملہ ''اس قصہ کا اس میں کوئی ذکر نہیں ہے'' عجیب جملہ ہے کیونکہ روایت میں قصہ کے نہ بیان ہونے سے کیا کمی رہ جاتی ہے جب کہ قصہ خود آیات میں بالتفصیل موجود ہے۔ بحث تو صرف اس کی ہے کہ آیات نے جس قصہ کو بیان کیا ہے یہ قصہ اور یہ تذکرہ ہے کس کا ؟ چنانچہ راوی نے بیان کر دیا کہ آیات نے یہ قصہ علی و فاطمہ کے بارہ میں بیان کیا ہے۔ وہی ان آیات کے ممدوح ہیں۔

اہل بیت علیہم السلام کے ایفاء نذر اور اطعام مسکین و یتیم و اسیر کا یہ واقعہ اور معتبر راویوں کا یہ بیان نہ روایت کے لحاظ سے کمزور ہے نہ درایت کے اعتبار سے۔

کیونکہ کسی روایت کو کمزور اُس وقت کہا جا سکتا ہے جب کہ اس روایت کی کوئی مضبوط اصل نہ ہو اس روایت کے معاملہ میں کوئی معارض اور مقابل روایت ہو اس سے یہ نسبتاً زیادہ قوی ہے۔

یہاں یہ صورت ہے کہ اس روایت کی اصل خود قرآن حکیم ہے جو اس واقعہ کو بالتفصیل بیان کر رہا ہے کہ مخصوص افراد (عباد اللہ) نے ایفاء نذر کیا۔ مسکین و یتیم و اسیر کو ذاتی ضرورت کے باوجود اپنا کھانا کھلایا اور یہ سب کچھ انہوں نے لوجہ اللہ کیا۔ یہ آیات تو ہیں اس روایت کی اصل جس سے زیادہ مضبوط کوئی اصل نہیں ہو سکتی۔ اب رہا یہ سوال کہ اس ایفاء نذر اور اطعام کے فاعل ہیں کون ؟ اور یہ عمل کیا کس نے ؟ تو یہاں اس ایک روایت کے سوا کہ یہ عمل اہل بیتؑ کا تھا کوئی دوسری روایت مقابلہ میں ہے ہی نہیں۔ آج تک کسی نے جھوٹوں بھی نہیں کہا کہ یہ عمل اہل بیتؑ کا نہ تھا کسی اور کا تھا یا اس عمل کے عامل اہل بیتؑ کے بجائے فلاں اشخاص تھے۔ ترجمان القرآن نے یا کسی نے بھی اہل بیتؑ کے سوا کسی اور کا نام لیا ہی نہیں اور اس روایت کے مقابلہ میں کوئی

دوسری روایت ہی نہیں تو اہل بیتؑ والی روایت کو کمزور کہہ کر وہ روایت کونسی ہے جس کو قوی کہا جائے؟ لہٰذا یہ روایت منفرد اور مطابق قرآن ہو کر روایت نہیں رہی بلکہ قرآنی آیت ہو گئی۔ اب رہا درایت کا مسئلہ یعنی یہ دیکھنا کہ جن افراد کا یہ عمل بتایا جارہا ہے اور جن حضرات کو اس ایفاء نذر اطعام کا فاعل دکھایا جارہا ہے ان سے اس قسم کا عمل متوقع ہو سکتا ہے یا نہیں اور یہ حضرات ایسے عمل کے عامل ہو سکتے ہیں یا نہیں تو یہ تذکرہ اگر کسی کنجوس، بخیل اور نفس پرور اور کم ظرف گھرانے کا ہوتا تو بے شک کہا جا سکتا کہ اس روایت میں ایسے اشخاص کو سخی اور فیاض دکھایا جارہا ہے جو انتہائی بخیل اور کنجوس تھے یا ان کی ایسی کوئی عطاد کھائی جارہی ہے جو ان کے دسترس ہی میں نہ تھی اور ان کے گھر میں دینے کیلئے وہ چیز ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ ان میں سے اگر کوئی صورت ہوتی تو روایت کو خلاف درایت کہا جا سکتا تھا لیکن کوئی انصاف سے کہے اور بتائے کہ یہاں ان دونوں صورتوں میں سے کوئی صورت ہے؟ ہرگز نہیں۔ یہاں ذکر ہے اس گھرانے کے نانِ جویں دے دینے کا جس کے برابر جواد و کریم رحمدل اور سخی کوئی گھرانہ ہو ہی نہیں سکتا جو خدا کے نام پر اور خدا کی راہ میں جانیں دے دیں۔ ان کے لئے جو کی روٹیاں دینا کیا مشکل ہے؟ لہٰذا روایت کو خلافِ درایت کہنا کس قدر غلط اور نادرست ہے؟

ان آیات کا نزول بر بناء امر نہیں ہوا بلکہ بر بناء خبر ہوا ہے

ان آیات کے بارے میں یہ کہنا غلط ہے کہ ان کا نزول کسی واقعہ کی بنیاد پر نہیں ہوا بلکہ ان آیات سے ایفاء نذر اور اطعام مساکین کا حکم دیا گیا ہے اور اس طرح یہ آیات خبر نہیں ہیں بلکہ امر ہیں۔

کیونکہ جو شخص بھی ان آیات پر بے تعصب نظر کرے گا وہ بالیقین یہی سمجھے گا کہ کوئی واقعہ بیان کیا جارہا ہے جس میں یہ بیان کیا جارہا ہے کہ بندگان خاص نے ایفاء نذر کیا اور خود ضرورت مند ہونے کے باوجود اپنا کھانا مسکین و یتیم و اسیر کو دے دیا جبکہ ان کی نیت یہ تھی کہ ہمارا یہ عمل صرف لوجہ اللہ ہے اس لئے نہیں کہ ان حاجت مندوں سے

کوئی بدلہ یا کوئی شکریہ چاہیں۔ ہم تو اللہ کی ناراضی سے اس روز کے بارے میں ڈرتے ہیں جو نہایت سخت اور دشوار گزار ہوگا۔ اس کے بعد اللہ کا یہ فرمانا کہ ہم ان کو اس روز کے شر سے بچا چکے اور ان کے صبر کے بدلے میں ان کو جنت دے چکے۔ اے ایفاء نذر کرنے والو اور مستحقین کو کھانا کھلانے والو یہ جنت جو ہم نے تم کو دی ہے یہ ہماری کوئی عطا اور بخشش نہیں ہے۔ یہ تو تمہارے عمل کا بدلہ ہے اور تمہاری سعی کے ہم شکر گزار اور قدر دان ہیں۔ کون عاقل یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ آیات بغیر کسی واقعہ کے وقوع کے آ گئیں اور ابھی جب کہ کام ہوا کچھ بھی نہ تھا خدا جنت بھی دے چکا اور شکر گزار بھی ہو گیا۔ اگر کوئی واقعہ (ایفاء نذر اور اطعام کا) وقوع میں آیا ہی نہ تھا اور یہ آیات اس ایفاء نذر اور اطعام مساکین کا شوق دلانے اور ان امور کا حکم دینے کے لئے آ رہی تھیں تو پہلے ان فرائض کا حکم دیا جاتا جو حقیقتہً فرائض ہیں اور اس سے کہیں زیادہ اہم ہیں جیسا کہ دوسرے مواقع پر آیات میں اقامت صلوٰۃ اور ایتاء زکوٰۃ جیسے اہم فرائض کو پہلے بیان کیا گیا ہے لیکن ان آیات میں نہ نماز کا حکم نہ زکوٰۃ کا نہ روزہ کا حکم نہ حج و جہاد کا ذکر ہے۔ صرف ایفاء نذر کا اور محتاجوں کو کھانا کھلانے کا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ محتاجوں کے کھانا کھلانے کو کوئی بھی عقلمند اداء زکوٰۃ فریضہ نہیں کہہ سکتا۔ ایفاء نذر اس وقت واجب ہے جب کوئی نذر مانے اور نذر کا ماننا کسی بھی مسلمان پر کسی وقت فریضہ لازمہ نہیں ہے اسی طرح زکوٰۃ فریضہ ادا کرنے کے علاوہ عام حالات میں محتاجوں کو کھانا کھلانا بھی کوئی فریضہ نہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ خداوند عالم فرائض کا ذکر چھوڑ کر صرف ان امور کا حکم دے رہا ہے جن کو اپنے اوپر فرض کر لینے کو لازمی فریضہ ہی نہیں قرار دیا گیا۔ پھر خصوصیت سے اس آیت میں ایک اسیر کو بھی کھانا کھلانے کا ذکر ہے جب کہ کسی بھی آیت قرآنی میں جہاں جہاں بھی فقراء و مساکین کے استحقاق کا ذکر ہے کہیں بھی لفظ اسیر نہیں آیا۔ مستحقین زکوٰۃ و صدقات آیات میں جا بجا بیان کئے گئے ہیں۔ اس فہرست میں ذوی القربیٰ' یتامیٰ' مساکین ' فقراء ' سائلین' ابناء سبیل (مسافران) مؤلفة القلوب یا غلاموں (کی رہائی) کا تو ذکر ہے لیکن لفظ اسیر کہیں بھی نہیں۔ چنانچہ آج بھی

لاکھوں دیندار اور پرہیزگار لوگ ایسے ہوں گے جنہوں نے اپنی زندگی بھر میں کبھی کسی اسیر کو روٹی نہ کھلائی ہو گی۔ ان تمام چیزوں سے بخوبی ثابت ہو رہا ہے کہ سورہ دہر کی یہ آیات کسی حکم اور امر کی حیثیت سے نہیں آئیں بلکہ بیان واقعہ اور خبر کی حیثیت سے نازل ہوئیں جن میں مذکورہ اعمال کے بجالانے والوں کی یعنی اہل بیت علیہم السلام کی مدح کی گئی نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج و جہاد ایسی کسی چیز کا ذکر اسی لئے نہیں کیا گیا کہ یہ چیزیں اس واقعہ کا جزو نہ تھیں۔ اشارہ صرف ان روزوں کی طرف ہے جو نذر کے تھے۔

مذکورہ روایت پر فاضل محترم نے جو اپنے خیالی اشکال وارد کئے ہیں ان کی کوئی حقیقت نہیں مثلاً فرمایا ہے کہ :

> "یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے کہ ایک مسکین، ایک یتیم اور ایک قیدی اگر آکر کھانا مانگتا ہے تو گھر کے پانچوں افراد (علی، فاطمہ، حسن، حسین اور فضہ) کا پورا کھانا اس کو دے دینے کی کیا معقول وجہ ہو سکتی ہے ؟ ایک آدمی کا کھانا اس کو دے کر گھر کے پانچ افراد چار آدمیوں کے کھانے پر اکتفا کر سکتے تھے"۔ (ترجمان القرآن)

جواباً عرض ہے کہ فاضل محترم نے یہ کہاں سے خود بخود ہی فرض کر لیا کہ ان حضرات میں سے ہر ایک کے پاس ایک آدمی کے شکم سیر ہو جانے کے لائق کھانا موجود تھا اور اس لئے صرف ایک آدمی کا کھانا سائل کے لئے کافی تھا؟ یہ مفروضہ محض مفروضہ ہے۔ ورنہ ہر ایک کا حصہ اس کی ضرورت سے کمتر اور بقدر قلیل تھا۔ اس کے علاوہ اگر یہ مان لیا جائے کہ پانچوں کا حصہ مل کر ایک آدمی کی خوراک سے زیادہ ہو گیا تھا تو وہاں سائل کو کھانا دینے کی یہ صورت نہ تھی کہ ان حضرات نے باہمی مشورہ سے کوئی بات طے کر کے کھانا دیا ہو۔ وہاں تو صورت یہ تھی کہ سائل کی آواز پر ہر ایک نے اپنی اپنی جگہ سے اپنے نفس پر ایثار کا مظاہرہ کیا۔ اس سے کوئی بحث ہی نہیں کہ سائل کو کتنے کھانے کی ضرورت ہے اس سے زیادہ نہ دیا جائے۔ ہر ایک نے اپنے اپنے سامنے سے اپنا اپنا حصہ اٹھا کر دے دیا۔ کسی کو کچھ دیتے وقت اس پر نظر رکھنا کہ ضرورت مند کو اس کی

ضرورت سے زیادہ نہ پہنچ جائے اور اس کی صرف وقتی ضرورت کو پورا کیا جائے۔ یہ عوام کی بات تو ہو سکتی ہے لیکن خاصانِ خدا کے حوصلہ عطا اور جذبہ جود و سخا کو اپنے اوپر قیاس کرنا اور ان کو اپنا جیسا سمجھنا انتہائی زیادتی نہیں تو اور کیا ہے ؟ خود حضرت علی علیہ السلام کا قول ہے لایقاس الناس باٰل محمد یعنی لوگوں کو آل محمدؐ کے ساتھ قیاس نہیں کیا جاسکتا (نہج البلاغہ) تعجب ہے کہ فاضل محترم سید اور دودمانِ نبوی کا ایک فرد ہوتے ہوئے اپنے گھر کی عظیم ترین قربانیوں اور بے مثال جود و ایثار کے کارناموں کو بھول رہے ہیں۔

ترجمان القرآن کی ایک اور عبارت ملاحظہ ہو :

"پھر یہ بھی باور کرنا مشکل ہے کہ دو بچے جو ابھی بیماری سے اٹھے تھے اور کمزوری کی حالت میں تھے انہیں بھی تین دن بھوکا رکھنے کو حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ جیسی کامل فہم دین رکھنے والی ہستیوں نے نیکی کا کام سمجھا ہوگا"۔

عبارت بالا پھر اسی انداز کی ہے جو بتا رہی ہے کہ فاضل محترم اس گھر کے بڑوں اور بچوں کو عام گھروں کے بڑوں اور بچوں جیسا سمجھ کر گفتگو کر رہے ہیں وہ سب کچھ جانتے ہوئے کیوں اس سے انجان بن رہے ہیں کہ یہ بچے بقول رسولؐ بچپن میں لوح محفوظ کا مطالعہ کرتے ہیں اور بچپن میں جوانانِ جنت کی سرداری کا لقب رسولِ صادق سے پاتے ہیں۔ یہ وہ بچے ہیں جن کو بچپن میں منجانب اللہ مباہلہ میں جانے کی دعوت آتی ہے اور بچپن ہی میں خدائے برتر ان کے کمال تطہیر کا اعلان کرتا ہے۔ موصوف کے اس شبہ کا جواب کہ ماں باپ نے تین دن تک بیماری سے اٹھنے والے بچوں کا بھوکا رہنا کیسے گوارا کر لیا یہ ہے کہ جب بھی امتحان کا وقت آتا ہے تو خاصانِ خدا اپنے بچوں کو اپنے ہاتھ سے ذبح کرنا تک گوارا کر لیتے ہیں اور ان کے بچے ذبح ہونا خوشی منظور کر لیتے ہیں۔ یہ تین دن بھی آل محمدؐ کے امتحان اور آزمائش کے تھے۔ جس کی طرف سورۂ دہر کی ابتداء میں یہ کہہ کر اشارہ کیا گیا ہے انّا خلقنا الانسان من نطفة امشاج نبتليه فجعلناه

سمیعاً بصیراًo یعنی ہم نے انسان کو مخلوط نطفہ سے پیدا کیا تاکہ ہم اس کو آزمائیں اسی لئے ہم نے اس کو دانا و بینا قرار دیا۔

فاضل محترم کی طرف سے بس یہ دو باتیں تھیں جن کی بنا پر انہوں نے روایت کو درایت کے لحاظ سے کمزور سمجھ لیا۔ ایک تو یہ کہ سائل کو اس کی ضرورت سے زیادہ کیوں دیا گیا۔ دوسری یہ کہ بچوں کا بھوکا رہ جانا ماں باپ نے کیسے گوارا کیا۔ ظاہر ہے کہ ان میں سے کسی بات میں بھی کوئی معقولی انداز نہیں ہے۔ اب صرف ایک بحث باقی رہی وہ یہ کہ یہ سورہ پورا مکے میں نازل ہوا یا مدینے میں یا یہ کہ اس سورہ کی بعض آیات مکے میں آئیں اور بعض مدینے میں۔ اس بحث کی ضرورت اس لئے ہے کہ اگر یہ سورہ مکی ہے تو چونکہ حضرات حسنینؑ مکے میں پیدا ہی نہیں ہوئے تھے اس لئے وہ روایت جس کا تعلق حضرات حسنینؑ کی بیماری سے ہے وہ روایت کالعدم ہو جاتی ہے۔ اس بحث کے متعلق تفہیم القرآن کی عبارت ملاحظہ ہو:

> "اکثر مفسرین اس کو مکی قرار دیتے ہیں۔ علامہ زمخشری' امام رازی' قاضی بیضاوی' علامہ نظام الدین نیشاپوری' حافظ ابن کثیر اور دوسرے بہت سے مفسرین نے اسے مکی ہی لکھا ہے اور علامہ آلوسی کہتے ہیں کہ یہی جمہور کا قول ہے۔ لیکن بعض دوسرے مفسرین نے پوری سورۃ کو مدنی کہا ہے اور بعض کا قول ہے کہ یہ سورۃ ہے تو مکی مگر آیات ۸ تا ۱۰ مدینے میں نازل ہوئی ہیں"۔ (ترجمان القرآن)

عبارتِ بالا میں لفظ اکثر اور لفظ بعض کو تو مضمون نگار جانیں اور ان کی تحقیق لیکن ان کی اس عبارت سے دو باتیں خود بخود ثابت ہو رہی ہیں۔ ایک تو یہ کہ مفسرین اس سورۃ کے یا اس کے بعض آیات کے مکی اور مدنی ہونے میں مختلف ہیں۔ کوئی پوری سورۃ کو مکی کہتا ہے اور کوئی پوری سورۃ کو مدنی کہتا ہے اور کوئی یہ کہتا ہے کہ کچھ حصہ مکی ہے اور کچھ حصہ جس میں اہل بیتؑ کے ایفاء نذر اور اطعام کا ذکر ہے' مدنی ہے۔ دوسری بات یہ بھی ظاہر ہے کہ جنہوں نے پوری سورۃ کو مکی کہا ہے وہ اور جنہوں نے پوری سورۃ

کو مدنی کہا ہے وہ اور جنہوں نے کچھ حصہ کو مکی اور کچھ کو مدنی کہا ہے وہ یہ سب کے سب مفسرین علماء اہل سنت ہیں نہ یہ سُنّی عوام ہیں اور نہ ان میں کوئی شیعہ ہے کیونکہ شیعہ تو اس پر متفق ہیں کہ یہ سورہ بشان اہل بیتؑ مدینہ میں نازل ہوا۔ یہ اختلاف جو کچھ بھی ہے مفسرین اہل سنت میں ہے اور اختلاف کی موجودگی میں کوئی چیز اپنی جگہ یقینی نہیں رہتی بلکہ ہر پہلو مشکوک اور محتمل ہو جاتا ہے اور یہ بات اصولی اور منطقی ہے کہ احتمالی کوئی چیز لائق استدلال نہیں ہوتی۔ اذا جاء الاحتمال بطل الاستدلال احتمال کے آتے ہی استدلال بے کار ہو جاتا ہے لہذا اس سورہ کو مکی قرار دے کر جو غیر یقینی اور مشتبہ ہے اس روایت کو جس کو صحابہ کرام اور مفسرین نے بیان کیا ہے کس طرح مٹایا جا سکتا ہے۔ پھر لطف یہ کہ جنہوں نے اس سورۃ کو مکی کہا انہوں نے مکہ کا کوئی واقعہ بیان ہی نہیں کیا جب کہ سورۃ میں واقعہ موجود ہے لیکن اس کے بر خلاف جنہوں نے اس سورۃ کو مدنی کہا ہے وہ مدینہ کا واقعہ بیان کر رہے ہیں جو حرف بحرف قرآنی واقعہ اور قرآنی بیان کے مطابق ہے۔ لہذا مکی کہنے والوں کے پاس محض دعویٰ ہے جس کی کوئی دلیل نہیں اور مدنی کہنے والوں کے پاس جو دعویٰ ہے اس کی دلیل بیّن موجود ہے۔ اب جس کا دل چاہے وہ دعوائے بے دلیل کو قبول کرے اور جس کا دل چاہے وہ مدلل بیان کو تسلیم کرے۔

اس پر مستزاد یہ کہ یہ سورت جو مدح و ثناء سے بھری ہوئی ہے اس کا لب و لہجہ خود یہ بتا رہا ہے کہ یہ مدنی ہے کیونکہ مکی سورتوں میں عموماً مدح و ثنا کا رخ اختیار نہیں کیا گیا بلکہ مکی سورتوں میں تو یآ ایھا الذین امنوا کا لفظ بھی نہیں پایا جاتا۔ اس سورۃ کو مکی کہنے والے حضرات یہ بھی بھول گئے کہ آیات سورہ دہر میں ایک اسیر کو بھی کھانا کھلانے کا ذکر ہے۔ اور یہ بات ایک کم فہم انسان جو مسلمان ہو بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ مکہ میں مسلمانوں کے قبضہ میں مسلمانوں کا کیا ہوا تو کوئی اسیر ہو ہی نہیں سکتا۔ کیا مکہ میں مسلمانوں کی اتنی طاقت تھی کہ یہ کسی کو اسیر کر کے رکھ سکتے؟ ہر گز نہیں اور قطعاً نہیں۔ وہاں تو مسلمانوں ہی کی جانوں کے لالے پڑے ہوئے تھے اور اگر یہ کہیں کہ یہ اسیر کفار مکہ کا کیا ہوا اسیر تھا تو جو شخص کفار کی اسیری میں ہو وہ اپنی اسیری میں کسی

مومن کے گھر پر جا کیسے سکتا تھا کہ وہاں سے کھانا حاصل کرے لامحالہ یہ واقعہ مدینے کا ہے کیونکہ جنگ بدر کے بعد سے مدینے میں اسیروں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا جن کے لئے کوئی قید خانہ (جیل) نہ تھا بلکہ ان کو مختلف مسلمانوں کی نگرانی اور کفالت میں دے دیا جاتا تھا اور یہ ظاہر ہے کہ اگر کسی وقت اس مسلمان ہی کے یہاں کھانے کو کچھ نہ ہو تو وہ اسیر کو کہاں سے کھلائے اس صورت میں اس مسلمان پر فرض ہے کہ وہ اسیر کو یہ موقع دے کہ وہ کسی اور مومن کے یہاں سے کھانا حاصل کر سکے۔ چنانچہ تفسیر اہل بیتؑ میں صراحتہً آیا ہے کہ سورۂ دہر میں جس اسیر کا ذکر ہے یہ اسیر زمرۂ کفار سے تھا جو اسیری کی حالت میں مسلمانان مدینہ کے پاس تھا۔ یہ بھوکا تھا در اہل بیتؑ پر سائل ہوا اور اس کا سوال پورا کیا گیا۔ غرضیکہ مکہ میں کسی اسیر کا کسی مومن سے کھانا پانا کسی طرح بھی ممکن نہیں کیونکہ یہ اسیر اگر کفار کے قبضہ میں پھنسا ہوا کوئی مومن ہو تو وہ کسی مومن کے یہاں پہنچ کیسے سکتا ہے؟ اور اگر یہ اسیر مسلمانوں کا کیا ہوا اسیر ہو تو یہ بات مدینہ کی ہے مکہ کی ہرگز نہیں ہو سکتی۔ مکہ میں تو مسلمانوں کو اپنی ہی جانوں کا بچانا دوبھر تھا وہاں کسی کافر کو اسیر کرنے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ سچ پوچھئے تو مکہ میں مسلمان کسی کافر کو تو کیا قید کرتے کسی مسلمان پر بھی کسی جرم میں حد نہیں جاری کر سکتے تھے کیونکہ وہاں ایسی تنظیم اور طاقت ہی نہ تھی کہ تعزیرات اور حدود کا اجراء ہو سکے۔ لفظ اسیر نے تو بالکل واضح کر کے رکھ دیا کہ سورۂ دہر کا مبینہ واقعہ قطعاً مدینہ کا ہے مکہ کا ہرگز نہیں۔ اسی لئے جن علماء اہل سنت نے سخن فہمی سے کام لیا انہوں نے صاف کہہ دیا کہ یہ سورہ اور بالخصوص وہ آیات جو ایفاء نذر اور اطعام مسکین و یتیم و اسیر کے متعلق ہیں مکی نہیں بلکہ مدنی ہیں۔ موجودہ صحیفہ قرآنی کے متعلق جہاں سنی اور شیعہ ہر دو فرقہ میں یہ مسلّم ہے کہ یہ کل کا کل کلام خدا ہے اور اس میں کوئی دوسرا کلام ہرگز شامل نہیں وہاں یہ بھی مسلّم ہے کہ اس کی ترتیب و جمع چونکہ کسی معصوم اور عالم ربانی کے ہاتھوں نہیں ہوئی اس لئے مطابق تنزیل نہیں پھر یہ بھی مسلّم ہے کہ بعض سورتوں میں بعض آیات ایسی رکھ دی گئی ہیں جو ان سورتوں کی نہیں بلکہ دوسری سورتوں کی ہیں۔ اسی کے ساتھ ہی یہ بات

بھی واضح ہے کہ بعض الفاظ کی کتابت ایسی نادرست صورت سے ہو گئی ہے کہ اگر اس کو صحیح کر کے نہ پڑھا جائے تو تلاوت غلط ہو جاتی ہے بلکہ بعض جگہ تو اگر کتابت کے مطابق پڑھ دیا جائے تو معنی کفر لازم آ جاتا ہے جیسے ایک جگہ دراصل تھا ''لا لی للّٰہ ترجعون'' یعنی تم لوگ ضرور اللہ کی طرف پلٹائے جاؤ گے۔ یا ایک جگہ تھا ''لالی اللّٰہ تحشرون'' یعنی تم لوگ ضرور محشور ہو گے لیکن ان دونوں جملوں کی کتابت اس طرح ہے لا الی اللّٰہ ترجعون ٥ لا الی اللہ تحشرون ٥اس کے معنی ہو گئے یہ کہ تم لوگ اللہ کی طرف نہیں پلٹائے جاؤ گے تم لوگ اللہ کی طرف محشور نہ ہو گے۔

سورۂ اقراء میں تھا کلا لئن لم ینتہ لنسفعاً بالناصیۃ''اس میں لنسفعاً فعل مضارع ہے جس کی ابتداء میں لامِ تاکید اور آخر میں نونِ تاکید خفیفہ ہے اور یہ اصولی بات ہے کہ فعل پر کبھی تنوین (دوزبر اور دوزیر دو پیش) نہیں آسکتے لیکن لنسفعن کی کتابت اس طرح کی گئی ہے لنسفعاً۔ لفظ شئے قرآن مجید میں بہت جگہ آیا ہے لیکن ایک جگہ شئے کو شاءٔ لکھا ہوا ہے ہر جگہ لفظ علیہ اور علیھم قرآن مجید میں ھاء ہوز کے زیر کے ساتھ ہے جو اصولاً صحیح ہے لیکن سورہ فتح میں ہے علیہُ ھاء ہوز کے پیش کے ساتھ غرضیکہ اسی طرح کتابت میں فروگذاشت بہت سی جگہ موجود ہے۔ سورتوں کی ابتداء میں جو نشان دہی کی گئی ہے کہ یہ سورہ مکی ہے اور یہ سورہ مدنی ہے یہ عبارت نہ تو قرآن کی ہے نہ اس عبارت کی تحریر میں کسی معصوم زبان و قلم کا دخل ہے تو پھر ان تمام تر شواہد یقینیہ کی موجودگی میں جو ان آیات کو مدنی ثابت کر رہے ہیں یہ کیوں ضروری ہے کہ ھی مکّیۃ (یہ سورہ مکی ہے) کو بھی ایک آیت قرآنی کا درجہ دے کر آنکھ بند کر کے صحیح مان لیا جائے ؟ھی مکیۃ کا جملہ تو امام شافعی اور ان مفسرین اہل سنت نے بھی دیکھا تھا جنہوں نے اس سورہ کا بالخصوص آیات کا مدینہ میں بشان اہل بیتؑ نازل ہونا یقینی قرار دیا۔ ظاہر ہے کہ انہوں نے ھی مکیۃ والے جملہ کو ساقط الاعتبار سمجھ کر لائق قبول نہیں سمجھا۔ وآخر دعوٰنا ان الحمد للّٰہ ربّ العلمین۔

☆☆☆

وجُودِ انسان

وجودِ انسان مرکب ہے جسم اور روح سے۔ حیات نام ہے ان دونوں کے اتصال کا اور موت نام ہے ان کے ایک دوسرے سے جدا ہونے کا۔ یہ ظاہر ہے کہ تمام جسم ایک مادہ ہے جس میں نہ حس ہے نہ شعور، نہ ارادی حرکت ہے نہ عقل نہ فہم۔ یہ سب چیزیں کب پیدا ہوئیں؟ جب روح داخل ہوئی، اور کب تک رہیں؟ جب تک اس مادی جسم میں روح موجود رہی۔ اس سے ثابت ہوا کہ اصل وجود اور حقیقتِ انسان روح ہے جسم نہیں ہے۔ روح اور جسم کا تعلق بالکل ایسا ہے جیسا کہ مکین اور مکان کا۔ جسم مسکن ہے اور روح اس میں ساکن اور آباد۔ جب تک کوئی مکان رہائش کے لائق نہیں بنتا مکین رہائش نہیں کرتا اور رہائش کے بعد جب پھر وہ مکان خراب وخستہ ہو کر لائق قیام نہیں رہتا مکین اس کو چھوڑ دیتا ہے۔ یہی حال جسم اور روح کا ہے۔ روح اس مکان میں داخل ہی اس وقت ہوتی ہے جبکہ یہ مکان لائقِ قیام ہو جائے پھر اس مکان میں روح رہتی ہے اس وقت تک کہ یہ لائق قیام رہے۔ اسی لیے قدرت نے روحِ آدم کے لیے پہلے مسکن جسم تیار کرایا پھر یہ مسکن آبادی روح کے لائق ہو گیا تو اس میں روح کو آباد کیا۔ حکمِ سجدہ جو ملائکہ کو اس وجود کی تعظیم اور اس کے منصب کو تسلیم کرنے کے لیے دیا گیا اس حکم کو نفخِ روح کی شرط پر مشروط رکھا اور فرمایا "فاذا سویته و نفخت فیه من رّوحی فقعوا له ساجدین" یعنی اے گروہِ حاضر جب میں آدم کے جسم کو مرتب اور مکمل کر دوں اور پھر اس میں اپنی روح داخل کر دوں تو تم سب اس کے لیے سجدہ

میں جھک جانا۔ یہ کہنا صحیح ہے کہ جہاں نفخِ روح کے ہوتے ہی سجدہ کو فرض قرار دیا گیا وہاں نفخِ روح سے پہلے سجدہ سے روکا بھی گیا ہے۔ نفخِ روح کی شرط صاف بتا رہی ہے کہ جو سجدہ نفخِ روح ہونے پر واجب ہے وہ نفخِ روح سے پہلے حرام ہے۔ کیونکہ سجدہ بربنائے فضیلت ہے اور فضیلتِ آدم بربنائے روح ہے جسم کی بنا پر نہیں۔ جب عظمت ہی روح کی بناء پر ہے تو جسم بے روح کو سجدہ کیسا؟ اور یہ بت پرستی کیسی؟ سجدہ کرنے والے بھی باروح تھے۔ ان کا یہ سجدہ ان کی روح کا ہی عمل تھا تو جس نے سجدہ کیا وہ بھی روح اور جس کو سجدہ کیا وہ بھی روح۔ ساجد بھی روح اور مسجود بھی روح۔ ثابت ہوتا ہے کہ روحِ ملک سے خلیفۃ اللہ کی روح اتنی افضل و برتر کہ یہ روح ساجد ہو اور وہ روح مسجود۔ حکم سجدہ کے الفاظ نے اور نفخِ روح کی شرط نے یہ بات بالکل واضح کر دی تھی کہ سجدہ روحِ آدمؑ کو کرایا جا رہا ہے جسمِ آدمؑ کو نہیں۔ لیکن ابلیس نے جب سجدہ نہ کیا تو قدرت نے اس سے پوچھا کہ تیرے سجدہ نہ کرنے کا سبب کیا ہے؟ **مامنعك ان لاتسجد** الخ تو اس نے وہ مہمل اور لغو جواب دیا جس کی تردید قدرت پہلے ہی کر چکی تھی۔ ابلیس کہتا ہے **انا خير منه** میں آدمؑ سے بہتر ہوں۔ کیوں؟ **خلقتني من نار وخلقته من طين**o اس لیے بہتر ہوں کہ تو نے مجھے آگ سے خلق کیا (جو لطیف اور بلند ہے) اور اس کو تو نے مٹی سے پیدا کیا (جو کثیف اور پست ہے) کس قدر غلط ہے یہ جواب جب کہ قدرت پہلے ہی یہ فیصلہ کر چکی تھی کہ سجدہ کا شرف اور افضلیت کا تعلق جسم آدمؑ کی بنا پر ہرگز نہیں ہے بلکہ روح کی بناء پر ہے۔ یہ روح تم سب کی ارواح سے اس درجہ عظیم ہے کہ میں اظہار عظمت کے لیے اس کو اپنی طرف منسوب کرتے ہوئے یہ کہہ رہا ہوں کہ یہ روح میری ہے۔ اب اس کے بعد اپنے جسم سے جسمِ آدمؑ کا مقابلہ اور موازنہ کیسا؟ اور اب روح عظیم سے بالکل قطع نظر کر کے محض جسم آدم کو دیکھنا' یہ کیوں؟ یہ محض اس لیے کہ تو آج نہیں بلکہ تو تھا ہی پہلے سے کافر۔ تو سجدہ نہ کر کے کافر نہیں ہوا بلکہ کافر تھا تو سجدہ نہ کیا "**ابیٰ واستکبر وکان من الکافرین**"' ابلیس نے انکار کیا اور تکبر کیا اور وہ تھا ہی کافرین میں سے۔ اگرچہ اس وقت وہاں ابلیس کے سوا اور

کوئی کافر نہ تھا لیکن قدرت نے تنہا ابلیس کو کافر نہیں کہا بلکہ ایک جماعت کی نشاندہی کرتے ہوئے اس ایک کو ان کی برادری کا فرد بتایا یعنی ابلیس تجھ جیسے کافر اور بھی پیدا ہوں گے اور وہ کون ہوں گے؟ کفار تو دنیا میں بہت سے ہوتے رہے۔ عام کفار نے خلفائے خدا کو جھٹلایا ضرور مگر ان کا قول اسی حد تک محدود رہا کہ ان انتم الا بشر مثلنا الخ یعنی تم لوگ (مرسلین) بس ہم جیسے ہو اور ہماری مثل ہو' یہ نہیں کہا کہ ہم تم سے افضل ہیں لہذا یہ عام کفار ہو بہو ابلیس جیسے تو نہ ہوئے اور ابلیس ان میں کا تو ایک نہ ہوا۔ ارشاد الٰہی نے تو ابلیس کا رشتہ برادری و برابری ایسے لوگوں سے قرار دیا جو اس کی طرح سے خلفائے خدا سے اپنی برتری اور افضلیت کے دعوے دار ہوئے۔ غرض کہ جسم پر نظر رکھنا اور روح سے قطع نظر کر لینا اور اپنے نظریات کو محض جسم اور جسمانیات کی بناء پر قائم کر لینا یہ وہ جرم اور تنگ نظری ہے جس کی ابتداء ابلیس نے کی۔ پھر یہ سارا واقعہ قدرت نے ہم کو من و عن کیوں سنایا؟ صرف اس لیے کہ ہم اس مجرم سے اور اس کے جرم سے بیزار رہیں اور کبھی یہ جسارت نہ کریں کہ انبیاء اور ائمہ برحق کے جسم کو اپنا جسم دیکھ کر یہ فیصلہ کر لیں کہ واقعاً اور در حقیقت وہ حضرات ہیں ہی ہم جیسے۔ جسم تو روح کا لباس ہے اسی طرح جیسے جسم کا لباس ہے جامہ۔ جسم تو مکان ہے جس میں روح مکین ہے اگر مکان یکساں ہوں تو یہ کب ضروری ہے کہ ان کے مکین بھی یکساں ہوں۔ ایک مکان میں کافر ہے دوسرے میں مومن۔ ایک مکان میں عالم ہے دوسرے میں جاہل۔ ایک مکان میں شخص نجس ہے دوسرے میں پاک۔ ایک مکان ظلمت کدہ ہے دوسرے میں سراج منیر۔ روحِ آدمؑ کو ارواحِ ملائکہ پر جب اتنی فوقیت ہو کہ وہ ساجد اور یہ مسجود تو وہ ارواح جن کے نام کی برکت سے آدمؑ کی توبہ قبول ہوئی وہ کس قدر عظیم ہوں گی۔ ہے کوئی طاقتِ مدرکہ جو ان ارواح کی عظمت کا پورا ادراک کر سکے؟ روح تو کسی بھی انسان کی ہو بذاتِ خود ایک روشنی اور ضیاء ہے تو پھر وہ روحِ آدمؑ جس کے لیے قدرت نے فرمایا ''میری روح'' جس کو ارواحِ ملائکہ کا مسجود قرار دیا گیا وہ کس درجہ روشن اور منور ہو گی تو پھر وہ ارواح جو وسیلہ قبولِ توبہ آدمؑ و بنی آدم ہوں کیوں

نہ نورِ خدا ہوں گی۔ اگر محمدؐ و آلِ محمد نور نہیں ہیں تو عالمین میں وہ چیز ہی کون سی ہو گی جس کو نور کہا جا سکے۔ پھر تو زبانِ قرآن پر لفظ نور وہ لفظ ہوا جس کے کوئی معنی ہی نہ ہوئے۔ یہ تو قدرت کی ہم پر عین عنایت اور کمالِ رحمت ہے کہ اس نے اپنے نورِ معظم کو ہماری شکل و صورت میں جاگزین کر کے ہماری ہدایت کے لیے بھیجا تاکہ ہم ان کو اپنی شکل و صورت میں دیکھ کر ان سے مانوس ہوں اور متوحش نہ ہوں۔ آج کل ہمارے اربابِ علم و فہم ایک ایسے مباحثے میں لگے ہوئے ہیں جس سے قوم خلجان میں مبتلا ہے۔ ایک ہی فریق ہے جو اب فریقین کہلا رہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس مباحثہ کا بیشتر حصہ تو نزاعِ لفظی ہے مثلاً ایک کہتا ہے کہ یہ حضرات عالم الغیب نہ تھے اس معنی سے جس معنی سے اللہ عالم الغیب ہے کیونکہ اللہ کا علم لذاتہٖ ہے۔ کسی کا دیا ہوا اور کسی سے لیا ہوا نہیں بلکہ وہ خود عین علم ہے اور وہ بلا استثناء عالم کل ہے۔ ظاہر ہے کہ اس بات کو غلط کون کہہ سکتا ہے۔ دوسرا کہتا ہے کہ یہ حضرات عالم الغیب ہیں کیونکہ اللہ نے ان کو غیب کا علم عطا کیا ہے اور غیب کے جاننے کی صلاحیت عطا کی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بات بھی کسی طرح غلط نہیں تو اب وہ نفی اور یہ اثبات محض نزاع لفظی ہو کر رہ گیا۔ اس کے علاوہ کچھ ایسے بھی مباحث ہیں جن کو طے کرنے کے ہم مکلّف اور ذمہ دار نہیں۔ بعض اوقات یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ کوئی فریق اپنے موقف کی حمایت کے جوش میں افراط کی حد میں داخل ہو جاتا ہے تو دوسرا فریق اپنے موقف کو نمایاں کرنے کے لیے تفریط کا راستہ اختیار کر لیتا ہے جس سے معصومین علیہم السلام کی تنقیص لازم آتی ہے۔ ہر فریق ان ہی حضرات معصومین کے ارشاداتِ عالیہ کو پیش کرتا ہے۔ ہم اس بحث کو چھوڑتے ہوئے کہ اخبارِ مرویہ میں معتبر اور غیر معتبر کا امتیاز ناگزیر ہے یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ حضرات معصومین کو ایسے دو مختلف قسم کے لوگوں کا مقابلہ کرنا پڑا جو دو مختلف قسم کے غلط نظریات ان حضرات کے بارے میں رکھتے تھے۔ ایک طرف وہ لوگ تھے جو ان کے محلِ اختصاص اور مرتبہ کمال سے ان حضرات کے بارے میں غلو رکھتے تھے دوسری طرف وہ لوگ تھے جو ان کے محلِ اختصاص اور مرتبہ کمال سے ان حضرات کو

گرا کر اپنی صف میں کھڑا کرتے تھے اور ان حضرات کو اپنا اور اپنے آپ کو ان کا مثل سمجھتے تھے جس کا بین ثبوت اس قرارداد سے ہوتا ہے کہ طلحہ' زبیر' سعد بن وقاص' عبدالرحمٰن بن عوف' عثمان و علیؑ میں سے جس کو چاہو چن لو۔ یعنی یہ لوگ تقریباً ایک ہی جیسے ہیں۔ کسی کو کسی پر کوئی حتمی اور فیصلہ کن ترجیح نہیں۔ معاذاللہ! ظاہر ہے کہ اس قسم کے نظریہ کی رد میں ان حضرات کیلئے ضروری تھا کہ یہ اپنے ان مدارج عالیہ اور کمالِ مراتب کا اظہار کریں جو ان کو منجانب اللہ اور منجانب الرسولؐ حاصل تھے۔ یہاں معصومینؑ کو تمام تر یہ بتانا تھا کہ تم ہم جیسے نہیں اور ہم تم جیسے نہیں تم کچھ اور ہو اور ہم کچھ اور ہیں۔ یہاں ان چیزوں کو بیان کرنے کی کوئی ضرورت ہی نہ تھی جن میں وقتی اور ظاہری طور پر مماثلت تھی۔ یعنی یہاں یہ فرمانا بالکل بے ضرورت اور عبث تھا کہ ہم بھی تمہاری طرح کھاتے ہیں' تمہاری طرح پیتے ہیں' تمہاری طرح اٹھتے بیٹھتے' چلتے پھرتے ہیں کیونکہ وہ لوگ تو پہلے ہی ہر عنوان اور ہر رخ سے غلط طور پر اپنے جیسا سمجھتے تھے۔ دوسری طرف وہ لوگ تھے جو ان کو خود خدا یا مثل خدا سمجھنے لگے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان لوگوں سے ان حضرات کو اپنے علوئے مدارج کا بیان کرنا بے محل تھا' کیونکہ اس میدان میں تو خود ہی حد سے آگے بڑھ چکے تھے۔ ان سے تو یہی کہنا تھا اور ان کی رد میں تو یہی فرمانا تھا کہ ہم خدا کیسے ہو سکتے ہیں؟ ہم تو تمہاری ہی طرح کھاتے پیتے ہیں۔ چلتے پھرتے ہیں۔ طفولیت کے بعد جوان ہوتے ہیں۔ پھر بوڑھے ہوتے ہیں۔ کبھی تندرست ہیں تو کبھی بیمار ہوتے ہیں۔ پھر ہم خدا کیونکر ہوئے؟ مطلب یہ ہے کہ منکرین فضیلت کے سامنے وہ رُخ پیش کیا جس کے وہ منکر تھے اور خدا ماننے والوں کی رد میں وہ رخ پیش کیا جس سے ان کی اصلاح ہو۔ اب ہو کیا رہا ہے؟ یہ کہ ہر فریق اپنے موقف کے اثبات میں ان دونوں میں سے صرف ایک وہ رخ پیش کر دیتا ہے جس سے اس کے موقف کی حمایت حاصل ہو سکے۔ وہ دوسرے رخ سے قطع نظر کر لیتا ہے اور یہ غلط ہے۔ ہر رخ پر نظر رکھنا ضروری ہے۔ ہمارے لیے یہ عقیدہ کافی ہے کہ حضرات محمدؐ و آل محمدؐ جسم کے اعتبار سے ہم سے کتنے ہی مماثل ہوں لیکن ان کی روح جو اصلِ وجود ہے وہ کمال لطافت

کی بناء پر محض نور ہی نہیں بلکہ نور علیٰ نور ہے۔ ایسا نور جس کو خود خدا نے اپنا نور کہا۔ یہ حضرات علم ماکان اور مایکون کے اعتبار سے 'منتہائے عصمت و طہارت کے اعتبار سے' کمالِ صبر و استقامت اور حصولِ رضائے خدا کے اعتبار سے 'سخاوت' عبادت' شجاعت غرضیکہ ہر ہر وصف اور کمال کے اعتبار سے 'اس ارتقاع و عروج کے نقطہ آخری پر ہیں جہاں ان کے ساتھ عوام و خواص تو کجا نہ کوئی نبی مرسل ہے نہ کوئی ملک مقرب۔ نہ اُن جیسا کوئی ہوا ہے نہ ہوگا جو تقرب خدا ان کو حاصل ہے کسی کو نہیں۔ ان کے حدودِ اختیارات بھی ان کے مرتبے کے لائق ہیں نہ ہم ان کے مراتب کی اصل حقیقت کا ادراک کر سکتے ہیں نہ اُن کے حدودِ اختیارات کا۔ خالق کے سوا کوئی بھی ان سے برتر و اعلیٰ نہیں۔ یہ بھی سننے میں آتا ہے کہ بعض حضرات اقرارِ توحید خدا کے جذبے میں اتنے سخت اور متشدد ہیں کہ ''یا علی مدد'' کہنا بھی وہ منافیِ اقرارِ توحید سمجھتے ہیں۔ ان کی نظر ہے ''ایاك نعبدو ایاك نستعین'' پر (ہم صرف تیری عبادت کرتے ہیں اور صرف تجھ سے مدد چاہتے ہیں) اس سے یہ مطلب نکالا جاتا ہے کہ اللہ کے سوا کسی سے مدد چاہی ہی نہیں جا سکتی۔ حالانکہ کوئی بھی زندہ انسان دوسرے سے مدد چاہے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ جو ''یا علی مدد'' کہنا پسند نہیں کرتے وہ بھی قدم قدم پر عام انسانوں سے مدد چاہتے ہیں۔ خداوندِ عالم ایسا کوئی حکم دے ہی نہیں سکتا جو ممکن العمل نہ ہو۔ اس نے تو خود ایک دوسرے کی مدد کرنے کا حکم دیا ہے۔ فرمایا ہے تعاونوا علیٰ البر والتقویٰ ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان نیکی اور پرہیز گاری کے کاموں پر ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور سرکشی پر کسی کے مددگار نہ ہو''۔ حضرت ذوالقرنین نے بھی جب کہ خود ایک قوم سے یاجوج وماجوج کے خلاف ان سے مدد چاہی تھی تو اس قوم سے کہا تھا اعینونی بقوۃٍ ''تم لوگ مال و دولت سے نہیں بلکہ اپنی طاقت سے میری مدد کرو''۔

مدد تو ہم سے خدا بھی اپنے دین کے لیے چاہتا ہے۔ ان تنصروا اللہ ینصر کم ویثبت اقدامکم۔ ''اگر تم نے اللہ کی یعنی اللہ کے دین کی اور اللہ کے رسولؐ کی مدد کی تو اللہ بھی تمہاری مدد کرے گا اور تم کو ثابت قدم کر دے گا''۔ انصار' نام ہی ان مدنی

مومنین کا ہے جنہوں نے دینِ خدا اور رسولؐ خدا کی مدد کی۔ مظلوم کربلا امامؑ کا استغاثہ یہی تو تھا: هل من ناصر ينصرنا. حقیقتاً یہ آیت (اياك نعبدو اياك نستعين) کفار کے عقیدہ و عمل کی تردید میں ہے۔ وہ لوگ غیر خدا کی عبادت کرتے تھے اور ان کو معبود مان کر اپنی حاجتیں ان کے سامنے پیش کرتے تھے۔ ان کی تردید میں مومن سے یہ کہلایا گیا ہے کہ نہ ہم تیرے سوا کسی کو معبود مانتے ہیں اور نہ کسی کو معبود مان کر اس سے مدد چاہتے ہیں۔ اسی لیے اياك نستعين سے پہلے اياك نعبد کہلایا ہے تاکہ یہ ظاہر ہو جائے کہ استعانت (مدد چاہنا) وہ قبیح اور ممنوع ہے جو معبود مانتے ہوئے ہو۔ اسی طرح یہ بھی ظاہر ہو رہا ہے کہ وہ استعانت بالکل مہمل اور غلط ہے کہ کسی سے وہ مدد چاہی جائے کہ جو اس کے امکان اور طاقت ہی میں نہ ہو۔ علی مرتضیٰؑ کا تو کیا کہنا، وہ تو اس حیثیت سے بھی ہمارے مددگار ہیں کہ ہمارے اور ہمارے خدا کے درمیان وسیلہ ہیں اور اس حیثیت سے بھی کہ انتہائی مقربِ بارگاہ خدا ہیں اور ہر مقرب کو اپنے تقرب کے بقدر اس بارگاہ سے عطا کرنے کا حق ہوتا ہے۔ علیؑ تو علیؑ ہیں میں تو حضرت قنبر کا بھی ان کے خادمِ امیر المومنینؑ، محبِ اہل بیتؑ اور اس محبت کی بناء پر فائز بالشہادۃ ہونے سے یہ مقام سمجھتا ہوں کہ ان کی نگاہِ کرم اور نظرِ محبت ہماری حلِ مشکل کا سبب ہو سکتی ہے اور وہ ہماری مدد کر سکتے ہیں۔

بات اصل میں یہ ہے کہ حضرات معصومینؑ اور ان کے وہ انصار جنہوں نے ان پر اپنی جانیں قربان کر دیں ان پر دنیا میں جو خدا کا حق تھا اس کو وہ باحسن وجوہ ادا کر گئے اور جو اللہ کے ان پر فرائض تھے وہ ان کو پورا کر گئے۔ اب وہ عالم جزاء میں ہیں اب اپنی طرف سے خدا کو ان کا حق ادا کرنا ہے اور خدا سے بہتر کسی کے حق کا ادا کرنے والا کون ہو سکتا ہے۔ میری ہر فریق سے استدعا ہے کہ وہ افراط و تفریط سے بچیں اور اس بحث کے دروازے کو بند کر دیں یہ خواہش میری ذاتی بھی ہے اور بعض حضرات نے مجھ سے اصرار بھی فرمایا ہے۔ وآخر دعوٰنا ان الحمد لله رب العالمين والصلوٰة الدائمة علىٰ خير خلقه محمد و آله الطاهرين۔

جمع بین الصلوٰتین اور اوقاتِ نماز

نماز پنجگانہ کے اوقات کے بارے میں بعض چیزیں مسلّم اور بلا اختلاف ہیں۔ مثلاً صبح کا وقت صرف نماز صبح کے لئے مخصوص اور معین ہونا اور اس کے ساتھ نماز پنجگانہ میں سے کسی نماز کا وقت نہ ہونا یا زوال آفتاب سے غروب تک صرف نماز ظہر و عصر کا وقت ہونا اور اس وقت باقی تین نمازوں کا وقت نہ ہونا۔ اسی طرح غروب آفتاب سے نصف شب تک اس وقت کا صرف نمازِ مغرب و عشا کا وقت ہونا اور باقی تین نمازوں کا وقت نہ ہونا۔ اسی طرح یہ بھی مسلّم ہے کہ کوئی نماز کسی حالت میں بھی قبل از وقت نہیں ہو سکتی۔ یہ بھی مسلّم ہے کہ ظہرین اور مغربین کے وقت مشترک میں ظہر کی نماز کے بغیر عصر کی نماز اور مغرب کی نماز کے بغیر عشاء کی نماز نہیں ہو سکتی۔ لائق بحث صرف یہ چیز ہے کہ زوال آفتاب سے غروب تک جو وقت ہے اس میں سے کچھ حصہ نماز ظہر سے ایسا مخصوص ہے کہ اس وقت نماز ظہر کے ساتھ نماز عصر نہ ہو سکے اور کچھ حصہ نماز عصر سے ایسا مخصوص ہے کہ اس وقت نماز ظہر نہ ہو سکے؟ اسی طرح غروب آفتاب کے بعد سے نصف شب تک جو وقت ہے اس میں نماز مغرب کا وقت بالکل الگ اور نماز عشا کا وقت بالکل الگ ہے؟ یا یہ کہ دونوں نمازوں کی فضیلت کے وقت کی تفصیل کے علاوہ اور ظہر و عصر کی اور پھر مغرب و عشا کی ترتیب کے علاوہ ظہرین اور مغربین کا وقت ایک ساتھ اور مشترک ہے؟

مذہبِ امامیہ کے آئمہ اور فقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ زوالِ آفتاب سے

غروب تک یہ وقت ظہر و عصر دونوں نمازوں کے لئے مشترک ہے۔ سوائے اس کے کہ ظہر کی نماز مقدم اور نماز عصر موخر ہے جس کی بنا پر اول زوال پر چار رکعتوں کا پہلا وقت نماز ظہر سے اور آخر زوال پر چار رکعتوں کا آخری وقت نماز عصر سے بلحاظ ترتیب مخصوص ہوا۔ درمیان میں تمام وقت ظہر و عصر دونوں نمازوں کے لئے مشترک ہے جس میں دونوں نمازیں ایک ساتھ ہو سکتی ہیں بالکل یہی صورت نماز مغرب و عشاء کی ہے۔ نہ تو ظہر و عصر کے اوقات الگ الگ ہیں نہ مغرب و عشاء کے البتہ وقت فضیلت ہر نماز کا کم از کم اس اعتبار سے جداگانہ ہے کہ فضیلت ظہر کا وقت پہلے ختم ہوتا ہے اور فضیلت عصر کا وقت بعد میں۔ اسی طرح فضیلت مغرب کا وقت پہلے ختم ہوتا ہے اور فضیلت عشا کا بعد میں لیکن ظہر و عصر کا اور مغرب و عشا کا وقت فضیلت ابتدا سے ایک ساتھ شروع ہوتا ہے یا یہ کہ پہلی نماز کا وقت فضیلت گزر جانے کے بعد دوسری نماز کا وقت فضیلت شروع ہوتا ہے اس میں نظریاتی اختلاف ہے۔ ظاہر یہی ہے کہ پہلی نماز کا وقت فضیلت ختم ہونے پر دوسری نماز کا وقت فضیلت شروع ہو خصوصاً مغرب و عشاء میں۔

اب ہمیں پہلی نظر ان آیات قرآنیہ پر کرنا ہے جن میں نمازوں کے اوقات کا ذکر ہے۔ قرآن کریم کی دو آیتوں میں اوقات نماز کا ذکر ہے۔ ایک آیت سورۂ بنی اسرائیل کی ہے :

اقم الصلوٰة لدلوك الشّمس الى غسق اللّيل و قرآن الفجر انّ قرآن الفجر كان مشهوداً (بنی اسرائیل، آیت 78)

(ترجمہ) قائم کرو نماز کو زوالِ آفتاب سے رات کی تاریکی چھا جانے (نصف شب) تک اور صبح کے قرآن (نماز صبح) کو یقیناً نماز صبح کی شہادت دی جاتی ہے۔

اس آیت میں صرف نماز صبح کو الگ بیان کیا گیا ہے باقی چار نمازوں (ظہر، عصر مغرب و عشا) کو وقت کے لحاظ سے الگ الگ بیان نہیں کیا گیا بلکہ چاروں نمازوں کا وقت زوال آفتاب سے نصف شب تک دکھایا گیا ہے لیکن یہ مسلّم اور ظاہر ہے کہ دن کی

نمازوں کا وقت (ظہر و عصر) رات کی نمازوں (مغرب و عشاء) کے وقت سے اسی طرح جداگانہ ہے جس طرح دن سے رات اور رات سے دن جدا ہیں اس لئے ظہرین سے مغربین اور مغربین سے ظہرین تو بدلیل واضح جدا رہینگی لیکن خود ظہرین میں سے نماز ظہر و عصر کے اوقات کی علیحدگی اور مغربین میں نماز مغرب و عشا کے اوقات کی علیحدگی بلا دلیل ہے لہذ اآیات مذکورہ سے ظہرین اور مغربین کا اشتراک وقت ثابت ہوتا ہے۔

دوسری آیت سورۂ ہود کی ہے :

و اقم الصلوٰة طرفی النہار وزلفا من اللیل (سورہ ہود'114)

(ترجمہ) ''اور قائم کرو نماز دن کے دونوں حصوں میں رات کے ایک حصہ میں''۔

یہ آیت پہلی آیت سے زیادہ واضح ہے۔ پانچوں نمازوں کا ذکر ہے مگر ان کے وقت تین بتائے گئے ہیں۔ اوقات نماز اس طرح بتائے گئے ہیں کہ تین نمازیں دن کی ہیں مگر ان کے لئے دن کے صرف دو حصے ہیں اور دو نمازیں رات کی ہیں اور ان کے لئے رات کا صرف ایک حصہ ہے۔ دن کا پہلا حصہ صبح کا ہے جس میں صرف ایک نماز ہے۔ دن کا دوسرا حصہ زوال سے غروب تک ہے۔ اس ایک حصہ میں دو نمازیں ہیں۔ رات کا ایک حصہ غروب سے نصف شب تک ہے۔ اس ایک حصہ شب میں مغرب و عشا دونوں نمازیں ہیں۔ چونکہ زوال سے غروب تک کو دن کا صرف ایک حصہ کہا گیا ہے اور دو نمازوں کے لئے اس ایک حصہ کے دو جداگانہ حصے نہیں کئے گئے ؟ مغرب و عشاء دونوں نمازوں کے لئے صرف ایک حصہ شب کہا گیا ہے اس حصہ کے بھی دو حصے نہیں کیے گئے اس سے مغرب و عشا کا اشتراک وقت واضح ہے لہذا قرآن کریم نے ظہر و عصر کا اور اسی طرح مغرب و عشاء کا وقت جداگانہ نہیں بتایا بلکہ ایک ساتھ اور مشترک بتایا ہے۔ قرآن کریم کی یہ دو آیتیں تو اوقاتِ نماز کے لیے صریحی ہیں ان میں اقم الصلوۃ کا لفظ موجود ہے جس سے ظاہر ہے کہ خاص نماز ہی کا ذکر ہے۔ عام ذکرِ خدا جو ہر وقت مستحب اور مستحسن ہے مراد نہیں ہے۔ ان دو آیتوں کے علاوہ دو اور آیات ہیں

جن کو اوقاتِ نماز کے متعلق سمجھا جاتا ہے۔ایک آیت سورہ طہٰ کی ہے :۔

وسبح بحمد ربك قبل طلوع الشمس وقبل غروبها ومن اناء الليل فسبح واطراف النهار لعلك ترضیٰo (طہٰ :130)

(ترجمہ)اور تسبیح کرو اپنے رب کی حمد کے ساتھ طلوع آفتاب سے پہلے اور غروب آفتاب سے پہلے اور رات کے کچھ حصہ میں پس تسبیح کرو اور دن کے حصوں میں تاکہ تم خوش رہو"۔

اس آیت میں لفظ صلوٰۃ (نماز) مطلقاً نہیں بلکہ تسبیح اور حمد کا حکم ہے جبکہ اس سے پہلے کی دونوں آیتوں میں اقم الصلوٰۃ صاف کہا گیا ہے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس آیت میں نماز فرض کے علاوہ اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے شب و روز ذکرِ خدا کرتے رہنے کا استحباباً حکم دیا گیا ہے جس کی طرف لعلك ترضیٰ میں بھی اشارہ ہے کہ ذکرِ خدا کرتے رہنے سے تمہارے امور میں خیر و برکت اور خوشی حاصل ہو گی جیسا کہ سورۂ جمعہ میں فاذا قضيت الصلوٰۃ کے بعد فرمایا گیا ہے کہ واذکروا الله کثيراً لعلكم تفلحونo یعنی جب نماز تمام کر دی جائے تو تم زمین پر چل پھر کر اپنی روزی اور اللہ کے فضل کے طلبگار رہو۔اور اس حالت میں بھی اللہ کو زیادہ یاد کرتے رہو تاکہ کامیاب رہو۔اسی طرح آیہ مذکورہ بالا میں ہدایت کی جارہی ہے کہ نماز فرض ہی پر موقوف نہیں ہے۔ذکرِ خدا اس کے علاوہ بھی ہوتا رہنا چاہیے۔ طلوعِ آفتاب سے پہلے بھی، غروب سے پہلے بھی، رات کے بعض حصوں میں بھی (جو تمہاری بیداری کے ہوں)اور دن کے طلوع و غروب کے درمیانی اوقات میں بھی۔اور اگر بالفرض اس آیت کو نماز اور اوقاتِ نماز کے متعلق ہی سمجھا جائے تب بھی ظہرین اور مغربین کا اشتراک وقت اس میں بھی موجود ہے۔نہ ظہر و عصر کا وقت جداگانہ ہے نہ مغرب و عشاء کا کیونکہ قبل طلوع الشّمس (سورج نکلنے سے پہلے)اس سے مراد صبح کی نماز ہو گی اور قبل غروبھا (غروب آفتاب سے پہلے)اس سے مراد نماز ظہر و عصر دونوں ہوں گی جو یک وقت ہیں اور من آناء اللیل (رات کے ایک حصہ میں) یہ تذکرہ

مغرب و عشاء دونوں نمازوں کا ہوگا۔ان کا بھی ایک ہی وقت بتایا گیا ہے لہذا یہ آیت بھی ظہرین اور مغربین کا ایک ساتھ ہونا اور ہر دو نماز کا ایک ہی وقت ہونا بتاتی ہے۔ یہاں اگر کوئی شخص یہ کہے کہ قبل غروبھا سے ظہر و عصر دونوں مراد نہیں بلکہ صرف نماز عصر مراد ہے تو سوال یہ پیدا ہوگا کہ نماز ظہر کس لفظ سے مراد ہوگی اور نماز ظہر کے لیے کونسا لفظ سمجھا جائے گا؟ قبل طلوع الشمس سے نماز ظہر مراد نہیں ہو سکتی نہ من آناءِ اللیل سے نماز ظہر مراد ہو سکتی ہے۔اگر قبل غروبھا سے بھی نمازِ ظہر مراد نہیں ہے تو آیت کے آخر میں ایک ہی لفظ باقی ہے و اطراف النھار ' مگر ''اطراف'' یہ لفظ واحد نہیں ہے بلکہ جمع ہے اس لفظ جمع پر تبعیض کا من بھی نہیں ہے جو اطراف میں سے ایک طرف سمجھی جا سکے۔اس لفظ کا ترجمہ تو یہ ہوا کہ دن کے حصوں میں تسبیح اور حمد کیا کرو۔ یہاں لفظ جمع بتا رہا ہے کہ یہ تسبیح اور حمد دن کے مختلف اور متعدد حصوں میں کئی بار ہونا چاہیے تو اگر تسبیح اور حمد سے مراد نمازِ ظہر ہے تو ''اطراف النھار'' سے مراد کئی نمازیں لینا پڑیں گی حالانکہ نماز صبح ' نماز عصر ' نماز مغرب و عشاء کا ذکر آجانے کے بعد نماز ظہر ایک ہی باقی رہتی ہے جس کے لیے اطراف النھار کے بجائے طرف النھار بصیغہ واحد آنا چاہیے تھا۔ اطراف النھار سے تو وہ عمل ثابت ہو رہا ہے جو دن میں کئی بار کرنا ہے لہذا یہ ماننا پڑے گا کہ نماز ظہر و عصر دونوں کا ذکر ایک ہی لفظ ''قبل غروبھا'' میں کیا گیا ہے جس طرح نماز مغرب و عشاء دونوں کا ذکر ایک ہی لفظ ''من آناء اللیل'' میں کیا گیا ہے۔اب رہا لفظ ''اطراف النھار'' جو اوقات نماز پنجگانہ کے بعد میں ہے اور اس کے ساتھ ہی ''لعلك ترضىٰ'' بھی ہے۔اس سے مراد یہ ہے کہ نماز پنجگانہ کے علاوہ تم کو دن کے مختلف حصوں میں بھی ذکرِ خدا کرتا رہنا چاہیے تاکہ اس ذکر کی برکت سے تم بامراد اور خوش رہو۔ یہ ذکر برضاء استحباب و ثواب ہے۔اس آیت کے علاوہ ایک اور آیت سورۂ روم کی ہے :۔

فسبحان اللّٰہ حین تمسون وحین تصبحون ولہ الحمد
فی السمٰوٰت والارض وعشیاً و حین تظھرون (سورۂ روم'

آیت نمبر 18)

(ترجمہ) ''اللہ کی تسبیح ہوتی رہتی ہے جب تم شام کرتے ہو اور جب تم صبح کرتے ہو اور اسی کے لیے حمد ہے آسمانوں اور زمین میں اور دن کے دوسرے آدھے حصہ میں اور جب کہ تم دوپہر کرتے ہو''۔

اس آیت میں کوئی حکم ہی نہیں ہے بلکہ یہ جملہ خبریہ ہے نہ کہ انشائیہ۔ محض یہ خبر دی جارہی ہے کہ اے زمین پر بسنے والو جو وقت تمہاری صبح کا تمہاری شام کا دن کے دوسرے حصہ کا اور دوپہر کا ہوتا ہے ہمہ وقت آسمانوں اور زمین میں خدا کی تسبیح اور حمد کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ یہاں پنجگانہ نمازوں کا کوئی ذکر نہیں جس سے اوقاتِ نماز کا تعین کیا جاسکے۔ پھر لطف یہ ہے کہ نمازیں مع صبح کے یقیناً پانچ ہیں اور یہاں مع صبح کے صرف چار وقت کا ذکر ہے۔ صبح، شام، دن کا دوسرا حصہ اور دوپہر۔ ان اوقات میں بھی خبر اس تسبیح اور حمد کی دی جارہی ہے جو صرف زمین ہی پر نہیں بلکہ آسمانوں پر بھی ہوتی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ پنجگانہ نمازیں اور پنجگانہ نمازوں کے اوقات صرف اہلِ زمین کے لیے ہیں کیونکہ انسان مسلسل اور متواتر قیام و قعود اور رکوع و سجود نہیں بجا لا سکتا۔ ملائکہ تو مسلسل اور متواتر ان عبادتوں میں مصروف رہتے ہیں۔ پھر سماوات کی مخلوق کے لیے صبح، شام، دوپہر اور بعد دوپہر کا تعین کس بناء پر ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ ان مذکورہ اوقات کی نسبت انسانوں ہی سے دی گئی ہے یعنی یہ کہا گیا ہے کہ آسمانوں اور زمین پر اللہ کا ذکر جاری رہتا ہے۔ جب تمہارے لیے صبح ہوتی ہے جب تمہارے لیے شام ہوتی ہے، جب تمہارے لیے دوپہر ہوتی ہے۔ لہذا یہ آیت بھی پنجگانہ نمازوں کے یا ان کے اوقات کے لیے مخصوص نہ ہوئی بلکہ ہر جگہ اور ہر وقت ہر ایک شے کا اللہ کے لیے تسبیح خواں ہونا بیان کیا گیا ہے جیسا کہ دوسرے مقام پر فرمایا گیا ہے۔ وان من شیئٍ الا یسبّح بحمدہ ولکن لا تفقھون تسبیحھم ٥ (ترجمہ) کوئی چیز نہیں ہے، مگر یہ کہ وہ اللہ کی تسبیح اور حمد بجا لاتی ہے مگر اے لوگو تم ان کی تسبیح کو سمجھتے نہیں''۔

یعنی زبانیں تسبیح کریں یا نہ کریں ہر شے کا وجود جو اپنے خالق کے کمالِ قدرت اور کمالِ حکمت کا نمونہ ہے اپنے خالق کے وجود اور کمال کا پتہ دے رہی ہے اور زبانِ حال سے کہہ رہی ہے کہ میرا خالق قدرۃً اور حکمۃً بے مثال ہے ؎

برگِ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار
ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار

وفی کل شیی له آیة .. تدلُّ علی انه واحد

(ترجمہ) اور ہر شے میں اللہ کی نشانی ہے جو اس کی یکتائی ثابت کر رہی ہے"۔

بہر حال یہ آیت خصوصی طور پر نمازِ پنجگانہ کے لیے نہیں ہے نہ تو اس میں نماز کا ذکر ہے نہ یہ صرف اہل زمین کے لیے ہے۔ یہ آیت عام ذکرِ خدا کے لیے ہے۔ یہ بات دوسری ہے کہ اس عام ذکر میں ضمناً نماز پنجگانہ بھی آ جائے جیسا کہ بعض روایات میں اس طرف بھی اشارہ ہوا ہے۔ قانونی طور پر اس آیت سے اوقاتِ نماز کا تعین نہیں ہو سکتا۔ پھر جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ نمازیں پانچ ہیں اور اس آیت میں مع صبح کے صرف چار وقتوں کا ذکر ہے اگر اوقاتِ نماز ہی اس آیت سے اخذ کیے جائیں تب بھی دو نمازوں کو ایک وقت ہی میں رکھنا پڑے گا۔ یعنی تمسون (شام کے وقت) مغرب اور عشاء دونوں نمازوں کو سمجھا جائے گا۔ اس کے علاوہ لفظ تظھرون پر بحث ہو گی کہ اس سے مراد زوالِ آفتاب کا وقت ہے یا عین دوپہر (نیم روز) کیونکہ یہ لفظ دونوں معنوں میں مستعمل ہے۔ اگر عین دوپہر اور نیم روز مراد ہے تو وہ وقت کسی بھی نماز کا نہیں ہے بلکہ آرام و استراحت کا وقت ہے جس کے بارے میں کسی اور جگہ فرمایا گیا ہے (نور۔ آیت 58)۔ وحین تضعون ثیابکم من الظھیرۃ o یعنی وہ وقت بھی تمہاری تنہائی اور پردہ کا ہے جبکہ تم دوپہر کے وقت اپنے کپڑے اتار کر (آرام کرتے ہو) اگر تظھرون سے مراد یہی عین دوپہر ہے تو پھر اس کا مقصد یہ ہو گا کہ دوپہر کو آرام کرتے وقت ذکرِ خدا کرنا چاہیے۔ اس صورت میں حین تظھرون سے مراد وہ تسبیح خدا اور ذکرِ

خدا کا وقت ہوا جو مستحب ہے اب اس آیت میں نماز کے لیے صرف تین ہی وقت رہ گئے۔حین تمسون سے اول شب کا اور حین تصبحون سے صبح کا اور عشیاً سے دن کے زوال سے غروب تک کا لہذا ایک لفظ تمسون سے مغرب عشاء دونوں نمازیں مراد ہوئیں اور حین تصبحون سے نماز صبح اور عشیاً (زوال سے غروب تک) اس ایک لفظ سے ظہر و عصر دونوں نمازیں مذکور ہوئیں۔پانچ نمازوں کے لیے صرف تین وقت کا معین ہونا ظہرین اور مغربین کا وقت ایک اور مشترک ہونا بتا رہا ہے۔چنانچہ عربی لغت کی مشہور اور مفصل کتاب منتہی الارب جو بہت مستند ہے اور صاحبِ کتاب ہے بھی عقیدۂ سنی وہ دن کے دو حصے کرتے ہیں۔پہلا صبح سے دوپہر تک کا اور دوسرا زوال سے شام تک کا وہ لفظ عشیٰ اسی دوسرے حصہ کو بتاتے ہیں اور صاف لکھتے ہیں کہ صلاتا العشاء سے مراد نماز ظہر و عصر ہے۔اب یہ مسئلہ اوقاتِ نماز بالکل واضح ہو گیا کہ نمازِ صبح کا وقت ہے صبح اور نمازِ ظہر و عصر کا وقت ہے عشی زوال سے غروب تک اور نماز مغرب و عشاء کا وقت ہے مسا یعنی اول شب۔پس نمازِ ظہر و عصر کا وقت بھی ایک ہے الگ الگ نہیں اور نماز مغرب و عشاء کا وقت بھی ایک ہے جداگانہ نہیں۔نمازوں کے یہ نام کہ ایک کو نماز ظہر کہیں اور دوسری کو نماز عصر اور ادھر ایک کو نمازِ مغرب کہیں اور دوسری کو نماز عشاء یہ نام اصلِ وقت کی بناء پر نہیں ہیں بلکہ فضیلت کے اعتبار سے ہر نماز کی تشخیص کے لیے ہیں۔جس طرح بعض قرآنی سورتوں کے نام بسم اللہ کے بعد اس سورۃ کے پہلے لفظ سے ہیں جیسے سورۂ یاسین اور سورہ رحمان اور بعض سورتوں کے نام اس سورہ کے کسی درمیانی لفظ سے ہیں جیسے سورہ کوثر' سورہ بقرہ۔پس جن سورتوں کے نام ابتدائی لفظ سے رکھے گئے ہیں اس سے یہ مطلب ہوا کہ یہ سورہ اس لفظ سے شروع ہوتا ہے نہ یہ کہ یہ سورہ اس لفظ پر ختم ہوتا ہے۔اسی طرح نماز ظہر اور نماز مغرب کے یہ نام ان نمازوں کے وقت کی ابتداء بتاتے ہیں کہ یہ نمازیں اس وقت سے شروع ہوتی ہیں نہ یہ کہ یہ نمازیں اس وقت پر ختم ہوتی ہیں اور جن قرآنی سورتوں کے نام کسی درمیانی لفظ سے رکھے گئے مثلاً سورۂ فیل' سورۂ کوثر' سورۂ بقرہ وغیرہ وہاں نہ یہ مطلب

ہے کہ یہ سورہ اس لفظ سے شروع ہوتا ہے اور نہ یہ مطلب ہے کہ یہ سورہ اس لفظ پر ختم ہو جاتا ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ یہ سورہ اس لفظ سے پہلے بھی ہے اور اس لفظ کے بعد بھی ہے۔ اسی طرح نماز عصر اور نماز عشاء میں لفظ عصر اور عشاء ان نمازوں کے درمیانی وقت کا اظہار کر رہے ہیں جبکہ اصل وقت اس وقت سے پہلے بھی اور بعد میں بھی ہے۔ مختصر یہ کہ پہلی دو آیت جو صاف نمازوں کے اوقات کے بارے میں ہیں ان سے اور بعد کی دونوں آیتیں جن میں نماز کا کوئی نام نہیں اگر ان سے بھی اوقات نماز اخذ کیے جائیں تو ان سے بھی ظہر و عصر اور مغرب و عشاء کے وقت کا اشتراک اور دونوں نمازوں کے وقت کا ایک ہونا ثابت ہے۔

آیاتِ قرآنیہ کے بعد عملِ پیغمبرؐ کو دیکھنا ہے۔ جو اصل مسئلہ کی حقیقی تفسیر ہے۔ عہدِ مقدسِ نبوی میں اکثر ظہر و عصر کا اور مغرب و عشاء کا الگ الگ پڑھا جانا تو ملتا ہے جبکہ از روئے قرآنِ کریم ظہرین اور مغربین کا وقت ایک ساتھ ہے۔ صرف وقت فضیلت ہے جو الگ الگ ہے تو وہ عمل بر بناء فضیلت ہوا۔ اصلِ وقت کے الگ الگ ہونے کی بناء پر نہیں چنانچہ وہ روایات تو عام اور مشہور ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ نے خوف و خطر، سفر اور مطر (بارش) اس قسم کی چیزیں جب درپیش ہوئیں تو ظہرین اور مغربین کو ملا کر ایک ساتھ پڑھا ہے۔ ظہر و عصر کو ایک ساتھ بیک وقت پڑھنا اور مغرب و عشاء کو ایک ساتھ بیک وقت پڑھنا خواہ کسی عذر اور دشواری ہی کی وجہ سے ہو اشتراک وقت کی دلیل ہے کیونکہ کوئی نماز خواہ کیسا ہی عذر درپیش ہو وقت سے پہلے نہیں ہو سکتی اور ادا کی نیت سے وقت کے بعد بھی نہیں ہو سکتی۔ کوئی بھی حالت ہو نماز بہ نیت ادا اپنے وقت پر ہی ہوگی۔ یہ تو کوئی روایت نہیں کہ سرکار رسالت نے کسی خوف و خطر یا سفر کی وجہ سے نمازِ صبح کے وقت ظہر و عصر پڑھی یا دن چھپنے سے پہلے ہی نماز مغرب و عشاء پڑھ لی۔ ظہر و عصر کو جب بھی ملایا زوالِ آفتاب کے بعد ملا کر پڑھا۔ مغرب و عشاء کو جب بھی ملا کر پڑھا غروبِ آفتاب کے بعد ہی پڑھا یعنی کسی نماز کو کسی حالت میں بھی بے وقت نہیں پڑھا بلکہ وقت پر پڑھا۔ چونکہ ظہر و عصر کا وقت ایک

ساتھ تھا۔ مغرب و عشاء کا وقت ایک ساتھ تھا اس لیے آپ نے جائز صورت کو اختیار فرمایا۔ پھر یہ بھی دیکھتے چلیے کہ کیا سرکارؐ نے ظہرین اور مغربین کو صرف خوف و خطر یا کسی دشواری ہی کے وقت ملا کر پڑھا ہے ؟ یا کسی عذر اور دشواری کے بغیر بھی ان نمازوں کو ایک ساتھ اور ملا کر پڑھا ہے۔ روایاتِ شیعہ سے قطع نظر اگر صرف روایات مندرجہ کتبِ اہل سنت ہی پر نظر کی جائے تو ان سے بھی یہ بات قطعاً ثابت ہے کہ آنحضورؐ نے بغیر کسی دشواری (سفر، خوف و خطر، بارش) کے بھی ظہرین اور مغربین کو ایک ساتھ اور ملا کر پڑھا ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ ان نمازوں کو ایک ساتھ اور ملا کر پڑھنے کی یہ توجیہ بھی ان کی کتابوں میں موجود ہے کہ سرکارؐ کا یہ عمل (جمع بین الصلوٰتین) اس لیے تھا کہ امت میں سے کوئی شخص الگ الگ نمازِ ظہر و عصر یا نماز مغرب و عشاء پڑھنے پر مجبور ہو کر دشواری میں نہ پڑ جائے۔ ہم اس سلسلہ میں صحیح مسلم کی بعض روایات کو پیش کرتے ہیں جو صحاح ستہ میں سے ایک مشہور صحیح ہے :۔

۱۔ **عن ابن عباس، قال صلّی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم الظهر والعصر جمعاً والمغرب والعشاء جمعاً فی غیر خوف ولاسفرہ**

(ترجمہ) ”ابن عباس سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ظہر و عصر کو ایک ساتھ ملا کر پڑھا اور مغرب و عشاء کو بھی ملا کر پڑھا جبکہ کوئی خوف اور سفر نہ تھا۔

۲۔ **عن ابن عباس قال صلّی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم الظهر والعصر جمعاً بالمدینة فی غیر خوف و سفر قال ابوالزبیر فسئالت سعیداً لم فعل ذالك فقال سألت ابن عباس کما سالتنی فقال ارادان لایحرج احد امن امتهٖ**

(ترجمہ) ابن عباس سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں بغیر کسی خوف اور سفر کے نماز ظہر و عصر کو ایک ساتھ پڑھا۔ ابو الزبیر نے بیان کیا کہ میں نے سعید سے پوچھا کہ سرکار نے یہ کیوں کیا تو سعید نے کہا کہ

جو سوال تم نے مجھ سے کیا ہے وہی سوال میں نے ابن عباس سے کیا تھا تو ابن عباس نے کہا تھا کہ سرکار نے یہ چاہا کہ اپنی امت میں سے کسی کو دشواری میں نہ رکھیں۔

یعنی اگر یہ نمازیں الگ الگ ہی ہوتی رہیں گی تو امت یہ سمجھنے پر مجبور ہو گی کہ ان دونوں نمازوں کے وقت ہی الگ الگ ہیں اور اس بناء پر یہ سمجھا جائیگا کہ ان دونوں کو ایک ساتھ پڑھا ہی نہیں جاسکتا۔

۳۔ عن عبداللّٰہ بن شفیق قال خطبنا ابن عباس یوماً بعد العصر حین غربت الشمس وبدات النجوم وجعل الناس یقولون الصلوٰۃ الصلوٰۃ قال فجائه ' رجل من بنی تمیم لایفترو لایثنی الصلوٰۃ الصلوٰۃ فقال ابن عباس اتعلمنی السنّة لا ام لك ثم قال رایت رسول اللّٰہ جمع بین الظهر والعصر والمغرب والعشاء قال عبداللّٰہ بن شفیق فحاك فی صدری من ذلك شیٍ فاتیت ابا هریرة فسالته فصدق مقالته٥

(ترجمہ) عبداللہ بن شفیق سے منقول ہے کہ ایک روز ہمارے سامنے ابن عباس نے عصر کے بعد تقریر کی۔ جب آفتاب چھپ گیا اور ستارے نکل آئے تو لوگ الصلوٰۃ الصلوٰۃ کہنے لگے۔ بنی تمیم کا ایک شخص ابن عباس کے پاس آیا اور لگا تار الصلوٰۃ الصلوٰۃ (نماز نماز) کہنے لگا تو ابن عباس نے کہا کہ نہ ہو' تیری ماں۔ کیا تو مجھے سنتِ رسول سکھا رہا ہے؟ پھر ابن عباس نے کہا کہ میں نے رسول اللہؐ کو دیکھا ہے کہ انہوں نے ظہر و عصر کو اور مغرب و عشاء کو ایک ساتھ پڑھا۔ عبداللہ بن شفیق کہتا ہے کہ مجھے ابن عباس کی اس بات میں کچھ شک پیدا ہوا تو میں ابو ہریرہ کے پاس آیا اور ان سے سوال کیا تو ابو ہریرہ نے ابن عباس کے قول کی تصدیق کی یعنی ابو ہریرہ نے کہا کہ ابن عباس نے سچ کہا۔

۴۔ صحیح بخاری کتاب مواقیت الصلوٰۃ میں عمر بن دینار سے منقول ہے "سمعت

جابر بن زید عن ابن عباس قال صلّی النبی سبعاً جمعاً وثمانیاً جمعاًo

یعنی میں نے جابر بن زید سے سنا کہ ان سے ابن عباس نے کہا کہ نبیؐ نے (مغرب و عشاء) کی سات رکعت اور (ظہر و عصر) کی آٹھ رکعت ایک ساتھ ملا کر پڑھی ہیں۔

۵۔ صحیح ترمذی میں بھی صحیح مسلم والی وہ روایت موجود ہے کہ سرکارؐ نے بغیر کسی خوف و خطر اور بارش کے ظہر و عصر کی نمازیں ایک ساتھ ملا کر پڑھی ہیں اور مغرب و عشاء کی نمازیں ایک ساتھ پڑھی ہیں تاکہ امت کے لیے دشواری نہ رہے۔

آیاتِ قرآنیہ اور سنتِ نبویہ دونوں سے یہ بات ثابت ہے کہ ظہر و عصر کا وقت بھی ایک ہے اور مغرب و عشاء کا بھی۔ یہی وجہ ہے کہ مناسکِ حج ادا کرتے ہوئے حجاج بیت اللہ (سنی اور شیعہ) سب کے سب عرفات میں نماز ظہر و عصر اول وقت ملا کر پڑھتے ہیں اور مشعر الحرام پہنچ کر کچھ رات گئے نماز مغرب و عشاء ایک ساتھ پڑھتے ہیں۔ اگر یہ چیز ناجائز ہوتی تو حج اس لیے تو نہیں کہ وہ ناجائز چیزوں کو جائز کر دے وہاں تو بعض جائز چیزیں بھی ناجائز ہو جاتی ہیں چہ جائیکہ جو چیز دوسرے اوقات اور مقامات میں ناجائز ہو وہ چیز اثنائے حج میں جائز ہو جائے۔ اگر زوال کے بعد عصر کا وقت ہی نہ تھا تو یہ نماز عصر قبل از وقت ہوئی اور اگر رات کا ایک حصہ گزرنے پر نماز مغرب کا وقت ہی نہیں رہتا تو مشعر الحرام میں پہنچ کر یہ نماز مغرب بہ نیت ادا کیسے ہوئی۔ یہ تو مسلّم ہے کہ کیسا ہی خوف و خطر ہو، سفر ہو یا بارش ہو کوئی بھی نماز قبل از وقت نہیں ہو سکتی۔ اور پھر مسلّم ہے کہ وقت نماز گزر جانے کے بعد کوئی نماز بہ نیت ادا نہیں ہو سکتی۔ اب حُجاج سے دریافت کیا جائے کہ کیا عرفات میں عصر کی نماز پیشگی کی نیت سے پڑھی تھی؟ اور کیا مشعر الحرام میں مغرب کی نماز قضا کی نیت سے پڑھی تھی؟ جواب یہی ملے گا کہ نہیں۔ دونوں جگہ ادا کی نیت سے پڑھی تھیں جس کے معنی یہ ہیں کہ ہر نمازی نے یہ

اقرار کیا کہ ظہر کے اول وقت نمازِ عصر اپنے وقت پر ہو رہی ہے اور کچھ رات گئے نماز مغرب بھی اپنے وقت ہی پر ادا کی جا رہی ہے۔ کوئی نماز نہ وقت سے پہلے ہے نہ وقت گزرنے کے بعد ہے جس طرح سرکار رسالتؐ نے اپنے مقدس عہد میں دونوں نمازوں کو ملا کر یہ بتایا کہ ظہرین اور مغربین کا وقت ایک ہے اسی طرح حج کے موقع پر جمع بین الصلوٰتین کا التزام فرما کر قیامت تک اشتراکِ وقت کو نمایاں رکھا۔

بعض حضرات روز عاشورہ امام علیہ السلام کی نماز ظہر پیش کر کے دونوں نمازوں کا اور ان کے وقت کا الگ الگ ہونا دکھاتے ہیں۔ اول تو محض کوئی واقعہ یہ بتانے کا ذمہ دار نہیں ہوتا کہ جو بات جس طرح ہوئی وہ بات اسی طرح ہو سکتی تھی۔ دوسری طرح ہوتی تو نادرست ہوتی۔ یہاں بحث اس کی تو نہیں ہے کہ ظہر و عصر کا الگ الگ پڑھنا جائز ہے یا نہیں بحث تو اس امر کی ہے کہ ملا کر دونوں کا ایک ساتھ پڑھنا جائز ہے یا نہیں۔ امرِ جائز کو انسان چھوڑ بھی سکتا ہے اور کر بھی سکتا ہے۔ یہ بات تو اس وقت پیش کیے جانے کے لائق تھی کہ جب دونوں نمازوں کو ایک ساتھ پڑھنا واجب کہا جا رہا ہو۔ بحث تو صرف جواز کی ہے اور جواز کا ترک اور عمل دونوں جائز ہیں۔

اس کے علاوہ روایات میں اگر نماز ظہر کا ذکر ہے اور اس کے ساتھ نمازِ عصر پڑھنے کا کوئی تذکرہ نہیں کیا گیا تو کسی چیز کے ذکر کا نہ ہونا اس کی نفی اور نہ ہونے کی دلیل نہیں ہے۔ راویوں نے اگر یہ نہیں بیان کیا کہ نماز عصر بھی پڑھی تو انہوں نے یہ بھی تو نہیں کہا کہ نماز عصر نہیں پڑھی گئی۔ اگر ایک بات کے ساتھ دوسری بات کی نفی اور اثبات کچھ بھی نہیں ہے تو اس بات کا ہونا اور نہ ہونا دونوں ممکن ہیں۔ یہ صورت رات دن رہتی ہے کہ واقعہ کے کسی جزء کو بیان کیا جاتا ہے اور کسی جزء کو نہیں حتیٰ کہ قرآنِ کریم میں اگر کوئی واقعہ بیان کیا گیا ہو تو یہ ضروری نہیں کہ مذکور کے سوا اس کا اور کوئی جز ہی نہ تھا۔ تخلیق حضرت آدم علیہ السلام کے بارہ میں جو گفتگو ملائکہ سے ہوئی ایک جگہ صرف اتنا ذکر ہے۔ انی جاعل فی الارض خلیفہ یہاں نہ لفظ بشر ہے نہ یہ کہ مٹی سے، نہ یہ کہ گندھی ہوئی کھنکھناتی مٹی سے پیدا کر رہا ہوں۔ جب کہ دوسری جگہ

وہ الفاظ بھی ملتے ہیں جو انّی جاعل فی الارض خلیفہ کے ساتھ بالکل نہیں بیان کیے گئے۔ کہیں انّی خالق بشرا من طین' کہیں من حماٍ مسنون ہے۔ اور یہاں لفظ خلیفہ بالکل غیر مذکور ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک مکمل گفتگو تھی۔ اس میں سے بقدر ضرورت مختلف مقامات پر بیان کیا اور اب بھی ممکن ہے کہ بعض اجزاء کلام مطلقاً بیان ہی نہ ہوئے ہوں۔ واعظ اگر اپنے بیان میں کہتا ہے کہ سرکارؐ نے غدیر خم میں ارشاد فرمایا ہے الا من کنت مولاہ فعلی مولاہ تو اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ وہ سرکارؐ کی ساری تقریر کو ایک اسی جملہ میں منحصر اور محدود کر رہا ہے اور یہ کہہ رہا ہے کہ سرکارؐ نے اس سے پہلے کچھ فرمایا نہ اس کے بعد۔ واعظ تو صرف یہ ظاہر کر رہا ہے کہ سرکار نے یہ جملہ فرمایا تھا' وہ اس کے ماسوا کی نفی نہیں کر رہا ہے لہٰذا روایات میں صرف لفظ ظہر کو دیکھ کر یہ فیصلہ کر لینا کہ نماز عصر اس کے ساتھ نہیں ہوئی بے وجہ ہے۔ ان روایات سے نہ تو یہ فیصلہ ہو سکتا ہے کہ ظہر کے ساتھ نماز عصر پڑھی گئی اور نہ یہ کہ نہیں پڑھی گئی۔ روایات کے رو سے دونوں باتوں کا امکان ہے جس کو روایتاً طے نہیں کیا جا سکتا بلکہ درایۃً طے کرنا ہوگا اور چشمِ بصیرت سے دیکھنا ہوگا کہ حقیقتاً واقعہ کیا ہے یعنی ظہر کے ساتھ نماز عصر بھی پڑھی گئی یا نہیں۔ یہ بات مسلّم ہے کہ آنحضورؐ نے ظہرین اور مغربین کو بغیر کسی خوف و خطر کے' بغیر سفر اور بارش کے بھی ایک ساتھ پڑھی ہے۔ تاکہ کسی فردِ امت کو الگ الگ نماز پڑھنے کی دشواری کے لیے مجبور نہ ہونا پڑے اور آسانی کا دروازہ کھلا رہے جو ایک ساتھ پڑھنے میں ہے۔ پھر اس سے بھی کہیں زیادہ یہ امر مسلّم ہے کہ سفر' بارش اور خوف و خطر کے وقت تو آنحضورؐ نے ظہرین اور مغربین کو ضرور ہی ملا کر ایک ساتھ پڑھی ہے تو کیا یہاں یہ سوال نہیں پیدا ہوتا کہ رسولِ اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ میں جو سفر در پیش ہوئے اور جو خوف و خطر کے حالات آنحضرتؐ کے سامنے آئے ان سے کہیں زیادہ ہولناک سفر اور کہیں زیادہ خوف و خطر آپ کے صحیح جانشین اور محبوب ترین فرزند امام حسین علیہ السلام کو در پیش ہوا۔ وہ ہولناک سفر' وہ انتہائے خوف و خطر' وہ تیروں کی بارش جس کی مثال تاریخ عالم میں نہیں مل سکتی خصوصاً روزِ

عاشورہ علی الخصوص وقتِ ظہر اور بعدِ زوال آفتاب تو کیا یہ ممکن ہے کہ رسولؐ کے فرزندِ دلبند اور صحیح جانشین نے اپنے جدِ نامدار کا لائحہ عمل چھوڑ دیا ہو اور اپنے جدِ امجد کا اسوۂ حسنہ نہ اختیار کیا ہو۔ رسولؐ تو اس سے کمتر حالات میں ظہرین ملا کر پڑھیں اور حسینؑ کربلا کی قیامت خیز بلاؤں میں بھی ظہر و عصر کو ایک ساتھ نہ ادا کریں جب کہ یہ بات بھی اظہر من الشمس تھی کہ اس کے بعد حالات اور شدید تر ہو جائیں گے۔ یہ ظہر کے نمازی عصر تک کہاں باقی رہیں گے۔ اس کے بعد تو مہلت کا ایک سانس بھی نہ ملے گا۔

روایات کا حال تو یہ ہے کہ روایت جس طرح چل پڑی اسی طرح چلتی رہی اور اسی کو نقل کیا جاتا رہا۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ راوی پورے واقعہ کا کوئی جزء چھوڑ گیا ہو۔ کیا ہمارے لیے یہ راستہ صحیح ہو گا کہ ہم امامؑ کے عمل کو تو نبیؐ کے عمل سے مختلف مان لیں لیکن راوی کی روایت کے سامنے اس طرح سر جھکا دیں کہ اگر اس نے نمازِ عصر کا نام نہیں لیا تو نمازِ عصر امامؑ نے اس وقت پڑھی ہی نہیں۔ اگر پڑھی ہوتی تو راوی ضرور بیان کرتا۔ ہرگز نہیں۔ امام عین وقتِ حج مجبوراً اپنا حج چھوڑ کر آئے تھے اور اپنا معنوی حج کربلا میں ادا کر رہے تھے جس کی انتہا قربانیوں کی انتہا سے ہو رہی تھی۔ حجاج بھی عرفات میں ظہرین ایک ساتھ پڑھتے ہیں۔ امامؑ نے بھی ظہرین ایک ساتھ ادا کی۔ یہی وجہ ہے کہ پھر اس کے بعد بقیہ انصار امام کا کسی وقت بھی نمازِ عصر پڑھنا مذکور نہیں ہے۔ خود امام علیہ السلام کا بھی قبل شہادت کسی روایت میں نماز پڑھنا اور کسی روایت میں محض سجدہ کرنا پایا جاتا ہے یہ نماز ہو یا سجدہ اپنے معبود کے آخری ذکر و شکر کے لیے تھا ورنہ ظہرین اول وقت ادا ہو چکی تھی۔

اب رہا راویوں کا اس نماز کو جو امامؑ نے باجماعت پڑھی نمازِ ظہر بیان کرنا۔ اس کے کئی پہلو ہو سکتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ نمازِ ظہر کا پہلی نماز ہونے کی وجہ سے اسی کا نام لینے پر اکتفا کی گئی ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی ایک نے دوسرے سے امامؑ کا چار رکعت نماز پڑھنا بیان کیا ہو۔ اور سننے والے نے چار رکعت سن کر یہ سمجھ لیا ہو کہ یہ ظہر کی نماز ہوئی۔ اس کا خیال اس طرف نہ گیا ہو کہ یہ دونوں نمازیں بصورت نمازِ خوف دو دو

رکعت ادا کی گئیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی نے امامؑ کا صرف نماز پڑھنا بیان کیا ہو اور سننے والے نے لفظ نماز چونکہ مفرد اور واحد ہے اس سے ایک ہی نماز یعنی نماز ظہر سمجھ لی ہو۔ جس طرح ہم بھی مسجد میں جاتے ہیں دونوں نمازیں پڑھنے کے لیے مگر یہ نہیں کہتے کہ نمازیں پڑھنے جارہا ہوں یا نمازیں پڑھ کر آرہا ہوں۔ کہا یہی جاتا ہے کہ نماز پڑھنے جارہا ہوں، نماز پڑھ کر آرہا ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ امامؑ کی نماز کو بیان کرنے والے نے لفظ ظہر نماز کے لیے استعمال نہ کیا ہو بلکہ اس کا مطلب وقتِ ظہر سے ہو اور اس سے نماز ظہر سمجھ لی گئی ہو۔ غرضیکہ ہم کو لکیر کا فقیر ہو کر محض روایات ہی کو اپنا مبلغ علم اور منتہائے نظر نہیں بنانا چاہیے بلکہ روایات کو اپنی فراست اور عقل سے بھی جانچنا چاہیے۔ روایت ایک شہادت ہے اور راوی ایک شاہد ہے۔ محقق کو ایک قاضی اور جج بن کر دیکھنا چاہیے کہ یہ شہادت کس حد تک لائق قبول ہے۔ بے شک ہم احادیث و روایات سے محض بے نیاز نہیں ہو سکتے کیونکہ قاضی اگر شہادتوں کے سننے سے یہ کہہ کر انکار کر دے کہ ان شہادتوں کا صحیح ہونا یقینی نہیں تو میں کیوں سنوں تو وہ قاضی حقیقت کے معلوم کرنے کے لیے علمِ غیب کہاں سے لائے گا؟ اسی طرح یہ بھی غلط ہے کہ پیش کردہ شہادت کو قاضی اپنی فراست و عقل کو استعمال کیے بغیر بے کم و کاست تسلیم کر لے۔ ہم کو حقائق اور واقعات صحیحہ کا تعین احادیث اور روایات ہی سے کرنا ہے۔ تنہا ہماری فراست کچھ نہیں کر سکتی۔ اسی طرح تنہا حدیث و روایت بلکہ قرآن کی آیت بھی ہمارے لیے مفید نہیں ہو سکتی۔ جب تک کہ ان چیزوں کو عقل و فراست کی روشنی میں نہ دیکھا جائے۔ یہ بھی غلط ہے کہ احادیث و روایات کو بالکل چھوڑ دیا جائے اور یہ بھی غلط ہے کہ پہلی نظر میں جو کچھ سامنے آجائے تدبر اور تفکر کے بغیر اسے مان لیا جائے۔

میں آخر میں پھر ایک بار کہتا ہوں کہ صحاح اہل سنت میں مواقیت الصلوٰۃ اور جمع بین الصلوٰتین کے ابواب کے تحت وہ متعدد روایات موجود ہیں جن سے ثابت ہے کہ آنحضورؐ نے بغیر کسی عذر اور مجبوری کے ظہرین ملا کر پڑھی۔ مغربین ملا کر پڑھی تاکہ امت کے لیے عُسر و حرج نہ پیدا ہو۔ پھر وہ روایات بھی ہیں کہ کسی عذر (بارش، سفر،

خوف وخطر) کے وقت تو لامحالہ یہ نمازیں ملا کر پڑھی گئیں۔ان میں سے اگر محض عذر اور مجبوری والی ہی روایات کو دیکھا جائے اور پہلی قسم کی روایات سے قطع نظر کر لی جائے تب بھی ظہرین کا اور مغربین کا اشتراکِ وقت ہونا عقلی ثابت ہے کیونکہ نہایت معمولی سے تفکر سے یہ بات سامنے آجاتی ہے کہ عذر کتنا ہی شدید ہو اور خطرہ کتنا ہی زبردست ہو کوئی نماز اپنے وقت سے پہلے نہیں ہو سکتی چنانچہ صبح کے وقت کسی حالت میں بھی ظہرین اور مغربین نہیں ہو سکتیں اور ظہرین کے وقت مغربین کسی حالت میں بھی نہیں ہو سکتیں۔اسی طرح وقت گزرنے کے بعد کوئی نماز کسی حالت میں بھی ادا نہیں ہے۔ قضا ہے۔لہذا کسی عذر کے وقت بھی اگر سرکارؐ نے ظہر وعصر کو ملایا یا مغرب وعشاء کو ملایا تو اسی لیے کہ دونوں نمازوں کا وقت تھا۔

اب اگر حصولِ فضیلت کے لیے کوئی شخص ان نمازوں کو الگ الگ پڑھے جب کہ وقت کو مشترک جانتا ہو تو یہ امر نادرست نہیں بلکہ مستحسن ہے۔لیکن اگر وقت کو الگ الگ جان کر الگ الگ پڑھے تو پھر یہ اس قبر کے مثل ہے جو اوپر سے آراستہ ہے لیکن اندر تعفن ہی تعفن ہے۔

☆☆☆

جنابِ سیّد الشہدؑ اور درسِ ایمان و عمل

دین کوئی سا بھی ہو اس میں کچھ چیزیں ماننے کی ہوتی ہیں اور کچھ چیزیں ہوتی ہیں فعل و عمل میں لانے کی۔ ماننے کی چیزوں کو ایمان یا اصول دین کہتے ہیں اور طریقہ کار کو فروع دین یا عمل کہا جاتا ہے۔ مانا جاتا ہے دل سے اس لیے ایمان اور اصول دین کا تسلیم کرنا دوسری نگاہ کے لئے ایک باطنی، مخفی اور غیر محسوس شے ہے۔ عمل ہوتا ہے اعضاء ظاہرہ سے' اس لئے عمل ہوتا ہے ظاہر بظاہر نظر آنے والا اور محسوس مانا جاتا ہے پہلے اور عمل ہوتا ہے بعد میں۔ ظاہر ہے کہ انسان کسی شے کو کسی کے جبر سے نہیں مان سکتا۔ اسی لئے اسلام میں اصول دین کے منوانے کے لئے کسی پر جبر و اکراہ کی گنجائش نہیں ہے۔ ماننے والا ہی ہے جو اپنی رضا و رغبت سے مانے۔ پھر یہ رضا و رغبت دلانے والا خواہ کوئی بھی طریقہ ہو یا کسی دین کی حقانیت کو سمجھانے والا کوئی بھی ہو۔ جب تک خود اس انسان کے دل و دماغ میں اس دین کو صحیح سمجھنے کے وجوہ نہ ہوں گے اور جب تک یہ خود اپنی سمجھ بوجھ سے اس دین کو سچا نہ سمجھ لے گا محض کسی کے کہہ دینے سے کیوں اختیار کرے گا اور اگر خود اپنی سمجھ میں آئے بغیر اختیار کرے گا بھی تو یہ دل سے ماننا کہاں ہوگا۔ قالت الاعراب اٰمنا قل لم تؤ منوا ولکن قولوا اسلمنا ولمّا یدخل الایمان فی قلوبکم (آیت قرآنی) اعراب نے کہا کہ ہم ایمان لائے' رسول کہہ دو کہ تم ہرگز ایمان نہیں لائے مگر یہ کہو کہ ہم مسلمان ہو گئے۔ ایمان تمہارے دلوں میں تو داخل ہی نہیں ہوا۔

اپنی سمجھ بوجھ سے کام لینا اور دل و دماغ میں وجوہ و اسباب کو قائم کرنا اس کا نام ہے تحقیق' اور کسی کے کہنے سے مان لینا اس کو کہتے ہیں تقلید۔

چونکہ دین کو محض کسی کے کہنے سے قبول نہیں کیا جا سکتا' اس لئے ایمان میں یا اصول دین کے ماننے میں تحقیق ہے تقلید نہیں۔ لیکن جب دین کو سوچ سمجھ کر مان لیا تو اس دین کے احکام پر محض اس لئے کہ وہ احکام اس دین کے ہیں عمل کرنا ہوگا۔ خواہ ہم ان احکام کی غرض و غایت نہ سمجھتے ہوں۔ لہذا جس طرح اصول دین میں صرف تحقیق ہے تقلید نہیں ہے اسی طرح فروعِ دین میں تقلید ہے۔ غرض و غایت کی تحقیق نہیں۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ ہم کسی کو اپنا استاد یا اپنا باپ محض کسی کے کہہ دینے سے نہیں مان سکتے بلکہ استاد کے استاد ہونے کا اور باپ کے باپ ہونے کا ہم کو علم واقعی ہونا چاہئے۔ ہم یہ سمجھتے ہوں کہ اس کے استاد اور اس کے باپ ہونے کے وجوہ کیا ہیں یعنی اس سے ہم نے پڑھا ہے اس لئے یہ میرا استاد ہے اور اس کا میں بیٹا ہوں اس لئے یہ میرا باپ ہے۔ اس کے بعد استاد یا باپ جو حکم دے چاہے ہم کو یہ بھی معلوم نہ ہو کہ یہ حکم کس لئے دیا جا رہا ہے ہم کو تعمیل کرنا چاہئے۔ پہلا مرحلہ تحقیق کا تھا اور اب یہ دوسرا مرحلہ تقلید کا ہے۔

دین کے اصول و فروع :

اصول و فروع' یہ الفاظ اصل میں درخت کے لئے ہیں۔ جڑوں کو عربی میں اصول اور شاخوں کو فروع کہتے ہیں۔ اصولِ دین اور فروعِ دین کہہ کر ہم دین کو ایک درخت سے تشبیہ دیتے ہیں اور یہ تشبیہ کچھ ہماری ایجاد نہیں ہے بلکہ قرآن حکیم میں خداوندِ عالم نے دین کو شجرہ طیبہ سے اور بے دینی کو شجرہ خبیثہ سے تشبیہ دی ہے۔ جس طرح درخت کی کچھ جڑیں ہوتی ہیں جن کے بغیر درخت کا وجود نہیں ہو سکتا اسی طرح دین کے وہ اصول ہیں جن کے بغیر دین نہیں۔ جس طرح جڑوں کی فیض رسانی سے شاخیں پھوٹتی ہیں اور درخت سرسبز اور پُربہار ہوتا ہے اسی طرح دین کے وہ فروع

ہیں جو اصول کی بدولت نشو و نما پاتے ہیں۔ اس طرح ہر درخت کا ایک تخم ہوتا ہے جو بویا جاتا ہے اسی طرح اس شجر طیبہ کا تخم دینِ حق ہے۔ ہر تخم کہیں نہ کہیں سے آتا ہے اور کوئی ہوتا ہے جو اس تخم کو لا کر بوتا ہے۔ یہ تخم من جانب اللہ ہوتا ہے اور رسول اس تخم کو لا کر بوتا ہے۔ ھو الذی ارسل رسولہ بالھدیٰ و دین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ (آیت قرآنی) "اللہ ہی نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تاکہ وہ اس دین حق کو ہر ایک دین پر غالب کر دے"۔ لہٰذا خدا ہی نے یہ تخم بھیجا اور خدا ہی نے اس تخم کی کاشت کرنے والے (رسول) کو بھیجا۔ تخم ریزی کے لئے کوئی زمین ہونا چاہئے۔ اس تخم کی زمین قلب انسانی ہے۔ زمین کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔ کوئی زمین انتہائی مناسب ہوتی ہے جس کو بنانے سنوارنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ اس میں تخم ریزی کی دیر تھی۔ تخم ریزی ہوئی اور زمین اپنی صلاحیت دکھانے لگی۔ کسی زمین میں صلاحیت تو ہوتی ہے مگر کوشش کر کے اس کو لائق کاشت بنانا پڑتا ہے۔ زمین کی سختی کو نرم کرنا اور اینٹ پتھر کو ہٹانا پڑتا ہے۔ اس وجہ سے کچھ دیر لگ جاتی ہے۔ کوئی زمین ایسی ہوتی ہے کہ اس میں مٹی کا نام ہی نہیں ہوتا۔ وہاں کنکر پتھر کے سوا کچھ ہے ہی نہیں۔ یہاں کاشتکار کتنا ہی محنتی اور ہوشیار ہو مگر جب زمین ہی میں صلاحیت نہیں تو درخت کیسے اُگے۔ دنیا کا کاشتکار ایسی جگہ بیج ڈال کر ضائع کر دینا کبھی پسند نہیں کرتا لیکن دین کی تخم ریزی کرنے والا (رسول) ایسی زمینوں میں بھی تخم ریزی کر کے اپنا فرض منصبی ادا کر دیتا ہے تاکہ کسی کو کسی وقت یہ کہنے کی ہمت نہ ہو کہ صلاحیت تو یہاں بھی تھی مگر کاشتکار نے تخم ریزی ہی نہیں کی۔ اگر تخم ریزی کی جاتی تو درخت اس زمین سے بھی لہلہاتا نظر آتا۔ اول نمبر کی صلاحیت رکھنے والے یہ ہیں السابقون الاوّلون دوسرے درجے کی صلاحیت رکھنے والے یہ ہیں فاصحٰب المیمنۃ کچھ بعد والے اتبعوھم باحسان بالکل پتھریلی زمین والے یہ ہیں کالحجارۃ او اشدّ قسوۃً تخم ریزی کرنے کے بعد کاشتکار فارغ البال نہیں ہو جاتا۔ درخت کو بار بار سینچا جاتا ہے۔ گرم و سرد ہواؤں سے، جانوروں سے ظالموں سے بچانے کے لئے اس کی دیکھ بھال بھی

کی جاتی ہے۔ یہ سیرابی اور یہ حفاظت چند روزہ نہیں ہوتی بلکہ ہمیشہ کے لئے ہے اس لئے ضروری ہے کہ درخت کو سیراب کرنے والا اور درخت کا محافظ بھی ہمیشہ رہے۔ جس زمین میں درخت ہے وہ زمین خود اپنی طاقت سے نہ درخت کو سیراب کر سکتی ہے نہ ہر ضرر سے درخت کو بچا سکتی ہے۔ یہ کام کاشتکار کا ہے یعنی رسول کا' جس طرح کاشتکار درخت کی سینچائی اور حفاظت سے منہ موڑ کر اور درخت کو لاوارث چھوڑ کر کہیں دور دراز نہیں جاسکتا اگر جائے گا تو درخت کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے کسی کو اپنا قائم مقام بنا کر جائے گا اسی طرح شجرہ طیبہ کا کاشتکار (رسول) اپنی انتہائی محنت و مشقت سے بوئے ہوئے اور اگائے ہوئے درخت کو لاوارث چھوڑ کر دنیا سے نہیں جا سکتا جبکہ وہ بار بار خود اپنے ہی لئے یہ دیکھ چکا ہو کہ جب کبھی انسان صورت خونخوار درندوں نے مجھ پر حملہ کیا تو اپنائیت کے بعض دعویداروں نے میرا ساتھ چھوڑ دیا۔ دینی شجر کا مزارع (رسول)! ایسے لوگوں پر یہ کیسے اعتماد کر سکتا تھا کہ جو لوگ میرے سامنے میری ہی حفاظت سے کنارہ کش ہو گئے وہ میرے بعد میرے شجرۂ طیبہ کی مکمل حفاظت کریں گے ؟ رسول اپنے نونہال اور نورستہ پودے کو ہرگز کسمپرسی میں نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ نہ اس درخت کا مالک (خدا) ہی یہ گوارا کر سکتا تھا کہ اصل مزارع (رسول) کے بعد کوئی متبادل اور باضابطہ محافظ نہ رہے۔ رسول کے بعد کے محافظ کا نام امام ہے جس کا وجود ہر زمانے میں ضروری ہے جس کو خدا اور رسول نے خود منتخب اور معین کیا ہو۔ دین کو درخت سے تشبیہ دینے کے وجوہ پر پھر توجہ کیجئے۔

جڑیں پہلے پیدا ہوتی ہیں شاخیں بعد میں۔ اسی طرح اصولِ دین پہلے ہیں فروعِ دین بعد میں۔ جڑوں کے بغیر درخت کا وجود نہیں۔ اسی طرح اصولِ دین کو مانے بغیر دین کا کوئی وجود نہیں۔ جڑیں چاہے متعدد ہوں مگر ان کا کام مختلف نہیں۔ وہ سب ایک ہو کر درخت کی پرورش اور مضبوطی کرتی ہیں۔ سب کا مقصد ایک ہے۔ اقرار خدا ہو۔ اعترافِ رسالت ہو' تصدیقِ امامت ہو' اقرارِ قیامت ہو' قرآن کا سامنا ہو یا قبلہ کا یہ تمام اصول شجر دین کی بقا اور استحکام کے لئے ہیں۔ درخت کی جڑیں جس طرح زمین

میں چھپی ہوئی ہوتی ہیں دیکھنے میں نہیں آتیں اسی طرح اصولِ دین یعنی ایمان بھی زمینِ دل میں مخفی ہے۔ اس کو کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ درخت کی شاخیں فضا میں لہلہاتی ہیں اور سب کو نظر آتی ہیں اسی طرح فروعِ دین یعنی اعمال بھی آسانی سے نظر آتے ہیں۔ درخت کی جڑیں چونکہ زمین کی تہ میں دبی ہوئی اور مخفی ہوتی ہیں اسی وجہ سے ضرر رساں کا ہاتھ ان تک آسانی سے نہیں پہنچتا لہذا وہ جڑیں اپنی شاخوں سے زیادہ محفوظ ہیں لیکن شاخیں چونکہ اوپر ہوتی ہیں اور سب کے سامنے ہیں اس لئے آنے جانے والے ان شاخوں کو آسانی سے توڑ لیتے ہیں اس طرح شاخوں پر جڑوں سے زیادہ آفت رہتی ہے۔ یہی حال دین کے اصول و فروع کا ہے۔ شیاطین جن و انس جب جڑوں تک رسائی نہیں پاتے تو پورا زور شاخوں پر صرف کرتے ہیں اور مومن کو بے عمل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ خود اس کے نفسِ امارہ کو اپنا مددگار بنا لیتے ہیں کیونکہ بھید کے بغیر چوری نہیں۔ یہاں اپنا ہی نفسِ امارہ بھیدی بن جاتا ہے اور باغیوں سے سازباز کر لیتا ہے۔

ایمان چونکہ درخت کی جڑوں کی طرح مخفی ہوتا ہے۔ اس لئے جو لوگ ایمان سے خالی ہوتے ہیں ان کو بھی ایمان کا جھوٹ موٹ دعویٰ کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ایمان جب نظر آنے کی چیز ہی نہیں ہے تو یہ کون دیکھ سکتا ہے کہ ہمارے دل میں ایمان نہیں۔ یہ لوگ نماز روزہ اور ہر قسم کی عبادت اور نیکی کر کے اپنا صاحبِ ایمان ہونا ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن خدا اور رسول نے جو دلوں کا حال جانتے ہیں ہم بے خبروں کو باخبر کرنے کے لئے دو زبردست علامتیں مقرر کر دی ہیں جو کبھی خطا نہیں کرتیں۔ ان دو شیشوں کا چشمہ لگا کر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس دل میں ایمان ہے کہ نہیں اللہ اور رسول جانتے ہیں کہ یہ لوگ نماز، روزہ اور ہر قسم کی عبادت اسی طرح کر سکتے ہیں جیسے کہ ایک مومن بلکہ اس سے بھی زیادہ لیکن دو اہم عبادتیں ایسی ہیں جو کبھی ان کے بس کی نہیں ہو سکتیں۔ ان کو غیر مومن کر ہی نہیں سکتا۔ وہ دو عبادتیں کون سی ہیں؟

۱۔ میدانِ قتال میں جب جان جاتی نظر آتی ہو اس وقت ثابت قدم رہنا۔

۲۔ شمع آلِ محمدؐ کا پروانہ وار محب اور فدائی ہونا۔

یہ دو علامتیں سچے مومن کی ہیں جن سے سچ اور جھوٹ کی بے خطا آزمائش ہو سکتی ہے۔ کسی کے لمبے لمبے رکوع و سجود پر لمبے لمبے جبے اور داڑھی پر نہ جاؤ یہ مومن اور غیر مومن سب کے لئے ممکن ہے۔ یہی دو مذکورہ علامتیں دیکھو جو مومن کے لئے سہل اور غیر مومن کے لئے محال ہیں۔

پروانہ ہمیشہ شمع کا عاشق ہوتا ہے اس کو ظلمت اور اندھیرے سے کوئی لگاؤ نہیں لہذا اگر کوئی پروانہ شمع اور ظلمت دونوں کا فدائی نظر آئے تو وہ پروانہ صورت تو ہو سکتا ہے مگر پروانہ نہیں ہے کچھ اور ہی ہے۔

ہم نے یہ دونوں علامتیں قرآنِ کریم اور مسلم الثبوت ارشادات نبویہ سے لکھی ہیں۔ اختصار کی بنا پر نقل نہیں کیا۔

غرض کہ عمل اسی طرح تابع ایمان ہے جیسے شاخیں اپنی جڑوں کی تابع ہوتی ہیں۔ جڑوں کے زندہ، مردہ، قوی اور کمزور ہونے کا حال جس طرح شاخوں سے معلوم ہو جاتا ہے اسی طرح سے دینداری، بے دینی، پختگی ایمان اور خامئی ایمان کا حال عمل کے آئینہ میں دیکھا جا سکتا ہے۔ بلا تشبیہ جس طرح خدا کا وجود اس کی مخلوقات سے ثابت ہوتا ہے خدا خود نظر نہیں آتا، جس طرح روح زندگی کا وجود اعضاء کی حرکت سے ثابت ہوتا ہے، روح خود نظر نہیں آتی اسی طرح ایمان اور اصول دین کا وجود و عدم بھی عمل ہی سے ثابت ہوتا ہے ایمان خود نظر نہیں آتا۔ قدرت نے یہ مخصوص شرف انسان کو دیا ہے کہ وہ جس چیز کو دیکھتا ہے اس کے ذریعہ سے بے دیکھی چیزوں کو بھی پہچان لیتا ہے۔ غرض کہ ایمان و عمل کا ایسا بے خطا رابطہ ہے کہ جس رابطہ سے ہم ایمان کے وجود و عدم کو بھی پہچان لیتے ہیں اور اسی عمل کی ترازو میں ہم ایمان کی کمی اور بیشی کو بھی تول لیتے ہیں۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ ایمان کمزور ہو اور عمل قوی ہو یا ایمان قوی ہو اور عمل کمزور ہو۔ جتنا جتنا ایمان کا درجہ بلند ہوتا چلا جائے گا اتنا اتنا عمل کا مقام بھی بلند ہو جائے گا۔ ہر جگہ ہر چیز کا درجہ ایک نہیں ہوتا۔ صفت کا نام ہر جگہ ایک ہی رہتا ہے

مگر وہ صفت ہر جگہ برابر کی نہیں ہوتی مثلاً نماز ایک عبادت کا نام ہے یہ عبادت کوئی بھی کرے ہر جگہ اس کا نام نماز ہی ہے مگر ہر نماز اور ہر ایک کی نماز کا درجہ ایک تو نہیں۔ علم بہت سی جگہ ہے وہ ہر جگہ علم ہی کہلائے گا لیکن درجات میں زمین' آسمان سے زیادہ کا فرق ہو سکتا ہے ہر معصوم کی عصمت ہر نبی کی نبوت ہر پاک کی پاکیزگی برابر نہیں نمازیوں کی نمازیں' عالموں کا علم اور متقین کا تقویٰ تو کیا ایک ہوتا خود ایک ہی شخص کی نمازیں علم اور تقویٰ ہر زمانہ اور ہر وقت میں یکساں نہیں۔

اسی طرح اصول دین کے ماننے والے سب ہی مومن کہلائیں گے مگر سب کے ایمان کا ایک درجہ نہیں۔ کسی کے ایمان کا درجہ انتہائی بلند ہوگا کسی کے ایمان کا درجہ انتہائی پست ہوگا۔ اب ان کا یہ ایمان آخری نقطہ کمال پر ہوگا جن کو مجسمہ ایمان اور کلِ ایمان کہنا بجا ہوگا۔ جن کی محبت کا نام ایمان ہوگا۔ جن کا ذکر ایمان آموز جن کی دید ایمان افروز جن کی اقتداء گنہگارانِ امت ہی نہیں انبیاء و مرسلین کریں۔ جن کا وسیلہ خطاکار امت ہی نہیں انبیاء خدا اختیار کریں کتنا بلند ہوگا ان کا ایمان اور ایمان کی اس انتہائی بلندی کے ساتھ ساتھ کتنا بلند ہوگا ان کا عمل۔

ایمان کا وہ نقطہ کمال کیا محمدؐ و آلِ محمدؐ کے سوا کسی اور نے پایا؟ کیا انتہائی تطہیر کا اعلان اولین و آخرین میں سے ان کے سوا کسی اور کے لئے ہوا؟ ہرگز نہیں۔ وہی اور صرف وہی ہیں جن کو اصحاب کساء قرار دے کر ان کی انتہائی پاکیزگی دکھائی گئی اور ارباب مباہلہ قرار دے کر ان کی انتہائی صداقت دکھائی گئی۔ حضرت سید الشہداء ان ہی میں سے ہیں جو اطہر بھی ہیں اور اطہرین کے وارث بھی ہیں اور اطہرین کے مورث بھی ہیں۔ کیا کہنا ان کے ایمان کا اور کیا کہنا ان کے عمل کا۔ حسینؑ کربلا میں پہنچ کر ہی حسینؑ نہیں ہوئے۔ امام وہ عظیم قربانی دے کر امام نہیں ہوئے۔ وہ جب بھی تھے اور جہاں بھی تھے حسینؑ ہی تھے۔ امام ہی تھے۔ وہ ہر وقت اور ہر جگہ اللہ کے منتخب اور چنے ہوئے تھے۔ دنیا میں ہر شخص نے حسینؑ کو اپنے رخ سے دیکھا اور یہ نام اپنے نظریئے کو اور اپنے مفاد کو مستحکم کرنے کے لئے استعمال کیا ہے لیکن جو رابطہ حسینؑ اور خدا کے درمیان

میں تھا اس رخ سے دیکھنے کی کوشش کم کی گئی ہے۔ ہر شخص نے اس عظیم قربانی کو اور اس کے سبب کو، اس کی غرض و غایت کو اپنے خیال و اعتقاد کے سانچے میں ڈھالا۔ کسی نے کہا کہ امام کے ترک بیعت یزید کا سبب یہ تھا کہ یزید فاسق و زانی اور شراب خوار تھا، کسی نے کہا کہ کفر و نفاق، ظلم، جور، آمریت و باطل کی جڑوں کو اکھاڑ پھینکنے کے لئے امام نے یہ قربانی دی۔ غرض کہ جتنے منہ اتنی باتیں۔ جو لوگ امام کے انکار بیعت کا سبب یزید کے فسق و فجور کو قرار دیتے ہیں یہ اصل میں ایک تدبیر ہے کسی کسی دامن کو بے داغ دکھانے کی۔ حالانکہ حسین علیہ السلام کا انکار بیعت یہ اس گھرانے کا کوئی پہلا اور آخری موقع نہ تھا۔ حسینؑ اور حسنؑ کے بزرگوں کا یہ طرز عمل ہمیشہ رہا جو حسنؑ کے بعد حسینؑ کے وارث ائمہ تک پہنچا۔ کیوں؟ اس لئے کہ آلِ محمدؐ اجماعی طاقت کے یا اجماعی خلافت کے سہارے سے خلافت کے قائل نہ تھے وہ تو صرف خلافت الٰہیہ کی حقانیت کے معتقد تھے۔

کیا حسینؑ نے یزید سے پہلے خلیفہ (معاویہ) کی بیعت کر لی تھی؟ ہر گز نہیں اور بالکل نہیں۔ کیا حسنِ مجتبیٰؑ نے حضرت معاویہ کو یہ مان کر حکومت سونپی تھی کہ تم مجھ سے زیادہ خلافت کے حقدار ہو؟ کیا امام حسنؑ نے یہ مان لیا تھا کہ میں اور میرے باپ علیؑ معاذ اللہ غلطی پر تھے؟ کہ میں اور وہ (علیؑ) اب تک تم سے قتال کرتے رہے؟

کیا ان دونوں صاحبزادوں نے اب سے بہت پہلے منبر نشین حضرات سے یکے بعد دیگرے یہ نہیں کہا تھا کہ آپ میرے باپ کے منبر سے اتر جائیے۔

کیا علی مرتضیٰ نے اپنے قتل کئے جانے اور گھر جلا دیے جانے کی دھمکیوں کے باوجود بیعت کرنے سے انکار نہیں کیا تھا؟

کیا علیؑ نے تیسری خلافت کو کسی خاص سیرت کی پابندی کی شرط لگانے سے نامنظور نہیں کیا تھا؟ کیا حسین علیہ السلام کا انکار بیعت یزید صرف اس لئے تھا کہ یزید فاسق و فاجر تھا؟ کیا یزید اگر فاسق و فاجر نہ ہوتا تو حسینؑ اس کی بیعت کر لیتے؟ یا یزید کی بجائے اگر کوئی پرہیزگار آدمی حسینؑ سے طالبِ بیعت ہوتا تو کیا حسینؑ اس کی بیعت کر

لیتے ؟ کیا بیعت کرنے کے لئے اور خلافت کے منصب کے لئے حسینؑ کی نظر میں کوئی اور پرہیزگار مسلمان تھا ؟ اور ضمناً یا صراحتہً یا اشارۃً آپ نے کسی شخص دیگر کا نام لیا تھا ؟

بات تو ایک ہے اور صرف ایک ہے کہ آل محمدؐ کے نزدیک خلافت اور امامت کی قرارداد، نبوت اور رسالت کی مثل خدا کے ہاتھ میں تھی جیسا کہ آیات قرآنیہ کا بیان ہے۔ ربك يخلق مايشاءُ ويختار۔ اے رسول تمہارا رب جس کو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے چن لیتا ہے۔ ماكان لهم الخيرةُ بندوں کو چننے کا کوئی حق نہیں۔ انى جاعل فى الارض خليفة میں ہوں زمین میں خلیفہ کا قرار دینے والا۔ انّى جاعلك للناس اماما۔ ابراہیمؑ ! میں ہوں تم کو انسانوں کے لئے امام قرار دینے والا۔ آل محمدؐ کا شروع سے آخر تک یہی عقیدہ رہا کہ نبی اور خلیفہ اور امام خدا ہی کا قرار دادہ ہو سکتا ہے۔ کوئی اس کو مانے یا نہ مانے وہ ہر حالت میں اپنے منصب پر قائم ہے۔ انکار تو خدا سے لے کر امام تک ہر ایک ہی سے ہوا اور محض انکار ہی نہیں بلکہ مقابلے میں خدا رسول اور امام بھی بنتے رہے اور ماننے والے ان کو مانتے بھی رہے لیکن حقیقت سے انکار ہو یا دعوے کے مقابلہ میں دعویٰ ہو۔ کچھ بھی ہو حقیقت بدل نہیں سکتی نہ ان باتوں سے خدا کی خدائی جا سکتی ہے نہ نبی کی نبوت نہ امام کی امامت۔ کیوں ؟ اس لئے کہ خدا کے خدا ہونے سے، نبی کے نبی ہونے سے، امام کے امام ہونے سے غیروں نے انکار کیا ہے۔ خود خدا نے اپنے خدا ہونے سے انکار کر کے دوسرے کا خدا ہونا تسلیم نہیں کیا۔ نبی کی نبوت سے غیر نبی نے انکار کیا ہے۔ خود نبی نے اپنے نبی ہونے سے انکار کر کے غیر کی نبوت کا کلمہ نہیں پڑھا۔ امام کی امامت سے بھی غیروں نے انکار کیا ہے۔ خود امام نے اپنی امامت سے انکار کر کے کسی غلط دعویدار کی امامت کو نہیں مانا۔ البتہ اگر خود خدا ہی اپنے خدا ہونے سے انکار کر کے کسی اور کو خدا مان لے یا خود نبی ہی اپنی نبوت سے انکار کر کے کسی اور کی نبوت کا کلمہ پڑھ لے یا امام ہی خود اپنی امامت کا منکر ہو کر غیر امام کی امامت کو تسلیم کر لے تو کیا اس صورت میں خدا، خدا رہا ؟ نبی، نبی رہا ؟ امام، امام رہا ؟ ہرگز نہیں ! لطف یہ ہے کہ باطل تو اس صورت میں بھی باطل

ہی رہے گا۔ وہ خدائے برحق، نبی برحق، امام برحق نہیں ہو سکتا۔ لیکن حق بھی باطل کو تسلیم کر کے باطل ہی ہو گیا حق نہ رہا۔ یہاں سے یہ نکتہ سامنے آجاتا ہے کہ خدا کے خدا ہونے سے انکار یا نبی کے نبی ہونے سے انکار یا امام کے امام ہونے سے انکار جب کہ یہ انکار غیروں کی طرف سے ہو اس انکار کو خدا، رسول اور امام تسلیم تو ہرگز نہیں کر سکتے لیکن برداشت کر سکتے ہیں کیونکہ محض کسی کے انکار کرنے سے یا مقابلہ میں خود کسی کے مدعی بننے سے ان کا نصب زائل نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ ہر زمانے میں اس انکار کو برداشت کیا جاتا رہا اور کسی بھی منکر پر محض اس کے منکر ہونے کی وجہ سے تشدد نہیں کیا گیا لیکن ایسی مثال ایک بھی نہیں مل سکتی کہ خدا نے یا نبی نے یا امام نے کسی بھی اپنے حریف باطل کو خود تسلیم کر لیا ہو اور اپنی خدائی سے، نبوت سے امامت سے دست برداری اختیار کر لی ہو۔

یاد رکھئے کہ رسول اور امام کا وجود جسم و جان تو خدا کے وجود سے الگ ہے خالق کا وجود بالکل الگ اور مخلوق کا وجود بالکل الگ۔ اسی لئے رسول اور امام کی موت سے قتل سے اس دنیا میں نہ رہنے سے خدا کے خدا ہونے میں کوئی خلل اور کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لیکن رسول کی رسالت اور امام کی امامت یہ خدا کا انتخاب اور خدا کی قرارداد ہے۔ اس رسالت اور امامت کا تعلق براہ راست خدا کے خدا ہونے سے ہے اس کو آپ اللہ کی الوہیت سے جدا نہیں کر سکتے۔ اگر رسول یا امام رہے تو خدا بدستور خدا رہے گا۔ لیکن اگر رسالت اور امامت نہ رہے اور رسالت یا امامت پر آنچ آجائے تو محض رسالت یا امامت ہی تباہ نہ ہوئی۔ اللہ کی الوہیت تباہ ہو گئی، رب کی ربوبیت ہی زائل ہو گئی، رسالت اور امامت کے لئے جو چناؤ اللہ نے کیا ہے اللہ کو اس چناؤ پر ناز ہے اور اس چناؤ کے بہترین ہونے سے اللہ نے اپنے کمال علم کا ثبوت اور اپنے عین علم ہونے کی دلیل قرار دیا ہے واللہُ اعلم حیث یجعل رسالتہ (انعام : 124)۔ اللہ بہت زیادہ اور سب سے زیادہ جاننے والا ہے کہ وہ اپنی رسالت کا منصب کس کو دے اور کس جگہ رکھے۔ اخترناھم علی علم علی العالمین (دخان : 32)۔ ہم نے جن کو چنا اور چن کر

تمام اہل عالم پر فوقیت دی۔ یہ ہمارا چناؤ ہمارے انتہائے علم کے بھروسہ پر ہوا ہے۔ یہ چناؤ اندھے کی لکڑی نہیں ہے بلکہ علیم بالذات الصدور کا علم ہے۔ اللہ کا وہ علم واعتماد اسی امر کا تو ہے کہ ہمارا چنا ہوا کبھی ہم سے منحرف اور برگشتہ نہ ہوگا۔ خود اس کو کوئی مانے یا نہ مانے یہ کسی بھی مرحلہ پر گھبرا کر ہماری رسالت یا امامت کے خلعت کو نہ اتار پھینکے گا۔ یہ کسی مدعی باطل کو حق نہ مانے گا۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ نے جس کو بھی نبی یا امام بنایا اس کو کبھی اس کے منصب سے معزول نہیں کیا۔ معزول کرنے کی ضرورت ان کو پیش آتی ہے جو انتخاب کے وقت حالات مابعد سے بے خبر اور لاعلم ہوتے ہیں۔ اب سوچئے کہ اگر نبی ہی اپنی نبوت کا منکر ہو کر غیر کی نبوت مان لے اور امام ہی اپنی امامت کا منکر ہو کر غیر کی امامت کو تسلیم کر لے تو ائمہ کا وہ علم واعتماد جس کے بھروسہ پر ان کو چنا تھا خاک میں مل گیا بلکہ بالکل معدوم ہو گیا۔ اور خدا ہماری طرح جاہل محض اور بے علم ہو گیا۔ ہم کو تو اپنی بے علمی کا اعتراف ہے لیکن اس نے تو اس چناؤ پر اپنے علم کا دعویٰ کیا تھا۔ وہ تو ہم سے بھی بدتر ہو گیا کیونکہ اس نے نادان ہو کر ہمہ دانی کا دعویٰ کیا۔ کوئی بتائے کہ اس صورت میں معاذ اللہ جب خدا بے علم' جاہل اور کاذب ٹھہرا تو کیا وہ خدا رہا؟

حسینؑ کے بیعت یزید کر لینے کے معنی سوائے اس کے اور کیا ہیں کہ حسینؑ یہ تسلیم کر لیں کہ خلیفہ اور امام میں نہیں ہوں بلکہ یزید ہے۔ حسینؑ کو چنا تھا خدا نے اپنے اس علم اور اعتماد پر کہ دنیا والے حسینؑ کی امامت و خلافت کو مانیں یا نہ مانیں مگر حسینؑ یہ کبھی نہیں کہہ سکتے کہ میں خلیفہ اور امام نہیں ہوں بلکہ یزید ہے یا کوئی اور ہے۔ یہ بیعت صرف حسینؑ ہی کی امامت کا زوال نہ ہو گا بلکہ اللہ کی الوہیت کا زوال ہو گا پھر جب خدا ہی خدا نہ رہا تو رسول کی رسالت' دین حق کی حقانیت' روز جزا اور قیامت یہ سب ہی افسانہ باطل ٹھہرے۔ اب حسینؑ کے لئے دو ہی صورتیں تھیں۔ یا تو بجرم انکار بیعت اپنا اور اپنوں کا قتل ہونا گوارا کریں یا بیعت کر کے اپنی امامت ہی کو باطل نہیں بلکہ ائمہ کو کاذب و جاہل اور پورے دین ہی کو باطل کر دیں۔ حسینؑ یہ جانتے ہیں کہ اللہ کی الوہیت

میری زندگی پر منحصر نہیں۔ جب نہ میں تھا نہ کوئی تھا تب بھی خدا' خدا ہی تھا۔ اور جب کوئی بھی نہ رہے گا تب بھی خدا' خدا ہی رہے گا۔ لیکن بیعتِ غیر کرنے میں وہ یزید ہو یا کوئی بھی' وہ فاسق ہو یا عادل' اللہ کا علم و اعتماد جہل محض قرار پاتا ہے اس کی صداقت زائل ہوتی ہے اور مختصر اً خدا' خدا نہیں رہتا جو محال ہے اور قطعاً ناممکن ہے۔ حسینؑ ان دو میں سے جو صورت اختیار کر سکتے تھے۔ آپ نے وہی صورت اختیار کی۔ اپنے آپ کو نہیں بچایا۔ خدا کی خدائی کو اس کے علم و اعتماد کو' اس کی صداقت کو' نبی کی نبوت کو ائمہ کی امامت کو دین کی حقانیت کو بچایا۔ اور ان سب چیزوں کو بچایا ہی نہیں بلکہ ثابت کر دیا اور اپنے خون سے مہر تصدیق ثبت کر دی۔ حسینؑ نے ظلم و ستم کے بھڑکتے شعلوں پر اپنی اور اپنوں کی جانیں رکھ دیں۔ مگر مفہوم الوہیت پر آنچ نہ آنے دی ؎

سر داد نہ داد دست در دستِ یزید
حقا کہ بنائے لا الہٰ ہست حسینؑ

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ امام حسنؑ اور امام حسینؑ ان دونوں بھائیوں کے طرزِ عمل میں اختلاف ہے کہ ایک نے صلح کر لی اور دوسرے نے دعوتِ جنگ کو قبول کر لیا مگر بیعت نہ کی۔ حقیقت یہ ہے کہ حقیقت کو سمجھا ہی نہیں گیا۔ بھائیوں میں اختلاف نہیں بلکہ مطالبہ کرنے والوں کے مطالبے میں اختلاف ہے۔ حسنؑ سے جو کچھ مانگا گیا وہ حسینؑ سے نہیں مانگا گیا۔ اور جو حسینؑ سے مانگا گیا وہ حسنؑ سے نہیں مانگا گیا۔ اگر طلب دونوں سے ایک ہوتی تو عمل بھی ایک ہی ہوتا ہر چیز یکساں نہیں ہوتی۔ کوئی چیز جبر کے تحت میں دی جاسکتی ہے اور اس کو چھوڑا جاسکتا ہے لیکن ہر چیز نہیں۔ کوئی چیز ایسی ہوتی ہے کہ اس کو کسی حالت میں بھی نہیں دیا جاسکتا۔

حسنؑ سے وہ حکومت چھینی جارہی تھی جو ان کے پاس تھی' اس وقت اس سے بحث ہی نہ تھی کہ خلافت و امامت کے لئے ہمارا حق تسلیم کر لو۔ تجربہ شاہد ہے کہ کسی سے کسی چیز کو زبردستی چھیننے والا محض چیز چاہتا ہے۔ اس وقت چھیننے والا محض چیز چاہتا ہے اس وقت چھیننے والے کو اس کا خیال تک نہیں آتا کہ مالک سے یہ کہلا لوں یا لکھا لوں

کہ یہ چیز میری نہیں ہے بلکہ اس لے جانے والے کی ہے۔ راہزن اپنی ملکیت کہہ کر نہیں لوٹا کرتے۔ حسینؑ کے پاس کوئی حکومت نہ تھی۔ وہ پہلے ہی چھن چکی تھی۔ حسینؑ کے پاس صرف امامت تھی جو بیعت کے عنوان سے چھینی جا رہی تھی۔ امامت کوئی اکیلی چیز نہیں اور تنہا اپنی چیز نہیں۔ اس زنجیرہ میں رسالت اور الوہیت سب ہی کچھ ہے۔ یہ نہ چھینی جاسکتی تھی نہ چھنوائی جاسکتی تھی۔ حکومت اور چیز ہے 'امامت اور چیز ہے۔ نبی اور امام حکومت کے بغیر بھی نبی اور امام ہے۔ کیا ہمارے نبیؐ کے پاس مکہ سے ہجرت کے وقت کوئی حکومت تھی؟ بالکل نہیں۔ تو کیا سرکار اس وقت نبی نہ تھے؟ ضرور تھے۔

بے شک حکومت حق ہے نبی اور امام کا لیکن نبوت و امامت یہ خدا کا حق ہے' خدا کا عہد ہے بلکہ خدا کی خدائی ہے۔ ہزار ظلم و ستم ہوں یہ چھوڑنے کی چیز نہیں۔ اپنا حق جبر و تشدد کی بناء پر چھوڑا جاسکتا ہے لیکن اللہ کا حق 'اللہ کا عہد اور اللہ کی امانت کو رائیگاں نہیں کیا جاسکتا۔ انبیاء اور خاصانِ خدا ظلم و جبر کی بناء پر اپنا حق چھوڑتے چلے آئے ہیں مگر حقوقِ خدا پر آنچ نہیں آنے دیتے۔ خود رسولؐ نے مصالحت کر کے حرمِ خدا میں داخل نہ ہونا حسب شرائط مان لیا' کیا وہ رسول کا حق نہ تھا؟ رسولؐ نے صلح نامہ حدیبیہ سے لفظ رسول اللہ کو قلمزد کرنا گوارا کر لیا' کیا یہ لفظ رسول اللہ آپ کا حق نہ تھا؟ رسولؐ نے مفرورین جنگ احد و حنین سے درگزر کی کیا رسول کو ان کی تعذیب کا حق نہ تھا؟ رسولؐ نے فتح مکہ ہو جانے پر اپنا آبائی گھر واپس نہ لیا' شدید ترین دشمنوں کو سزا نہ دی کیا وہ رسولؐ کا حق نہ تھا؟

فاطمہ زہراؑ نے فدک کو صبر کر لیا کیا وہ سیدہ کا حق نہ تھا؟ بعد سیدہؑ جب تک خود ہی کسی نے فدک واپس نہ کیا آلِ محمدؐ نے از خود کبھی اس کا مطالبہ نہ کیا کیا وہ ان کا حق نہ تھا' علیؑ نے پہلی بار اس لئے کہ لوگ آپ سے جدا ہو گئے اور تیسری بار اس لئے کہ شرط لائق قبول نہ تھی حکومت کو خیرباد کہہ دیا کیا وہ علیؑ کا حق نہ تھا؟

ایسے ہی حالات میں حسنؑ نے حکومت چھوڑ دی مگر امامت کو محفوظ رکھا۔ اور حسینؑ نے جانیں دے دیں مگر امامت کو محفوظ رکھا۔

دونوں بھائیوں نے کچھ دیا اور جبر کے تحت میں دیا مگر امامت نہیں دی۔ وہ دونوں ایک ہی اور ان کا نقطہ نظر ایک ہے۔ یہ ہے حسینؑ کا درسِ ایمان و عمل جس پر ایمانؓ و عمل کو خدا اور رسول کو اہل بیتِ رسولؐ کو ہمیشہ ناز رہے گا۔

☆☆☆

بعثتِ سیدؐ انبیاء

ماہ رجب کی ستائیسویں تاریخ وہ مبارک ترین روز ہے جس روز آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مبعوث بر سالت ہوئے۔ اس سے پہلے سرکارؐ یقیناً نبی تھے لیکن تبلیغ پر مامور نہیں ہوئے تھے جیسا کہ خود آپ کا یہ قول مشہور بین الفریقین ہے کنت نبیاً و آدم بین الماء والطین۔ یعنی میں خلقت آدمؑ سے پہلے نبی تھا۔ نبی جب تک تبلیغ پر مامور نہ ہو اس وقت تک وہ نبی ہے۔ اس کو رسول اس وقت کہا جائے گا جب وہ تبلیغ پر مامور ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی ولادت کے بعد گہوارہ میں جو کلام کیا تو اس کلام میں انہوں نے اپنے آپ کو رسول نہیں کہا بلکہ نبی کہا آتانی الکتاب وجعلنی نبیاً۔ یعنی اللہ نے مجھے کتاب دی ہے اور نبی قرار دیا ہے۔ اس کے بعد جب آپ (عیسیٰؑ) تبلیغ پر مامور ہوئے تو اس زمانہ کے لئے خداوندِ عالم نے ان کو قرآن کریم میں بار بار رسول کہا۔ اسی طرح سرکارِ دو عالمؐ نے خلقت آدم سے پہلے خود کو رسول نہیں کہا بلکہ نبیؐ کہا۔ رسول آپ اس وقت ہوئے جب تبلیغ پر مامور ہوئے۔ سرکار پر الٰہی درود و سلام کا سلسلہ چونکہ خلقتِ آدمؑ کے پہلے سے تھا اور آپ اس وقت نبی تھے رسول نہ تھے اس لئے آیہ صلوات میں ان اللہ و ملائکتہ یصلون علی الرسول نہیں کہا گیا بلکہ ان اللہ و ملائکتہ یصلون علی النبی کہا گیا۔ لیکن جب آپ کی بعثت اور تبلیغ پر ماموریت کی قدرت نے خبر دی تو ارشاد قدرت ہوا ھو الذی بعث فی الامیین رسولاً منھم یعنی وہ اللہ وہی تو ہے جس نے اہل مکہ میں

رسول مکی مبعوث کیا۔ خداوند عالم نے اہل مکہ کو قرآن مجید میں کئی جگہ اُمّیّین فرمایا اور اسی جہت سے کہ سرکار دو عالم بھی مکی ہیں آپ کو بھی قرآن مجید میں نبی اُمّی فرمایا گیا کیونکہ شہر کا نام جیسا کہ قرآن مجید میں بھی آیا ہے اُم القریٰ ہے (لتنذر ام القری و من حولها)۔ شہر مکہ کے اس نام کی وجہ سے مکہ کے باشندہ کو امی اور باشند گان کو اُمّیّین کہا جاتا ہے خصوصاً مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کے بعد چونکہ یہ لوگ پہلے سے مدینہ کے نہ تھے۔ اس لئے وہاں کے لوگ ان حضرات کو اُمّیّین کہتے تھے۔ اس لفظ کو خواندہ' ناخواندہ سے کوئی بحث نہیں بلکہ مقصد صرف یہ ہے کہ یہ شخص ام القریٰ یعنی مکہ کا رہنے والا ہے لیکن نافہمی کی انتہا ہو گئی کہ اس لفظ قرآنی کے معنی جاہل اور ناخواندہ کے سمجھ لئے گئے جو بالکل خلافِ قرآن' بے اصل اور مہمل ہیں اور اس طرح نبی اُمّی کے معنی معاذ اللہ ناخواندہ اور صرف ناشناس نبی کے لیکر سیدِ انبیاء کی توہین کی گئی۔

تاریخ بعثت میں اختلاف:

حیات القلوب میں علامہ مجلسی علیہ الرحمہ نے بیان کیا ہے کہ حضرات اہل سنت میں روز و بعثت رسول کے متعلق بہت اختلاف ہے۔ بعض نے ۱۸ رمضان بعض نے سترہ رمضان بعض نے چوبیس رمضان بعض نے ۳ ربیع الاول بعض نے ۸ ربیع الاول اور بعض نے بارہ ربیع الاول بیان کی ہے لیکن علماء شیعہ کا اس پر اجماع ہے اور آئمہ اہل بیت علیہم السلام کے بکثرت ارشادات ہیں کہ آپ کی بعثت مقدسہ ستائیس رجب کو ہوئی جب کہ عمر شریف کے چالیس سال گزر چکے تھے۔ پھر یہی تاریخ سرکار رسالت کی معراج کی بھی قرار پائی۔ مذہب شیعہ کا اس پر بھی اتفاق ہے کہ معراج محض روحانی اور خواب کی حیثیت سے نہ تھی بلکہ سرکار بہ نفس نفیس مقام قاب قوسین او ادنیٰ تک مع الجسم پہنچے۔ جبکہ دوسری طرف بعض صحابہ بغیر جسم اقدس کے محض معراج روحانی کے قائل ہوئے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ معراج کے بارہ میں جس قدر بھی آیات قرآنیہ ہیں مثلاً اسریٰ بعبدہ اُن سے آپ کی مکمل ذات کی معراج ثابت ہے۔ کسی آیت میں بھی

جسم مقدس کا استثناء نہیں ہے۔

فرشتوں کے پَر جس جگہ جل رہے تھے یہ نعلین پہنے وہاں چل رہے تھے

جسم مقدس کا تو ذکر ہی کیا شرف معراج میں تو سرکار کا لباس اور نعلین مبارک بھی شامل ہیں غرضیکہ اس اعتبار سے کہ ۲۷ رجب کو بعثت بھی ہوئی اور معراج بھی۔ یہ دوہری عید کی تاریخ ہے۔ دن بعثت کا تو شب معراج کی۔ خداوند عالم نے اس نبی کی بعثت کو خصوصیت سے اپنی عظمت و جلالت اور کمالِ قدرت کا شاہکار قرار دیا ہے۔ سورۂ جمعہ میں خلاقِ عالم اپنی حمد و ثناء فرما رہا ہے اور بتا رہا ہے کہ آسمانوں اور زمین میں ہر شے (بزبان حال) اللہ کی تسبیح کرتی ہے جو مالک الملک ہے' ہر شے پر غالب ہے پاک و پاکیزہ ہے۔ عین علم و حکمت ہے پھر فوراً فرمایا جاتا ہے ھو الذی بعث فی الامیین رسولا منھم وہ وہی تو ہے جس نے اہل مکہ میں مکی نبی کو مبعوث کیا۔ اس عبارت قرآنی سے صاف ظاہر ہے کہ خداوندِ عالم اس رسول کو اپنے صفات و کمالات کا بہترین نمونہ قرار دے کر پیش کر رہا ہے اور رسول کی تخلیق اور بعثت پر فخر کر رہا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم میں امتیاز درجات

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مبعوث برسالت ہوتے ہی فی الفور دُعا کی تھی رب الشرح لی صدری ویسّرلی امری واحلل عقدۃ مّن لسانی یفقھوا قولی واجعل لی وزیراً من اھلی الخ۔ یعنی خداوند میرے سینہ کو فراخ کر دے اور میرے کام کو مجھ پر آسان کر دے اور میری زبان کی گرہ کو کھول دے تاکہ لوگ میری بات کو سمجھیں اور میرے اہل سے میرے بھائی ہارون کو میرا وزیر کر دے۔ الخ

جواب قدرت آیا قد اوتیت سولک یا موسیٰ ولقد مننّا علیک مرّۃ اُخریٰ۔ یعنی اے موسیٰ تمہارا سوال تم کو دیا گیا اور ہم نے تم پر اس سے پہلے بھی احسان کیا تھا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ یہاں موسیٰ علیہ السلام نے مانگا اور اللہ نے ان کا سوال پورا

کیا لیکن اس نبی آخر کو خداوند عالم نے یہ سب کچھ از خود عطا فرمایا الم نشرح لك صدرك۔ اے رسول کیا ہم نے تمہیں وسعتِ قلب نہیں دی۔ یہ کہہ کر نبی کے شرح صدر کا ذکر کیا اور اس کے بعد وضعنا عنك وزرك کہہ کر ظاہر کیا کہ ہم نے علیؑ کو تمہارا وزیر بنا کر تمہارا بوجھ کم کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ سخن فہمی سے کام لیا جائے تو دونوں نبیوں میں خدا کے نزدیک کتنا فرق مرتب ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا قبول کرتے ہوئے خداوندِ عالم حضرت موسیٰ پر اپنا احسان جتا رہا ہے لیکن اس نبیؐ آخر کی شان دیکھئے کہ خداوند عالم اس نبی کی بعثت کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے:

لقد منّ اللّٰه علی المومنین اذ بعث فیھم رسولاً منھم الخ۔ یعنی اللہ نے مومنین پر احسان کیا کہ ان میں ایسا رسول مبعوث کیا۔ یہاں عطاء رسالت کا احسان خداوند عالم رسول پر نہیں رکھتا بلکہ اس رسول کی بعثت پر خداوندِ عالم مومنین کو زیر بار احسان قرار دے رہا ہے۔ پھر جو ذاتِ کبریا رسولؐ پر اپنا بار احسان نہیں رکھتا وہ یہ کیسے گوارا کر سکتا تھا کہ لوگ اس رسول کا کلمہ پڑھ پڑھ کر رسول پر اپنا احسان جتائیں چنانچہ جب کچھ نو مسلم لوگوں نے اپنے ایمان لانے اور مسلمان ہونے کا نبیؐ پر احسان جتایا تو فوراً آیت نازل ہوئی قل لاتمنّوا علیّ اسلامکم الخ۔ یعنی اے رسول کہہ دو کہ تم لوگ اپنے اسلام میں آنے کا احسان مجھ پر نہ رکھو بلکہ یہ تسلیم کرو کہ اللہ نے تم پر احسان کیا کہ تم کو ایمان کا راستہ دکھا دیا۔

قبلِ بعثت سرکارؐ کس دین و آئین پر عمل پیرا تھے:

یہ تو ظاہر ہے کہ بعثت کے بعد تو سرکار اپنی شریعت کے عالم و عامل بھی تھے اور معلم بھی لیکن سوال یہ ہے کہ بعثت سے پہلے ان کے اعتقادات اور عمل کی حیثیت کیا تھی؟ بعض لوگوں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ اس وقت آپ کے سامنے کوئی راہ نہ تھی معاذ اللہ۔ بعض حضرات کا یہ کہنا ہے کہ سرکار اپنی ذاتی سمجھ سے جس طرح چاہتے تھے عبادت کرتے تھے اور اپنے قیاس سے نیک و بد کی تشخیص کرتے تھے۔ اس زمانہ میں وحی و

الہام کا کوئی رشتہ نہ تھا اور اس طرح آپ کے اعمال وافعال کی بناء کسی شریعت الٰہیہ پر نہ تھی۔ لیکن جائے حیرت ہے کہ ہر انسان تو بالغ ہونے کے فوراً بعد احکام الٰہیہ کا مکلّف ہو جائے اور اس کا فرض ہو کہ الٰہی شریعت کا پابند ہو اور اپنے عقائد اعمال اس شریعت کے سانچے میں ڈھالے لیکن جو ذات خیر خلق خدا ہو اس کے لئے منجانب اللہ کوئی شریعت نہ ہو اور وہ کسی سندِ قدرت کے بغیر غیر مستند عبادت کرے اور غیر مستند اعمال بجالائے۔

ایک نظریہ یہ ہے کہ بعثت سے پہلے آپ کسی نہ کسی نبی سابق کی شریعت پر گامزن تھے۔ وہ شریعتِ نوحؑ ہو یا شریعتِ ابراہیمؑ یا شریعتِ موسیٰؑ یا شریعتِ عیسیٰؑ ان میں سے کسی کی شریعت پر عمل کرتے تھے۔ یہ نظریہ بھی پہلے دونوں نظریوں کی طرح مہمل ہے۔ پہلے تو یہ کہ آپ کا کسی نبی کی شریعت کا تابع ہونا آپ کی افضلیت اور انبیاء پر برتری کے منافی ہے کیونکہ تابع کا درجہ متبوع سے لامحالہ کم ہوتا ہے۔ کسی نبی کا پیروی کرنے والا اس کی اُمت قرار پاتا ہے اور وہ نبی پیروی کرنے والے کا امام ہوتا ہے حالانکہ سرکارؐ سید الانبیاء اور امام الانبیاء ہیں۔ اس کے علاوہ کسی کی شریعت پر عمل کرنا اس پر موقوف ہے کہ عمل کرنے والا اس شریعت کا عالم اور جاننے والا ہو اور کسی شریعت کا علم دو ہی صورتوں میں ہو سکتا ہے یا تو یہ علم اللہ کی طرف سے ہو یعنی وحی اور الہام ہو یا یہ علم شریعت کے عالموں سے سن کر یا پڑھ کر حاصل کیا جائے۔ اگر یہاں یہ مانا جائے کہ جس نبی کی شریعت پر آپ عمل کرتے تھے اس کا علم آپ کو منجاب اللہ ہوتا تھا تو وحی والہام ربانی ثابت ہے اور وحی والہام ثابت ہے تو آپ کا نبیؐ ہونا ثابت جیسا کہ کنت نبیاً و آدم بین الماء والطین سے ظاہر ہے اور اس صورت میں حقیقتاً کسی نبی کا اتباع نہ ہوگا بلکہ ان احکام خُدا کا اتباع ہوگا جو براہ راست آپ تک پہنچ رہے ہیں۔ یہاں لفظ اتباع معنائے حقیقی میں نہ رہے گا بلکہ معنی ہوں گے اس شریعت سے موافقت کے جیسے کہ بعد بعثت بھی فرمایا گیا ہے۔ واتبع ملّة ابراهيم حنيفا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ بعثت کے بعد تو آپ اپنی شریعت چھوڑ کر کسی کی شریعت کے پابند نہیں ہو سکتے تھے۔ لہذا یہاں صرف موافقت ہی مراد ہو سکتی ہے۔ اب رہی وہ دوسری صورت کہ

بعثت سے پہلے آپ نے کسی نبی کی شریعت کا علم کسی سے پڑھ کر یا سن کر حاصل کیا ہو تو یہ سراسر غلط اور باطل ہے کیونکہ یہ مسلم اور متفق ہے کہ قبل بعثت نہ تو آپ کسی مذہب کے عالم کے پاس بیٹھے نہ کسی سے کچھ پڑھا نہ کسی سے کچھ سنا نہ کسی سے کچھ سیکھا' دنیا میں آپ کا معلم ہی کوئی نہیں لہذا مذکورہ تمام نظریات باطل 'امر حق اور مذہب حق یہ ہے کہ سرکار بعثت سے پہلے بھی اسی طرح نبیؐ تھے جس طرح بعثت کے بعد آپ ہمیشہ موردِ وحی والہام رہے۔ قبل بعثت بھی اور بعثت کے بعد بھی فرق صرف اتنا ہے کہ بعثت سے پہلے آپ تبلیغ پر مامور نہ تھے۔ اس وقت وحی الٰہی کا تعلق ان امور سے تھا جو آپ کی ذات سے متعلق تھے۔ اس الٰہی وحی سے آپ اپنی تکلیفِ شرعی اور ذمہ داری کو کماحقہ' جانتے تھے اور اس کے مطابق عمل کرتے تھے۔ بعثت کے بعد آپ تبلیغ پر مامور ہوئے اور رسول قرار پائے اور محمد رسول اللہ کہلائے۔ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

☆☆☆

امامِ زمانؑ کا وجود و ظہور

ختم نبوت کے بعد مسئلہ امامت مسلمانوں کے دونوں فرقوں (شیعہ ' سنی) کے نزدیک ایک اہم مسئلہ ہے۔ نبیؐ کے بعد فی الفور اور بلا فاصلہ امامِ امت کا ہونا ہر فرقہ نے ضروری تسلیم کیا ہے۔ اصول شیعہ کی رو سے تو نبیؐ کی اس وقت تک وفات ہی نہیں ہو سکتی جب تک ان کی جانشینی (خلافت و امامت) کے لئے منجانب اللہ صریح تعین نہ ہو چکا ہو اور نبیؐ نے قرار داد قدرت کا اعلان عام نہ کر دیا ہو۔ عمل اہل سنت سے بھی یہ ظاہر ہے کہ ان کے نزدیک نبیؐ کے بعد نصبِ امام اور تقرر خلیفہ اتنا اشد ضروری ہے کہ دفن نبیؐ کے انتظار کے بقدر بھی اس مسئلہ میں تاخیر نہ ہونی چاہیے۔ نبیؐ کریم کے ارشاد مبارک سے بھی جو متفق علیہ بین الفریقین ہے۔ عموماً ظاہر ہوتا ہے کہ ہر زمانہ کا ایک امام ہے اور ہر زمانے میں امام کا ہونا بھی ضروری ہے اور افراد امت پر اس امام کی معرفت بھی لازمی ہے چنانچہ دونوں فرقوں میں سرکار کا یہ ارشاد موجود ہے من مات ولم یعرف امام زمانہ مات میتةً جاھلیة (حمیدی جمع بین الصحیحین بخاری و مسلم) یعنی جو شخص اس حالت میں مرا کہ اس نے اپنے زمانے کے امام کو نہ پہچانا اس کی موت کفر کی حالت میں ہوئی۔

نصبِ امام کے بارے میں شیعہ سنی اختلاف:

امام کی ضرورت تو ہر فرقے میں مسلم ہے البتہ امام کے طرز تعین میں اختلاف ہے اور اسی طرز تعین کے اختلاف سے شیعہ ' سنی تفریق ہوئی۔ شیعوں کا نظریہ جیسا کہ

ہم بیان کر چکے ہیں کہ امام کا تعین منجاب اللہ حیاتِ نبیؐ میں ہوتا ہے اور نبیؐ خود قرار دادِ قدرت کا اعلان کرتے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ جس کو خدا خود چُنے گا وہ ہستی کیسی کامل الصفات ہو گی۔

اہل سنت کے ہاں یہ کام اجماع امت سے متعلق ہے پہلی خلافت ظاہراً اسی طرز سے ہوئی لیکن اس موقع پر کل بنی ہاشم اور بعض صحابہ کبار کی غیر موجودگی مسلّم ہے اور ان کے علاوہ بھی جو لوگ وہاں موجود تھے ان میں سے بھی کل یا بعض انصار کا یہ قول مورخین نے لکھا ہے لانبایع الاّ علیاً (ہم علیؑ کے سوا کسی کی بیعت نہ کریں گے) بہر حال اجماع کا لفظ جس معنی میں بھی ہو خلفائے ثلاثہ میں سے صرف پہلی خلافت کے لئے ہے۔ دوسری اور تیسری خلافت اس طرز (اجماع) سے نہیں ہوئی بلکہ دونوں خلافتیں خلیفہ سابق کے شخصی یا محدود تعین سے ہوئیں۔ اور اس طرح ہر خلیفہ کا تعین ہر بار ایک نئے طرز سے ہوا۔ یہ بھی کہیں ذکر نہیں کہ قرار دادِ خلافت کے لئے جو طریق کار وقتاً فوقتاً اختیار کئے گئے وہ تمام طریقے پہلے خلیفہ کے تعین سے پہلے بطور اصول تجویز کر لئے گئے ہوں۔ پتہ یہی چلتا ہے کہ جو طریقے اختیار کئے جاتے رہے بعد میں وہی اصول قرار پاتے رہے۔ اگر یہ عمل اصول کی موجودگی میں ہوتا اور عمل سے اصول بننے کے بجائے اصول سے عمل ہوتے تو غالباً حضرت معاویہ (جو نہ مہاجرین میں تھے نہ انصار میں بلکہ محض ایک طلیق تھے) مسند خلافت پر متمکن نہ ہو سکتے تھے اور نہ اپنے بعد کے لئے یزید کو یہ عہدہ دے سکتے تھے۔ ابتداء کار میں خلافت کے لئے کسی معیار کے نہ ہونے اور اصول کے معدوم ہونے کا یہ نتیجہ نکلا کہ یزید و مروان جیسے لوگ بھی مسندِ خلافت پر آگئے اور مسلمانوں کے آگے چل کر خلافت کو خلافت راشدہ میں تقسیم کرنا پڑا۔ لیکن اس لفظی تقسیم سے سوائے لفظی تسلی کے اسلام اور مسلمانوں کو فائدہ کیا پہنچا! ستم کیش خلفاء سے جو ضرر سریعت کو' اہل بیت کو اور مسلمانوں کو پہنچا اور جو ٹھیس اسلام کے وقار و اعتبار کو لگی اس کا تو کوئی علاج نہ ہوا۔

خلفائے راشدین و غیر راشدین کی تقسیم کب ہوئی :

کون عقلمند یہ کہہ سکتا ہے کہ جن خلفاء کو اب غیر راشدین کہا جارہا ہے ان کو ان کے زمانہ استبداد میں بھی غیر راشدین کہا اور سمجھا جاتا تھا۔ یہ کس کی مجال تھی کہ ان کے دور اقتدار میں ان کو غیر راشد کہتا؟ اور کہتا بھی تو کون کہتا؟ علماء اور محدثین ان کے تابع فرمان تھے۔ اعلیٰ اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے کوئی سلطنت کا فقیہ معتمد کوئی قاضی اور کوئی قاضی القضاۃ۔ یہ کس میں دم تھا کہ ان کو غیر عادل کہہ دے۔ اہل مدینہ نے امیر شام (حضرت معاویہ) کے اشارے پر یزید کی بیعت کرلی۔ صرف تین آدمی تھے جو بیعت سے کنارہ کش رہے (امام حسینؑ، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عبداللہ بن زبیر (ان تینوں میں بھی اسباب واغراضِ انکار مختلف تھے۔ ورنہ دنیائے اسلام نے یزید جیسوں کو امیر المومنین مان لیا تھا (اگر ان لوگوں) خلفاء راشدین' کے زمانہ میں جمہور معلمین نے ان کو غیر راشدین مانا ہوتا تو جمہور کی مخالفت کے ہوتے ہوئے یہ لوگ خلیفہ ہی کیوں ہوتے؟

اسی طرح یہ سمجھنا بالکل لغو ہے کہ یہ خلفاء خود بھی اپنے آپ کو غیر راشدین کہتے اور سمجھتے تھے اور اس کا اعتراف رکھتے تھے کہ ہمارے کردار اور طریق کار' ہمارے کام اور ہمارے احکام' اصولِ اسلام سے مختلف بھی ہوتے ہیں۔ حقیقتاً یہ لوگ اپنے آپ کو جائز اور صحیح سمجھتے تھے امیر المومنین کہلاتے تھے۔ اپنی موافقت کو دینداری اور مخالفت کو بے دینی بتاتے تھے اپنی ہر بات کو دین اور اسلام کا رنگ دے کر پیش کرتے تھے۔ عوام بلکہ خواص کے ذہنوں میں یہ بٹھا دیا گیا تھا کہ جو خلیفہ سے سرتابی کرے وہ باغی اور واجب القتل ہے خواہ وہ نواسہ رسولؐ ہی ہو۔ ان کی رائے سے جو اختلاف کرے وہ مستوجب سزا ہے چاہے امام الحرم ہی کیوں نہ ہو۔

ایک خاندان تھا (اہل بیتؑ) ایسا جنہوں نے ان لوگوں کے جواز خلافت کو کبھی تسلیم نہ کیا اور وہ اس لئے کہ ان کے نزدیک معیار خلافت ہی بالکل الگ تھا۔ نتیجہ اس کا

لامحالہ یہ ہونا ہی تھا کہ وہ اہل بیتؑ ہمیشہ معتوب خلافت رہے اور ان کے ساتھ ان کے ہم نوا بھی۔ ائمہ اہل بیت پر کیسی کیسی سختیاں کی گئیں ان کو شاہی سواری کے ساتھ دوڑایا گیا مجرموں کی طرح ان کے گھر کی تلاشیاں ہوئیں۔ ان کو درندوں کے سامنے لا کر کھڑا کیا گیا۔ قید کیا گیا۔ زہر دیا گیا۔ لہذا خلافت راشدہ اور غیر راشدہ کے لفظ ان کے زمانہ میں نہیں بلکہ زمانہ بعد میں کہے گئے۔

عامتہ المسلمین کو اہل بیتؑ سے ان کے فضائل سے بلکہ ان کے ناموں سے بیزار کر دیا گیا:

چونکہ اس خاندان (اہل بیتؑ) نے خلفاء جور سے کبھی ہم آہنگی اختیار نہ کی اور ان کے آلہ کار نہ بنے اس لئے اہل بیتؑ اور ان کے ہمنوا افراد پر ہر طرح کے ظلم و ستم ڈھائے گئے اور عوام کو ان (اہل بیتؑ) سے بیزار اور متنفر کر دیا گیا کہ محدثین نے ان سے روایت بھی گوارا نہ کی خوارج اور قاتلان اہل بیتؑ تک سے حدیثیں حاصل کیں لیکن اہل بیتؑ کو اس لائق نہ سمجھا کہ ان سے ان کے گھر کی باتیں لی جائیں دنیا اہل بیتؑ سے ایسی برگشتہ ہو گئی کہ اگر کسی نبویؐ حدیث میں اہل بیتؑ کا لفظ یا ذکر دیکھا تو فوراً سمجھ لیا کہ یہ حدیث وضعی اور ساقط الاعتبار ہے اور اس کے بارے میں یہ مقولہ زبان زد ہو گیا **ھذا من حدیث الرافضیہ**۔ یہ رافضیوں کی حدیث ہے چاہے اس حدیث کی کتاب اور اس حدیث کے راوی کتنے ہی معتبر ہوں۔ اگر مانا بھی جائے گا تو اس حدیث کے صرف اتنے حصہ کو جتنے حصے میں اہل بیتؑ کا ذکر نہ ہو جہاں اہل بیتؑ کا نام یا ذکر آیا اس کو کالعدم اور بے معنی سمجھ لیا سابق میں بھی ہر کس و ناکس خلیفہ اور امام بنتا رہا اور دنیا مانتی رہی۔ ماضی قریب میں بھی ایک صاحب مسیح موعود' امام زمان اور مہدی نکل آئے۔ ظاہر ہے کہ مرزا صاحب نے جس لفظ مسیح اور جس لفظ مہدی کو اپنے لئے استعمال کیا یہ الفاظ مسلمانوں کے لئے اجنبی نہیں ہیں۔ مرزا صاحب کو اپنے لئے مسیح اور مہدی کہنے کا موقع یہ دیکھ کر ہی ملا کہ اسلام میں مہدی کے آنے کی اور ان کی تائید میں مسیح کے آنے

کی ایک مشہور خبر ہے اور اس خبر کی بنا پر مسلمان ان کی آمد کے امیدوار ہیں اگر مہدی کا ذکر نبوی اخبار اور اہل بیتؑ کے آثار میں مطلقاً نہ ہوتا تو مرزا صاحب کو آسانی سے اس ادعا کا موقع نہ ملتا لیکن افسوس اس کا ہے کہ ارشادات نبویہ میں جہاں امام زماں حضرت مہدی کا ذکر ہے وہاں سرکار نے یہ بھی فرمایا ہے کہ وہ مہدی میری اولاد سے ہوگا۔ میرے اہل بیتؑ سے ہوگا۔ فاطمہ زہرا کے فرزندوں میں سے ہوگا۔ ان جملوں کے ہوتے ہوئے ایک مغل یا مرزا کو یہ کہنے کی ہمت کیسے ہوئی کہ مرزا ہونے اور اولادِ رسول سے نہ ہونے کے باوجود میں ہی مہدی ہوں؟ صاف معلوم ہوتا ہے کہ مرزا صاحب کو بڑی حد تک یہ اطمینان ہے کہ مہدی کے بارے میں ان جملوں کو کون معتبر سمجھے گا؟ اور کون کھل کر کہے گا کہ مرزا صاحب آپ اولادِ رسول سے نہیں۔ اہل بیتؑ نبیؐ سے نہیں، فرزندانِ فاطمہؑ زہرا سے نہیں تو آپ مہدی کیسے ہو سکتے ہیں؟ مرزا صاحب مسلمانوں کی اس کمزوری کو اچھی طرح سمجھے ہوئے تھے کہ لفظ اہل بیتؑ اولادِ رسولؐ اولادِ فاطمہؑ کسی کا بھی لفظ ہو اور کسی نے بھی کہا ہو مسلمانوں کے لئے وہ لائق اعتناء نہیں وہ ایک حد تک اس کے خوگر ہو چکے ہیں کہ ایسے لفظوں کو ساقط الاعتبار سمجھ لیں۔ اس قسم کے الفاظ کو آسانی سے نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کہ کچھ نہ کچھ کامیابی حاصل کی ان کے مریدوں نے یہ آنکھ کھول کر بھی نہ دیکھا کہ مہدی کے اور صفات تو رہے ایک طرف یہ کھلی شرط بھی ان میں نہیں کہ بقول پیغمبر مہدی میری اور فاطمہؑ زہرا کی اولاد سے ہوگا۔

علماء اور متکلمین نے اپنے عوام کو آنے والے مہدیؑ کا خاطر خواہ تعارف ہی نہیں کرایا:

ہمارے علماء ماضی کی خوشگوار روایات اور وہ بھی اس قطع و برید اور اس احتیاط سے کہ کوئی ناگوار اور ناپسندیدہ چیز زبان و قلم پر نہ آئے جھوم جھوم کر بیان کرتے ہیں مگر اسلام کا وہ شاہکار جو مستقبل میں ہے اس سے عوام کو مطلع نہیں کرتے۔ ورود مہدی

ہادی' ان کی امامت و خلافت اور ان کے مقتداء حضرت عیسیٰ ہونے کی فضیلت متقدین کی کتابوں ہی تک محدود رہ گئی اور یہ یقینی اور غیر مبہم عقیدہ کتابوں ہی میں دفن ہو کر رہ گیا اگر علماء اور ناطقین نے آنے والے مہدی کا عوام کو تعارف کرایا ہوتا ان کے صفات کمالات و کرامات کو نمایاں کیا ہوتا تو مسلمان یہ جاننے کے بعد کہ وہ امام منجانب اللہ ہوگا وہ آخری اور معصوم امام ہوگا' اللہ اس کو آفاق عالم پر اقتدار کامل دے گا' وہ نبیؐ کے گھر کا چشم و چراغ ہوگا۔ کیوں کسی ایسے ویسے کو مانتے جس میں ان صفات کا نام تک نہیں۔

کہیں علماء کا سکوت اور اس مسئلہ سے سرد مہری اس بناء پر تو نہیں کہ اس سے فضیلت اہل بیتؑ نمایاں ہوگی اور اس کے ساتھ ساتھ یہ سوچنے کا بھی عوام کو موقع ملے گا کہ آخری امامت کا تو وہ طرز نہیں جو اب تک ہمارے ذہنوں میں تھا اس کی امامت تو منجانب اللہ ہے جس میں ہمارا کوئی دخل نہیں ؟

ظہور قائمِ آلِ محمدؑ اسلام کا طرۂ امتیاز ہے :

امام عالی مقام (حضرت مہدی) کا وجود اور وقت معین پر ظہور دین اسلام کا ایک ایسا عظیم ترین امر ہے جو دین اسلام کو تمام ادیان عالم سے ممتاز کرتا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ اگر دین اسلام سے اس عقیدہ کو نکال دیا جائے اور ظہور امام کے نظریے کو یک سر ختم کر دیا جائے تو دوسرے ادیان حقہ کے مقابلے میں اس دین کا کوئی بھی امتیاز نہیں رہتا۔ کیوں کہ جو دین بھی کوئی نبی برحق لایا وہ اپنے زمانے کے لئے یقیناً دین حق تھا۔ ہر نبی نے اشاعت دین میں سختیاں جھیلیں ان پر سنگ باری بھی ہوئی ان کو قید بھی کیا گیا۔ ان کو جلاوطن بھی کیا گیا۔ ان کو قتل بھی کیا گیا فریقاً کذبتم و فریقاً تقتلون٥ انہوں نے انتہائی مصیبتیں اٹھا کر مدتوں کے بعد تھوڑی بہت کامیابی حاصل کی کچھ لوگوں نے مان لیا کچھ نے نہ مانا ادھر نبی دنیا سے رخصت ہوا ادھر اس کے ماننے والوں میں اختلاف شروع ہو گیا۔ شریعت بدلنے لگی۔ فرقے بننے لگے۔ خانہ جنگیاں ہونے لگیں دین کا نام رہے گا مگر دین کا نظام ختم ہو گیا۔ انفرادی طور پر جس کا دل چاہے نیکی

کرے جس کا دل چاہے بدی کرے مرکزیت ختم ہو گئی۔ حدود شریعت معطل ہو گئے نہ کوئی مسلّم ناظم شریعت رہا نہ کوئی متفق علیہ حاکم شرع۔ یہی وہ تمام ترچیزیں تھیں جو ایک ایک کر کے اسلام کے دعویداروں میں رونما ہوئیں۔ جو حشر تمام ادیان کا ہوتا رہا۔ وہی اس دین کا بھی ہوا بلکہ وہ کچھ ہوا جو کبھی نہ ہوا تھا۔ پچھلے انبیاء کو ستایا نہ ماننے والوں نے' لیکن اس نبی کو ستایا گیا مان مان کر۔ نبیؐ کی وفات ہوتے ہی اختلاف و نزاع کا دروازہ کھل گیا فرقے فرقے ہونے لگے بات بڑھتی چلی گئی ہولناک خون ریزیاں ہوتی رہیں۔ شریعتیں الگ الگ ہونے لگیں کفار کا خون اتنا نہ بہا تھا جتنا مسلمانوں کا خون بہہ گیا وفات نبیؐ کے کچھ ہی برسوں کے بعد کھلے ہوئے ستم پیشہ لوگ امت پر مسلط ہونے لگے۔ کتاب خدا کی اگر لفظی نہیں تو معنوی تحریف کی بھرمار ہو گئی آیت ایک مگر معنی جدا جدا اسلام برائے نام ایک مگر احکام الگ الگ۔ بالآخر وہ رہا سہا نظام جیسا کچھ بھی تھا ختم ہوا اب لاکھ مسلمانوں کی حکومتیں ہوں اور رہیں لیکن دین کی' شریعت کی' اسلام کی حکومت ندارد۔ آج اگر مسلمان حکمران موجود ہیں تو ہندو' عیسائی' یہودی وغیرہ بھی حکمران ہیں لیکن دین کی حکومت نہ وہاں ہے نہ یہاں۔ حالات کا حالات سے' واقعات کا واقعات سے مقابلہ کر کے کوئی بتائے کہ موجودہ صورت میں دین ناسخ کو ادیان منسوخہ پر کیا فوقیت ہوئی اور اسلام کا دوسرے ادیان کے مقابلے میں کیا طرہ امتیاز رہا؟

اسلام کا امتیاز تو یہی ہے اور صرف یہی ہے کہ یہ دین زوال کے بعد پھر کمال کو پہنچے گا اور پست ہونے کے بعد پھر بلند ہو گا۔ مغلوب ہونے کے بعد غالب آئے گا۔ ظلم و ستم کی بھرمار ہونے کے بعد عدل و انصاف کا دور دورہ ہو گا' دین کا حاکم آئے گا' شریعت کا ناظم آئے گا۔ اجرائے احکام ہو گا شریعت کا نظام ہو گا۔ دین کی حکومت ہو گی حق کی سلطنت ہو گی۔ نور عدل سے عالم معمور ہو گا۔ امامِ آخر کا ظہور ہو گا حق آئے گا اور باطل جائے گا اور آفاق عالم پر دین حق چھا جائے گا' اللہ کا وعدہ پورا ہو گا۔ یظهره على الدّين كله ولو كره المشركون یعنی اللہ اسلام کو ہر دین پر غالب کر دے گا چاہے مشرکین کو ناگوار ہو والله متمّ نوره ولو كره الكافرون یعنی اللہ اپنے نور کو تمام

کرنے والا ہے چاہے کفار کو ناگوار ہو۔ ادیان سابقہ چونکہ منسوخ ہو چکے اب ان کی بقا ہی منظور قدرت نہیں تو ان کے ارتقاء کا نظام ادھر سے کیوں ہو؟ وہ جب تک رہیں گے اسی زبون حالی میں رہیں گے اگر اسلام کے لئے بھی اس کے ابھرنے کا آنے والا کوئی دن نہ ہو اگر اس کے بھی حدود شریعت کبھی قائم ہونے والے نہ ہوں تو کیا فرق رہا دین اسلام میں اور غیر دین اسلام میں؟ افسوس کہ مسلمان اپنے دین کے امتیازی نشان کو اور اسلام کی اس مخصوص آن بان کو بھول بیٹھے اور دینِ مصطفیٰؐ کو دوسرے دینوں کی برابری پر ختم کر دیا اور دین باقی کو دین فانی کا مثل سمجھ لیا۔

قرآن کریم کی بہت سی آیات میں مہدیؑ کے ورود مسعود کی خبر دی گئی:

دو آیتیں ہم بر سبیل تذکرہ پہلے دکھا چکے ہیں جن میں خداوند عالم نے دین اسلام کے تمام ادیان عالم پر غالب کرنے کا وعدہ فرمایا اور اپنے نور کو اتمام و اکمال تک پہنچانے کا وعدہ کیا ہے۔

بشارت اور خوشخبری جو ہو بھی اللہ کی طرف سے وہی ہو سکتی ہے جو مستقل اور پائیدار ہو اس غالب آنے کی خبر کو جس کے بعد غالب پھر مغلوب ہو جائے اور بلند ہو کر پھر پست ہو جائے خداوند عالم اس شان سے بیان نہیں کر سکتا تھا جس شان سے بیان کیا ہے۔ یقیناً ان آیات دین میں اسلام کے غالب ہونے سے وہ غلبہ مراد ہے جس کے بعد مغلوبیت نہیں اور وہ بلندی مراد ہے جس کے بعد پستی نہیں۔

تیسری آیت وعد الله الذين آمنوا منكم و عملوا الصالحات ليستخلفنهم في الارض كما استخلف الذين من قبلهم وليمكنن لهم دينهم الذي ارتضى لهم الخ...... یعنی تم مومنین میں سے جو لوگ مخصوص ایمان رکھتے ہیں اور ہر قسم کی نیکیاں کرتے ہیں اللہ کا ان سے وعدہ ہے کہ ان کو روئے زمین پر اسی طرح خلیفہ قرار دے گا جس طرح ان سے پہلوں کو قرار دیا تھا۔ اور اللہ ان کو ان کے اس دین کے نفاذ کرنے کی پوری طاقت دے گا جس دین کو خدا نے ان کے لئے پسند کیا ہے اللہ ان کے خوف

کو امن اور اطمینان میں بدل دے گا وہ (ائمہ) صرف میری عبادت کریں گے اور میرے ساتھ کسی شے کو بھی شریک نہ کریں گے الخ اللہ کا یہ وعدہ بھی پورا ہونا ہے جو ابھی پورا ہوا نہیں اس آیت میں امام کے ظہور اور جمعیت ائمہ اہل بیت کی طرف صریحی اشارہ ہے۔ اور خاص طور پر جو بات کہی گئی ہے وہ یہ کہ ان کو خلیفہ کوئی اور نہیں بلکہ خدا خود قرار دے گا پھر مزید وضاحت بیان کی ہے یہ فرما کر کہ اللہ ان کو خلیفہ قرار دے گا بالکل اسی طرح جس طرح اس نے پہلوں کو بلا شرکت غیرے خلیفہ قرار دیا تھا اور یہ ظاہر ہے کہ پہلے کبھی کوئی خلیفہ آراء انسانی کا مرہون منت نہیں ہوا جس کو بنایا صرف خدا نے بنایا۔

اس کے علاوہ اور بہت سی آیات ہیں جن میں یہ نوید روح پرور موجود ہے۔ صاحب ینابیع المودۃ نے جو حنفی اور مفتی اعظم قسطنطنیہ ہیں ایک مستقل باب قائم کر کے ان بہت سی آیات کو جو امام مہدی کے بارہ میں ہیں بیان کیا ہے یہ کتاب آسانی سے مل سکتی ہے اردو ترجمہ بھی ہو گیا ہے۔

احادیث نبویہ' امام مہدی کے بارہ میں بکثرت اور متواتر ہیں :

حدیث مبارک جو کہ ذیل میں لکھی جاتی ہے سنی اور شیعہ دونوں فرقوں میں موجود ہے۔ لو لم یبق من الدنیا الاّ یوم واحد لطوّل اللّٰہ ذالك الیوم حتّٰی یبعث فیھم رجلاً من اھلِ بیتی یوطی اسمه اسمی یملاء الارض قسطاً وعدلاً کما ملئت ظلماً وجوراً (ابن ماجہ۔ ابو داؤد۔ امام احمد ترمذی۔ مشکوٰۃ المصابیح و ینابیع المودۃ) یعنی دنیا کا اگر ایک دن بھی باقی رہے گا تو اللہ تعالیٰ اسی دن کو دراز کرے گا۔ تا ایں کہ اللہ عالم میں میرے اہل بیت سے ایک مرد کو مبعوث کرے گا۔ جو میرا ہم نام ہو گا وہ زمین کو اسی طرح عدل و انصاف سے بھر دے گا جس طرح وہ ظلم و جور سے بھری ہو گی (۲) بی بی اُم سلمہ سے روایت ہے کہ میں نے رسولؐ اللہ کو فرماتے ہوئے سنا کہ مہدی میری عترت سے ہو گا۔ جو فاطمہؑ کے فرزندوں میں سے ہو گا (صحیح مسلم' ابو داؤد' نسائی' ابن ماجہ' بیہقی' ینابیع المودۃ) (۳) بی بی عائشہ نبیؐ سے روایت کرتی ہیں کہ رسولؐ اللہ نے

فرمایا مہدی میری عترت سے ہوگا وہ میری سنت پر جہاد کرے گا جس طرح میں نے وحی پر جہاد کیا (جواہر العقدین، ینابیع المودۃ) (۴) حذیفہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا مہدی آئیں گے، عیسیٰ بن مریم بھی آئیں گے، امام مہدی عیسیٰ بن مریم سے فرمائیں گے آگے بڑھیے اور نماز پڑھایئے۔ حضرت عیسیٰ کہیں گے نماز آپ کی خاطر قائم کی گئی ہے۔ حضرت عیسیٰ میرے ایک فرزند کے پیچھے نماز پڑھیں گے (جواہر العقدین ینابیع المودۃ وغیرہ) (۵) آنحضرتؐ نے فرمایا تمہاری اس وقت کیا حالت ہوگی جب ابن مریم تم میں نازل ہوں گے اور تمہارا امام تم میں سے ہوگا (صحیح بخاری و صحیح مسلم و ینابیع المودۃ) (٦) آنحضرت نے فرمایا ابشری یا فاطمة انّ المهدی ابنك (ینابیع المودۃ وغیرہ) فاطمہ تم کو بشارت ہو کہ مہدی تمہارا فرزند ہے (۷) آنحضرت نے فرمایا منّا الذّی یصلّی عیسیٰ خلفه (ینابیع المودۃ وغیرہ) یعنی ہم میں سے ہے وہ جس کے پیچھے عیسیٰ نماز پڑھیں گے (۸) حضور نے فرمایا المهدی طائوس اهل الجنة یعنی مہدی اہل جنت کا حسن و جمال ہیں۔ مہدی ہم اہل بیتؑ سے ہے۔ اللہ ایک رات میں اس کے لئے سب سامان درست کر دے گا۔ (۹) آنحضرت نے فرمایا المهدی منّی وهو اجلّی الجبینة (ینابیع المودۃ) یعنی مہدی مجھ سے ہے اور وہ روشن پیشانی والا ہے۔ (۱۰) یخرج فی آخرالزمان خلیفته لیعطی المال بغیر عددٍ...... (ینابیع المودۃ) یعنی سرکار نے فرمایا کہ آخری زمانہ میں ایک خلیفہ ظاہر ہوگا جو بے حساب لوگوں کو مال عطا کرے گا۔ غرض کہ صدہا احادیث و اخبار ہیں جو اس امام کی امامت اور ظہور کی خبر دے رہی ہیں۔

آنحضرتؐ نے بارہا خبر دی ہے کہ امام اور خلیفہ بارہ ہوں گے :

تمام کتب احادیث (بخاری، مسلم و دیگر صحاح وغیرہ) میں آنحضرتؐ کا یہ ارشاد موجود ہے کہ میرے بعد بارہ امام ہوں گے۔ یہی نہیں کہ آنحضرتؐ نے بارہ کی گنتی ہی گنائی ہو بلکہ کتب اہل سنت میں مندرج ہے کہ میرے بعد بارہ امام ہوں گے۔

آنحضرت نے ان کے نام بھی بتائے ہیں اور اپنے ہم نام امام (محمد باقرؑ) کو سلام بھی کہلایا ہے چنانچہ صاحب ینابیع المودۃ نے اپنی کتاب مذکورہ میں ان احادیث رسولؐ کو بیان کیا ہے جن میں بارہ اماموں کے نام موجود ہیں۔ بطور مثال دو حدیثیں ہم بھی بیان کرتے ہیں (۱) خطیب خوارزم نے سلیمان راعی سے روایت کی ہے کہ میں نے شب اسریٰ (شب معراج) کے بارہ میں آنحضرت سے خود یہ سُنا ہے کہ خداوند عالم نے ارشاد فرمایا کہ یا محمد انّی خلقتك و خلقت علياً وفاطمة والحسن والحسين والائمة من ولده من نوری وعرضت ولايتكم علی اهل السمٰوٰت والارض فمن قبلها كان عندی من المومنين ومن جحدها كان عندی من الكافرينo یعنی اے محمدؐ میں نے تم کو، علیؑ کو، فاطمہؑ کو، حسنؑ و حسینؑ کو اور حسینؑ کی اولاد سے ائمہ کو اپنے نور سے پیدا کیا اور تمہاری ولایت کو اہل آسمان اور اہل زمین پر پیش کیا جس نے قبول کیا وہ مومنین میں سے اور جس نے اس سے انکار کیا وہ میرے نزدیک کفار میں سے ہے۔

پھر اللہ نے مجھ سے فرمایا أتحبّ ان تراهم۔ یعنی اے حبیب کیا تم ان سب کو دیکھنا چاہتے ہو میں نے کہا ہاں پروردگار۔ ارشاد الٰہی ہوا کہ یمنِ عرش کی طرف نظر کرو۔ میں نے نظر کی فاذا بعلّی و فاطمة والحسن و الحسين وعلی بن الحسين و محمد بن علی و جعفر بن محمد و موسیٰ بن جعفر و علی بن موسیٰ و محمد بن علی و علی بن محمد والحسن بن علی والمهدی فی ضحضاح من نور قياماً يصلّون وهو فی وسطهم كأنّه كوكب درّیo

ناگاہ میں نے دیکھا کہ علیؑ ہیں، فاطمہؑ ہیں، حسنؑ و حسینؑ ہیں، علیؑ بن حسینؑ ہیں، محمد بن علی جعفر بن محمد ہیں، موسیٰ بن جعفر ہیں، علی بن موسیٰ ہیں، محمد بن علی ہیں، علی بن محمد ہیں، حسن بن علی ہیں اور مہدی ہیں جو نور کی سرزمین میں کھڑے ہیں۔ نماز پڑھ رہے ہیں اور مہدی ان کے درمیان میں ستارہ درخشاں کی مانند ہیں۔ فقال يا محمد هولاء الحجج وهوالثاير من عترتك وعزتی و جلالی انه الحجة

الواجبة لأ ولیائی والمنتقم من أعدائی پھر ارشاد خداوندی ہوا کہ اے محمد یہ لوگ میری حجت ہیں اور وہ (مہدی) اس خون کا بدلہ لینے والے ہیں جو تمہاری اولاد کا بہا ہے۔ مجھے قسم ہے اپنے عزت و جلال کی یہ (مہدی) میری قائم رہنے والی حجت ہیں' میرے دوستوں کے لئے اور انتقام لینے والے ہیں میرے دشمنوں سے۔ اس حدیث مبارک کو علامہ سید قندوزی حنفی مفتی اعظم قسطنطنیہ نے اپنی کتاب ینابیع المودۃ کے باب نمبر 93 میں بیان کیا ہے اور لکھا ہے کہ اس حدیث کو حموینی نے بیان کیا ہے (۲) علامہ مذکور الصدر نے باب نمبر 94 میں بیان کیا ہے کہ جابر بن یزید جعفی نے کہا ہے کہ میں نے جابر بن عبداللہ انصاری کو کہتے ہوئے سنا کہ مجھ سے رسولؐ اللہ نے فرمایا کہ اے جابر میرے اوصیاء اور مسلمانوں کے امام جو میرے بعد ہوں گے اول ان میں علی ہے پھر حسنؑ پھر حسینؑ پھر علی بن حسینؑ...... پھر محمد بن علی معروف باقر اے جابر عنقریب تم اس کو پاؤ گے جب تم اس کو پانا تو اس کو میرا سلام کہہ دینا۔ پھر جعفر بن محمد پھر موسیٰ بن جعفر پھر علی بن موسیٰ پھر محمد بن علی پھر علی بن محمد پھر حسن بن علی پھر قائم ہوں گے اس کا نام میرے نام پر' اس کی کنیت میری کنیت پر ہوگی وہ محمد بن حسن بن علی ہوں گے یہ وہ ہیں جو اپنے اولیاء سے ایک عرصہ تک غائب رہیں گے ان کی امامت کے عقیدہ پر وہ شخص ثابت قدم رہے گا جس کے قلب کا امتحان اللہ نے ایمان کے ساتھ لے لیا ہو گا۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا ان کے زمانہ غیبت میں مخلوق کو کوئی فائدہ حاصل ہو گا! فرمایا ہاں قسم ہے اس ذات کی جس نے مجھے نبوت کے ساتھ مبعوث کیا لوگ ان کی غیبت میں نور ولایت کی ضوء سے اسی طرح فائدہ اٹھائیں گے جس طرح بادل میں چھپے ہوئے آفتاب سے لوگ اس کی روشنی سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ یہ بات اللہ کے راز میں پوشیدہ ہے اور اللہ کے علم میں مخزون ہے۔

آنحضرت کا امام باقر کو سلام کہلانا تاریخ طبری اور صواعق محرقہ میں بھی مذکور ہے۔

طول حیات پر تعجب لائق تعجب ہے:

مسلمان جانتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام زندہ ہیں۔ ادریس و خضر و الیاس کی

زندگی کو بھی سب نے مانا حد یہ ہے کہ جس شیطان نے جناب آدمؑ کو سجدہ نہ کیا تھا اس کی حیات میں کسی کو شبہ نہیں۔ اور اس کی صرف حیات میں ہی مسلم نہیں بلکہ یہ بھی مسلم ہے کہ وہ وسوسہ اندازی کرتا ہے اور نیک راستے سے انسان کو ہٹانے میں کامیاب ہو جاتا ہے لیکن تمام تر بحث امامؑ کے بارے میں ہوتی ہے کبھی ان کے طول حیات پر تعجب اور تعجب کے نتیجہ میں انکار کبھی یہ کہ غائب امامؑ کے وجود سے فائدہ کیا؟ یہ نہیں سوچا جاتا کہ زندگی دو گھڑی کی ہو یا دو ہزار برس کی کوئی بھی زندگی اور کسی کی بھی زندگی اس کی ذاتی نہیں۔ زندہ رکھنے والا تو کوئی اور ہی ہے وہ زندہ رکھنا چاہے تو موت کا آنا محال اور مارنا چاہے تو زندہ رہنا محال۔ امامؑ کے مسئلہ میں یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ اللہ نے ہم کو بار بار بتایا ہے ان اللہ علی کل شئی قدیر کیا طول حیات کل شی میں نہیں اور خداوند عالم چاہے تو وہ ہزاروں برس زندہ نہیں رکھ سکتا۔ ''طول حیات اور غیبت میں بھی امام کا نفع بخش ہونا ان دونوں چیزوں کو آنحضرت نے جابر بن عبداللہ سے خود بیان فرمادیا ہے اور پہلے ہی بتادیا ہے کہ طول انتظار کی زحمت وہی شخص اٹھا سکتا ہے جس کے ایمان قلبی کا خداوند عالم نے امتحان کر لیا ہو۔ یعنی طولانی غیبت میں بھی وجود امام کا یقین رکھنا' یہ مومن ہی کا حوصلہ ہے۔ وجود امام کا ایک سب سے بڑا فائدہ تو یہی ہے کہ ان کی برکت سے زمین و آسمان قائم ہیں زمین پر بنی آدم آباد ہیں اور مخلوق خدا رزق پا رہی ہے۔

امام احمد بن حنبل بحوالہ اربعہ اہل سنت میں سے ایک امام ہیں فرماتے ہیں کہ رسول اللہ نے فرمایا ''ستارے اہل آسمان کے لئے امان ہیں اور میرے اہل بیت زمین والوں کے لئے امان ہیں جب ستارے ختم ہو جائیں گے آسمان والے ختم ہو جائیں گے اور جب میرے اہل بیت ختم ہو جائیں گے زمین والے ختم ہو جائیں گے۔

علامہ سلیمان قندوزی نے اس حدیث کو ینابیع المودۃ میں مختلف مقامات پر متعدد طریقوں سے بیان کیا ہے اور کہا ہے کہ اس بارے میں بہت سی احادیث وارد ہوئی ہیں۔ اس ایک ہی حدیث سے جس کو بابجا متعدد راویوں نے بیان کیا ہے بخوبی ثابت ہو رہا ہے کہ زمانہ کسی نہ کسی برگزیدہ اہل بیت سے کبھی خالی نہیں ہو سکتا اور ظاہر ہے کہ وہ

برگزیدہ بارگاہ خدا جو ہر زمانہ میں اہل بیت سے ہو اور سبب بقاء عالم ہو وہ امام زمانہ ہی ہو سکتا ہے لہذا یہ بالکل غلط ہے کہ وہ ہیں نہیں پیدا ہوں گے اگر وہ ہوتے تو ہم ان سے پہلے نہ ہوتے یہی وجہ ہے کہ علماء عارفین نے ان کے وجود اور ان کی غیبت کو صمیم قلب سے تسلیم کیا ہے اور مانا ہے کہ امام مہدی علیہ السلام موجود اور زندہ ہیں۔

شیخ محمد بن ابراہیم محدث، فقیہ شافعی نے اپنی کتاب فرائد المطین میں امامؑ کے وجود اور غیبت پر بہت سی احادیث کو بیان کیا ہے۔ صاحب ینابیع المودۃ نے باب نمبر 85 میں بیان کیا ہے کہ میرے آقا عبدالوہاب شعرانی نے اپنی کتاب ''الیواقیت والجواہر'' کے مبحث نمبر 65 میں بیان کیا ہے کہ حضرت مہدیؑ امام حسن عسکری علیہ السلام کے فرزند ہیں جو ۲۵۵ھ شب نیمہ شعبان میں پیدا ہوئے ہیں وہ اس وقت تک زندہ ہیں حتیٰ کہ وہ ظاہر ہو کر حضرت عیسیٰؑ کے ساتھ اکٹھے ہو جائیں گے'' اس کے بعد علامہ موصوف نے دوسرے مشائخ عظام کے نام لے لے کر اُن کا بھی یہی عقیدہ بیان کیا ہے پھر ان خوش نصیب مشائخ کو نام بنام پیش کیا ہے جن کو امام علیہ السلام کی زیارت اور بیعت نصیب ہوتی ہے ہم نے ہر جگہ اختصار سے کام لیا اس کے باوجود ہمیں احساس ہے کہ بات لمبی ہو گئی۔

وآخر دعوٰنا ان الحمد للّٰہ رب العالمین۔

☆☆☆

کلامِ انیس

عالمِ کائنات میں جو کچھ بھی ہے فانی ہے بقاء کسی شے کو بھی نہیں۔ دستِ فنا ایسا شہ زور ہے کہ اس کے سامنے ہر قوی کمزور بلکہ بے بس اور بے زور ہے۔ مخلوق ارضی ہی پر منحصر نہیں ارض و سماء پست و بالا جن و بشر' خشک و تر' شمس و قمر زیر و زبر' فلک و ملک سب ہی اس دائرۂ فنا میں محصور ہیں جو ہے وہ فنا اور موت کے لئے یہاں تک کہ موت ملک الموت کے لئے آنا علامت ہے جانے کی اور ہونا دلیل ہے نہ ہونے کی۔

بقاء صرف ایک کے لئے ہے ورنہ فنا ہر ایک کے لئے۔ انسان جب یہ دیکھتا ہے کہ فنا کے ہاتھ سے کسی طرح چھٹکارا نہیں تو ہار کر چاہتا ہے کہ میرے بعد میرا تذکرہ ہی باقی رہے۔ سمجھتا ہے کہ اولاد ہو گی تو اس سے میرا نام و نشان رہے گا اولاد کی آرزو کرتا ہے۔ لیکن افسوس کہ اس آرزو کے پورا ہونے کے بعد بھی اصل آرزو خاک میں مل جاتی ہے۔ چند پشتوں کے بعد اولاد میں بھی کوئی اس کا نام و نشان تک نہیں جانتا۔ کوئی اپنے لئے یادگار سمجھ کر باغ لگاتا ہے کوئی عالی شان عمارت بناتا ہے لیکن باغ ہے قلم ہونے کے لئے اور عمارت ہے منہدم ہونے کے لئے۔ تصویریں کھنچوائی جاتی ہیں کہ ہمارے بعد ہماری مصنوعی شکل ہی رہ جائے۔ لیکن اصل شکل ہی نہ رہے تو یہ نقلی کیا رہے گی؟ اور کب تک رہے گی۔ فانی کے لئے ہر یادگار فانی' یہ یادگاریں کچھ دنوں رہیں بھی تو برائے نام ہی رہیں کیونکہ ان چیزوں میں یہ صلاحیت کہاں کہ مرنے والے کے وہ صفات و کمالات دکھا سکیں جو اس کی ذات میں مجتمع تھے۔ ان تمام چیزوں سے بلند و بالا اور

دیرپا وہ یادگار ہے جو صاحبِ کلام کے کلام سے وابستہ ہے۔ کلام متکلم کے عیب و ہنر کا وہ آئینہ ہے جو متکلم کے قصد و ارادہ کے بغیر خود بخود اس کی اصلی سیرت کے ہر پہلو کو نمایاں کرتا رہتا ہے۔ انسان جب تک خاموش ہے اس کے عیب و ہنر چھپے ہوتے ہیں لیکن بولنے پر یہ پردہ چاک ہو جاتا ہے اور عیب و ہنر جو کچھ بھی ہے بے نقاب ہو جاتا ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے۔ تامرو سخن نگفتہ باشد۔ عیب و ہنرش نہفتہ باشد۔ کلام سے محض صفاتِ کلام ہی واضح نہیں ہوتے۔ بلکہ کلام سے متکلم کے وہ صفات بھی واضح ہو جاتے ہیں جن کے اظہار کا متکلم کو خیال بھی نہ آیا تھا۔ کلام متکلم کے ان تمام صفات کا نقشہ خود بخود کھینچ دیتا ہے۔ جن سے کلام کا ظاہر بظاہر کوئی تعلق بھی نہ ہو۔ کلام بتادیتا ہے کہ متکلم اس وقت مضطرب ہے یا مطمئن، پراُمید ہے یا مایوس، تندرست ہے یا بیمار، جوان ہے یا پیر، خفیف الحرکات ہے یا سنجیدہ، باہمت ہے یا بے ہمت، خود غرض ہے یا غیور، امیر ہے یا مامور، جابر ہے یا مجبور، قانع ہے یا طامع، متلون ہے یا محکم، امام ہے یا ماموم، حاکم ہے یا محکوم، خطاکار ہے یا معصوم، نیک ہے یا بد، عالم ہے یا جاہل، نبی ہے یا اُمت، خالق ہے یا مخلوق۔ غرضیکہ کلام کا دیکھنے والا یا سننے والا اپنی صلاحیت کے بقدر متکلم کے کلام سے اس کے صفات و حالات اور رازہائے دروں کا پتہ چلا سکتا ہے لہذا صاحب کلام فانی ہو یا باقی اس کی بہترین یادگار اور اس کے صفات کا آئینہ دار اس کا کلام ہے۔ خدا کے کلام سے شانِ ربوبیت نظر آئے گی۔ رسولؐ کے کلام سے شانِ رسالت، امام کے کلام سے شانِ امامت، عالم کے کلام سے شانِ علم اور کامل کے کلام سے شانِ کمال غرضیکہ متکلم جس کیفیت اور جس حیثیت میں ہے اس کے کلام سے ظاہر ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ کسی کے کلام کو اگر صاحبِ نظر تعمق نظر سے دیکھے تو پھر وہ صاحبِ کلام کے دیکھنے سے بڑی حد تک بے نیاز ہو جاتا ہے۔ پھر کیا کہنا اس کلام کا جو دنیا میں مقبول و مشہور ہونے کے ساتھ ساتھ مقبول بارگاہ خدائے جلیل اور آخرت کے لئے سبب اجر جزیل ہو۔ یقیناً اس مقام پر حمدِ خدا اور مدح محمدؐ و آلِ محمدؑ کرنے والے حضرات ہیں۔ اس سلسلہ میں نثر ہو یا نظم دونوں چیزوں کا مقام بلند ہے۔ لیکن نثر چونکہ آسانی سے زبانِ زدِ خاص و عام

نہیں ہو سکتی اور نظم کی طرح ایک دم دل نشین اور محفوظ نہیں ہوتی اس لئے نظم کی تاثیر و تسخیر ایک مسلم امر ہے۔

موجودہ زمانہ میں نظم کو شعر اور صاحبِ نظم کو عموماً شاعر کہا جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس بناء پر کسی کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہو کہ شعر و شاعری کی قرآن کریم نے مذمت کی ہے لہٰذا دفع دخل کے لئے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ ہر مفہوم کے لئے ہر زمانے میں ایک لفظ کا استعمال ضروری نہیں ہے۔ اکثر یہ دیکھا جاتا ہے کہ جس مفہوم کے لئے کسی زمانہ میں جو لفظ تھا آگے چل کر اسی مفہوم کے لئے پہلے لفظ کی جگہ دوسرے لفظ نے لے لی اور اب اس مفہوم کے لئے دوسرا لفظ بولا جانے لگا۔ مفہوم کے لئے الفاظ بھی بدلتے رہتے ہیں اور الفاظ کے لئے مفہوم بھی یعنی کسی زمانہ میں مفہوم کے لئے کوئی لفظ اور کسی زمانہ میں کوئی لفظ اسی طرح کسی زمانہ میں ایک لفظ کا مفہوم کچھ تھا اور کسی زمانے میں کچھ۔ مدح ہو یا مذمت لفظ کی نہیں ہوتی مفہوم کی ہوتی ہے۔

الفاظ کے لئے مفہوم اور مفہوم کے لئے الفاظ کا ادل بدل ہوتا رہتا ہے مثلاً آج لفظ معجزہ عموماً بولا جاتا ہے اور اس کا مفہوم بھی ذہنوں میں موجود ہے۔ مسلمان معجزات انبیاء و ائمہ کے قائل ہیں لیکن قرآن مجید میں اس لفظ کا استعمال نہیں پایا جاتا لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ قرآن کریم نے معجزات انبیاء کا ذکر ہی نہیں کیا۔ قرآن کریم نے اس مفہوم کے لئے لفظ آیات و بینات کا کہیں صیغہ واحد اور کہیں صیغہ جمع میں استعمال کیا ہے۔ اسی طرح لفظ معصوم آج زبان زد ہے۔ اس لفظ کا مفہوم بھی ایک حد تک ذہنوں میں ہے لیکن انبیاء اور ائمہ کا تذکرہ قرآن مجید میں جا بجا ہے۔ ان کے لئے لفظ معصوم کہیں نہیں کہا گیا۔ لیکن اس سے انبیاء اور ائمہ کی نفی عصمت ہرگز نہیں ہو سکتی کیونکہ جو مفہوم آج لفظ معصوم کا ہے اور لفظ معصوم آج جس مفہوم کے لئے بولا جا رہا ہے اس مفہوم کے لئے قرآن کریم نے مخلصین، صادقین اور مطہرین کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔

شعر اور شاعر کی قرآن کریم نے مذمت ضرور کی ہے اس وقت شعر کا مفہوم

یہ نہ تھا جواب ہے ورنہ کفار قرآن کو شعر اور نبی کو شاعر ہرگز نہ کہتے۔ اس وقت شعر کا مفہوم لغو گوئی ہرزہ سرائی اور بے ہودہ گوئی تھا چاہے وہ نثر ہی میں ہو۔ لیکن آج شعر کا مفہوم ہے۔ وزنِ خاص سے کلام کو موزوں کرنا یہ موزوں کلام اپنے مضمون کے اعتبار سے زیادہ سے زیادہ باخبر بھی ہو سکتا ہے اور موجب ثواب بھی اور اس کے برعکس بھی۔

عجب نہیں کہ روزے میں شعر پڑھنا جو شرعاً مکروہ قرار دیا گیا ہے۔ اس سے مراد وہی شعر ہو جس کے معنی بے ہودہ گوئی کے ہیں خواہ وہ نظم ہو یا نثر کیونکہ یہ بات تو لائق تسلیم نہیں ہے کہ روزے میں وہ بے ہودہ گوئی مکروہ نہ ہو جو نثر میں کی جائے۔

میں اگرچہ شاعر نہیں ہوں لیکن تھوڑا بہت ذوق کلام رکھتا ہوں۔ میرا یہ تمام تر مقالہ شہنشاہِ اقالیم سخن میر انیس اعلی اللہ مقامہ کے تصور میں ہے۔ میرے نزدیک نظم کے جس قدر بھی فنون و کمالات ہیں۔ انیس کا کلام ان سے بھرپور ہے۔ کلام کی ہر خوبی کو الگ الگ گنانا اور دکھانا دآسان نہیں ہے۔ چند چیزیں بطور مثال بیان کی جاتی ہیں۔ ہر کلام میں الفاظ کو مناسب ترین محل پر رکھنا' یہ کلام کی وہ خوبی ہے جو حدِ کمال پر پہنچ جائے تو وہ کلام معجزہ ہے۔ اور اس کی ایک ہی مثال ہے جس کو مثال بے مثالی کہا جائے تو درست ہے۔ یعنی کلام اللہ جو عینِ کمال کا کلام ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ قرآن کریم میں وہی الفاظ ہیں جو پہلے سے زبان میں موجود تھے۔ اگر قرآن کے لئے نئے الفاظ وضع کئے جاتے تو اس کو عربی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ وہی مستعملہ الفاظ جب استعمالِ قدرت میں آتے ہیں تو جن و انس بھی مل کر اس کی مثل نہیں لا سکتے' کیوں؟ اس لئے کہ عینِ کمال نے الفاظ کے نظم و ترتیب کو اس حدِ کمال پر پہنچا دیا جس کے بعد کمال کا یعنی تناسب ترتیب الفاظ کا درجہ ہی نہیں۔ بہر حال کلام کے حسن' دل کشی اور تاثیر میں الفاظ کی مناسب ترتیب کو بڑا دخل ہے۔ کلام کی برتری کے لئے ضروری ہے کہ ترتیب الفاظ ایسے عنوان سے ہو کہ تصنع اور تکلف کی جھلک بھی نہ ہو اور سننے والا یہ محسوس نہ کرے کہ الفاظ کو جہاں جہاں بٹھایا ہے زبردستی اور بالجبر بٹھایا ہے۔ ایسے اشعار بہترین اشعار قرار پائیں گے۔ جن میں سادگی کے ساتھ ساتھ ترتیب الفاظ عام بول چال کے یا بالکل

مطابق ہو یا قریب تر ہو۔ یعنی اس نظم کی نثر کی جائے تو یا وہ نظم ہی عین نثر ہو جائے اور کسی بھی لفظ کو مقدم موخر نہ کرنا پڑے یا نثر کرنے میں اگر کچھ مقدم موخر کرنا بھی پڑے تو وہ تغیر نہایت خفیف اور غیر محسوس ہو۔ کاملین کے بعض اشعار ایسے نظر آتے ہیں جن کی نثر کرنے میں ترتیب کو مطلقاً بدلنے کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ وہ نظم علی حالہ بول چال کی نثر ہے۔ ایسی مثالیں عربی، فارسی، اُردو میں ہر جگہ نظر آتی ہیں چنانچہ یہ قطعہ مشہور و معروف ہے۔

بلغ العلیٰ بکماله کشف الدّجیٰ بجماله حسنت جمیع خصاله صلّو علیه و آله

عربی زبان ہونے کی وجہ سے ہم اس کلام کی پوری خوبی کو نہیں سمجھتے۔ اس نظم میں مخصوص کمال یہ ہے کہ اس کی نثر کرنے میں کسی ایک حرف کو بھی اِدھر اُدھر کرنے کی ضرورت نہیں۔ جو لفظ جہاں ہے وہ بغیر تکلف کے قواعد کے لحاظ سے اپنے اصل مقام پر ہے۔ لہذا جو نظم ہے وہی اس کی نثر ہے۔

یہی حال اُن دونوں الہامی شعروں کا ہے جن کو نادِ علی کہا جاتا ہے۔

نادِ علیاً مظهرالعجائب تجده عونًالك فی النوائب

کل هم و غم سینجلی بعلیٍ بعلیٍ بعلیٍ

ان دونوں شعروں کی نثر بالکل وہی ہے جو نظم ہے۔ ہر لفظ بقاعدہ نثر اپنی جگہ ہے۔ ممکن ہے کہ بعض عربی داں حضرات کی بھی توجہ اس خوبی کی طرف نہ ہوئی ہو۔

اسی وصف کی مثال میں آنے والا اُردو شعر بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔ شاعر کی نظر میں وہ موقع ہے کہ امام حسین علیہ السلام اپنے بچپن میں سواری کے نہ ہونے کی وجہ سے روٹھے ہوئے ہیں۔ نازبردار نانا اپنے فرزند کو روٹھا ہوا دیکھ کر حسینؑ سے فرماتے ہیں ؎

جب آپ روٹھتے ہیں تو مشکل سے منتے ہیں
اچھا سوار ہو جیئے ہم اونٹ بنتے ہیں انیسؔ

یہ شعر بھی نثر کی بول چال میں ہے۔ جس کی نثر کرنے کے لئے کسی لفظ کی

تقدیم و تاخیر کی ضرورت نہیں۔ زیادہ سے زیادہ نثر میں جائے۔ ''جب آپ'' کے ''آپ جب'' کہا جائے لیکن ''جب آپ'' بھی نثر کے منافی نہیں ہے۔ بہر حال نظم جس قدر بھی زیادہ سے زیادہ مطابق نثر ہو گی اور بول چال سے جتنی بھی قریب تر ہو گی اتنی ہی کامیاب اور موثر ہو گی۔ یہ وصف انیسؔ کے یہاں بڑی خصوصیت سے پایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ نظم کی خصوصیت یہ ہے کہ جو واقعہ سنایا جائے اور منظر پیش کیا جائے وہ محض سنایا ہی نہ جائے بلکہ دکھایا جائے۔ سننے والے کی سماعت سماعت سے آگے بڑھ کر بصارت بن جائے۔ اور سامع کو یہ محسوس ہو کہ وہ بچشم خود دیکھ رہا ہے۔ انیسؔ کے یہاں یہ وصف حدِّ کمال ہے۔

اسی طرح مبالغہ شاعری کی جان ہے لیکن مبالغہ اگر مبالغہ نظر آئے تو شاعری ہی کیا ہوئی۔ باکمال شاعر کی صفت یہ ہے کہ وہ مبالغہ کتنا ہی زبردست 'دور از کار بلکہ غیر ممکن الوقوع ہو بیان ایسے عنوان سے کیا جائے کہ سننے والے کو چون وچرا کے بغیر یقین آتا چلا جائے اور کسی ہوش مند کو بھی اس وقت یہ سوچنے کا موقع نہ ملے کہ یہ بات ہو بھی سکتی ہے یا نہیں۔ کلام کی تسخیر کا یہ عالم ہو کہ فلسفہ اور دلیل کی طرف توجہ ہی نہ ہو سکے۔ مواقع اور مناظر کے پیش کرتے وقت انیسؔ کی یہ عظیم خصوصیت ہے۔ غرضیکہ انیسؔ کے یہاں کلام کے وہ تمام لفظی اور معنوی صفات مکمل موجود ہیں۔ جن کی بناء پر ان کو اقالیم سخن کا شہنشاہ کہنا غلط نہیں پھر عمر بسر کی مرحوم نے تولا کلام اس کلام میں جو دنیاء و آخرت 'دونوں جہاں میں ان کی سربلندی کارسازی اور سرفرازی کا سبب ہے۔

رحمۃ اللہ علیہ O

☆☆☆

تعارف...... شہید انسانیت

تعارف کرایا جاتا ہے اس شے کا جو خود تو ہو غیر معروف اور تعارف کرانے والا ہو اپنی جگہ معروف و مشہور، لیکن یہاں صورت حال بر عکس ہے۔ دنیائے شیعیت میں کون ایسا شخص ہو گا جو جناب سید العلماء السید علی نقی النقوی دامت مکارمہ، اور ان کے کمالِ علم و فضل سے یا ان کے مصنفات کی جلالتِ قدر سے ناآشنا ہو لیکن چونکہ عالمِ اسباب میں عظیم تر ہستیوں کی پشت پر بھی تصدیق و تائید کرنے والے مناسب حضرات رکھے گئے ہیں جیسے جناب موسیٰ علیہ السلام کی تصدیق و تائید کے لئے ہارون علیہ السلام اور حضرت سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تصدیق و تائید کے لئے حضرت علی مرتضٰی علیہ السلام، اسی طرح میں بھی کتاب ''شہید انسانیت'' کے تعارف کے لئے قلم اٹھا رہا ہوں۔

میں ہمیشہ سے یہ سمجھتا رہا ہوں کہ جناب سید العلماء مجدہ، علم و فضل کے بلند ترین مقام پر ہیں اور تقریباً ہر علمی شعبہ میں خداداد کمال اور ذوق بے مثال رکھتے ہیں اس اعتبار سے وہ مجتہد العصر ہی نہیں بلکہ وحید عصر اور نادرہ روزگار اور حقیقتاً سید العلماء ہیں۔ چونکہ ہر کلام اپنے متکلم کے صفات و کمالات کا آئینہ دار ہوتا ہے لہذا سید العلماء کا ہر کلام سید الکلام اور ان کی ہر کتاب کتابوں کی سید و سردار ہے۔ کتاب شہید انسانیت بھی جناب موصوف کی نگارش قلم ہے۔ ابتدأء مسودۂ کتاب میں کچھ نامانوس اور غیر مشہور چیزیں آگئی تھیں لیکن موجودہ طباعت میں جناب موصوف نے

نظر ثانی فرما کر ہر امر کا لحاظ فرماتے ہوئے ہر مضمون کو مطبوع اور مانوس حیثیت میں پیش کیا ہے۔ میں نے کتاب پیش نظر کو اول سے آخر تک دیکھا ہے۔ صرف کتابت کے اغلاط کو درست کیا گیا ہے۔ یہ کتاب یقیناً ہر قوم و ملت کے لئے مفید ہے کیونکہ جناب موصوف نے یہ کتاب ایسی نرم اور ہموار سطح پر تحریر فرمائی ہے جو ہر مذہب و ملت کے لئے لائق قبول ہو۔ ہو سکتا ہے کہ جناب مسلم بن عقیل علیہ السلام کی آخری جنگ والا حصہ کسی اور صاحب قلم کا ہو کیونکہ آپ کا وہ شاہکار شجاعت جو کتب تاریخ میں پایا جاتا ہے پورے طور پر نمایاں نہیں ہوا۔

مسئلہ بیعت جو واقعہ کربلا کی اصل بنیاد ہے اگرچہ جناب موصوف نے اس کو انتہائی لطافت سے پیش کیا ہے لیکن ظاہر ہے کہ کتاب کو ہموار اور معتدل رکھنے کے سبب سے پوری توضیح نہیں ہو سکی تھی۔ اس لئے اس مسئلہ کی مختصراً توضیح کی جاتی ہے۔

یہ تو دنیا جانتی ہے کہ امام حسین علیہ السلام اور ان کے اقرباء و انصار نہ کسی قتل کے قصاص میں قتل کئے گئے نہ کسی اور جرم کی پاداش میں۔ وہ قتل کئے گئے صرف اس بناء پر کہ انھوں نے بیعتِ یزید نہیں کی۔ لیکن یہ کہ امامؑ نے بیعتِ یزید کیوں نہ کی' انکارِ بیعت کا سبب کیا تھا اور وہ کیا چیز تھی کہ بیعت یزید کے مقابلہ میں امامؑ کو اپنا بھرا گھر لٹا دینا اور ہرا بھرا باغ کٹوا دینا آسان نظر آیا۔ کیا امامؑ کو یہ توقع تھی کہ اس عظیم قربانی کے بعد خلافت اپنے صحیح اصول پر آجائے گی' یزید اور یزیدیت کا خاتمہ ہو جائے گا۔ حق مانا جائے گا اور باطل مٹ جائے گا' ظلم و جور کی حکمرانی نیست و نابود ہو جائے گی۔ امتِ مسلمین حق سے وابستہ اور باطل سے کنارہ کش ہو جائے گی اور ان کی سوئی ہوئی دنیا جاگ جائے گی۔ آلِ محمدؐ اور ان کے متبعین پر جو ظلم و ستم ہو رہا ہے اس کا سلسلہ ختم ہو جائے گا اور میرے بعد میرا خاندان اپنے متبعین کے ساتھ آرام اور عافیت کی زندگی بسر کرے گا۔ بدعتیں ختم ہو جائیں گی اور شریعتِ حقہ کا ہر طرف سے خیر مقدم ہو گا۔ اگر ان باتوں میں سے کوئی بات ہو گئی ہوتی تو ہم یہ سمجھنے میں حق بجانب ہو سکتے تھے کہ امامؑ نے ان اغراض و مقاصد کو سامنے رکھ کر بیعت نہ کی اور اس عظیم قربانی کو قبول کیا۔ زورِ

شاعری اور زورِ تقریر چاہے کسی سے یہ نتائج بیان کرادے اور نمائشی طور پر اس شہادت کے نتیجہ میں یہ سبز باغ دکھادے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہی خلافت کا رنگ رہا' وہی ظلم و جور رہا' وہی باطل پسندی اور حق سے دوری رہی' وہی خاندانِ رسالت اور ان کے متبعین پر ظلم و تشدد رہا۔ مسلمانوں کی دنیا میں کونسی برائی تھی جو مٹ گئی ہو اور کونسی بھلائی تھی جو پلٹ آئی ہو۔ یزید کے بعد مروان اور مروان صفت خلیفہ ہوتے رہے۔ کیا وہ یزید سے کچھ کم تھے ؟ ائمہ اہل بیتؑ کی انتہائی خاموش اور صابرانہ زندگی کے باوجود ان پر کیا کیا ظلم و ستم نہ ہوئے۔ سادات اور ان کے متوسلین کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر تہ تیغ کیا جاتا رہا۔ زندہ' دیواروں میں چنا جاتا رہا۔ ان کے خون سے گارے بنائے گئے۔ مرقدِ حسینؑ کو بے نشان کرنے کے لئے پانی چھوڑا گیا۔ ہل چلائے گئے۔ روضہ حسینی میں کتنی بار آگ لگائی گئی اور اس کو تباہ کیا گیا۔ علی مرتضیٰؑ پر کب تک سب و شتم ہوتا رہا اور گانے والیوں سے ان کی ہجو گوائی گئی۔ کیا دنیا کے ظلم و جور' قہر و استبداد کا رنگ کچھ بدلا ؟ نہیں۔ دنیا جوں کی توں رہی بلکہ بد سے بدتر ہوگئی۔ پھر یہ کیسے کہا جائے کہ ان مقاصد کے لئے امامؑ نے بیعت کرنا نامنظور اور شہادت کو منظور کیا۔ انکارِ بیعت کا سبب تو کچھ اور ہی تھا۔

یہ لفظ بھی زباں زدِ خاص و عام ہے کہ امامؑ نے بیعتِ یزید سے اس لئے انکار کیا کہ وہ شراب خوار تھا' زانی تھا' ظالم تھا' فاسق و فاجر تھا۔ یہ نظریہ بظاہر خوش آئند ہے۔ جو اٹھتا ہے اسی پر اپنے خیالات کی عمارت بناتا چلا جاتا ہے لیکن حقیقت سے کوسوں دور ہے یہ نظریہ۔ ابتداء میں کچھ سوچ سمجھ کر پھیلایا گیا ہوگا جس کی اب ہر شخص بغیر سوچے سمجھے رٹ لگا رہا ہے۔ اس طریقہ سے اصل میں یہ تاثر بہم پہنچانا تھا کہ یزید وہ پہلا دعویدارِ خلافت تھا جو فاسق و فاجر تھا۔ اس سے پہلے فضا ٹھیک تھی اس لئے امام حسینؑ اور ان کے خاندان کی طرف سے یہ انکارِ بیعت کا پہلا واقعہ ہے۔

ایسا کہنے والوں سے اگر یہ پوچھا جائے کہ اچھا اگر یزید شراب خوار' زانی اور فاسق نہ ہوتا تو کیا امامؑ اس کی بیعت کر لیتے ؟ بے خبر دنیا تو شاید کہہ دے کہ کر لیتے لیکن باخبر فوراً چونک کر بولے گا کہ ہرگز نہیں۔ پھر ہرگز نہیں تو انکارِ بیعت کا سبب یہ فسق و

فجور کہاں رہا؟ یہ بات تو بالکل ختم ہی ہو گئی اور امامؑ کا انکارِ بیعت تو کسی اور ہی سبب سے ہوا جس کو ہم آئندہ بیان کریں گے۔ یہاں یہ بات بھی لائق توجہ ہے کہ یزید کی مبینہ بد کرداری اس کے باپ کی زندگی ہی میں تھی یا بعد میں رونما ہوئی؟ یاد رکھئے کہ امامؑ نے حضرت معاویہ کی زندگی ہی میں خلافتِ یزید کی قرارداد سے انکار کیا تھا۔ اس کے بعد مدینہ میں حضرت معاویہ کی خبرِ وفات اور امامؑ سے بیعتِ یزید کی طلب یہ دونوں چیزیں ایک ساتھ پہنچی تھیں لہذا امامؑ اور دوسروں کی نظر میں یزید کی وہی زندگی تھی جو اس کے باپ کے سامنے تھی۔ وہ جیسا بھی تھا اپنے باپ کی زندگی ہی میں تھا۔ پھر ایسے فاسق و فاجر کو خلافت کے لئے نامزد کرنا اس کا الزام نامزد کرنے والے پر آئے گا یا نامزد ہونے والے پر؟ یزید خود سے تو خلیفہ نہیں بنا' اس کو تو خلیفہ بنایا گیا۔ اب فسق و فجور کے توازن میں کس کا پلہ بھاری رہتا ہے۔ پھر یہ بھی سوچنا پڑے گا کہ وہ کون سے ایسے سنگین گناہ تھے جن کے لئے یزید کو منفرد اور پہلا شخص کہا جا سکے اور یہ سمجھا جا سکے کہ ایسے سنگین گناہ یزید سے پہلے نہ تھے۔ بیشک شراب خوری اور زناکاری سنگین اور گناہ کبیرہ ہیں لیکن ان گناہوں کا تعلق گنہگار کی ذات سے ہے۔ ان گناہوں کے مقابلہ میں مومنین کا دیدہ ودانستہ قتل ناحق وہ سنگین ترین گناہ ہے جس پر قرآنِ کریم کے کھلے الفاظ میں وعید جہنم ہے۔ مومن کے قتل عمد کے سامنے شراب نوشی اور زناء کیا چیز ہے؟ اور یہ قتل مومن کی جزاء کا جہنم ہونا اس وقت ہی ہے جبکہ یہ مقتول مومن عام مومنین میں سے ہو اور یہ قتل صرف ایک مومن کا ہو تب اس جرم کی سزا جہنم سے کم نہیں اور اگر وہ مقتول صرف مومن ہی نہ ہو بلکہ متقی' مجتہد' فقیہہ' عارف اور صحابی رسولؐ بھی ہو تو اس جرم کی سنگینی کتنی بڑھ جائے گی اور ایسا مقتول اگر محض ایک ہی نہ ہو بلکہ بہت سے ہوں تو یہ جرم کہاں سے کہاں پہنچے گا؟ اور ایسے متواتر جرم کے مقابلہ میں شراب نوشی اور عیاشی کیا چیز رہ جائے گی۔ میں یہاں جنگ صفین کا کوئی ذکر نہیں کر رہا ہوں بلکہ امام حسن علیہ السلام اور مالک اشتر ایسے حضرات کو زہر دلانے کا بھی ذکر مقصود نہیں ہے کیونکہ اس پر کچھ نہ کچھ پردہ ضرور ہے۔ یہ خدا ہی جانتا ہے کہ حضرت معاویہ نے کتنے

بے خطا اور ایماندار حضرات کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ تمام واقعاتِ مذکورہ تاریخ سے قطع نظر کر کے اگر صرف حجر بن عدی اور ان کے ساتھیوں کے قتل ناحق پر ہی نظر کی جائے جو مرج عذراء میں تہِ تیغ کئے گئے اور ان چھ حضرات کو ایک ساتھ موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور ساتویں شخص عبدالرحمٰن بن حسان نامی کو حضرت معاویہ کی ہدایت کے مطابق زیاد نے زندہ زمین میں دفن کر دیا۔ یہ وہ لوگ تھے جن کے قتل سے اُم المومنین عائشہ اور امام حسین علیہ السلام نہایت دردناک' ملول اور شاکی ہوئے۔ حضرت اُم المومنین عائشہ نے ان لوگوں کو علمی طاقت اور فقہی قابلیت کے اعتبار سے عرب کا سر اور دماغ فرمایا۔ جن کے قتل سے باز رکھنے کے لئے حضرت عائشہ نے عبدالرحمٰن بن حارث بن ہشام کو حضرت معاویہ کے پاس بھیجا اور کہلایا کہ معاویہ تم حجر اور ان کے اصحاب کے بارہ میں خدا سے ڈرنا لیکن اُم المومنین کے قاصد مذکور کے وہاں پہنچنے سے پہلے یہ کامل الایمان حضرات قتل کئے جا چکے تھے۔ ان بے خطا لوگوں کے قتل کی خبر سن کر حضرت عبداللہ بن عمر چیخیں مار مار کر رونے لگے اور ربیع بن زیاد حارثی حاکمِ خراسان نے دردمند ہو کر جمعہ کے دن اس امر کی دعا کی کہ خداوندا اب جلد ربیع کی یعنی میری روح کو بھی قبض کر لے اور مجمع سے خواہش کی کہ وہ آمین کہے۔ چنانچہ وہ مسجد سے نکلتے ہی گر کر مر گئے۔ اس پر مستزاد یہ کہ صحابی رسولؐ عمر بن حمق الخزاعی جن کو پیغمبرؐ نے سلام کہلایا تھا اور جو بقول امام حسینؑ ایسے صالح اور عبادت گزار تھے کہ کثرتِ عبادت سے ان کا جسم گھل گیا تھا' چہرہ پر زردی چھا گئی تھی' ان کی گرفتاری کا حکم ہوا اور حضرت معاویہ کی خصوصی ہدایت کے مطابق ان پر نیزہ کے نو وار کئے گئے حالانکہ وہ پہلے یا دوسرے ہی زخم میں دنیا سے رخصت ہو چکے تھے یعنی ان کی شہادت کے بعد بھی کم از کم سات مرتبہ نیزہ مارا گیا۔

مقدام بن معدی کرب نے خود حضرت معاویہ سے کہا کہ میں تمہارے یہاں سونے کا پہننا' درندہ جانوروں کی کھال پر بیٹھنا' پاخانوں کا رخ قبلہ کی طرف ہونا یہ سب دیکھ رہا ہوں جو حرام اور خلافِ شریعت ہے۔ امیر شام مذکور نے عرفہ کے روز حج میں

تلبیہ (لبیک کہنا) ممنوع قرار دے دیا۔ مدینہ میں نماز عشا پڑھائی تو نہ بسم اللہ پڑھی نہ بعض تکبریں کہیں اور اہل مدینہ کے ٹوکنے پر بھی کوئی اعتناء نہ کی۔ یہ تمام چیزیں اسی کتاب ''شہید انسانیت'' کے صفحہ ۱۲۴ تا ۱۳۵ میں پڑھ لیں۔ ان تمام چیزوں سے زیادہ یزید کا اس کی تخت نشینی کے وقت وہ کون سا فسق و فجور تھا جس کی وجہ سے فسق و فجور میں اس کو منفرد اور بے مثال کہا جا سکے۔ امامؑ سے طلب بیعت کے وقت نہ اس کے دامن پر قتل اہل بیتؑ کا دھبہ تھا نہ کعبہ کی بے حرمتی کا' نہ اہل مدینہ کی غارت گری کا۔ بیعت یزید سے امامؑ اور ان کے خاندان کا انکار کوئی پہلی اور نئی بات نہ تھی۔ کیا امام حسنؑ اور امام حسینؑ نے حضرت معاویہ کو حقدارِ خلافت تسلیم کر لیا تھا؟ کیا امام حسنؑ نے ان کو صحیح حقدارِ خلافت مان کر حکومت ان کے سپرد کی تھی؟ ہر گز نہیں۔ اس صلح میں یہ قرارداد بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ معاویہ کو اپنے بعد کسی کو خلافت کے لئے نامزد کرنے کا حق نہ ہو گا بلکہ بعض جگہ تو یہ بھی مذکور ہے کہ خلافت بعدِ معاویہ پھر حسنؑ کی طرف منتقل ہو گی اور یہ امر اس بات سے بالکل ثابت ہو جاتا ہے کہ حضرت معاویہ نے امام حسینؑ کے وجود کو نہیں بلکہ امام حسنؑ کے وجود کو یزید کی ولی عہدی کے لئے سنگِ راہ سمجھا اور جب تک امام حسن علیہ السلام کو زہر دلا کر شہید نہ کر دیا اس وقت تک یزید کی ولی عہدی کو زبان سے نہ نکالا۔ عزت و وقار کے اعتبار سے امام حسنؑ اور امام حسینؑ دونوں بھائی ایک جیسے تھے۔ پھر یہ کیا بات ہے کہ جب تک امام حسنؑ زندہ رہے یزید کی ولی عہدی کا اظہار نہ کیا گیا اور شہادت حسنؑ کے بعد حسینؑ کی موجودگی میں یزید کی ولی عہدی کا چھپا ہوا منصوبہ کھل کر سامنے آ گیا۔ اگر محض امام حسنؑ کا وقار مانع تھا تو وہی وقار امام حسینؑ کا تھا۔ صرف امام حسنؑ کو زہر دلانا اور اس کے بعد دس برس تک امام حسینؑ کو چھوڑے رکھنا اور ان کے خلاف ایسا کوئی حربہ نہ استعمال کرنا جس سے ان کی شمع حیات گل ہو جائے اس کی کوئی نہ کوئی وجہ ہے اور وجہ یہی ہے کہ صلح نامہ میں امام حسنؑ کے نام کی تخصیص سے یہ بات آ چکی تھی کہ معاویہ کے بعد خلافت پھر امام حسنؑ کی طرف منتقل ہو گی۔ اس شرط نے یہ مسئلہ صاف کر دیا کہ امام حسنؑ نے صرف عارضی طور پر

نظامِ حکومت حضرت معاویہ کے سپرد کر دیا تھا۔ وہ مستقل خلیفہ قرار نہیں دیئے گئے کیونکہ سنی، شیعہ دونوں نقطہ نظر اس پر متفق ہیں کہ ہر خلیفہ کو حق ہے کہ وہ اپنے بعد کے لئے خلیفہ معین کرے اور خلیفہ مابعد کی تصریح کرے۔ جیسا کہ حضرت ابو بکر نے حضرت عمر کو معین کیا اور حضرت عمر نے خلافت کو چھ نامزد افراد میں منحصر کیا۔ نامزدگی دونوں حضرات نے کی اور وہ عموماً تسلیم کی گئی۔ حضرت علی مرتضیٰؑ نے اپنے بعد کے لئے امام حسنؑ کو نامزد فرمایا اور ہر امام آخر تک اسی طرح اپنے بعد کے لئے نامزد کرتا رہا۔ جبکہ دونوں مذہب میں ہر خلیفہ کا حق استخلاف موجود ہے مگر غیر خلیفہ کو نہیں تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ خلیفہ ہے تو اس کو حقِ استخلاف بھی ہے اور جس کو حقِ استخلاف نہیں تو وہ خلیفہ بھی نہیں' لہذا یہ شرط کہ معاویہ کو حق استخلاف نہ ہو گا رکھی ہی اس لئے گئی تھی کہ دنیا ان کو خلیفہ نہ سمجھ بیٹھے۔ اگر ان کو خلیفہ مان کر حکومت دی گئی ہوتی تو ان کو استخلاف کے لئے بے بس کیوں کیا جاتا؟ جبکہ سنی شیعہ کسی کے یہاں بھی کوئی خلیفہ حق استخلاف سے محروم نہیں۔ مجھے تعجب ہے کہ عموماً اہل نظر نے بھی اس شرط اور اس معاہدہ کی افادیت پر نظر نہیں کی۔

جب یہ بات ثابت ہے کہ امام حسنؑ و امام حسینؑ اور ان کے خاندان اور متبعین نے خلافت حضرت معاویہ ہی کو تسلیم نہیں کیا (جیسا کہ اروئی بنت عبدالمطلب کی اس گفتگو سے ثابت ہے جو حضرت معاویہ سے ہوئی اور کتاب حاضر میں کسی جگہ مذکور بھی ہے تو انکار بیعتِ یزید اس گھرانے کی طرف سے کوئی پہلی مثال ہرگز نہ تھی۔ حق تو یہ ہے کہ علی مرتضیٰؑ سے لے کر گیارھویں امام تک ہر امام کا مستقل یہ شعار رہا کہ اپنے اپنے عہد کے حکمران کی حکمرانی کو ضرور برداشت کرتے رہے اور کسی امام نے بھی اپنے حق حکومت کو حاصل کرنے کے لئے اگرچہ قتال و جدال نہیں کیا لیکن ان میں سے ایک امام نے بھی کسی کا استحقاقاً خلیفہ ہونا تسلیم نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ تیسری خلافت کے انعقاد کے وقت علی مرتضیٰؑ نے کسی بھی حکمران کے اتباع کی شرط کو مان کر اپنا خلیفہ ہونا پسند نہ کیا اور یہی وجہ ہے کہ علی مرتضیٰؑ سے لے کر گیارھویں امام تک ایک امام بھی کسی

عہدِ حکومت میں کسی عہدۂ حکومت پر نہ آیا اور نہ لایا جا سکا۔ نہ کسی جہاد اور مہم میں شریک ہو سکا۔ کیا یہ تعجب کی بات نہیں ہے کہ با تو امام حسنؑ اپنے باپ کے بعد تھے امیر المومنین اور خلیفہ راشد یا صلح کے بعد اپنی دس سالہ زندگی میں صرف مدینہ کے بھی حاکم نہ رہے۔ امام حسینؑ عہدِ حکومتِ معاویہ میں بیس برس مدینہ میں رہے مگر ایک دن کے لیے بھی صرف مدینہ کے بھی حاکم نہ رہے بلکہ امامین کی موجودگی میں دوسرے ہی لوگ مدینہ کے حاکم ہوتے رہے جن کو حسنؑ و حسینؑ سے کسی طرح کوئی نسبت ہی نہیں۔ آخر ہر امام کا حکومت اور حکومت کی ہر مہم سے دور رہنا' ہر حکومت کی ان پر کڑی نگاہیں' کسی کے لیے قتل اور کسی کے لیے قید و بند' یہ کیوں ہوتا؟ اگر وہ اپنے اپنے عہد کی حکومتوں کے سامنے سر تسلیم خم کیے ہوتے اور حکومتیں یہ سمجھتیں کہ یہ لوگ ہم کو خلیفہ برحق تسلیم کرتے ہیں۔ انکارِ بیعتِ خلیفہ حسینؑ کے گھرانے میں شروع سے آخر تک رہا اس لیے حسینؑ وہ پہلے شخص نہیں جس نے انکارِ بیعت کیا ہو خود اسی کتاب میں کسی جگہ اس کا ذکر آیا ہے کہ ابنِ زیاد کی تحریر پر ابنِ سعد نے یہ کہا کہ حسینؑ ہرگز بیعت نہ کریں گے۔ ان کے سینہ میں ان کے باپ (علیؑ) کا دل ہے۔ ابن سعد کا یہ جملہ صاف ترجمانی کر رہا ہے کہ کسی تشدد سے متاثر ہو کر علیؑ نے بیعت نہ کی تو حسینؑ ان ہی کے بیٹے ہیں اور ان کے سینے میں علیؑ ہی کا دل ہے۔ خلافت کے ابتدائی مرحلے میں علیؑ سے بیعت لینے کے لیے ضرور ایک بار تشدد کو آزمایا گیا تھا لیکن متعلق حضرات نے محسوس کر لیا کہ یہ تشدد کارگر نہیں ہو سکتا بلکہ خطرناک اور مضر ہو گا' خاموش ہو گئے۔ اس کے بعد یزید سے پہلے تک ہر خلیفہ اس ہی نظریے پر رہا کہ افرادِ اہل بیتؑ جب ہماری خلافت کی بناء پر ہم سے جنگ آزما نہیں تو ہم ان کے ترکِ بیعت پر ان سے کیوں جنگ کریں۔ یزید پر جوانی اور حکومت کا نشہ سوار تھا۔ اس کو آلِ محمدؐ کی قوتِ ارادی کا صحیح اندازہ نہ تھا اس نے تشدد کی انتہا کر دی مگر امام تو امام اس گھر کا کوئی بچہ' بڑا' غلام' کنیز' فدائی' شیدائی کسی کو بھی اس کے مقامِ عزم سے نہ ہلایا جا سکا لہٰذا حسینؑ کا طرزِ عمل کوئی نیا طرزِ عمل نہ تھا البتہ جو طرزِ عمل حسینؑ' کے ساتھ اختیار کیا گیا وہ ضرور نیا تھا۔

اب ہم انکارِ بیعت کے سبب پر روشنی ڈالتے ہیں :۔

بات یہ ہے کہ تمام کائناتِ عالم کا خالق صرف ایک ہے جس کا کوئی دوسرا نہیں ہے ''جو تیرے سوا ہے وہ تراشیدہ ہے''۔ جب تمام مخلوق کا خالق صرف ایک ہے تو اس مخلوق پر اطاعت بھی صرف اس ایک ہی ذات کی ہے دوسرے کی نہیں۔ چاہے وہ دوسرا شان و شوکت، عزت و طاقت کے اعتبار سے کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو کیونکہ وہ بھی مخلوق ہونے میں اس ہی مخلوق کی مثال ہے۔ الا له الخلق والامر. خالق بھی صرف وہی ہے اور آمر و حاکم بھی صرف وہی، البتہ اگر وہ خالق ہی کسی کی اطاعت کا حکم دے دے تو یہ اطاعت کسی کی وجاہت کی بناء پر نہ ہوگی بلکہ حکمِ خدا کی اطاعت اور صرف خدا کی اطاعت ہوگی اور اگر اُس کے حکم کے باوجود اطاعت نہ ہوگی تو یہ اس کی نافرمانی ہوگی جس کی اطاعت کا حکم خدا نے دیا تھا بلکہ حکمِ خدا کی مخالفت اور خدا کی نافرمانی ہوگی۔ اللہ نے ایمان والوں کو حکم دیا ہے کہ وہ اللہ اور رسول اور اولی الامر کی اطاعت کریں۔ یا ایها الذین امنوا اطیعوا الله واطیعوا الرسول و اولی الامر منکم. بعض حضرات کم علمی کی وجہ سے لفظ منکم کو لفظ اولی الامر سے متصل دیکھ کر یہ سمجھ لیتے ہیں کہ منکم صرف اولی الامر کے لیے کہا گیا ہے حالانکہ یہ غلط ہے۔ لفظ منکم رسول اور اولی الامر دونوں کے لیے کہا گیا ہے بلکہ اگر پہلا جملہ اطیعوا الله الگ نہ کر دیا گیا ہوتا اور ایک ہی جملہ قرار دے کر یہ کہا جاتا اطیعوا الله والرسول واولی الامر منکم تو لفظ منکم اللہ، رسول، اولی الامر سب کے لیے ہو جاتا اور ترجمہ یہ ہوتا کہ ایمان والو، تمہاری ہی جنس سے جو اللہ، رسول، اولی الامر ہیں ان کی اطاعت کرو۔ ظاہر ہے کہ اللہ ہماری جنس سے نہیں اس لیے جملہ اطیعوا اللّٰہ کو الگ رکھا تاکہ لفظ منکم اللہ کے بارے میں نہ رہے۔ رسول اور اولی الامر چونکہ ہماری جنس سے ہیں اس لیے ان کو منکم کہا اور کہا اس لیے کہ رُسل اور اولی الامر ملائکہ میں سے بھی ہیں جیسے کہ فرمایا گیا انه لقول رسول کریم یا جیسے فرشتہ نے حضرت مریمؑ سے کہا انا رسول ربك یا حضرت ابراہیمؑ اور حضرت لوطؑ کی طرف آنے والے فرشتوں کے

لیے کہا گیا جاء ت رُسُلنا پھر ملائکہ ہی کے بارہ میں فرمایا تنزل الملائکۃ والروح فیھا باذن ربھم من کل امرفا لمد برات امراً (قرآن کریم) یہ رُسُل اور اولی الامر جو ملائکہ میں ہماری جنس سے نہیں، نہ ہم پر ان کی اطاعت ہے لہذا آیہ اطیعوا اللّٰہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم میں منکم قید احترازی ہے کہ تم پر اطاعت اُن رُسُل اور اولی الامر کی نہیں جو تمہاری جنس سے نہیں ہیں بلکہ اُس رسول اور اُن اولی الامر کی ہے جو تمہاری جنس سے ہیں۔ رسول اور اولی الامر دونوں کی اطاعت کا حکم ایک جملہ میں ایک ہی شان سے دیا گیا ہے۔ حکمِ اطاعت میں نہ کسی حکم کی قید نہ کسی حکم کا استثناء۔ ہر حکم کی اطاعت ہر مومن پر فرض کی گئی جس سے ثابت ہے کہ رسول اور اولی الامر کا ہر حکم مطابق مشیتِ الٰہی ہے۔ کوئی حکم منشائے الٰہی کے مخالف نہیں ہو سکتا۔ پس وہ سب معصوم عن الخطاء ہوئے جس طرح رسول نہ کوئی خود سے ہو سکتا ہے نہ غیر خدا کے بنائے بن سکتا ہے اسی طرح اولی الامر کا تعین بھی منجانب اللہ ہے۔ اسی لیے ان کی اطاعت بھی ہر امر میں بامر اللہ ہے بلکہ لفظ منکم کی قید احترازی نے یہ بات اچھی طرح واضح کر دی کہ جو رُسل اور اولی الامر تمہاری جنس سے نہیں ہیں اگرچہ وہ سب اللہ ہی کے منتخب کیے ہوئے ہیں لیکن اس کے باوجود تم پر ان کی اطاعت نہیں، تو پھر جس رسول اور جن اولی الامر کو تم نے متعین کیا ہو ان کی اطاعت تم پر کیسے فرض ہو سکتی ہے۔ مختصر یہ کہ انسان پر صرف اللہ، رسول اور اولی الامر کی اطاعت فرض ہے جو مطلق اور بغیر کسی قید کے ہے مگر اس اطاعت کے لیے جبر واکراہ نہیں ہے جس کا دل چاہے اطاعت کرے نہ چاہے نہ کرے مگر دنیا میں جہاں اطاعت کی بہترین مثالیں ہیں وہاں ترکِ اطاعت کی آخری مثالیں ہیں۔ حد ہے کہ خدائے حقیقی کے مقابلے میں خدا بن گئے یا بنا لیے گئے۔ رسول کے مقابلے میں رسول اور اولی الامر کے مقابلے میں اولی الامر ہوئے۔ خدائے حقیقی نے تو اپنی، اپنے رسول اور اولی الامر کی اطاعت کے لیے کوئی جبر و اکراہ روا نہ رکھا تھا لیکن مقابلہ والوں نے جبر و تشدد سے مطیع بنانا چاہا۔ یہیں سے حق و باطل کا فرق نمایاں ہو جاتا ہے۔ حق اپنے منوانے کے لیے کبھی تشدد نہیں کرتا کیونکہ

حق اپنے نہ مانے جانے پر بھی حق ہی رہے گا مگر باطل تشدد سے کام نہ لے تو وہ مانا کیسے جائے؟ اور نہ مانا جائے تو رہے کیا؟ یہی وجہ ہے کہ خدا' رسول اور اولی الامر اپنے منوانے کے لیے کبھی نبرد آزما نہیں ہوئے۔ خدائی کا دعویٰ ہو یا نبوت و امامت کا' اگر محض دعویٰ کی حد میں رہے تو ان میں سے کسی کو بھی حرب و قتال کی ضرورت نہیں۔ اپنی جگہ جس کا جو دل چاہے کہتا رہے۔ یہ سب برداشت کیا جاسکتا ہے اور برداشت کیا گیا ہے لیکن اگر خدائی کا مدعی چاہے کہ خود خدا بھی اس کو خدا مان لے' رسالت کا مدعی اگر چاہے کہ رسول برحق بھی اپنی رسالت کو خیرباد کہہ کر اس کو رسول مان لے' ولایت و امارت کے مدعی اگر یہ چاہیں کہ اولی الامر بھی ان کو اولی الامر تسلیم کرلیں تو یہ ہر ایک کے لیے ناقابل برداشت' ناممکن اور محال ہے۔ اگر خدا نے غیر خدا کو خدا مان لیا تو یہ بات تو بعد کی ہے کہ وہ مانا ہوا خدا حقیقتاً خدا ہو گیا یا نہ ہوا لیکن خدا تو خدا نہ رہا۔ رسول نے اگر غیر رسول کو رسول مان لیا تو رسول' رسول نہ رہا۔ اگر حقیقی ولی امر نے کسی غیر کو ولیِ امر مان لیا تو ولی الامر تو ولی الامر نہ رہا۔ اب رسول کے رسول نہ رہنے سے اور ولی الامر کے ولی الامر نہ رہنے سے صرف ان ہی کے منصب کو زوال نہ ہوگا بلکہ جس خدا نے ان کو اپنے کمال علم اور انتہائے اعتماد سے منتخب کیا تھا وہ جاہل اور بے بس ثابت ہوا۔ پھر اس کا خدا ہونا کیسا؟ جس خدا کا نمائندہ اپنے خدا سے ٹوٹ کر باطل سے مل گیا اور جس خدا کو اپنے علم اور انتخاب پر ناز تھا وہ منہ دیکھتا رہ گیا تو اب کیسا خدا' کیسا رسول' کیسے اولی الامر' کہاں کی کتاب' کہاں کا دین؟ یہ سب ملیا میٹ ہو گیا۔ خدا کے مقابلے میں کوئی خدا بن جائے تو خدا کی شان میں کوئی نقص نہیں آتا۔ رسول اور اولی الامر کے مقابلہ میں اگر دوسرے مدعی آجائیں تو رسالت اور امامت کے دامن پر اس سے کوئی دھبہ نہیں آتا۔ دھبہ اس وقت آئے گا جب کوئی بھی ان میں سے غیر خدا کو خدا یا غیر رسول کو رسول یا غیر اولی الامر کو اولی الامر مان لے اور یہ دھبہ جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے صرف مان لینے والے پر ہی نہ آئے گا بلکہ اس زنجیر کی ہر کڑی اور اس رشتے کا ہر دانہ ایک دم ٹوٹ جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر امام نے اپنے مقابلے کی ہر صورت حال کو برداشت کیا اور اپنی

امامت کو منوانے کے لیے اظہار حق سے آگے قدم نہ اٹھایا۔ اور خود سے کوئی تشدد کی راہ اختیار نہ کی کیونکہ بندوں کو ان کی اطاعت کا حکم تھا۔ خود ان حضرات کو یہ حکم نہ تھا کہ بندوں کو اپنا مطیع بناؤ۔ ان کا فرض یہی تھا کہ وہ اپنا اولی الامر ہونا اور مقابل کا نہ ہونا ظاہر اور ثابت کرتے رہیں۔ اس کے بعد اطاعت کرنا' نہ کرنا یہ دوسروں کا کام تھا۔ لیکن رسول اور اولی الامر یہ ان کے لیے ناممکن اور محال تھا کہ وہ کسی بھی تشدد سے متاثر ہو کر اپنے خدا اور رسول کو جھٹلا کر اپنے منصب کے منکر اور غیر کے منصب دار ہونے کے مُقر ہو جائیں۔ جس کے نتیجہ میں نہ خدا خدا رہے نہ رسول رسول رہیں اور خاتمہ ہو جائے دین' ایمان' کتاب ہر شے کا۔

بیعت تو بڑی چیز ہے' صاحب الامر تو غیر کی اقتداء میں نماز بھی نہیں پڑھ سکتا۔ کیونکہ اس غیر پر اس نماز کے وقت بھی منجانب اللہ صاحب الامر کی اطاعت واجب ہے۔ تو اب صاحب الامر اس کے اتباع کی نیت ہی کیسے کر سکتا ہے جس پر خود اس کا اتباع لازم ہے۔ اس کے خلاف ایک ہی وقت میں یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ صاحب الامر کر رہا ہو امام جماعت کا اتباع اور امام جماعت کر رہا ہو صاحب الامر کا اتباع۔

فرض کیجئے کہ اگر عہدِ رسول میں کوئی شخص مدعی رسالت ہو کر چاہتا کہ رسول اپنے دعوائے رسالت سے دست بردار ہو کر اس مدعی کی رسالت کو تسلیم کر لیں اور اپنی طاقت کے بل بوتے پر انتہائی تشدد سے کام لیتا جب کہ رسول کے انصار کم سے کم اور مدعی باطل کے مددگار زیادہ سے زیادہ ہوتے تو کیا ایسی صورت میں یہ ممکن ہوتا کہ رسول برحق اپنی رسالت کو خیر باد کہہ کر اُس کی رسالت کو تسلیم کر لیں؟ ہرگز نہیں۔ یقیناً اگر رسول کو یہ صورت پیش آتی تو آپ مدعی باطل کی کسی صورت میں بھی بیعت نہ کرتے چاہے وہ تشدد کتنا ہی سخت تر کیوں نہ ہوتا۔ نبی برحق کبھی اس کی بیعت نہیں کر سکتا تھا چاہے وہ کوئی فاسق و فاجر ہوتا یا ظاہراً نیک اور پارسا ہوتا۔ اگر نبی پر انتہائی تشدد کیا جاتا تو پہلے آپ اظہارِ حق فرما کر اتمامِ حجت کرتے اور کم از کم یہ چاہتے کہ مخالف اپنی

جگہ جو چاہے کہے اور کرے مگر اس پر بضد نہ ہو کہ میں اس کے دعوے کو تسلیم کر لوں۔ اگر وہ یہ بھی نہ مانتا تو آپ یہ کوشش کرتے کہ مقابل اس پر ہی راضی ہو جائے کہ میں اپنے وطن، شہر اور ملک کو چھوڑ کر دور دراز کسی جگہ چلا جاؤں۔ اگر یہ صورت بھی قبول نہ کی جاتی اور دشمن صف آراء ہو کر قتال شروع کر دیتا تو آپ بھی اپنے انصار کو لے کر میدانِ قتال میں آتے اور دشمن کی بھرپور طاقت اور اپنے انصار کی کمی کی پرواہ نہ کر کے قتال کے جواب میں قتال کرتے اور اپنا سب کچھ خدا کا بول بالا رکھنے کے لیے قربان کر دیتے۔ حسینؑ رسولؐ کے وارث بھی تھے اور خدا کے قرار دیئے ہوئے صاحب الامر بھی تھے۔ یعنی اس جماعتِ اولی الامر میں سے ایک تھے جن کی اطاعت اللہ نے کافۂ مومنین پر فرض قرار دی تھی۔ جو ایسی حالت میں رسولؐ کرتے وہی حسینؑ نے کیا۔ اپنی عزیز ترین جانوں کو دے کر اپنی اور ہر امام کی امامت پر، رسولؐ کی رسالت پر، خدا کی خدائی پر آنچ نہ آنے دی۔ حقا کہ بنائے لا الہ است حسینؑ۔ صلّی اللہ علی محمد وال محمد۔

☆☆☆

ثانیِ زہراؑ

بہت سے مردانِ ہمت اس دنیا میں پیدا ہوئے۔ جنہوں نے اپنے اہم مقاصد کے حاصل کرنے یا ان کو محفوظ رکھنے کے لئے عظیم الشان قربانیاں دیں۔ شدائد جھیلے اور سخت مشکلات کا سامنا کیا۔ مصائب اور مشکلات کا ہجوم ان کے پائے ثبات کو لغزش نہ دے سکا۔ خطرناک واقعات کا سیلاب ان کے عزم اور استقامت کی دیوار کو جنبش نہ دے سکا۔ بالآخر وہ اپنے عزم و استقامت کی بدولت کامیاب اور بامراد ہو کر رہے۔ اگرچہ دستِ فنا نے ان کو نہ چھوڑا اور وہ اپنی محدود زندگی کو پورا کر کے دنیا سے رخصت ہو گئے۔ مگر زبانوں پر ان کا نام اور دلوں میں ان کی یاد باقی رہ گئی۔ اب جب تک تاریخ عالم کے اوراق باقی ہیں، ان کا نام نیک باقی ہے۔ ان میں سے بعض ایسے ہیں جن کا مقصد ان کی ذات تک محدود تھا۔ انہوں نے جو کچھ کیا اپنے لئے کیا۔ بعض ایسے ہیں، جنہوں نے صرف اپنے لئے نہیں بلکہ قوم و ملک کی بھلائی کے لئے تن، من، دھن کی بازی لگا دی اور قوم و ملک کو ہمیشہ کے لئے اپنا شکر گزار اور قدردان بنا لیا۔ تیسرا طبقہ ان حضرات کا ہے جنہوں نے اپنے مقصد کا رُخ نہ اپنی جانب رکھا نہ قوم و ملک کی طرف۔ بلکہ ان کا مقصد تھا صرف رضائے الٰہی کا حصول اور دین خدا کا استحکام، جس کے تحت میں صرف قوم و ملک کی بھلائی نہیں بلکہ تمام نوع انسانی کی بھلائی خود بخود آجاتی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو سب کچھ خدا کے لئے کرتے ہیں۔ اور اپنا سب کچھ نام خدا پر تج دیتے ہیں۔ ان کا معاملہ خلق خدا کے ساتھ نہیں بلکہ خدا کے ساتھ ہوتا ہے۔ ان کی نیک نامی

صرف دنیا اور اہل دنیا میں ہی محدود نہیں بلکہ وہ بارگاہ خدا سے ایسا شرف قبول حاصل کرتے ہیں جس کے نتیجے میں وہ ہر جہان میں سربلند رہتے ہیں۔ وہ خدا کے ہوتے ہیں خدا ان کا ہوتا ہے۔ ان کی یاد کا اور ان کے نام کا زندہ رکھنا خدا اپنے ذمے لے لیتا ہے۔ خدا خود ان کا ذاکر ہوتا ہے جو کتاب خدا آتی ہے ان کا ذکر لے کر آتی ہے۔ خدا کی کتاب ان کے ذکر خیر کے بغیر نہیں' خدا کی نماز ان پر درود وسلام کے بغیر نہیں۔ یہی حضرات ہیں جو خاصان خدا کہلاتے ہیں۔ مرتبے میں بہت زائد۔ تعداد میں بہت کم' ایسے انسان اولین میں بھی ہیں آخرین میں بھی۔ مگر ایسے لوگ عموماً طبقہ رجال سے ہوئے ہیں۔ ایک تو اس لئے کہ یہ خاصہ عموماً نبوت ولایت کا ہے اور یہ منصب قدرت نے مردوں ہی کے لئے قرار دیئے ہیں۔ دوسرے یہ کہ مرد اپنے آزاد اور بے حجاب ہونے کی وجہ سے فطرتاً میدانِ عزم واستقامت کے شہسوار ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ تیسرے مرد کو قدرت نے مصائب وآلام کے تحمل وبرداشت کی قوت بھی نسبتاً زیادہ عطا کی ہے۔ اس بنا پر صنف نساء میں ایسی مثالیں نادر اور کالعدم ہیں جنھوں نے اپنے نوعی وقار اپنے زیور حیا اور اپنے تمام فرائض کے تحفظ کے ساتھ ساتھ ایسی کوئی دینی خدمت اور تبلیغی ریاضت کی ہو جو ان کی روحانیت کے کمال کی دلیل ہو۔ اور اس تبلیغ کی راہ میں ان کو ہولناک اور قیامت خیز مصائب ومشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہو۔

شرف ومنزلت کے اعتبار سے جناب حواؑ سے جناب مریمؑ تک چند خواتین ہیں جو مشہور ہیں لیکن ہر جگہ شرف ومنزلت کے اسباب جداگانہ ہیں۔ آسیہ زنِ فرعون جن کی مدح قرآن مجید میں کی گئی ہے ان کے لئے مشہور ہے کہ انہوں نے سخت تکلیف اور انتہائی شدت برداشت کی مگر راہ حق سے اپنا قدم نہ ہٹایا۔ بیشک یہ ان کی دینداری اور دینی خلوص کی انتہا ہے مگر اس کا تعلق صرف ان کی ذات سے ہے۔ انہوں نے اپنی دینداری کی حفاظت کی مگر اس کو گرمیٔ تبلیغ اور دین حق کی اشاعت عام نہیں کہا جا سکتا۔ اس سلسلہ میں ہم کو تین بیبیاں نظر آتی ہیں اور حُسنِ اتفاق کہ وہ تینوں بیبیاں ایک ہی گھر کی ہیں مسلسل اور بلا فاصلہ ہیں۔ ذُریۃً بعضھا من بعضٍ کی شان پورے طور پر

نظر آتی ہے۔ ایک جناب خدیجۃ الکبریٰؑ پھر ان کی بیٹی فاطمہ زہرؑا پھر ان کی بیٹی زینب کبریٰؑ ۔ جناب خدیجۃ الکبریٰ بہت مالدار تھیں اور ملکہ حجاز کہی جاتی تھیں۔ ان کے شوہر نامدار مبعوث بر سالت ہوئے اور جناب محمد مصطفیٰؐ پر پہلی وحی آئی۔ اور جناب خدیجۃ الکبریٰؑ نے پہلی وحی پر تصدیق رسالت کی اور یہ کہہ کر تصدیق کی کہ میں تو پہلے ہی سے آپ کی ذات میں علامات نبوت دیکھ رہی تھی اور یہ سمجھ رہی تھی کہ آپ مرتبہ نبوت کے ہر طرح اہل و سزاوار ہیں۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ جب تک نبوت خاموش تھی اس وقت تک خدیجہؑ کی طرف سے بھی پُر سکوت تصدیق ہو رہی تھی اور جب زبانِ نبوت گویا ہو گئی خدیجہؑ کے دل کی بات بھی زبان پر آگئی۔ پیغمبر اسلام تبلیغ رسالت کا کام انجام دے رہے ہیں اور خدیجۃؑ الکبریٰ کا مال راہ تبلیغ میں خرچ ہو رہا ہے اور خاتون وفا جناب خدیجۃؑ الکبریٰ نے اپنا سارا مال فخر و مسرت کے ساتھ پیغمبر اسلام کی نذرِ عقیدت کر دیا ہے۔ شوہر نامدار کے مقصد تبلیغ میں خدیجۃؑ الکبریٰ ساتھ ساتھ ہیں۔ صرف مال ہی سے نہیں بلکہ جسم و جان پر بھی ہر طرح کی اذیت اٹھانے کو تیار ہیں۔ زبانِ پیغمبرؐ پر قولوا الا الہ الا اللہ کا آنا تھا کہ کفار قریش کا بچہ بچہ دشمن جان پیغمبرؐ ہو گیا۔ مردوں میں کوئی آپ کا سینہ سپر ہے تو جناب ابو طالبؑ اور ان کے فرزند علیؑ ۔ عورتوں میں کوئی مونس و غمخوار ہے تو ایک فاطمہ بنت اسد جنھوں نے ایک ماں بن کر رسولؐ کی پرورش کی بلکہ ماں سے زیادہ رسولؐ سے شفقت کی اور اپنے بچوں سے زیادہ رسولؐ کو کھلانے ' نہلانے ' پہنانے کا اہتمام کیا۔ اپنے بچوں سے چھپا چھپا کر رکھتی ہیں اور یتیم عبداللہ کو کھلاتی ہیں۔ فاطمہ بنت اسد نے ان کو اپنا فرزند عزیز سمجھا اور پیغمبرؐ نے فاطمہ بنت اسد کو اپنی ماں سمجھا۔ چنانچہ جب علی مرتضیٰؑ نے اپنی ماں کے انتقال کی خبر رسولؐ کو دی اور کہا کہ میری ماں کا انتقال ہو گیا ہے تو پیغمبرؐ نے فرمایا کہ انتقال میری ماں کا ہوا ' ازواج نبیؐ کے لئے فخر کا مقام ہے کہ اللہ نے ان کو مومنین کی ماں فرمایا۔ لیکن فاطمہ بنت اسد کا مقام بھی کتنا بلند ہے کہ وہ زبان رسولؐ پر رسولؐ کی ماں ہیں۔ غرضیکہ مستورات میں سے اگر مونس و غمخوار پیغمبرؐ ہیں تو ایک یہ معظمہ ' دوسرے جناب

خدیجۃؑ الکبریٰ' بعثت سے پہلے تو یہ تھا کہ زنان مکہ جناب خدیجۃ الکبریٰ کے لئے حاضر بارگاہ اور دست بدامن رہتی تھیں یا اب وہی خدیجہؑ ہیں کہ کسی کی صورت نظر نہیں آتی۔ تنہائی اور بیکسی کی زندگی گزار رہی ہیں۔ قریش نے ملنا جلنا خرید و فروخت ان لوگوں کے ہاتھ سب کچھ بند کر دیا ہے اور مکمل قطع تعلق کر لیا ہے۔ قوت لایموت کا ملنا دشوار ہو گیا ہے۔ شوہر نامدار کے ساتھ ساتھ ملکہ حجاز کی زندگی فاقوں میں بسر ہو رہی ہے۔ مگر ماتھے پر شکن نہیں بلکہ اس امر پر مسرت اور فخر محسوس کر رہی ہیں کہ اپنی جان و مال سے دین حق کی تبلیغ میں سرگرم عمل ہوں۔ خدا کی راہ میں وہ مال کل کا کل صرف ہو چکا اور جس وقت یہ معظمہ دنیا سے رخصت ہونے لگیں۔ گھر میں آخری پوشاک کفن کے لئے کچھ نہ تھا۔ شوہر نامدار سے وصیت کی مجھے اپنے مستعمل لباس کا کفن دیجئے گا تاکہ وہ میرے لئے سبب نزولِ رحمت ہو۔ اس وصیت سے خدیجۃؑ الکبریٰ نے ایک تو پیغمبرؐ خدا سے اپنے انتہاء حسن عقیدت کا اظہار کیا۔ دوسرے یہ موقع بہم پہنچا دیا کہ شوہر کو یہ ملال تک نہ ہو کہ میں آج اس زوجہ کے کفن کے لئے کچھ نہیں رکھتا جس نے اپنا سارا مال و متاع راہ تبلیغ میں لٹا دیا۔ خدیجہ دنیا سے رخصت ہوئیں اور اب مال کہاں تھا؟ جسے چھوڑ کر جاتیں۔ البتہ ایک دولت بے بہا ایسی چھوڑی ہے جس کا سلسلہ خیر و برکت مال دنیا کی طرح ختم ہونے والا نہیں ہے جس قدر جلد مال خدیجہؑ ختم ہو گیا۔ اتنی ہی دیر تک یعنی قیامت تک اس دولت کا سلسلہ قائم رہے گا یہ خدیجہؑ کی دولت کیا ہے؟ ایک پاکیزہ دختر فاطمۃ الزہرؑا جو خدیجۃؑ الکبریٰ کی یادگار اور پیغمبرؐ اسلام کا لختِ جگر ہیں۔ فاطمۃ الزہرؑا کے سینہ میں جو دل ہے اس دل میں خدیجۃؑ الکبریٰ اور رسولؐ دوسرا دونوں کی روح موجود ہے۔ فاطمۃ الزہرؑا ان چار ارکان میں سے ہیں (علیؑ فاطمہؑ، حسنؑ، حسینؑ) جن کو پروردگار عالم نے حمایت دین اور تبلیغ اسلام کے لئے پیغمبر کے ساتھ رکھا تھا اور عصمت و طہارت کو ان کی سرشت اور ان کا خمیر قرار دیا تھا۔

دو چشم من فدائے چار گوہر
علیؑ و فاطمہؑ شبیرؑ و شبرؑ

چادر تطہیر میں پیغمبرؐ کے ساتھ ہیں تو یہی میدان مباہلہ میں اثباتِ توحید و رسالت کے لئے رسولؐ کے ساتھ بھیجے گئے تو یہی۔ فاطمۃ الزہرؑ اکو جذبہ حمایت دین اور حوصلہ نصرت حق ماں اور باپ دونوں سے ملا۔ باپ کی خدمت کے ساتھ ساتھ خدمت دین میں سرگرم رہیں۔ بچپن ہی سے پدر بزرگوار کی خدمت ان کی ہر طرح دلجوئی اور دلداری کے فرائض بیٹی کے متعلق ہو گئے مکہ کا گوشہ گوشہ رسولؐ کا دشمن جان ہو گیا اور سیدہ اپنی آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھتی رہیں فاطمہ زہرؑا کی زندگی میں وہ رات آئی کہ باپ نے وطن چھوڑ کر مدینہ کی طرف ہجرت کی۔ گھر کی سب مستورات بدستور مکہ میں ہی رہیں، سیدہؑ بھی ان ہی میں سے تھیں اور اس ہی گھر میں تھیں جس میں رسولؐ کے بستر پر علیؑ مرتضٰی نے لیٹ کر اپنا جذبہ جان نثاری آشکارا کر دیا۔ اہل حرم سب کے سب علیؑ مرتضٰی کی حفاظت اور امانت میں تھے۔ علیؑ مرتضٰی ہجرت پیغمبرؐ کے بعد ان امانتوں کے پہنچانے میں مصروف رہے جو اہل مکہ کی طرف سے پیغمبرؐ خدا کے پاس تھیں اور اس فرض سے سبکدوش ہو کر رسولؐ کے اہل و عیال کو لے کر مدینہ کی طرف رواں ہوئے۔ فاطمہ زہرؑا بھی اسی قافلہ میں تھیں ادھر پیغمبرؐ اس قافلہ کی آمد کا بے چینی سے انتظار فرما رہے تھے تاانیکہ یہ قافلہ مدینہ پہنچا اور پیغمبرؐ کی آنکھیں ان لوگوں کو دیکھ کر ٹھنڈی ہوئیں۔ فاطمہؑ زہرا کے لئے جو محبت قلب پیغمبرؐ میں تھی اور فاطمہؑ زہرا کے لئے جو احترام بارگاہ پیغمبرؐ میں تھا اس کی مثال مل جاتی اگر فاطمہؑ زہرا کی کوئی مثال ہوتی۔ ہجرت کے دوسرے سال جبکہ خاتون جنت کی عمر دس سال کی تھی۔ سرور کائنات نے بحکم خدا ان کا عقدِ سعید علیؑ مرتضٰی کے ساتھ فرما دیا۔ سیدہ نساء عالمین ماں کی طرح مال و دولت نہ رکھتی تھیں مگر اس کم مائیگی میں اس فقر و فاقہ میں جود و سخا کی مثال بے مثالی قائم کر کے دکھا دی اور دنیا کو دکھا دیا کہ راہ خدا میں دینے والے فقر و فاقہ میں بھی اس طرح دیا کرتے ہیں بچوں کو بھوکا سلا دیا جاتا ہے مگر سائل اور مہمان کو سیر کیا جاتا ہے۔ روزہ پر روزہ رکھ لیا جاتا ہے مگر مصیبت زدوں کی کفالت کی جاتی ہے کبھی چادر ہفتاد پیوند رہن رکھ دیتی ہیں اور کبھی گلوئے اقدس سے گلوبند اتار کر دے دیتی ہیں کبھی

دروازے کا پردہ اتار کر مسلمان محتاجوں کی تن پوشی کرتی ہیں۔ کئی وقت کے فاقوں کے بعد اگر کچھ ملتا ہے تو باپ کو شریک طعام کئے بغیر نہیں کھاتیں۔ مشہور واقعہ ہے کہ جنگ احزاب کے لئے مدینے کی حد پر خندق کھودی جا رہی ہے۔ پیغمبرؐ اسلام بھی مسلسل فاقوں کی وجہ سے پیٹ پر پتھر باندھے شریک کار ہیں۔ فاطمہؑ زہراؑ ان کے شوہرؑ اور بچے کئی وقت کے فاقے سے ہیں۔ اس اثنا میں علیؑ مرتضٰی کہیں سے کچھ لائے۔ سیدہؑ نے روٹی پکائی اور پہلے باپ کا حصہ بھجوایا پیغمبرؐ نے روٹی کا وہ ٹکڑا لے کر فرمایا کہ کئی وقت کے فاقہ کے بعد آج روٹی کا یہ ٹکڑا دیکھا ہے جو میرے پارۂ جگر نے بھیجا ہے۔ سیدہؑ کے باپ اور شوہر کی زندگی کا بڑا حصہ میدان جہاد و قتال میں گزرتا ہے اور یہ دونوں حضرات بار بار میدان وغا میں جاتے ہیں کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ ایک جنگ سے آکر ابھی کمر نہیں کھلی کہ دوسری جنگ میں جانا ہو گیا۔ سیدہؑ ان دونوں بزرگوں کی یہ تعب یہ جان فشانی دیکھ رہی ہیں مگر کبھی نہیں روکتیں۔ کبھی اس سلسلہ میں اپنے درد و محبت کا اظہار کر کے سدراہ نہیں بنیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ دین کی مہم میں سیدہؑ کو بھی وہی انہماک تھا جو ان کے شوہر اور پدر بزرگوار کو تھا۔ شوہر نامدار جنگ کے لئے جا رہے ہیں اور سیدہؑ لوازم سفر کی تکمیل کر رہی ہیں۔ واپس آتے ہیں تو خون آلود تلوار صاف کر کے رکھ رہی ہیں۔ حمایت دین کے لئے سیدہؑ نے کون سی اذیت نہ اٹھائی اور وہ کون سی زحمت اور مصیبت تھی جو نہ جھیلی۔ یہاں تک کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ داغ مفارقت پدر اٹھایا۔ باپؐ کے بعد اس چند روزہ زندگی میں اہتمام حجت تبلیغ حق اشاعت دین کے فرائض ادا کرتی ہوئی دنیا سے رخصت ہوئیں اور ۷۵ روز باپ سے جدا رہ کر خون دل آنکھوں سے بہا بہا کر باپ سے جا ملیں۔ خدیجۃؑ الکبریٰ نے اپنی ایک یادگار چھوڑی تھی۔

زینبؑ عالی نسب :

فاطمہؑ زہرا نے اپنے چار جان و جگر چھوڑے۔ دو فرزند اور دو دختر۔ حسنؑ، حسینؑ، زینبؑ اور ام کلثومؑ۔ یہ وہی زینبؑ ہیں جو اس مختصر سے رسالے کا موضوع ہیں۔

ان بہن بھائیوں سے پہلے اسلام کے دامن میں ایک ہی گھر کی وہ چھ ہستیاں تھیں جنہوں نے اپنی آغوش میں اسلام کو پناہ دی جنہوں نے بصرت حق اور ترویج دین کا حق کما حقہ ادا کیا۔ایک خود سرورِ کائناتؐ' دوسرے ان کی رفیق حیات جناب خدیجۃ الکبریٰؑ تیسرے اور چوتھے جناب ابو طالبؑ اور اُن کی زوجہ گرامی قدر فاطمہ بنت اسد' پانچویں علیؑ مرتضیٰ' چھٹے خاتون جنت فاطمۃ الزہراؑ۔ نظام قدرت اور اُس کی حسنِ تدبیر کہ زینبؑ کبریٰ وہ خاتون ہیں جو ان چھ کی چھ ہستیوں کی نسل مبارک سے ہیں۔ علیؑ و فاطمہؑ کی بیٹی ہیں۔ رسولِ خداؐ اور خدیجۃؑ الکبریٰ کی نواسی ہیں۔ ابو طالبؑ اور فاطمہ بنت اسد کی پوتی ہیں۔ جس زینبؑ کی رگوں میں ان چھ ہستیوں کا خون دوڑ رہا ہو' جس زینبؑ کے سینہ میں ان چھ ہستیوں کی روح ہو' جس زینبؑ کے جسم میں ان چھ ہستیوں کی جان ہو اس زینبؑ کے دل میں کیسا جذبہ ہوگا۔ حمایت دین کا نصرتِ حق کا تبلیغ شریعت کا اعلاء کلمہ حق کا تصدیق ایمان کا' تردید باطل کا' زینبؑ کے ایک دل میں۔ ان سب ہستیوں کے حوصلے داخل تھے۔ زینبؑ کے عزم میں ان سب کے عزائم شامل تھے۔ زینبؑ کا کارنامہ ان سب کا شاہکار اور زینبؑ کا صبر ان سب کا صبر و قرار ہے۔

زینبؑ کبریٰ کی ولادت باسعادت :

تقریباً ہجرت کے پانچویں یا چھٹے سال میں ثانی زہراؑ آغوش زہراؑ میں آئیں اور رسول اکرمؐ نے اپنے گھر میں آج دوسری فاطمہؑ دیکھی۔ ماں خاتون جنت ہیں۔ بیٹی خاتون کربلا ہیں۔ کربلا جائے خود ایک جنت ہے جس کی شان ہے روضۃ من ریاض الجنۃ۔ ایک طرف تو نبیؐ خدا کو ایک باکمال اور پُر عظمت و جلال بیٹی کے ملنے کی خوشی' دوسری طرف مآلِ کار پر نظر اور ان مصائب و آلام کا تصور جو اس بچی کے لئے علم پیغمبرؐ میں تھے۔ پیغمبرؐ کی آنکھیں اور اُن میں ڈبڈبائے ہوئے آنسو' پیغمبرؐ کے لب اور اُن پر سرد آہیں۔ بچی کے ماں باپ پر ہونے والے واقعات کا اظہار ہونا اور گھر بھر کا اشک بار ہونا۔ زینبؑ آئیں اور رنج و غم کا سرمایہ ساتھ لائیں۔ بہر حال عصمت و طہارت کی آغوش

میں پلیں۔ عصمت وطہارت کے ہاتھوں نے زینبؑ کو سنوارا۔ زینبؑ نے وہ دودھ پیا جسے سر چشمہ عصمت کہا جائے تو بجا۔ زینبؑ نے وہ نگاہیں دیکھیں جن کو عین علم و عصمت کہا جائے تو بجا۔ یہ شرف عالم کائنات میں صرف اولاد فاطمہؑ کے لئے مخصوص ہے۔ جو معصوم ماںؑ باپؑ سے پیدا ہوئے۔ ورنہ کہیں اگر ماں معصومہؑ ہے تو باپ نہیں اور باپ معصوم ہے تو ماں معصومہ نہیں۔ قدرت کی جانب سے زینبؑ کے رعب داب اور پردہ وحجاب کا یہ اہتمام کہ دیکھا زینبؑ کو بہتوں نے لیکن دوست اور دشمن کسی کو یہ ہمت نہ ہوئی کہ سراپائے زینبؑ کو بیان کرنے کا ارادہ بھی کرے۔ تاریخ اور سیرت کی کتابیں اس عنوان سے خالی رہیں۔ گویا قدرت نے اس چیز کے لئے زبانوں پر مہر سکوت لگا دی۔ البتہ جن کانوں نے زینبؑ کے خطبوں اور تقریروں کو سنا تھا۔ اُن کی زبانوں پر آ گیا کہ زینبؑ کے دہن میں علیؑ کی زبان بول رہی تھی۔ بیٹی کا لب ولہجہ باپ سے اسی طرح مشابہ تر تھا جیسے فاطمہ زہراؑ کا لب ولہجہ بالکل رسولؐ کا لب ولہجہ تھا۔ زینبؑ کبریٰ کی کنیت زیادہ مشہور نہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ جناب زینبؑ کی کنیت ام کلثوم ہے۔ واقعہ کربلا کے بعد مصیبت زدہ کہا جانے لگا۔ القاب بہت ہیں اور ماں کی طرح متعدد ہیں۔ کبھی عقیلۃ القریش اور کبھی عقیلہ بنی ہاشم بھی کہا جاتا ہے۔ ابن عباس جب اس مخدومہ سے روایت کرتے ہیں تو کہتے ہیں "قالت عقیلتنا"۔ یہ خبر ہم کو ہماری عقیلہ نے دی ہے۔ نواسی کا رشتہ نانا نے اپنی زندگی ہی میں اپنے بھتیجے عبداللہ بن جعفر طیار سے کر دیا اور عجب نہیں کہ پیغمبرؐ نے اپنے ہونے والے داماد سے زینبؑ کے وہ سنگین اور شدید ترین مصائب کا ذکر فرماتے ہوئے جن کا تعلق رفاقت حسینؑ اور سفرِ عراق سے تھا۔ یہ بھی فرما دیا ہو کہ زینبؑ کو حسینؑ کے ساتھ عراق جانے سے نہ روکنا۔ خواص الامہ میں حضرت عبداللہ بن جعفر کا یہ بیان مندرج ہے کہ "رسول اللہ نے ایک روز مجھے اپنی سواری پر بٹھا لیا۔ اور مجھ سے ایک بات فرمائی جس کو میں کبھی کسی سے نہ کہوں گا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ بات زینبؑ کبریٰ کے اُسی ہولناک سفر کربلا سے متعلق ہو"۔

زینبؑ پانچ چھ سال کی تھیں کہ ناناؐ کا سایا سر سے اُٹھ گیا اور ماں فاطمہ زہراؑ

تصویر رنج و غم بن گئیں۔ ماںؑ کی وہ غمناک اور پچھتر دن کی زندگی بھی ختم ہو گئی اور زینبؑ کم سنی میں بے ماں کے ہو گئیں۔ ہوش مند گھرانہ کی بچی پانچ چھ سال کی عمر میں دیکھے ہوئے واقعات کو نہیں بھولتی اور اُن واقعات کا اثر مستقل طور پر قبول کر لیتی ہے' پھر خاندانِ رسالتؐ کی بچی اور بچی بھی وہ جس کو قدرت نے عظیم الشان اور اہم امور کے انجام دینے کے لئے پیدا کیا ہو' یقیناً زینبؑ نے اپنے ناناؐ اور اپنی والدہؑ کی وفات اور وفات کے قریبی واقعات کو ہوشمندانہ نظر سے دیکھا اور اس نظر نے جہاں اس بچی کے دل کو داغدار بنایا وہاں اس کے ننھے سے دل میں عبرت کا سرمایہ بھی جمع کر دیا جو آئندہ کے لئے اس کے عزم واستقلال کی مضبوط بنیاد بن گیا۔

جنابِ زینبؑ کا علم :

زینبؑ بے ماں کے ہو گئیں۔ مگر باپ کا سایہ سر پر تھا۔ دونوں بھائی بازوؤں کی طاقت تھے۔ زینبؑ کی جانب سے ان تینوں ہستیوں کے لئے اندازِ محبت سے بھری ہوئی حسنِ خدمت تھی اور زینبؑ ان سب کی نگاہِ محبت کا مرکز تھیں۔ زینبؑ نے ماحول عصمت میں پرورش پائی۔ زینبؑ کی تعلیم و تربیت علیؑ جیسے باپ سے وابستہ تھی اور یہ تعلیم و تربیت بلاواسطہ اور بالمشافہ تھی' لیل و نہار تھی' صبح و شام تھی' الفاظ سے تھی۔ اشاروں سے تھی' عمل سے تھی۔ جس ذات کے بالواسطہ علمی فیوض نے ایک عالم کو عالم بنا دیا ہو اس علیؑ کی بلاواسطہ اور مستقل تعلیم و تربیت نے زینبؑ کو علم و حکمت کے کس بلند مقام پر پہنچا دیا ہو گا۔ جس کے ادنیٰ شاگرد ابن عباس امام المفسرین ہو جائیں۔ پھر اس باپ کی بیٹی رسولؐ کی نواسی فاطمہؑ کی لاڈلی' حسنؑ و حسینؑ کی بہن ایک عظیم صلاحیت رکھتے ہوئے کس قدر باعلم اور باکمال ہو گی جب ہی تو ہمارے چوتھے امامؑ سید سجاد علیہ السلام نے اپنی پھوپھی سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا :

"فانك عالمة غير معلّمة و فهيمة غير مفهمة"

(ترجمہ) پھوپھی اماں آپ تو وہ صاحبِ علم ہیں جن کو کوئی تعلیم

نہیں دے سکتا اور آپ وہ صاحب فہم ہیں جن کو سمجھانے کا حق اور حوصلہ کوئی نہیں رکھتا"۔

زینبؑ اپنے پدر بزرگوار کے زمانہ خلافت میں کوفہ کے دارالامارہ میں رہتی ہیں۔ زینبؑ کی بارگاہ زنانِ کوفہ کے لئے ایک علمی درس گاہ ہے۔ جہاں تفسیر قرآن دین کے اصول و فروع پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ مستورات کے ذریعہ سے مرد تک مستفید ہو رہے ہیں۔ زینبؑ کی دینی معلومات کس قدر وسیع ہوں گی اور علمی مشکلات اُن کے لئے کتنی سہل ہوں گی۔ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ :

> "شب عاشور امام حسین علیہ السلام نے اپنی بہن سے فرمایا تھا کہ پیاری بہن! میرے بعد غم سے بے جان نہ ہونا۔ منہ پر طمانچے نہ مارنا' گریبان چاک نہ کرنا' اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حادثات کے وقت یہ امور خلاف شرع ہیں۔ جب ہی تو امامؑ نے ان امور سے اپنی بہن کو روکا"۔

کاش ان جملوں سے استدلال کرنے والے اس امر پر نظر فرماتے کہ یہ جملے کہے کس سے گئے ہیں۔ اگر اس خبر کو بعینہ صحیح مان بھی لیا جائے تو امامؑ کے اس ارشاد سے ان امور کا ناجائز ہونا ثابت ہونے کی بجائے جائز اور مباح ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اگر یہ جملے ایسے شخص سے کہے گئے ہوتے جس کو فقہ اور شریعت کے ایسے معمولی مسائل کا بھی علم نہ ہو اور جائز و ناجائز کی خبر نہ ہو یا وہ ناجائز ہونے کا علم رکھتے ہوئے بھی امر حرام کا ارتکاب کر لیتا ہو۔ تب تو یہ استدلال کچھ ٹھیک بھی ہو سکتا تھا لیکن حسینؑ یہ کلمے اس سے فرما رہے ہیں جس نے شریعت کدہ میں پرورش پائی۔ معصوم ماحول میں پلیں' معصوم ہستیاں اُن کے سامنے دنیا سے اُٹھیں۔ جسکی تعلیم و تربیت مستقل طور پر علیؑ مرتضٰی نے فرمائی۔ حسنؑ مجتبٰی کا حسینؑ خامس آلِ عبا کا پورا دور امامت دیکھا۔ کیا اُن کو یہ خبر نہ تھی کہ یہ امور حرام ہیں یا حسینؑ کو اُن سے یہ توقع ہو سکتی تھی کہ زینبؑ ان امور کے حرام ہونے کا علم رکھتے ہوئے ایسا ارتکاب کر سکتی ہیں۔ ہر گز نہیں۔ اصل

میں یہ بھائی کا اپنی بہن سے جوش محبت تھا۔ مواسات اور غمخواری کا جذبہ تھا کیونکہ دنیا میں عموماً ایسا ہوتا ہے کہ :

"جب مصیبت زدہ جوش غم سے تڑپتا' روتا اور فریاد کرتا ہے تو دیکھنے والوں میں فطرۃ ہمدردی اور غم خواری کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور ہر شخص اس کو تسلی دلاسا دے کر اس کا غم غلط کرنا چاہتا ہے اور جس سے جو کچھ بھی بن پڑتا ہے اس کی تسکین کے لئے اختیار کرتا ہے۔ یہ سمجھ کر نہیں کہ یہ دردمند شخص کوئی گناہ کر رہا ہے اس کو گناہ سے روکا جائے بلکہ یہ سمجھ کر کہ اس وقت اس کی روح نہایت بے چین ہے اس کی جان گھل رہی ہے اس کا خیال اِدھر اُدھر کر کے اس کے دل کی اذیت کو کچھ کم کر دیا جائے۔ کوئی اس کو ہوا دیتا ہے' پنکھا جھلتا ہے' کوئی ٹھنڈے پانی کے گھونٹ پلاتا ہے۔

امامؑ کو معلوم تھا کہ میرے بعد میری دکھیا بہن کو تسکین دینے والا کون ہو گا' اس کا دل کون سنبھالے گا؟ نہ کوئی مونس ہو گا نہ غم خوار' تسکین تو ایک طرف گھر جلتا ہو گا' چادریں چھنتی ہوں گی' دُرّے' تازیانے اور ہر طرح کے ظلم و ستم ہوں گے' اس وقت کے تصور میں امامؑ نے اپنی محبت و غم خواری کے جذبے میں یہ الفاظ فرمائے۔ شریعت نے بھی براہِ کرم باانداز شفقت سخت حادثات کے وقت حد سے زیادہ بے قرار نہ ہونے کی سفارش کی ہے' لیکن عام حادثات کہاں اور شہادت عظمیٰ کہاں' موت اور فنا کے عام واقعات کو ذبح عظیم سے کیا نسبت؟ بہر حال جناب علیاؑ کا علمی مقام اور معرفت الٰہی کا درجہ ایک مسلم اور ناقابل انکار حقیقت ہے۔ مخدومہ جس طرح علم و فضل میں اپنے بزرگوں کی وارث تھیں۔ اسی طرح حسنِ عمل' زہد و تقویٰ' عبادت و ریاضت' یہ سب کچھ ان کو میراث میں ملا تھا۔

جناب زینبؑ کا زہد و تقویٰ :

جناب علیاؑ کی عبادت اپنے بزرگوں کی طرح عظیم الشان عبادت تھی۔ نماز

شب اور تہجد کو انتہائی پریشانی اور لاغری میں بھی نہ چھوڑتی تھیں۔ آپ کی عبادت اور اس عبادت کی عظمت اور قبولیت کی سند اس سے زیادہ اور کیا ہو گی کہ خود امام حسینؑ نے بطور وصیت اپنی بہن سے فرمایا تھا:

"یا اختاہ لا تنسینی فی نافلۃ اللّیل"

"بہن نمازِ شب میں مجھے فراموش نہ کرنا"

اللہ اللہ کس قدر بلند مقام تھا زینبؑ کا اور زینبؑ کی عبادتِ مقبولہ کا کہ امامؑ ابن امامؑ حجت خدا ابن محمد مصطفیٰؐ یہ آرزو رکھتے ہیں کہ زینبؑ نماز شب کی دعا میں مجھے یاد رکھیں اور میرے درجات کی بلندی کے لئے دست بدعا رہیں۔ امام علیہ السلام کے اس ارشاد سے چند امور پر روشنی پڑتی ہے۔ ایک تو یہ کہ زینبؑ کبریٰ نماز شب مستقل طور پر ادا کرنے والی ہیں۔ دوسرے یہ کہ زینبؑ ان مقربانِ بارگاہ خدا میں سے ہیں۔ جن کی دعائیں مستجاب ہوتی ہیں۔ تیسرے امام کے اس ارشاد سے ایک خاص چیز پیدا ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ

"امامؑ جانتے تھے کہ میری بہن اُن مصائب و آلام میں گھری ہوئی ہیں جن کا سلسلہ میرے بعد بہت وسیع ہو جائے گا۔ مصائب کے ساتھ فرائض بھی بڑھ جائیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ آنے والے مصائب اور فرائض کا ہجوم نافلہ شب کے وظیفہ کی مہلت نہ دے اور اس مستقل اور مبارک عمل سے مصیبت زدہ بہن کسی وقت مجبور ہو جائے۔ اس لئے امامؑ نے اس مبارک عمل کے جاری رہنے کی یہ بہترین تدبیر فرمائی کہ نافلہ شب میں اپنی یاد کو شامل فرما دیا تاکہ بہن اگر کسی وقت اپنے اضمحلال اور بے حال ہونے کی وجہ سے اپنے آپ میں نماز شب کی طاقت نہ بھی پائے تو میری وصیت کی یاد اور میرے لئے دعا کرنے کی آرزو خستہ تن بہن میں تاب و توانائی پیدا کر دے اور یہ بہترین عمل ہر حالت میں جاری رہے۔

زینبؑ کی حسینؑ سے محبت :

یوں تو زینبؑ کبریٰ اپنے تمام بزرگوں کی شریک کار رہیں اور آپ نے ہر ایک کا ساتھ دیا لیکن قدرت نے اس معظمہ کو خصوصیت سے رفاقت حسینؑ اور حمایت حسینیتؑ کے لئے پیدا کیا تھا۔ جناب علیاؑ کو اپنے اس بھائی حسینؑ سے جو محبت والفت تھی وہ الفاظ میں بیان نہیں ہو سکتی۔ اس سلسلہ میں مؤلفِ ام المصائب نے لکھا ہے کہ :

> ”جب آپ نماز کے لئے وضو فرماتی تھیں تو باوضو ہو کر امام حسینؑ کا نورانی چہرہ دیکھ لیا کرتیں۔ جب کم سن تھیں اُس وقت اگر ماں کی آغوش میں کسی وجہ سے بے چین ہو کر رونے لگتی تھیں اور اس حالت میں امام حسینؑ اُن کو لے لیتے تھے تو خاموش ہو جاتی تھیں اور اپنے پیارے بھائی کے منہ کو لگاتار دیکھتی رہتی تھیں۔ بھائی بہن کی اُلفت کا یہ حال فاطمہؑ زہرا نے جب سر کارِ رسالتؐ کو سنایا تو آپ آہ سرد بھر کر رونے لگے اور فرمایا کہ : میری یہ بچی ہزاروں بلاؤں میں گھر جائے گی اور اپنے بھائی حسینؑ کے ساتھ بے پناہ مصائب جھیلے گی۔

بھائی، بہن کی اسی محبت کے تذکرہ میں مؤلف ”ام المصائب“ نے لکھا ہے کہ روزِ عاشورہ جب سید الشہداءؑ شدید زخمی ہو کر گھوڑے سے زمین پر تشریف لائے اور اُس وقت جبکہ جسم اقدس خون میں تر تھا۔ آسمان کی طرف دیکھ کر استغاثہ فرمایا تو جناب زینبؑ بھائی کی درد بھری آواز سن کر بے اختیار خیمہ سے باہر آئیں اور اپنے بھائی سے لپٹ گئیں۔ بھائی بہن نے ایک دوسرے کے سر کا بوسہ لیا اور جناب زینبؑ نے رو کر فرمایا :

> ”انت الحسینؑ، انت اخی ابن امی انت نور بصری وانت مهجة قلبی وفوادی انت حمانا انت رجانا انت ابن محمد المصطفیٰ انت بن علی المرتضیٰ انت بن فاطمة الزهره“

(ترجمہ) تم حسینؑ ہو، تم میرے بھائی ہو، تم میرے ماں جائے ہو۔ تم میری آنکھوں کی روشنی ہو، تم میرے جان و دل ہو، تم ہماری طاقت ہو، تم ہماری امید ہو، تم فرزندِ محمد مصطفیٰ ہو، تم فرزند علیؑ مرتضیٰ ہو، تم فاطمہؑ زہرا کے لختِ جگر ہو۔

جناب زینبؑ کے محبت اور درد بھرے کلمات کا امامؑ اپنے ضعف و ناتوانی کی وجہ سے جواب نہ دے سکے تو معظمہؑ آہیں بھر کر رونے لگیں۔ امامؑ نے چشم مبارک کھولیں اور بہن کو حسرت سے دیکھا اور ہاتھوں سے اشارہ کیا۔ جناب زینبؑ یہ حال دیکھ کر بے ہوش ہو گئیں۔ جب ہوش آیا تو اپنے بھائی کو اپنے ناناؐ، اپنی ماںؑ اور باپؑ کا واسطہ دے کر کہا کہ بھیا! مصیبت زدہ بہن سے کچھ بات تو کیجئے، اب امامؑ نے مجبور ہو کر ضعیف آواز میں فرمایا:

یا زینب کسرت قلبی و زدرتنی کرباً علی کربی فبا للّٰہ علیك الا ماسکنت و سکتت"

(ترجمہ) بہن! تیری فریاد سے میرا دل ٹوٹتا ہے اور تیرے نالے سے میرا دل زیادہ بے قرار ہوتا ہے، تمہیں خدا کی قسم اپنے دل کو ٹھہراؤ اور کچھ نہ کہو۔

جناب زینبؑ اور واقعات کربلا:

جناب علیاؑ کی زندگی کا سب سے زیادہ عظیم الشان اور اہم دور واقعات کربلا اور واقعات کی تمہید اور مابعد سے وابستہ ہے۔ یزید کا نحس ترین نامہ ولید حاکم مدینہ کے نام پہنچا، جس کا مضمون تھا کہ حسینؑ سے میری بیعت لو، اگر وہ بیعت نہ کریں تو قتل کر دو۔ ولید شب کے وقت امامؑ کو بلاتا ہے اور امامؑ ولید کے یہاں جانے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ زینبؑ کو بھائی سے جو جوش محبت تھا، زینبؑ کی نظر میں جو عبرت ناک انقلابات تھے، عجب نہیں کہ اُس جوش محبت نے اس دُور رس نگاہ نے گوارا نہ کیا ہو، کہ بھائی اکیلے

جائیں اور اصرار کیا ہو کہ بھیا! میں آپ کو تنہا نہ جانے دوں گی۔ جانا ہے تو جوانانِ ہاشمی اور نہالانِ فاطمی کو ساتھ لے جایئے۔ امامؑ سب کو ساتھ لے کر چلے۔ مگر حکم دیا کہ تم سب ولید کے دروازے پر کھڑے رہنا۔ اگر میری آواز بلند ہو تو اندر آجانا۔ یہی ہوا کہ امامؑ کی آواز بلند ہونے پر جوانانِ ہاشمی اندر پہنچ گئے۔ ولید اور مروان پر وہ رعب چھا گیا کہ دم نہ مار سکے اور امامؑ یزید کی بیعت کے بغیر سلامتی سے سب کو ساتھ لیکر دولت سرا واپس آئے۔ امام نے طے کر لیا کہ اب مدینے میں رہنا مناسب نہیں۔ حرمِ خدا سب کے لئے مقام امن ہے وہاں چلیں اور مکہ جا کر رہیں۔ امامؑ خوب جانتے تھے کہ یہ سفر سفرِ آخرت ہے۔ اب مدینہ واپس آنا نصیب نہ ہو گا۔ رخصت آخر کے لئے ناناؐ کے روضے پر گئے۔ شمع روشن کی۔ ناناؐ کو سلام کیا اور قبر انور سے لپٹ لپٹ کر دردِ دل سنایا۔ روتے روتے آنکھ لگ گی۔ ناناؐ کو دیکھا کہ بصد رنج و ملال کھڑے ہیں اور فرما رہے ہیں۔ پیارے حسینؑ! خدا کی بارگاہ میں تمہارے لئے شہادت کا عظیم الشان درجہ ہے۔ آنکھ کھل گئی۔ روتے ہوئے ماںؑ کی قبر پر گئے اور اشکبار ہو کر کہا "**السلام علیك یا ام**" (مادرِ مہربان! میرا آپ پر سلام ہو) جواب آیا "**وعلیك السلام یا غریب الام ویا شهید الام ویا مظلوم الام**" (تجھ پر بھی سلام اے ماں کے مسافر لال۔ اے ماں کے شہید فرزند' اے ماں کے مظلوم بیٹے)۔ اس جواب کا سننا تھا کہ امامؑ پر وہ رقت طاری ہوئی کہ پھر کچھ نہ کہہ سکے اور روتے ہوئے گھر واپس آئے۔

زینبؑ کبریٰ کی مدینے سے روانگی:

مسافرانِ آخرت کا اب مدینہ سے کوچ ہے نہ حسینؑ زینبؑ کو چھوڑ کر جا سکتے تھے نہ زینبؑ حسینؑ کے بغیر رہ سکتی تھیں۔ شریک کار اور غمخوار بہن بھائی کے ساتھ ہے۔ قافلہ مکہ پہنچ گیا۔ لیکن امن وہاں بھی نظر نہ آیا۔ حجاج کے لباس میں امامؑ کے قاتل پہنچ گئے ہیں۔ اثناء طواف میں قتل امامؑ کے منصوبے ہیں۔ مجبوراً امامؑ نے مکہ سے بھی رختِ سفر باندھا اور کوفہ جانے کا ارادہ کر لیا۔ جہاں سے طلب امامؑ میں بار بار خطوط آ رہے تھے اور اُن خطوط کے مضامین کی تصدیق کے لئے امامؑ حضرت مسلم بن عقیلؑ کو اپنا

نائب قرار دے کر اس سے پیشتر بھیج چکے تھے۔ مکہ میں جب یہ خبر عام ہوئی کہ امامؑ کوفہ کی طرف جا رہے ہیں تو بعض حضرات حاضر خدمتِ امامؑ ہوتے ہیں اور اس طرف کے سفر سے اپنی تشویش اور پریشانی کا اظہار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ امامؑ ارادۂ سفر کو ترک کر دیں۔ لیکن امامؑ کی نظر ایفاء عہد اور حصول رضا الٰہی پر ہے۔ یہاں تک کہ عبداللہ بن عباس حاضر بارگاہ امامؑ ہوتے ہیں اور عرض کرتے ہیں کہ فرزند رسولؐ اگر آپ کا یہ سفر ناگزیر ہی ہے تو نبی زادیوں کو تو ہمراہ نہ لے جایئے۔ معلوم نہیں کہ انجام سفر کیا ہو؟ نبی زادیوں کے لئے یہاں سے بہتر مقام امن و حفاظت نہیں ہے۔ امامؑ نے فرمایا کہ میری بہنیں رسولؐ اللہ کی امانت ہیں اور وہ جب تک میں زندہ ہوں خود بھی میری مفارقت ہرگز گوارا نہیں کر سکتیں۔

جنابِ زینبؑ کی مکے سے عراق کی جانب روانگی:

یہ گفتگو پسِ پردہ جناب علیاؑ حضرت زینبؑ نے سُن لی اور پکار کر کہا۔ ابن عباس! کیا اچھا مشورہ دیا تم نے ہمارے بھائی کو' کیا تم نہیں جانتے کہ اس دم کے سوا ہمارا کوئی والی و وارث نہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہمارا بھائی چلا جائے اور ہم اس سے جدا ہو کر رہ جائیں۔ ابن عباس رونے لگے اور یہ قافلہ مکہ سے روانہ ہو گیا۔ جناب عبداللہ بن جعفرؑ یعنی جناب علیاؑ کے شوہر نامدار اپنے ضعفِ بصارت اور علالت کے سبب سے عازم سفر نہ ہو سکے۔ لیکن اپنے دونوں فرزندوں عونؑ و محمدؑ کو امامؑ کی بارگاہ میں پیش کیا اور اپنے بچوں کو ہدایت کی کہ اپنے ماموں کا ساتھ کبھی نہ چھوڑنا اور اُن پر کوئی وقت پڑے تو اپنی جانوں کو قربان کر دینا۔ اس سلسلہ میں ایک واقعہ اور ملتا ہے جو لائق ذکر ہے وہ یہ کہ جب سانحہ کربلا کی خبر مدینہ پہنچی عبداللہ بن جعفرؑ اپنے گھر بیٹھے تھے اور لوگ تعزیت کے لئے ان کے پاس آ رہے تھے اور خصوصیت سے عونؑ و محمدؑ ان کے فرزندوں کا پرسہ دے رہے تھے' اس وقت جناب عبداللہؑ کے غلام نے اپنی حماقت سے یہ کہا کہ عونؑ و محمدؑ کے قتل ہو جانے کی مصیبت ہم پر حسینؑ کی وجہ سے پڑی ہے۔

حضرت عبداللہ بن جعفر نے غلام کا یہ احمقانہ کلام سنا تو ان کو سخت غصہ آیا اور انہوں نے جوتا کھینچ کر غلام کو مارا اور فرمایا کہ بد سرشت تو یہ کیا کہہ رہا ہے خدا کی قسم اگر میں حسینؑ کے ساتھ ہوتا تو میں بھی اپنی جان ان پر قربان کر دیتا۔ پھر لوگوں سے فرمایا! کہ خدا کا شکر ہے کہ میں اپنے فرزندوں کی قربانی سے سرخرو ہوا اگر میں خود امامؑ پر فدا نہ ہو سکا تو میرے بچوں نے فدا ہو کر اس فرض کو ادا کر دیا۔ اس سے ظاہر ہے کہ جناب عبداللہؓ کو بھی امامؑ سے وہی حسن عقیدت اور جوشِ محبت تھا جو امامؑ کے تمام اقرباء کو تھا۔ غرضیکہ یہ قافلہ منزلیں طے کرتا ہوا جب منزل ثعلبیہ پر پہنچا تو امامؑ کو ایک شتر سوار سے معلوم ہوا کہ کوفہ میں مسلم بن عقیل اور ہانی بن عروہ بیدردی سے قتل کر دیئے گئے۔ امامؑ نے سن کر اناللہ کہا اور یہ آیت پڑھی "منهم من قضىٰ نحبه و منهم من ينتظر" کچھ اپنے عہد کو پورا کر گئے اور کچھ ایفاءِ عہد کے منتظر ہیں۔ اس خبر نے سب کے دلوں پر رنج و غم کے بادل چھا دیئے۔ زنانِ اہلبیتؑ میں شورِ گریہ و بکا بلند ہوا۔ جب رونے کی آوازیں کچھ کم ہوئیں تو امامؑ نے سب کو جمع کیا اور فرمایا۔ اہلِ کوفہ نے بد عہدی کی اور ابن زیاد نے ظلم و ستم سے مسلم بن عقیل اور ہانی بن عروہ کو قتل کر دیا۔ میرے سامنے بھی یہی راستہ ہے جس کا دل چاہے چلا جائے۔ میری طرف سے تم پر کوئی پابندی نہیں۔ لوگ دائیں بائیں سے جانے شروع ہو گئے۔ اور صرف اقربا اور وہ اصحاب باقی رہ گئے جن کو رکابِ سعادت میں جان دینا منظور تھا۔ امامؑ نے اپنے اقرباء اور اصحاب کو حکم دیا کہ پانی کا کافی انتظام کر کے ساتھ لیکر آگے بڑھیں۔ قافلہ آگے بڑھا۔ یہاں تک کہ کسی نے کہا کہ ہمارے سامنے خرموں کے درخت سربلند نظر آتے ہیں۔ بعض نے کہا کہ اس مقام پر نخلستان اور خرموں کے درخت کبھی نہیں دیکھے گئے۔

رسالہِ حُرّ کا قافلہ اہلبیتؑ سے ملنا:

کچھ دیر کے بعد معلوم ہوا کہ سامنے لشکر ہے اور خرموں کے درختوں کا جس چیز پر دھوکہ ہوا تھا وہ اہلِ لشکر کے سربلند نیزے ہیں۔ یہ حُر کا رسالہ تھا، جو ایک ہزار

افراد تھے۔ اور سب پیاسے تھے۔ ساقیِ کوثر کے فرزند نے باوجودیکہ یہ ابن زیاد کا لشکر تھا اور امامؑ کا راستہ روکنے آیا تھا ان کو سیراب کرنے کا حکم دیا۔ لشکر کو پانی پلایا گیا۔ یہاں تک کہ اس رسالہ کے ایک پیاسے شخص کو جو بعد میں اور دیر سے آیا تھا اور پیاس سے بدحواس تھا اس کو امامؑ نے خود اُٹھ کر مشکیزہ آب اپنے ہاتھ میں لے کر سیراب کیا۔ حُر نے عرض کیا کہ میں ابن زیاد کا فرستادہ ہوں کہ جہاں آپ کو پاؤں وہیں روک دوں اور ابن زیاد کو اطلاع دوں۔ امامؑ آگے بڑھنا چاہتے تھے اور حُر روکنا چاہتا تھا۔ آخر حُر نے امامؑ کے گھوڑے کی باگ پر ہاتھ رکھ کر کہا میں آپ کو آگے نہ بڑھنے دوں گا۔ امامؑ کو غیظ آگیا اور تمام اقرباء اور اصحابِ امام غیظ و غضب سے سرخ ہوگئے۔ امامؑ نے فرمایا: حُر تیری ماں تیرے غم میں روئے تو یہ کیا کر رہا ہے۔ حُر نے کہا اگر آپ کے سوا مجھے اور کوئی اس طرح کہتا تو اسی طرح جواب دیتا۔ لیکن آپ کی والدہ ماجدہ کا ذکر میں سوائے درود و سلام کے اور کسی طرح نہیں کر سکتا۔ امامؑ نے اپنے تمام ساتھیوں کو سمجھایا اور اُن کے غیظ و غضب کو روکا اور فرمایا کہ میں جنگ میں پہل نہیں کرنا چاہتا۔ جناب سکینہؑ نے یہ سب حال رو رو کر اپنی پھوپھی کو جا کر سنایا۔ جناب زینبؑ نے ان الفاظ میں فریاد کی:

"واجدّاہ واعلیّا واحسناہ واحسیناہ واقلۃ ناصراہ لاادری کیف المخلص من ایدی الاعادی لیت الاعادی یرضون ان یقتلونی بدلاعن اخی الحسین"

(ترجمہ) آہ! اے جدِّ امجد اے پدرِ بزرگوار علیؑ مرتضٰی اور بھائی حسنؑ اور حسینؑ۔ ہائے کیسی کمی ہے۔ مددگاروں کی۔ ان دشمنوں کے ہاتھ سے کیسے چھٹکارا ہو۔ کاش یہ دشمن میرے بھائی حسینؑ کے بدلے مجھے قتل کرنے پر راضی ہو جائیں اور میرے بھائی کے درپے نہ ہوں۔

آخر یہ فیصلہ ہوا کہ امامؑ راہ کوفہ چھوڑ کر دوسرے راستہ سے آگے بڑھیں۔ قافلہ آگے بڑھا۔ حُر کا رسالہ ساتھ تھا۔

قافلہ آلِ محمدؐ کا وارد کربلا ہونا:

اس راستہ سے یہ قافلہ اپنی منزل آخر پر پہنچ گیا جس کا نام ہے کربلا۔ وہ کربلا جس کا نام اور اس جگہ شہادتِ حسینؑ کی خبر پیغمبرؐ اسلام دے چکے تھے۔ اور وہاں کی خاک جبریلؑ امین سے رسولؐ خدا نے پا کر اُم سلمہ کے سپرد کی تھی اور فرمایا تھا کہ اُم سلمہ اس خاک کو حفاظت سے رکھنا۔ جب یہ خاک خون تازہ بن کر جوش میں آجائے تو سمجھ لینا کہ میرا فرزند حسینؑ قتل ہو گیا۔ وہ ارض کربلا جس کی طرف سے امیر المومنینؑ راہ صفین میں گزرے تھے اور وہاں کی خاک سونگھ کر ریش مبارک کو آنسوؤں سے تر کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ آلِ محمدؐ کا خون اس سرزمین پر بہے گا۔ اس جگہ اُن کے خیمے ہوں گے۔ یہاں اُن کی سواری کے اونٹ بندھے ہوں گے۔ دریائے فرات کا قرب تھا۔ لیکن ابن زیاد کا حُر کے نام تازہ پیغام پہنچ گیا تھا کہ حسینؑ پر سختی شروع کر دو۔ اور ان کو ایسی جگہ اتارو جو سایہ اور پانی سے خالی ہو' اس لئے کاروانِ اہلبیتؑ کو ترائی سے دور ٹھہرایا گیا۔

اس کے بعد ابن زیاد نے عمر بن سعد کو سردار لشکر مقرر کر کے کئی ہزار کا لشکر دے کر کربلا بھیج دیا اور محرم کی ساتویں کو شمر ملعون ابن زیاد کا تہدید آمیز اور شدید حکم عمر بن سعد کے نام لے کر پہنچا کہ حسینؑ اور آبِ فرات کے درمیان اس طرح حائل ہو جاؤ کہ پانی کا ایک قطرہ اُن تک نہ پہنچے۔ حسینؑ اور ان کے ساتھیوں کو قتل کر دو اور ان کی لاشوں کو پامال کر دو۔

اب پانی امامؑ اور امامؑ کے قافلہ پر بالکل بند ہو گیا۔ خیام معلیٰ میں فریاد العطش بلند ہونے لگی۔ لشکر یزید جنگ کی تیاری میں مشغول ہو گیا۔ نویں محرم کی شام کو عمر بن سعد نے اپنے لشکر کو حملہ کرنے کا حکم دے دیا۔ اس کی فوجیں آگے بڑھنے لگیں۔ امامؑ اس وقت در خیمہ پر اپنی تلوار کے سہارے سے بیٹھے تھے اور کچھ غنودگی سی طاری تھی۔ بہن اپنے بھائی کی حفاظت کے خیال سے قریب تھیں۔ جناب علیاؑ نے آتی ہوئی فوج کا شور اور غل سنا۔ بھائی سے عرض کیا کہ فوج قریب آگئی ہے' امامؑ نے آنکھ کھولی اور بہن

سے فرمایا کہ میں نے نانا رسولؐ اللہ کو دیکھا۔ وہ مجھ سے فرماتے ہیں کہ حسینؑ "تم ہمارے پاس آرہے ہو" یہ سن کر زینبؑ نے اپنے منہ پر طمانچہ مارا اور فریاد بلند کی۔

امامؑ نے فرمایا "بہن صبر کرو، خدا تم پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے"۔

یہ کہہ کر اپنے بھائی عباسؑ سے فرمایا "ان لوگوں سے دریافت کرو کہ کیا ارادہ رکھتے ہیں؟"

جناب عباسؑ نے واپس آکر عرض کیا کہ "یہ لوگ حملہ کرنے آئے ہیں"۔

امامؑ نے دوبارہ جناب عباسؑ کو بھیجا کہ ان سے ایک رات کی مہلت طلب کریں تاکہ یہ رات عبادتِ خدا میں بسر کی جائے۔ عمر بن سعد نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا۔ بعض نے اپنے سردار سے کہا کہ سبحان اللہ قسم خدا اگر ترک و دیلم کے کافر بھی مہلت طلب کرتے تو مہلت کا دینا لازم تھا۔ غرضیکہ ایک رات کی مہلت دے دی گئی۔

شبِ عاشور :

امامؑ اور اصحاب امامؑ نے یہ رات تسبیح و تہلیل، رکوع و سجود و قیام و قعود میں گزاری۔ فضائے کربلا آواز تسبیح و تہلیل سے شہد کی مکھیوں کی طرح گونج رہی تھی۔ اسی شب میں امامؑ نے پھر ایک مرتبہ اپنے اصحاب و اقرباء کو جمع کیا۔ حمد و ثنائے الٰہی کے بعد فرمایا کہ کل جنگ ہو گی اور ہم میں سے کوئی جیتا نہ بچے گا۔ یہاں تک کہ میرا فرزند شیر خوار بھی شہید ہو جائے گا۔ یہ لوگ مجھے قتل کرنا چاہتے ہیں۔ میں تم سب کو اجازت دیتا ہوں جس طرف چاہو چلے جاؤ بلکہ ہر ایک میرے اقربا میں سے ایک ایک کا ہاتھ پکڑ کر نکل جائے۔ یہ سننا تھا کہ امامؑ کے اصحاب اور اقرباء بے چینی سے تڑپنے لگے اور ہر شخص اپنی زبان سے اپنے جذباتِ نصرت کی ترجمانی کرنے لگا اور کہنے لگا کہ فرزند رسولؐ یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ امامؑ اور حاضرین سب رونے لگے۔ جناب زینبؑ اور اُن کے ساتھ تمام اہل حرم امامؑ کے حسرت ناک کلمات کو سن کر رونے پیٹنے لگیں۔ امام زین العابدینؑ فرماتے ہیں کہ :

"شب عاشورا میری پھوپھی میری تیمارداری میں مصروف تھیں۔ جب میرے پدر بزرگوار اپنے اصحاب سے گفتگو فرما کر اپنے خیمے میں تشریف لے آئے اس وقت جون نامی غلام پدر بزرگوار کی تلوار صاف کر رہا تھا۔ حضرتؑ نے چند اشعار پڑھے جن سے مایوسی ٹپک رہی تھی۔ جن میں دنیا کی بے ثباتی اور بے وفائی کا شکوہ تھا۔ ان اشعار کو سن کر میں رونے لگا۔ میری پھوپھی زینبؑ اُن اشعار کو سن کر بیتاب ہو گئیں اور اپنی چادر گھسیٹتی ہوئی اپنے بھائی کے پاس پہنچیں اور وامصیتاہ کہہ کر رونے لگیں اور کہنے لگیں کہ بھیا کاش آج مجھے موت آجاتی۔ امامؑ نے فرمایا بہن! اپنے دل کو سنبھالو' صبر کرو' بہن نے کہا' یا ابا عبداللہ میں اور میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں۔ امامؑ پر بھی رقت طاری ہو گئی' آواز بھرّا گئی۔ زینبؑ نے واویلا کیا' اپنے منہ پر طمانچے مارے اور گریبان چاک کر ڈالا اور بے ہوش ہو گئیں۔ امامؑ ہوش میں لائے اور فرمایا۔ بہن! خدا کے سوا ہر ایک کو فنا ہونا ہے۔ اہل زمین ہوں یا اہل آسمان' موت اور فنا سب کے لئے ہے۔ میرے جد امجد' ماںؑ باپؑ اور بھائی مجھ سے بہتر تھے۔ آخر وہ سب اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ بہن صبر کرو' یہ فرماتے ہوئے پدر بزرگوار نے ان کو پھر میرے پاس پہنچادیا"۔

زینبؑ نے اس رات میں ایک ایک نونہال کو حسرت سے دیکھا اپنے بچوں کو سامنے بٹھایا اور آنے والے دن کے لئے ان کے فرائض کو یاد دلایا۔ بچوں نے ماں کو اطمینان دلایا اور جو وعدہ کیا تھا وقت آنے پر اُسے پورا کر دکھایا۔

روزِ عاشورہ :

صبح ہوئی۔ عمر بن سعد کا لشکر صف آراء ہو گیا۔ حسینیؑ لشکر پر ہزاروں تیروں کا مینہ برس گیا۔ امامؑ نے اپنی سواری کا ناقہ منگایا۔ سوار ہو کر آگے بڑھے اور بلند آواز سے

فرمایا:

"اے لوگو! جلدی نہ کرو، میری بات سنو، پھر جو تمہارے دل میں آئے کرنا"۔

ان ولییّ اللہ الذی نزّل الکتاب وھویتولی الصالحین"۔

(میرا سرپرست اور مددگار وہ خدا ہے جس نے کتاب نازل کی اور وہی صالحین کی سرپرستی کرنے والا ہے)۔

اہل حرم نے جب امامؑ کی آواز کو سنا تو شورِ گریہ و بکا بلند کیا۔ حضرتؑ نے اپنے بھائی عباسؑ اور فرزند علی اکبرؑ کو دولت سرا میں بھیجا اور کہلایا کہ اس وقت خاموش ہو جاؤ۔ ابھی تم کو بہت رونا ہے۔ جب اہل حرم کے رونے کی آواز موقوف ہوئی تو امامؑ لشکرِ یزید کی طرف متوجہ ہوئے اور حمد و ثناء کے بعد ارشاد فرمایا سوچو! کہ میں کون ہوں، کس کا فرزند اور کس کا نواسہ ہوں۔ کیا میرا خون بہانا اور ذریت رسولؐ کی بے حرمتی کرنا تمہارے لئے جائز ہے۔ کیا میں تمہاے نبیؐ کی دختر کا فرزند نہیں ہوں۔ کیا میں سابق الایمان امیر المومنینؑ وصی رسولؐ کا فرزند نہیں ہوں۔ کیا سید الشہداء حضرت حمزہؓ میرے باپؑ کے اور جعفرؓ طیار میرے عمِ نامدار نہیں ہیں کیا میں اور میرے بھائی حسنؑ بہ ارشادِ نبیؐ جوانانِ جنت کے سردار نہیں۔ کیا میں نے کسی کو قتل کیا ہے، جس کا بدلہ مجھ سے لے رہے ہو۔ کیا میں نے سنت نبویؐ کو بدلا ہے۔ یا کسی بدعت کو جاری کیا ہے۔ آخر تم نے کس بناء پر میرے خون کو حلال سمجھ لیا ہے۔ لشکر یزید سے کوئی جواب نہ دے سکا۔ امامؑ نے فرمایا! خدا کی قسم مشرق و مغرب میں میرے سوا کوئی دخترِ پیغمبرؐ کا فرزند نہیں۔ افسوس! کہ امامؑ کی اس حقانی تقریر کا اثر کسی پر نہ ہوا۔

حضرتِ حُر کی بارگاہِ امامؑ میں حاضری:

لشکر یزید کے ہزاروں افراد میں سے حضرت حُر کی قسمت کا ستارہ چمکا۔ اپنے فرزند برادر اور غلام کو ساتھ لئے ہوئے بارگاہِ امامؑ کی طرف روانہ ہوئے اور اپنے جرم و خطا پر ندامت و شرمندگی کو ساتھ لئے باریاب ہو کر عرض کرنے لگے۔ یا ابن رسولؐ اللہ! کسی

طرح میرے گناہ کی توبہ بھی ہو سکتی ہے۔ امامؑ نے نہایت مہربانی سے فرمایا۔ اے حُر! جس طرح تو اس دنیا میں حُر کہلاتا ہے اسی طرح تو آخرت میں بھی حُر ہے۔ اور آخرت کے عذاب سے آزاد ہے۔

انصار امامؑ کی جاں نثاری :

قتل کا بازار گرم ہو گیا۔ پیاسے انصار باری باری جام شہادت بڑھ بڑھ کر نوش کرنے لگے۔ ایک دوسرے سے آگے بڑھنا چاہتا ہے اور ہر ایک سبقت لے جانا چاہتا ہے۔ امامؑ لاشیں اٹھا رہے ہیں اور ایک جگہ جمع کر کے گنج شہیداں بنا رہے ہیں۔

شہادت اقرباء اور جناب زینبؑ کا بارگاہِ امامؑ میں نذرانہ :

اب امامؑ کے اقرباء بھی امامؑ پر اپنی جانیں نثار کرنے لگے۔ زینبؑ نے اپنے اور اپنے شوہر نامدار کی طرف سے اپنے دونوں فرزند عونؑ و محمدؑ کا نذرانہ بھائی کی بارگاہ میں پیش کر دیا۔ جعفر طیارؑ کے پوتے، علی مرتضٰی کے نواسے میدانِ دغا میں آگئے اور اپنی خاندانی شجاعت کے جوہر دکھا کر شہید راہِ خدا ہو گئے۔ لاشیں میدان سے آئیں۔ زینبؑ نے لاشوں کو گلے سے لگایا۔ بھائی اور بہن مل کر روئے۔ قاسمؑ و عباسؑ و اکبرؑ لی شمع امامتؑ پر پروانہ وار نثار ہو گئے۔ امامؑ نے اس عالم تنہائی میں آواز استغاثہ بلند کی جس پر گلستانِ رسالتؐ کا وہ غنچہ ناشگفتہ بھی جو سب کے ساتھ پیاسا تھا۔ شوق شہادت میں تڑپنے لگا۔ اپنے پیروں نہیں بلکہ باپ کے ہاتھوں میدان میں پہنچا۔ امامؑ نے پانی کا سوال کیا۔ بے شیر نے ہونٹوں پر پھرا کر زبانِ خشک دکھائی۔ حرملہ کا تیر ظلم چلا اور چھ مہینہ کی داستانِ زندگی ختم ہو گئی۔

اشقیاء کی کوشش کہ حسینؑ کے سامنے اہلِ حرم کو لوٹ لیں :

پسر زیاد کے سپاہیوں نے چاہا کہ بھائی کی زندگی میں ہی بہنوں کو لوٹ لیں۔ لشکر کے سپاہی خیام معلّٰی کی طرف بڑھنے لگے۔ امامؑ نے للکار کر فرمایا کہ لوگو! اگر تمہارا کوئی دین و مذہب نہیں تو آزاد لوگوں کی طرح تو برتاؤ کرو۔ میں تم سے لڑتا ہوں۔ تم مجھ پر حملے کرو۔ ان عورتوں اور بچوں نے کیا خطا کی ہے۔ ان کو کیوں لوٹتے اور ستاتے ہو۔ یہ فرما کر حفاظت

کے لئے خیموں کی طرف تشریف لائے۔ فوجیں رک گئیں اور نبیؐ زادیاں اس وقت لٹنے سے بچ گئیں۔

امامؑ کا رخصت آخر کیلئے درِ خیمہ پر آنا:

امامؑ رخصت آخر کے لئے درِ خیمہ پر آئے۔ وداعی سلام کیا۔ نام بنام بیبیوں کو پکارا۔ سب سے پہلے زینبؑ کا نام لیا۔ زینبؑ روتی پیٹتی آگے آگے اور سارا کنبہ پیچھے بھائی کے پاس پہنچیں۔ فریاد کرنے لگیں۔ کاش! مجھے موت آجاتی۔ اے یادگارِ اسلاف اب آپ کے سوا ہمارا کون ہے۔ آپ نے ہمیں کس کو سونپا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج میرے ناناؐ کی وفات ہوئی۔ آج میری ماں کا انتقال ہوا۔ آج پدر بزرگوارؑ شہید ہوئے۔ آج حسنؑ کا جگر ٹکڑے ٹکڑے ہوا۔ آج ہم پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ آج ہمارے تمام زخم ہرے ہو گئے۔ امامؑ نے ایک ایک کے منہ کو حسرت سے دیکھا۔ بیقرار ہو کر رو دئے اور فرمایا کہ میں تم کو سپردِ خدا کرتا ہوں۔ بہن کو ساتھ لیا۔ بیمار سے رخصت ہونے آئے۔ پھوپھی نے بھتیجے کا شانہ ہلایا۔ پدر اور فرزند میں گفتگو شروع ہوئی۔ امامؑ نے صبح سے اب تک کی داستان سنائی۔ سجادؑ نے پھوپھی سے کہا میرا عصا اور تلوار لا دیجئے۔ باپ نے پوچھا عصا اور تلوار کیوں منگاتے ہو۔ کہا میں بھی میدان میں جاکر آپ کے دشمنوں سے قتال کر کے شہید ہو جاؤں۔ امامؑ نے فرمایا بیٹا! پھر نبی زادیوں کو نبیؐ کے روضہ پر کون لے کر جائے گا۔ بیٹا! صبر کرو۔ تم کو اسیر ظلم ہونا ہے۔ تم میرے بعد حجت خدا اور امام زمانہ ہو بیٹا! قید ظلم سے چھوٹ کر مدینہ جاؤ تو میرے شیعوں کو میرا اسلام کہہ دینا اور کہنا کہ تمہارا امام دشت کربلا میں پیاسا ذبح ہو گیا جب آب خوشگوار پینا اپنے پیاسے امامؑ کو یاد کر لینا۔

امامؑ کی میدانِ قتال میں آمد:

امامؑ روتے پیٹتے کنبہ کو چھوڑ کر لاش ہائے شہداء کے پاس آئے۔ ہر ایک کو پکار کر فرمایا۔ میرے شیر دل بہادرو اٹھو ایسا نہ ہو کہ تم سوتے رہو اور نبی زادیاں لٹ جائیں۔ میں میدان میں جاتا ہوں تم جاکر نبی زادیوں کی حفاظت کرو۔ یہ فرما کر روتے ہوئے میدان میں

آئے اور دنیا کو دکھادیا کہ تین دن کی پیاس میں مصائب و آلام کے ہجوم میں اولاد و اقرباء اور انصار کے داغ اٹھانے کے بعد رسولؐ کے فرزند علیؑ و فاطمہؑ کے لخت جگر' صدق و صفا کے پیکر یوں لڑا کرتے ہیں۔ دشمن چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں۔ تلوار' تیر' تبر' نیزہ اور جس کے پاس کچھ نہیں وہ پتھروں سے تن تنہا پر حملہ کر رہا ہے آخر وقت آگیا کہ امامؑ صدہا زخم کھا کے گھوڑے سے گرے۔

امامؑ کی شہادت اور زینبؑ کی فریاد:

زینبؑ خیمہ سے نکلیں اور فریاد کرنے لگیں۔ لوگو! کیا تم میں کوئی مسلمان نہیں؟ اسی اثناء میں شاہزادی نے عمر بن سعد کو دیکھا تو حسرت سے پکارا۔ اے عمر بن سعد! فرزند رسولؐ قتل ہو رہا ہے اور تو دیکھ رہا ہے۔ ملعون رونے لگا اور منہ پھیر کر چلا گیا۔ بہن فریاد کرتی رہ گئی اور امامؑ کا سر نیزہ پر بلند ہو گیا۔ زینبؑ کی نظر بھائی کے سر پر پڑی تو سر و سینہ پیٹ کر کہا۔ میرے ماں باپ فدا ہو جائیں اس ریش انور پر جس سے خون ٹپک رہا ہے۔

پامالی لاش ہائے شہداء اور تاراجی خیام:

اب وہ وقت ہے کہ اُدھر لاشہائے شہداء پامال ہو رہی ہیں ادھر نبی زادیاں لٹ رہی ہیں۔ خیام میں آگ لگی ہوئی ہے۔ زینبؑ بے بھائی کے ہوتے ہی بے چادر ہو رہی ہیں۔ ڈر سے سہمے بچے ادھر ادھر منتشر ہو رہے ہیں اور فریاد کر رہے ہیں۔ بیبیوں میں شور محشر بلند ہے۔ بیمار امامؑ بستر علالت پر پڑا ہوا ہے مگر کیا کہنا اے ثانیِ زہراؑ تیرے حوصلے کا' تیرے قلب و جگر کا' وہ ہنگامہ حشر اور تیرا ہر فرض کو ادا کرنا' بچوں کی دیکھ بھال' ان کی جانوں کا تحفظ' ان کی تسکین' بیمار بھتیجے کی خبر گیری اور حفاظت۔ پھر امامؑ سے استفتاء کہ اب کیا حکم شریعت ہے ہمارے لئے۔ خیموں میں جل جائیں یا بے ردا باہر نکلیں۔ یہ تو ممکن نہیں کہ زینبؑ خود حکم شریعت سے ناواقف ہوں لیکن تمام مخدرات پر اور بالآخر تمام عالم پر عملاً یہ ظاہر کرنا کہ اب امام زمان اور حاکم شرع سید سجادؑ ہیں اور میں بزرگ ہوتے ہوئے بھی تابع فرمان ہوں۔ اب بے ردا زینبؑ فریاد کناں خیمہ سے باہر نکل رہی ہیں۔ اہل حرم پیچھے پیچھے ہیں۔ شام کی تاریکی چھانے لگی۔

شام غریباں :

رات آگئی یہ بہن کی پہلی رات ہے جو بھائی کے بغیر آئی ہے۔ یہ زینبؑ کی پہلی رات ہے جو عونؑ و محمدؑ، قاسمؑ عباسؑ و اکبرؑ کے بغیر آئی ہے کس طرح گزری یہ رات اور کیا گزری اس رات میں۔ لاوارثوں پر، نہ زبان میں کہنے کی طاقت نہ قلم میں لکھنے کی۔ زینبؑ نے سمجھ لیا کہ اب حسینؑ ہیں سجادؑ اور میں ہوں عباسؑ۔ کل عباسؑ نے خیام کی حفاظت کی تھی آج یہ فریضہ میرا ہے۔ عباسؑ کے ہاتھ میں تلوار تھی زینبؑ کے ہاتھ میں چوب خیمہ ہے۔

کربلا سے اہل حرم کی روانگی :

وحشت ناک رات گزری۔ صبح ہوئی۔ کشتگان فوج یزید دفن ہو رہے ہیں۔ نبیؐ کے جگر کے ٹکڑے خاک پر پڑے ہیں۔ عمر بن سعد کو فراغت ہوئی۔ اہلِ حرم کو اسیر کر کے لے چلے۔ مقتل شہداء سے گزر ہوا۔ زینبؑ کس حال میں ہیں بچوں اور بیبیوں پر کیا گزری ہے۔ زینبؑ نے روتے روتے جگر خراش نالہ و فریاد کرتے کرتے ایک دم دیکھا کہ سجادؑ کی نظر لاشوں پر ہے۔ چہرہ پر مردنی چھائی ہوئی ہے۔ نزع کا عالم طاری ہے۔ گھبرا کر بھتیجے کے پاس آئیں اور کہا یابنتی مالي اراك ان تجود بنفسك۔ اے پیارے فرزند مجھے کیا ہو گیا کہ میں تمہیں دیکھ رہی ہوں کہ تم بھی اپنی جان دیئے دیتے ہو۔ عرض کیا پھوپھی اماں! کیوں نہ یہ حال ہو میرا، آپ دیکھتی ہیں یہ نورانی لاشیں کس طرح خاک و خون میں بھری ہوئی پڑی ہیں کوئی ان کا پوچھنے والا نہیں۔ کوئی ان کا دفن کرنے والا نہیں۔ ہم ہیں کہ یونہی ان لاشوں کو چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ پھوپھی نے فرمایا۔ بیٹا! اپنے دل کو ٹھہراؤ یہ وہ عہد تھا جو میرے بھائی نے خدا اور رسولؐ سے کیا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ میرے بھائی نے اپنے عہد کو پورا کر دیا۔ پھر دونوں ہاتھ اٹھا کر کہا۔ خداوندا! آل محمدؐ کی اس قربانی کو قبول فرما۔ یہ وہ کلمات تھے جنہوں نے سید سجادؑ کے زخموں پر مرہم رکھا اور ڈوبتی ہوئی نبضوں میں حرکت پیدا کی۔

اہل حرم کا کوفے میں داخلہ :

لٹا ہوا قافلہ بارہ محرم کو کوفہ پہنچا۔ تماشائیوں کا ہجوم ہو گیا۔ شہیدوں کے سر

قافلہ کے ساتھ رکھے گئے۔ قافلہ کا دردناک منظر دیکھ کر کچھ لوگ روتے تھے۔ عورتیں بھی شہر کی رو رہی تھیں۔ زینبؑ جو کوفہ کی شہزادی تھیں۔ کل یہاں انتہائی عزت و احترام سے رہتی تھیں۔ آج یہاں اس حال تباہ سے آئی ہیں۔ کوفہ کے بازار میں جو یہ مجمع نظر آیا تو جناب علیاؑ خاموش نہ رہ سکیں۔ اگرچہ ہر طرف سے شور و غل کا یہ عالم تھا کہ کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی تھی۔ طبل اور باجوں کا شور الگ تھا۔ معظمہؑ نے اپنی روحانیت کو صرف کرتے ہوئے جانب آسمان دیکھا۔

کوفہ میں خطبہ جناب زینبؑ :

اور یہ کلمہ زبان پر جاری کیا "اياك نعبد و اياك نستعين" یہ کہہ کر عوام سے فرمایا کہ لوگو! خاموش ہو جاؤ۔ آپ کے یہ فرماتے ہی مجمع پر سکوت طاری ہو گیا۔ معظمہؑ نے فرمایا:

> "تمام حمد ہے اللہ کے لئے اور درود لامحدود ہے میرے جد بزرگوار محمدؐ مصطفیٰ پر اور ان کی پاکیزہ اور بہترین ذریت پر۔ امابعد اے چالاکی اور بے وفائی کے مجسمو! اے رسوائی اور فریب کے پتلو! تم روتے ہو۔ خدا تمہیں (آخرت میں بھی) رونا نصیب کرے اور تمہارے دل غم آخرت سے جلتے رہیں۔ تمہاری مثال اس عورت کی ہے جس نے بڑی محنت سے رسی کو بٹا۔ پھر اُس کا تار تار الگ کر دیا اور اپنی محنت کو برباد کر دیا۔ تمہاری جھوٹی قسموں میں کوئی صداقت نہیں۔ تم کو معلوم ہو کہ تم سوائے لغو گوئی کے اور بیکار سی باتوں کے اور فسق و فجور اور بغض و عداوت کے اور کچھ نہیں رکھتے۔ تمہاری حالت اُن کنیزوں اور لونڈیوں کی سی ہے جو نہایت ذلیل ہوں' تمہارے دل بغض و عداوت سے بھرے ہوئے ہیں۔ تمہاری مثال اس سبزی کی ہے جو نہایت بدبودار اور گندہ زمین سے اُگی ہو۔ تمہاری کیفیت اُن آراستہ قبروں کی سی ہے جن کے اندر

تعفن اور بدبو بھری ہو۔ تم نے بڑے سخت عظیم گناہ کا ارتکاب کیا ہے۔ سفر آخرت کیلئے تم نے بدترین توشہ مہیا کیا جس کے سبب سے اللہ تم سے ناراض ہو کر تم کو دائمی عذاب میں مبتلا کریگا۔ اب تم میرے بھائی کے لئے روتے اور فریاد کرتے ہو۔ بیشک تم اسی کے لائق ہو کہ زیادہ روؤ اور کم ہنسو۔ تم نے بدترین ننگ اختیار کیا' تم نے اپنے دامن پر قتل امامؑ کا وہ دھبہ لگالیا جو کبھی نہیں چھوٹ سکتا۔ تم نے قتل کیا۔ خاتم النبوۃؐ کی جان کو معدنِ رسالتؐ کے موتی کو' جوانانِ جنت کے سردار کو اپنے گروہ کی پناہ کو' اپنی سلامتی دین کے مرکز کو' اپنے دینی کلمہ کی بنیاد کو' اپنی مصیبتوں کی پناہ گاہ کو' اپنی حجت کے مینار کو' نبویؐ سنت کے نقطہ کو اور اپنے اقوال کی جائے بازگشت کو' تم نے بارگاہِ خدا میں بدترین عمل کر کے بھیجا ہے' تم نے بدترین عمل اپنے مابعد کے لئے کیا ہے' تم ہمیشہ رحمتِ خدا سے دور رہو' برباد اور تباہ رہو۔ تمہارے لئے تمہاری کوششیں ناکام ہو گئیں۔ تم برباد ہو گئے۔ تمہاری عملی تجارت نے تم کو نقصان پہنچایا۔ تم غضب خدا' ذلت اور حقارت کے مستوجب ہوئے۔ اے اہلِ کوفہ تم کو خبر بھی ہے۔ تم نے محمدؐ مصطفیٰ کے کس جگر کو پارہ پارہ کر دیا۔ تم نے کس عہد کو توڑ دیا اور کس جڑ کو کاٹا۔ اور کون سا خون تھا جسے بہایا۔ اور وہ کس کی حرمت تھی جس کو تم نے ضائع کیا۔ تم نے وہ امر عظیم کیا ہے کہ آسمان قریب ہے کہ پھٹ پڑے اور زمین شق ہو جائے۔ اور پہاڑ گر کر ریزہ ریزہ ہو جائیں۔ جان لو کہ تم نے وہ سنگین گناہ کیا ہے جس کا بوجھ زمین و آسمان نہیں اُٹھا سکتے۔ تعجب نہیں کہ آسمان سے خون برسے اور آخرت کا عذاب تو نہایت ہی رسوا اور ذلیل کرنے والا ہے۔ وہاں کوئی تمہارا مددگار نہ ہو گا۔ اس وقت یہ تھوڑی مہلت جو خدا نے تم کو دی ہے اس کی وجہ سے اپنے اوپر ہونے والے عذاب کو کم نہ سمجھنا۔ مہلت دے

دینے کی وجہ سے خدا اپنا عذاب نازل کرنے سے عاجز نہیں ہو سکتا۔ خدا کو انتقام کا موقع ہاتھ سے نکل جانے کا ڈر نہیں ہوتا۔ وہ تمہاری گھات میں ہے"۔

جنابِ علیاؑ کی اس تقریر نے کوفہ کو ہلا ڈالا اور مجمع بے خود ہو گیا۔ ایک کو دوسرے کی خبر نہ تھی۔ لوگ اپنا گوشت اپنے دانتوں سے نوچنے کو تیار تھے۔ اتنا فرما کر معظّمہؑ نے اپنا منہ اُن کی طرف سے پھیر لیا۔

اہلِ حرم ابن زیاد کے دربار میں :

اسیروں کو ابن زیاد کے دربار میں لایا گیا۔ زینبؑ اور پیغمبرؐ اسلام کا سارا کنبہ بے ردا تھا۔ کوئی بی بی اپنا منہ اپنی آستین سے کوئی بی بی اپنا چہرہ سر کے بالوں سے چھپائے ہوئے تھیں۔ جنابِ زینبؑ جب اُس ظالم کے دربار میں داخل ہوئیں تو ایک گوشہ میں بیٹھ گئیں۔ کنیزوں اور بیبیوں نے آپ کے گرد حلقہ بنا لیا۔ ابن زیاد نے پوچھا یہ کون ہیں؟ کنیزوں نے کچھ جواب نہ دیا۔ ابن زیاد نے برہم ہو کر پھر پوچھا۔ حاضرین میں سے کسی نے کہا۔ یہ زینبؑ بنت علیؑ ہیں۔ ابن زیاد کی رگِ عداوت حرکت میں آئی۔ جنابِ زینبؑ سے کہنے لگا خدا کا شکر ہے کہ اس نے تم کو ذلیل کیا اور تمہارے جھوٹ کو جھوٹ ثابت کر دیا۔

معظّمہؑ نے بے خوف و خطرات جواب دیا۔

"الحمد للّٰہ الذی اکرمنا بنبیہ محمد وطھّرنا من الرجس تطھیرا۔ انما یفتضح الفاسق و یکذب الفاجر و ھو غیرنا"

(ترجمہ) شکر ہے اُس خدا کا جس نے ہم کو اپنے نبی محمد مصطفیٰؐ کے ذریعہ سے بزرگی دی اور ہم کو ہر رجس سے ایسا پاک قرار دیا جو حق ہے پاک قرار دینے کا۔ رسوا ہوتا ہے وہ جو فاسق ہوتا ہے اور جھٹلایا جاتا ہے وہ جو فاجر ہوتا ہے اور وہ ہم نہیں ہمارا غیر ہے۔

ابن زیاد نے ہنس کر کہا۔ تم نے دیکھا کہ خدا نے تمہارے بھائی کے ساتھ کیا

برتاؤ کیا...... معظمہؑ نے جواب دیا:

"خدا نے میرے بھائی کے ساتھ سوائے خیر و برکت و سعادت عطا کرنے کے کوئی برائی نہیں کی۔ خدا نے ان لوگوں کے لئے شہادت عظمیٰ کی سعادت مقرر کی تھی۔ جو انہوں نے حاصل کر لی۔ اب خدا جلد تجھ کو اور اُن کو موقفِ حساب میں جمع کرے گا اور تیرے ظلم اور اُن کے صبر کی روئیداد کو سنے گا۔ اے زیاد کے بیٹے! اے مرجانہ کے پسر تیری ماں تیرے غم میں روئے تو اس دن کے جواب کے لئے تیار ہو جا"۔ معظمہؑ کی اس تقریر سے ابن زیاد بپھرا۔ اور اس نے معظمہ کے قتل کا حکم دے دیا۔ مگر عمر بن حریث نے حکومت یزید کی خیر خواہی میں یہ سمجھ کر کہ ملک میں تو قتل حسینؑ ہی سے شورش ہے۔ قتل زینبؑ قصرِ حکومت کی اینٹ سے اینٹ بجا دے گا۔ روکا اور ابن زیاد اس ارادے سے باز رہا اور کہنے لگا۔ حسینؑ باغی اور سرکش تھے خدا نے حسینؑ اور ان کے ساتھیوں کے قتل سے میرے دل کو ٹھنڈا کیا۔ جناب زینبؑ نے فرمایا مجھے اپنی جان کی قسم تو نے ہمارے بوڑھوں' جوانوں اور بچوں کو قتل کیا۔ ہم کو بے پردہ کیا۔ تو نے ہماری شاخوں کو کاٹ ڈالا اور ہماری جڑ کو اکھاڑ دیا۔ اگر ان امور سے تیرا دل ٹھنڈا ہوا تو بیشک ٹھنڈا ہوا۔ مجھے تعجب ہے اس شخص پر (یعنی تجھ پر) جو اپنے آئمہ کو قتل کر کے یہ سمجھے کہ مجھے شفا حاصل ہوئی۔ حالانکہ وہ جانتا ہے کہ دار آخرت میں اس کو سخت سزا ملے گی۔ زیاد کے بیٹے تیری آنکھیں اس حسینؑ کے قتل سے ٹھنڈی ہوئیں جس حسینؑ کو دیکھ کر رسولؐ خدا کی آنکھیں ٹھنڈی ہوتی تھیں اور رسولؐ اس کا منہ چومتے تھے اور اس کو اور اس کے بھائی کو اپنے کاندھوں پر بٹھاتے تھے تو فردائے قیامت میں اس کا جواب دینے کے لئے تیار ہو جا۔ ابن زیاد یہ سن کر معظمہؑ سے بد کلامی کرنے لگا۔ جس کو بیمارؑ کربلا برداشت نہ کر سکے اور شہزادہ کی آنکھوں میں عالم تیرہ و تار ہو گیا۔ اپنی جان سے بے نیاز اور بے پرواہ ہو کر کہنے لگے۔

"یابن اللئام انّی تھتك عمّتی وتعرفھا لمن لا یعرفھا قطع اللّٰہ یدیك و رجلیك"

(ترجمہ) اے کمینوں کے بیٹے! تو کب تک میری پھوپھی کی توہین کرتا رہے گا اور جو لوگ ان کو پہچانتے بھی نہیں ان کو بھی پہچوانتا رہے گا۔ خدا تیرے ہاتھوں اور پیروں کو قطع کرے۔

ابن زیاد یہ سن کر نہایت غضبناک ہوا اور سید سجادؑ کے قتل کا حکم دیا۔ زین العابدینؑ نے فرمایا۔ زیاد کے بیٹے! اے شقی! تو مجھے موت سے ڈراتا ہے تو یہ نہیں جانتا کہ خدا کی راہ میں قتل ہونا ہماری میراث اور شہادت ہماری فضیلت ہے۔ جنابِ زینبؑ بھتیجے سے لپٹ گئیں اور فرمایا:

"اے ابن زیاد! ہمارے خون کے بہانے سے تو ابھی تک سیر نہیں ہوا۔ خدا کی قسم! میں اپنے اس فرزند کو نہ چھوڑوں گی۔ اگر اس کو قتل کرنا ہے تو ساتھ مجھے بھی قتل کردے کیا تو نے قسم کھالی ہے کہ محمدؐ مصطفیٰ کی نسل سے کسی چھوٹے بڑے کو چھوڑے گا ہی نہیں۔ میں تجھے اللہ کی قسم دیتی ہوں کہ مجھے قتل کئے بغیر اس کو قتل نہ کر"۔

ابن زیاد کو خاموش ہونا پڑا اور سر حسینؑ جو تخت کے نیچے رکھا ہوا تھا۔ اس کی طرف چھڑی بڑھا کر لب ہائے مبارک پر لگانے لگا۔ اس وقت زید بن ارقم صحابی رسولؐ سے جو نہایت ضعیف تھے نہ رہا گیا' بول اُٹھے۔

"خدا کی قسم! رسولؐ خدا ان لبوں کے بوسے لیا کرتے تھے۔ یہ کہہ کر زید رونے لگے"۔

ابن زیاد غصہ سے بولا۔ زید! تیری عقل بڑھاپے سے زائل ہو گئی ہے تو بوڑھا نہ ہوتا تو قتل کرادیتا۔ زید روتے ہوئے باہر چلے گئے۔ اہل حرم کو یزید کے حکم کے انتظار میں قید رکھا گیا اور صفر کی تقریباً اٹھارہ تاریخ کو حکم یزید آنے پر اہل حرم کو کوفہ سے دمشق کی طرف روانہ کیا گیا۔

قافلہ اہلبیتؑ کی کوفے سے شام کی طرف روانگی اور وارد کربلا ہونا:

یہ قافلہ ۲۰ صفر کو پھر وارد کربلا ہوا۔ بنی اسد شہیدان کربلا کو دفن کر چکے

تھے۔ اہلِ حرم قبروں سے لپٹ لپٹ کر نالہ جگر خراش کرنے لگے۔ جابر بن عبداللہ انصاری صحابی رسول اور ان کے ساتھ کچھ محبانِ اہلبیتؑ زیارت شہداءؑ کے لئے وہاں جمع تھے۔ یہ قافلہ ان زائرین سے ملا۔ سید سجادؑ اور نبی زادیوں نے عاشورے کے دردناک واقعات اور شہداء کے پیاسے قتل ہونے کے حالات سنائے۔ وادیٔ کربلا میں کہرام برپا ہو گیا۔ بعض حضرات جابر بن عبداللہ انصاری کی موجودگی میں اہل حرم کا کربلا پہنچنا اور امسال آئندہ کے ۲۰ صفر کے متعلق بتاتے ہیں۔

قافلہ اہلبیتؑ کا جابر بن عبداللہ سے ملنے اور زیارت شہداءؑ کربلا کے بعد شام کی طرف روانہ ہونا:

الغرض یہ قافلہ شام کی طرف روانہ ہوا۔ چھ سو میل کا سفر' اسیری کا عالم' لشکر کے ظلم و ستم کی انتہائی نبی زادیاں بے مقنع ورداسید سجادؑ اسیر پابند زنجیر' قیامت کا سفر تھا اور اس سفر کو طے کرنا آل محمدؐ ہی کا کام تھا۔ اٹھائیس دن میں یہ سفر اور بقولے چالیس دن میں طے ہوا اور یہ قافلہ دمشق پہنچا۔

قافلہ اہلبیتؑ کا دمشق میں پہنچنا اور اس کا دربار یزید میں جانا:

جس روز قافلہ اہلبیتؑ دمشق پہنچا بنی امیہ نے اس کو روز عید منایا۔ شہر کو سجایا۔ اہل حرم کو باب الساعات سے شہر میں لے گئے۔ جہاں اژدحام عام تھا۔ اب اسیروں کو دربار یزید میں لے جایا جا رہا ہے۔ دربار کو سجایا گیا ہے۔ سات سو کرسی نشین موجود ہیں۔ اسیروں کو بھیڑ بکریوں کی طرح باندھا گیا ہے۔ ایک رسی میں بارہ اسیر۔ اس حالت میں یزید نے اسیروں کو دیکھا۔ نہایت خوش ہوا اور وہ اشعار پڑھے جو آج تک مشہور ہیں۔

> "کاش! میرے وہ بزرگ جو بدر میں قتل ہوئے۔ دیکھتے کہ میں نے فرزندان احمدؐ سے کیسا بدلہ لیا۔ بنی ہاشم نے سلطنت قائم کرنے کے لئے ایک ڈھونگ رچایا تھا۔ ورنہ نہ کوئی وحی آئی تھی نہ کوئی خبر اتری

تھی"۔

یزید ہر بی بی کا نام پوچھتا تھا اور بتانے والے بتاتے تھے۔ کچھ دیر بعد یزید امام زین العابدینؑ کی طرف متوجہ ہوا۔ کہنے لگا میں شکر کرتا ہوں خدا کا جس نے تیرے باپ کو قتل کیا اور سرِ امامؑ کی طرف دیکھ کر کہا "اے حسینؑ! تم نے مجھ سے سرکشی کی سزا پائی۔ سید سجادؑ سے نہ رہا گیا فرمایا:

> "اے شقی! خدا کی رحمت تجھ سے دور رہے۔ تو نے بہترین اولاد آدمؑ کو قتل کیا۔ اب ان پر بغاوت کا الزام لگاتا ہے۔ خدا سے شرم کر۔

یزید غضبناک ہوا اور سجادؑ کے قتل کا حکم دے دیا۔ جناب زینبؑ نے دیکھا کہ لاوارثوں کا یہ وارث بھی قتل ہو رہا ہے۔ زور سے رونے لگیں اور فریاد کرنے لگیں۔ اے جدِ امجد! آپ کہاں ہیں؟ یزید کو آپ کے پیارے نواسہ کو قتل کر کے بھی صبر نہ آیا۔ آج آپ کی نسل ہی کو منقطع کرنا چاہتا ہے۔ پھر یزید سے خطاب کیا:

> "اے یزید! تو خونِ اہلبیتؑ سے زمین کو سیراب کر چکا ہے۔ اب سوائے اس فرزند کے ہمارا کوئی باقی نہیں"۔

زینبؑ کبریٰ کے ساتھ تمام مخدراتِ عصمت بھی فریاد کرنے لگیں۔ اے خدا' اے جبارِ سما اے باسطِ بطحا! ہمارے سب مارے گئے۔ ہم قید ہو گئے۔ یزید کو اب بھی صبر نہیں۔ وہ اب بھی اپنی تلوار ہماری گردنوں سے نہیں اٹھاتا۔ دربارِ یزید میں کہرام برپا ہو گیا۔ یزید نے دیکھا کہ درباریوں کے چہرے بدلے ہوئے ہیں۔ دل میں ڈرا کہ لوگ مجھ سے منحرف نہ ہو جائیں۔ خاموش ہو گیا۔ یزید بھرے دربار میں سرِ امامؑ مظلوم سے بے ادبی کر رہا تھا۔ اس وقت جناب علیاؑ حضرت زینبؑ نے وہ خطبہ ارشاد فرمایا جس کا ترجمہ ہم حرف بحرف کتاب ام المصائب سے نقل کرتے ہیں۔ خداوند کریم مولف کتاب مذکور کو جزائے خیر دے۔

ترجمہ خطبہ جناب زینبؑ از کتاب ام المصائب:

"تعریف اس خدا کی جو رب العالمین ہے اور درود ہو میرے نانا سید المرسلینؐ

پر اور اس (خدا) کا قول سچ ہے کہ انجام برے کام کرنے والوں کا برا ہو گا۔ جنہوں نے اللہ کی نشانیوں کو جھٹلایا اور اُن کا مذاق اُڑایا۔ اے یزید! تو گمان کرتا ہے کہ تو نے ہم پر زمین کے گوشے اور آسمان کے آفاق تنگ کر دیئے اور ہم تیرے قیدی ہو گئے۔ اس لئے تیرے پاس قطار میں لائے گئے ہیں اور تو نے ہم پر اقتدار حاصل کر لیا ہے۔ تیرا کیا یہ خیال ہے کہ اللہ کی طرف سے ہم کو ذلت پہنچی اور تجھے عزت۔ اور یہ ظاہری فتح جو تجھے ہوئی وہ تیری جلالتِ قدر اور شان کی وجہ سے ہوئی۔ اور تو اس پر ناک چڑھانے لگا اور اترا کر بغلیں بجانے لگا اور شوخی اور گستاخی کرنے لگا۔ تو سمجھتا ہے کہ دنیا کے فتنے سے تیرے معاملات مستحکم ہو گئے اور ہمارا ملک تیرے قبضہ میں آگیا اور ہماری سلطنت تو نے چھین لی۔ ٹھہر جا جہالت سے اتنا نہ اچھل۔ کیا تو خدا کا حکم ''لاتحسبن'' الخ بھول گیا۔ ہر گز یہ خیال نہ کر کہ ہم نے کافروں کو اس لئے مہلت دی ہے کہ ان کی بھلائی ہے بلکہ اس وجہ سے مہلت دی ہے کہ ان کے گناہ زیادہ ہو جائیں اور پھر وہ ذلیل کرنے والے عذاب میں مبتلا ہوں اے آزاد کردہ غلاموں کے بیٹے! کہہ کیا تیرا یہ انصاف ہے کہ اپنی عورتوں اور لونڈیوں کو تو پس پردہ بٹھلائے اور رسولؐ اللہ کی اولاد کو قید کر کے در در پھرائے۔ تو نے ہماری ہتک کی۔ ہمارے چہروں کو بے نقاب کیا اور تیرے حکم سے اشقیا ہم کو شہر بشہر پھرا رہے ہیں۔ ہمہ اقسام کے لوگ خواہ وہ پہاڑی ہوں یا چشموں پر رہتے ہوں ہم کو دیکھ رہے ہیں۔ قریب وبعید' غائب وحاضر اور شریف ورذیل اور امیر و غریب سب ہم کو دیکھ رہے ہیں اور ہماری یہ حالت ہے کہ ہمارے ساتھ ہمارے مرد وعزیزوں میں سے (سوائے اس اسیر کے) کوئی نہیں ہے اور نہ ہمارا کوئی معین و ناصر ہے۔ اے یزید! جو کچھ تو نے کیا۔ اس سے تیری خدا سے سرکشی اور رسولؐ اللہ سے انکار ثابت ہوتا ہے تو اس کتاب اور سنت کو رد کرتا ہے جو رسولؐ اللہ خدا سے لائے اور تیرا یہ فعل کوئی حیرت انگیز نہیں ہے اس لئے کہ جس کے بزرگ نے شہیدوں کے جگر چبائے ہوں۔ جن کا گوشت اہل شقاوت کے خون سے نشوونما پا کر بڑھا ہو جنہوں نے سید الانبیاءؑ سے جنگ کی ہو۔ اُن کے مقابلے کے لئے جتھے جمع کئے ہوں اور رسولؐ اللہ

کے مقابلے میں تلواریں کھینچی ہوں وہ یقیناً اللہ اور رسول اللہ کے انکار کرنے میں تمام عربوں سے سخت اور کفر و طغیان و تعدی اور رسول اللہ کی دشمنی میں سب سے نمایاں ہیں۔ اے یزید! یاد رکھ کہ جو اعمال قبیح تجھ سے سرزد ہوئے۔ یہ طبائع کفر کا نتیجہ اور وہ دیرینہ کینہ ہے جو بدر کے مقتولین کی وجہ سے تمہارے دلوں اور سینوں میں موجزن ہے۔ جو شخص ہم کو عداوت اور کینہ سے دیکھتا ہے وہ ہم اہل بیتؑ رسولؐ سے دشمنی کرنے میں تامل نہیں کرتا۔ رسولؐ اللہ سے اپنا کفر ظاہر کر دیتا ہے اور زبان سے بھی کہہ دیتا اور خوش ہو کر کہتا ہے کہ میں نے رسول اللہ کے فرزندوں کو قتل اور اُن کی ذریت کو قید کیا ہے اور اس کو گناہ اور امر عظیم نہیں جانتا اور کہتا ہے کہ اگر اس کے بزرگ اس کے کارنامہ کو دیکھتے تو خوش ہو کر کہتے کہ تیرے ہاتھ شل نہ ہوں۔ تو نے ہمارا انتقام لیا۔ اے یزید! تو...... اس مجمع میں حسینؑ کے دندانِ مبارک کو چھڑی سے ایذا دے رہا ہے اور بے ادبی کر رہا ہے حالانکہ وہ رسولؐ اللہ کی بوسہ گاہ ہے اور تیرے چہرے سے خوشی و مسرت ظاہر ہو رہی ہے۔ میری جان کی قسم! تو نے سردار جوانانِ جنت اور یعسوب العرب کے بیٹے آفتابِ آل عبد المطلب کا خون بہا کر ہمارے زخموں کو گہرا کر دیا اور جڑ کو زمین سے اکھیڑ دیا۔ حسینؑ ابن علیؑ کو قتل کر کے کافر اسلاف سے تقرب حاصل کیا اور فخر کے ساتھ انہیں صدا دیتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر وہ تجھے دیکھیں تو کہیں گے کہ اے یزید! تو نے خوب کام کیا۔ خدا تیرا ہاتھ شل کرے۔ اے یزید! اگر تو اپنے افعال پر غور کرے کہ تو کس امر عظیم کا مرتکب ہوا تو تو یقیناً تمنا کرے گا کہ واقعی تیرا ہاتھ شل ہو کر کہنی سے علیحدہ ہو جائے اور بول اُٹھے گا کہ اے کاش! میرے ماں باپ مجھے نہ جنتے کیونکہ تو محسوس کرے گا کہ خدا تجھ سے ناخوش ہو گیا اور رسولؐ اللہ تیرے دشمن بن گئے ہیں۔ اے اللہ! تو ہمارا حق ہم کو دلا۔ ہمارے ظالموں سے ہمارا انتقام لے اور ان پر جنہوں نے ہمارے خون بہائے ہیں۔ ہم سے عہد شکنی کی۔ ہمارے عزیزوں اور حامیوں کو قتل کیا۔ ہماری عزت ریزی کی۔ اُن پر تو اپنا غضب نازل فرما۔ اے یزید! جو کچھ تجھے کرنا تھا کر چکا لیکن یاد رکھ تو نے اپنی ہی جلد کاٹی، اپنے ہی گوشت کے ٹکڑے بنائے۔

تو بہت جلد رسولؐ خدا کے سامنے پیش ہو گا۔ اس گناہ کا بار لئے ہوئے جو تو نے ان کی ذریت کے ساتھ کیا۔ یعنی ان کی عترت کا خون بہا کر ان کی ذریت کی ہتک حرمت کر کے۔ یہ وہ مقام ہو گا جہاں ان کی ذریت جمع ہو گی اور ان کے ظالموں سے انتقام اور ان کے دشمنوں سے بدلہ لیا جائے گا۔ اے یزید! تجھ کو عترت رسولؐ کو قتل کر کے اُچھلنا نہ چاہیے اور ہر گز یہ خیال نہ کر کہ (لا تحسبن الذین قتلوا فی سبیل الله الخ) جو لوگ خدا کی راہ میں شہید ہوئے وہ مردہ ہو گئے بلکہ وہ زندہ ہیں اور خدا کی طرف سے انہیں رزق مل رہا ہے۔ وہ خوش ہیں اللہ کی نعمت پر، جو انہیں ملی ہے مگر تیری خبر لینے کے لئے اللہ کافی ہے اور رسولؐ خدا تیرے دشمن ہیں۔ جبرئیلؑ تیرے مقابلہ میں ہماری پشت پناہ ہیں۔ وہ لوگ جنہوں نے تجھے بادشاہی دی اور مسلمانوں کی گردنوں پر تجھ کو سوار کرایا۔ عنقریب جان لیں گے کہ ان کا حشر کیا ہو گا۔ تحقیق کہ ظالمین کا انجام برا ہے اور یہ کون جانتا ہے کہ برا کون اور گمراہ کون ہے؟ اے یزید! میں نے اپنی تقریر میں جو تیری عزت گھٹائی اور تیرے عذاب کی شدت کا اظہار کیا۔ اس سے میرا یہ مطلب نہیں کہ بعد اس کے کہ تو نے مسلمانوں کو رلایا اور ان کے دلوں کو رنجیدہ کیا۔ اس سے تو کچھ اثر لے۔ اس لئے تو ان میں سے ہے جن کے دل سخت اور نفوس سرکش اور اجسام خدا کی نافرمانی اور رسولؐ کی لعنت میں مبتلا ہیں تو ان میں سے ہے جن کے دلوں میں شیطان نے گھونسلے بنائے اور بچے دیئے۔ اور ان گھونسلوں سے بچے نکلے۔ مقام تعجب ہے کہ نیک بندے جو انبیاء و اوصیاء کے فرزند ہیں وہ آزاد کردہ خبیث غلاموں اور فاسقوں اور فاجروں کی اولاد کے ہاتھ سے قتل ہو جائیں۔ ہمارے خون سے ان کے ہاتھ رنگے جائیں۔ ہمارا گوشت ان کی غذا ہے۔ افسوس ہے ان پاک بدنوں پر جو دشتِ کربلا میں بے گور و کفن پڑے تھے۔ جو تیروں کے زخم خوردہ ہیں اے یزید! اگر تو ہماری ظاہری شکست کو غنیمت سمجھتا ہے تو یاد رکھ کہ تجھے اس کا تاوان بھی ادا کرنا ہو گا۔ اس روز جبکہ تجھے اپنے کئے کا پھل ملے گا خدا اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔ خدا پر ہی ہمارا بھروسہ ہے اور وہی ہمارا ملجاء اور جائے پناہ ہے اور اسی سے ہماری امید وابستہ ہے اے

یزید! تو جتنا مکر کرنا چاہتا ہے کر لے اور جس قدر کوشش کرنا چاہتا ہے کر لے۔ اس ذات کی قسم! جس نے ہمیں وحی و کتاب اور نبوت و انتخاب سے مشرف کیا ہے تو ہمارے درجات نہیں پائے گا۔ اور نہ ہماری منزلت کو پہنچے گا۔ اور نہ تو ہمارے ذکر کو مٹا سکتا ہے اور نہ اس ننگ و عار کو دور کر سکتا ہے جو تجھ پر ہم پر ظلم و ستم کرنے کی وجہ سے عائد ہوا ہے۔ تیری رائے کمزور اور دن گنتی کے ہیں۔ تیری جماعت منتشر ہو جائے گی۔ اُس روز جب کہ منادی ندا کرے گا کہ خدا کی لعنت ہے تعدی اور ظلم کرنے والے ہیں۔

تعریف ہے اس خدا کی، جس نے اپنے اولیاء کا خاتمہ بخیر کیا اور اپنے اصفیاء کی مرادیں بر لایا اور انہیں اپنی رحمت و مہربانی و خوشنودی کی طرف بلا لیا۔ اے یزید! تو ان پر ظلم کر کے بدبختی اور شقاوت میں مبتلا ہو گیا۔ ہم دعا کرتے ہیں کہ خدا تعالیٰ ان اولیاء و اوصیاء) کی وجہ سے ہمارا اجر پورا کرے۔ ہمیں ثواب کثیر بخشے اور ہمیں حسن خلافت اور اجمال امامت عطا فرمائے۔ وہ مہربان ہے اور اپنے بندوں سے بہت محبت کرنے والا ہے۔

آلِ محمدؐ کی قید سے رہائی اور مدینہ کی طرف روانگی:

دمشق میں آل محمدؐ ایسے زنداں میں مقید کئے گئے جہاں ہر طرح کی اذیت اٹھاتے اٹھاتے مبارک چہروں کے رنگ بدل گئے۔ اسیری اہلبیتؑ کا زمانہ صحیح طور پر معین کرنا مشکل ہے۔ مگر اس میں شک نہیں کہ یہ زمانہ مختصر نہ تھا بلکہ یہ حضرات مدت دراز تک قید رہے۔ بالآخر جب یزید نے دیکھا کہ اسیروں اور ان کے وارثوں کی مظلومیت سے میرے خلاف نفرت عام بڑھ رہی ہے اور ملک میں ہر طرف شورش کے آثار ہیں۔ اسیروں کو رہا کیا گیا۔ جناب علیاؑ نے یزید سے کہلایا کہ ہم آج تک اپنے شہیدوںؑ کو جی بھر کر رو نہیں سکے۔ ہمارے لئے ایک مکان خالی کرا دیا جائے اور ہمارے لوٹے ہوئے تبرکات واپس دے دیئے جائیں تا کہ ہم شہیدوں کی یادگار سامنے رکھ کر دل بھر کر ماتم کر لیں۔ ایک مکان دیا گیا۔ اہل حرم نے وہاں اپنے شہیدوں کا ماتم

کیا۔ شہر کی بہت سی مستورات بھی پرسہ دینے آگئیں۔ دشمن کے شہر میں زینبؑ نے مظلوم بھائی کی یہ پہلی مجلسِ غم کی گریہ وبکا نوحہ وماتم کے شور سے شہر گونج اٹھا۔ اس کے بعد اونٹوں پر سیاہ محملیں رکھوا کر یہ سوگوار قافلہ مدینہ کی طرف روانہ ہوا۔ نعمان بن بشیر جو ایک مرد دیندار تھا اس قافلہ کا محافظ تھا۔ یہ قافلہ ہر جگہ اپنے شہیدوں کو یاد کرتا' ان کا ذکر کرتا' روتا پیٹتا مدینہ کے قریب پہنچا اور مدینہ سے باہر ٹھہرا۔ سیاہ علم بلند کئے گئے۔ مدینہ میں اس لٹے ہوئے قافلہ کے آنے کی خبر پہنچی۔ ہر طرف سے مردوزن روتے پیٹتے قافلہ کی طرف دوڑے۔ شورِ گریہ وبکا صدائے نوحہ وماتم سے مدینہ میں کہرام برپا ہو گیا۔ نبی زادیاں فریاد کر رہی تھیں اے ہمارے جد کے مدینہ تو ہمارے آنے کو قبول نہ کر کیونکہ ہم رنج وغم اور ذلتیں اٹھا کر آئے ہیں۔ اے مدینہ! جب ہم تجھ سے رخصت ہوئے تھے تو ہمارا گھر بھرا ہوا تھا۔ سب کو لے کر گئے تھے۔ اب اس حال میں آئے ہیں کہ ہمارے بڑے رہے نہ بچے۔ اب یہ قافلہ روضہ رسولؐ کی طرف روانہ ہوا۔ اہل مدینہ سر وپا برہنہ بد حواس پریشان حال پیچھے پیچھے ہیں۔ زینبؑ کی نظر ناناؐ کے روضہ پر پڑی۔ فریاد کی اور کہا ناناؐ! میں آپ کے فرزند حسینؑ کی سنانی سنانے آئی ہوں۔ وہ آپؐ کا پیارا حسینؑ وہ آپ کا لاڈلا حسینؑ تین دن کا پیاسا قتل کر دیا گیا۔ ہم اسیر ہوئے' دربدر پھرائے گئے۔

روضہ رسولؐ پر سید سجادؑ کی فریاد:

سید سجادؑ آگے بڑھے۔ روضہ رسولؐ کے ستون پر ہاتھ رکھا اور کہا:

انا جیك یا جدّاہ یا خیر مر سل

حسینك مقتول و نسلك ضائع

''اے جد امجد! اے سید انبیاءؐ میں آپ سے فریاد کرتا ہوں کہ آپ کے حسینؑ قتل ہو گئے اور آپ کی نسل تباہ ہو گئی''۔

مجمع چیخیں مار مار کر رو رہا تھا اور کسی کو اپنا ہوش نہ تھا۔ بالآخر یہ قافلہ اپنے

ویران اور سنسان گھر پہنچا۔ آہ! کیا گزری ہو گی زینبؑ دل خستہ پر' زنانِ اہلبیتؑ پر' سید سجادؑ پر' جب اجڑے ہوئے گھر کو دیکھا ہو گا اور گھر والوں میں سے ایک ایک کی یاد تازہ ہوئی ہو گی۔ نگاہوں نے اُن صورتوں کو ڈھونڈا ہو گا۔ جو کربلا کی خاک میں چھپ چکی تھیں۔ دلوں سے یہ داغ کبھی مٹنے والے نہ تھے جگر کے یہ زخم کبھی بھرنے والے نہ تھے۔ آنکھوں کے یہ آنسو کبھی خشک ہونے والے نہ تھے۔ جب تک زندہ رہے روتے رلاتے رہے اور یہ اُن کا رونا تھا جو آج تک ایک عالم کو رلا رہا ہے اور رلا تا رہے گا۔

مدفن جنابِ زینبؑ :

ثانی زہراؑ جب تک زندہ رہیں اپنے بھیتجے سید سجادؑ کے شریک حال اور شریک غم رہیں۔ معظمہؑ کی آخری خواب گاہ کہاں ہے۔ وفات کہاں ہوئی؟ اور کب ہوئی؟ ان امور میں اختلافِ روایات ہے۔ قبر انور کے متعلق مصر' شام اور مدینہ تین جگہوں کے نام ملتے ہیں لیکن محققین کا رُخ مدینہ کی طرف ہے۔ ذوق بھی کہتا ہے کہ قدرت نے زینبؑ اور سجادؑ کا ساتھ قرار دیا تھا۔ قبر بھی پھوپھی اور بھتیجے کی قریب قریب ہی ہو گی۔

والله العالم وعنده ام الكتاب

☆☆☆

صحابیت اور قرآن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ○

حامداً للّٰہ تعالیٰ و مصلیاً علی خاتم النبیین و آلہ الطاھرین ○

سنی شیعہ اپنے اپنے مذہب کے مطابق صحابہ کرام کے مداح ہیں:

جماعت صحابہ کی ابتدا خود نبیؐ کے اپنے گھر سے ہوئی مثلاً جناب ابو طالبؑ، فاطمہؑ بنت اسد، خدیجۃؑ الکبریٰ، علیؑ بن ابی طالب، حمزہؑ سید الشہدا، جعفرؑ بن ابی طالب۔ پھر اس کی وسعت مکہ، مدینہ اور دوسرے مقامات تک پہنچی۔ اس مقدس جماعت کی مدح و ثنا کوئی نئی بات نہیں۔ سنی شیعہ دونوں فرقے اپنے اپنے مذہب اور اطلاع کے مطابق ان کے ثناخواں ہیں۔ دونوں فرقے قرآن کریم سے وابستگی رکھتے ہیں اور قرآن کریم نے اس مقدس گروہ کی یقیناً مدح فرمائی ہے لیکن قرآن کریم نے اس مدح کی بنیاد ناموں پر نہیں بلکہ صفات و کردار پر رکھی ہے۔ اسی قرآن نے عہد نبیؐ کے ان مسلمانوں کی مذمت بھی کی ہے جو نبیؐ کے کلمہ گو تو ہو گئے تھے لیکن ان میں سے کچھ تو بباطن بدستور کافر تھے اور کچھ لوگ تذبذب اور شک کی حالت میں تھے اور ایمان ان کے دلوں میں جاگزیں نہ ہوا تھا۔ اس مذمت کی بنیاد بھی صفات و کردار پر ہے مثلاً اچھا ہے وہ جو ایسا کرتا ہے، برا ہے وہ جو ویسا کرتا ہے۔ اب یہ کہ کون ایسا کرتا ہے اور کون ویسا کرتا ہے یہ واقعاتی چیز ہے۔ نزول قرآن کے وقت وہ واقعات اور آیات دونوں چیزیں سامنے تھیں۔ واقعات کو دیکھ دیکھ کر آیات کے مصداق کو سمجھنے میں کافی آسانی تھی اور اس

کے ساتھ نبیؐ کی توضیح بھی موجود تھی۔ اس وقت کے لوگ بڑی حد تک پہچانتے تھے کہ اس آیت کا ممدوح کون اور اس آیت کا مذموم کون ہے۔ فلاں جنگ میں ثابت قدم افراد کون ہیں جن کی مدح نازل ہوئی۔ غیر ثابت قدم کون ہیں جن کی مذمت نازل ہوئی۔ یہ سب واقعات جن کے چشم دید تھے ان کو ایک ایک نام معلوم تھا۔ حاضرین سے یہ واقعات غائبین اور آئندہ نسلوں تک پہنچے جو کتاب کی صورت میں آئے۔ بیان واقعات میں سب کا یک زبان ایک قلم ہونا آسان نہ تھا۔ اس سلسلہ میں کچھ نہ کچھ اختلاف ہوا لیکن جس طرح یہ کہنا غلط ہے کہ کہیں اختلاف نہیں اسی طرح یہ کہنا بھی غلط ہے کہ کہیں اتفاق نہیں۔ دنیا کے بڑے سے بڑے نزاعی اور اختلافی قضیہ میں اتفاق کے حدود نمایاں رہتے ہیں جو ایک محقق کو اختلافی چیزوں میں سے صحیح اور واقعی چیز تک پہنچا دیتے ہیں۔ عدالتوں میں دونوں فریق اپنے اپنے مختلف اور متضاد بیان دیتے ہیں۔ سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ کرنے کی انتہائی کوشش کرتے ہیں۔ عدالت بالکل اجنبی ہوتی ہے۔ نہ وہ کسی فریق سے متعارف نہ کسی شاہد سے باخبر۔ لیکن وہ انتہائی اختلاف اور اپنی انتہائی اجنبیت کے ہوتے ہوئے آسانی سے حقیقتِ امر معلوم کر لیتی ہے اور اصلیت اس پر کھل جاتی ہے۔ کسی مجوز کو نہیں دیکھا کہ اس نے یہ کہہ دیا ہو کہ اس اختلاف کی بھرمار میں کسی صحیح نتیجے پر میں نہیں پہنچ سکتا۔ لہٰذا یہ خیال کر لینا غلط ہے کہ اختلافِ بیان کی حالت میں صحیح بات معلوم نہیں ہو سکتی۔ مذہبی امور کی تحقیق میں بڑے سے بڑا قابل انسان جو ناکام رہ جاتا ہے اور منزل تک نہیں پہنچ پاتا اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ وہ پہلے سے خالی الذہن نہیں ہوتا۔ اس کے دل و دماغ میں پہلے سے کچھ سمایا ہوا ہوتا ہے۔ وہ خود چاہے یہ سمجھ رہا ہو کہ میں تحقیق کر رہا ہوں لیکن وہ تحقیق نہیں کر رہا ہے اپنے موجودہ سرمایۂ ذہنی کو بڑھانے کے لیے تائیدات ڈھونڈھ رہا ہے۔ جو چیز خلاف نظر آتی ہے اس کو فوراً نظر انداز کر دیتا ہے۔ جو چیز موافق نظر آتی ہے اس کو اپنے سرمایہ میں شامل کر لیتا ہے۔ تحقیق کر سکتا ہے صرف وہ جو اپنے اس ذہنی سرمایہ کو جو پہلے سے موجود ہے اس کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھ کر اس امر کا محاسبہ کرے کہ اس کا غلط ہونا ناممکن نہیں ہے۔ ایسا تو

نہیں کہ یہ بالکل غلط ہو اور صحیح چیز کوئی اور ہو جس دل میں یہ خلش پیدا ہو گئی اور ذوقِ صحیح نے مدد کی وہ منزل پر پہنچ گیا۔ غرض کہ واقعات کا صحیح رُخ معلوم کر لینا کوئی مشکل بات نہیں۔ اب اگر کوئی یہ کہے کہ ہم کو مذکورہ جماعت کی چھان بین کی ضرورت ہی کیا ہے۔ ان کے اعمال کی باز پُرس ہم سے تو نہ ہو گی یہ بات کہنے کے لیے تو ٹھیک ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ دین اپنے تمام تر اصولی اور فروعی تقاضوں کے ساتھ ہم تک ان ہی واسطوں سے پہنچتا ہے۔ قرآن اور اس کے مطالب حدیث اور اس کے موارد یہ سب کچھ ان ہی ذرائع سے حاصل ہوتے ہیں۔ نبیؐ تک ہماری رسائی بہر حال ضروری ہے لیکن جب ہم اس عہدِ مقدس میں نہ تھے تو لا محالہ اب واسطہ ہی اختیار کرنا ہو گا۔ کون سا واسطہ اختیار کریں؟ یہ سوال چنداں اہم نہ ہوتا اگر اصول و فروع' عقائد و اعمال' حلال و حرام' اوامر و نواہی میں سب یک زبان ہوتے لیکن سب یک زبان ہوتے اور سب یک دل ہوتے تو قرآنِ کریم عہدِ نبیؐ کے سب ہی مسلمانوں کی مدح کرتا۔ یہ نہ ہوتا کہ کسی کی مدح اور کسی کی مذمت قرآنِ کریم کے یہ دونوں رخ ہی اس لیے ہیں کہ مسلمانانِ عالم تک جو چیز ممدوحین کے ذریعہ سے پہنچے گی وہ صحیح ہو گی اور جو مذمومین کے ذریعے سے پہنچے گی وہ غلط ہو گی۔ یہ اختلاف ہی اصل میں ہم سے اس امر کا مطالبہ کر رہا ہے کہ تمہارا وسیلہ اور ذریعہ ہر طرح سے سالم' بے خطاء اور انتہائی پاک و پاکیزہ ہونا چاہیے اور اس کا فیصلہ اگر تم خود کرو گے تو اس میں غلطی کا پورا امکان ہو گا اور اس کے علاوہ تم سب کا فیصلہ بھی ایک نہ ہو سکے گا۔ اس فیصلے میں بھی اختلاف ہو گا کہ کون سا ذریعہ اسلم اور پاک ہے اس صورت میں جس اختلاف سے تم بچنا چاہتے تھے وہ تم کو مزید اختلاف میں ڈال دے گا۔ ذریعہ وہ اختیار کرو جس کو اللہ کی تائید حاصل ہو۔ جس کی پاکیزگی کی اللہ نے شہادت دی ہو۔ جن کی اخروی نجات کی خبر قرآنِ کریم نے اسی دنیا میں دے دی ہو۔ جن کی مدح میں ذم کا شائبہ نہ ہو۔ جن کے ایمان و عمل میں دگر گونی نہ ہو۔ ان کا ماضی' حال' مستقبل ہر زمانے میں یک رنگ ہو۔ اس لیے ہماری دینی ضرورت ہم کو مجبور کرتی ہے کہ ہم اللہ اور رسول کے یعنی قرآن و حدیث کے ممدوح اور مذموم کو

پہچانیں تاکہ ہمارا وسیلہ صحیح ہو غلط نہ ہو۔ ممدوح کی مدح اور مذموم کی مذمت قرآنِ کریم نے یوں ہی نہیں کی بلکہ وہ ہمارے لیے عنوانِ ہدایت ہے۔ قرآن کسی کی مدح یا کسی کی مذمت کے لیے نہیں آیا تھابلکہ قرآن کا کُل ہو یا جُز ایک ایک حرف ہدایت کے لیے ہے اگر ہدایت کے تقاضے مدح وذم کے بغیر پورے ہو سکتے تو قرآن جو قانونِ الٰہی کا نام ہے اس کو ان جھگڑوں سے کیا مطلب تھا۔ افعال واعمال پر مدح وذم تو خود نبیؐ بھی کر سکتے تھے۔ اس کی کیا ضرورت تھی کہ یہ مدح وذم اس کتاب کا جزء لاینفک بنادی جائے جس کو مسلمانانِ عالم کے سامنے باقی رکھنے کی قیامت تک کے لیے اللہ نے ضمانت کی ہو جو قیامت تک ہر مسلمان کی تلاوت اور سماعت میں آتا رہے جس کا نتیجہ یہ ہو کہ وہ مذموم بھی جب قرآن پڑھے تو وہ آیت مذمت بھی پڑھے جو اس کے بارے میں ہے اور جب دوسرا اس کے سامنے پڑھے تو وہ اس آیتِ مذمت کو بھی سنے۔ وہ خود نہ رہے لیکن اس کا کردار ہر زبان پر آتا رہے اور ہر کان تک پہنچتا رہے۔ اگر محض ان ہی کی سرزنش مقصود ہوتی، اگر صرف ان ہی کی تنبیہ مقصود ہوتی تو نبیؐ کے ذریعے سے بھی یہ کام لیا جا سکتا تھا قرآن کی صورت میں اس اشتہار عام کی کیا ضرورت تھی۔ اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ خداوندِ عالم ہر زمانے کے مسلمانوں کو اس مدح وذم سے باخبر رکھنا چاہتا ہے تاکہ دیندار ممدوح و مذموم میں امتیاز کر کے صحیح وسیلہ اختیار کر سکے۔ اس لیے یہ جاننا ضروری ہوا کہ ممدوح کون ہے اور مذموم کون ہے۔

امرِ حق کی حفاظت کا اور اس کو قائم رکھنے کا اللہ نے وعدہ فرمایا ہے:

اصول ہوں یا فروع ان میں ایک حد قائم ہوتی ہے اتفاق کی، مثلاً اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ وہ یکتا اور بے مثل ہے، قدیم ہے، لم یزل اور لایزال ہے۔ محمد مصطفیٰؐ اللہ کے نبیؐ، رسول اور آخری نبیؐ ہیں۔ قرآن اللہ کی آخری کتاب ہے۔ کعبہ آخری قبلہ ہے۔ نماز پنجگانہ فرض ہے۔ ماہِ رمضان کے روزے فرض ہیں وغیرہ۔ یہ وہ چیزیں ہیں جن پر کُل امت کا اتفاق اور اجماع رہا ہے اس لیے ان کا صحیح ہونا یقینی ہے کیونکہ دین حق

کی حفاظت اور بقا کا اللہ نے وعدہ فرمایا ہے۔ اس کے بعد آتا ہے اختلاف' مثلاً خدا کا قیامت میں دیدار ہوگا یا نہیں؟ اللہ کے صفات قدیم ہیں یا حادث' صفاتِ خدا عین ذات ہیں یا ذات سے الگ' اللہ خیر و شر دونوں کا خالق ہے یا اس کی طرف سے جو کچھ بھی ہے وہ خیر محض ہے۔ رسولؐ کے آباؤ اجداد کافر ہو سکتے ہیں یا نہیں؟ قبلِ رسالت آپ دیندار تھے کہ نہیں؟ آپ سے قبلِ رسالت یا بعدِ رسالت کوئی گناہ ہو سکتا ہے یا نہیں؟ قرآن میں آیہ رجیم تھا کہ نہیں؟ نماز ہاتھ کھول کر پڑھیں یا باندھ کر۔ اگر ان مسائل میں خواہ وہ اصول کے ہوں یا فروع کے اختلاف ہے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ اختلاف دیکھ کر ہم اصل عقائد و اعمال ہی سے دست بردار ہو جائیں۔ خدا کا جاننا چھوڑ دیں۔ نبیؐ کا دامن چھوڑ دیں۔ نماز پڑھنا ہی چھوڑ دیں۔ نہ یہ کوئی عقلمندی ہو گی کہ اختلاف کے ہر متضاد اور متصادم پہلو کو درست سمجھیں کیونکہ دینِ حق کی بات اصل کے بارے میں ہو یا فرع کے بارے میں ہمیشہ ایک ہے دو نہیں ہو سکتیں لہٰذا اختلاف کا ہر پہلو صحیح نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح اختلاف کی موجودگی کے یہ معنی بھی نہیں کہ اختلاف کا جو بھی پہلو ہے وہ ہر پہلو غلط ہے۔ صحیح بات کچھ اور ہے اگر صحیح بات ان تمام اختلافات سے بالکل باہر کوئی چیز ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ جو دین کا امر حق تھا وہ معدوم ہو گیا اور وہ کہیں بھی باقی نہ رہا اور یہ ہو نہیں سکتا کہ جس دینِ حق کی حفاظت کا وعدہ اللہ نے کیا ہو وہ معدوم ہو جائے۔ خداوندِ عالم فرماتا ہے انا نحن نزلنا الذکر و انا له لحافظون۔ ''ہم ہی نے اس نصیحت کو نازل کیا ہے اور ہم ہی یقیناً حفاظت کرنے والے ہیں''۔ وہ نصیحت کیا ہے؟ دین۔ قرآن بھی دین ہی کا زبردست رکن ہے۔ قرآنِ کریم کی حفاظت بھی دین ہی کی حفاظت کے لیے ہے ورنہ یہ مطلب تو نہیں ہو سکتا کہ دین رہے یا نہ رہے قرآن ضرور رہے گا۔ اصل شے تو دین ہے جس کی رہنمائی کے لیے نبیؐ آئے' قرآن آیا۔ اس ہی وجہ سے دین کے ان رہنماؤں کے لیے بھی اللہ تعالیٰ نے لفظ الذکر فرمایا۔ یعنی رسولؐ کو بھی الذکر کہا جیسے قد انزل الله الیکم ذکراً (10) رسولاً یتلوا

علیکم ایات اللہ...... (طلاق) ''یقیناً نازل کیا ہے اللہ نے تمہاری طرف ذکر کو یعنی رسولؐ کو جو کھلی ہوئی آیات کی تلاوت کرتا ہے'' اور قرآن کو بھی ذکر کہا۔ ان ھو الاّ ذکر و قرآن مبین۔ (یٰسین۔69) ''نہیں ہے وہ لیکن ایک ذکر اور روشن قرآن''۔ پھر سورۂ ص میں قرآن کو ذکر والا فرمایا۔ ص والقرآن ذی الذکر۔ ''ص۔ اس قرآن کی قسم جو ذکر والا ہے' یعنی دین کی رہنمائی کرتا ہے''۔ سورۂ انبیاء (آیت 10) میں دین حق کو ذکر فرمایا ہے۔ لقد انزلنا الیکم کتاباً فیہ ذکرکم افلا تعقلون۔ ''ضرور ضرور ہم نے تمہاری طرف ایک کتاب نازل کی جس میں تمہارا دین (ذکر) ہے کیا تم عقل نہیں رکھتے۔ پھر فرمایا جاتا ہے۔ یٰویلتیٰ لم اتّخذ فلاناً خلیلاً لقد اضلّنی عن الذّکر بعد اذجاء نی (فرقان۔28,29)۔ ''روزِ قیامت ایک ظالم کہے گا کاش میں فلاں کو دوست نہ بناتا اس نے یقیناً مجھ کو دین (ذکر) سے گمراہ کر دیا جبکہ وہ دین مجھ تک آگیا تھا''۔ غرضیکہ ذکر دینِ حق ہے جس کی حفاظت کا اللہ نے وعدہ فرمایا ہے۔ کفار اور مشرکین اسی دینِ حق کو مٹانا چاہتے تھے لیکن اللہ کے وعدۂ حفاظت کے مقابلہ میں ناکام رہے۔ یریدون لیطفئوا نور اللہ بافواھھم واللہ متّم نورہ ولو کرہ الکافرون۔ (صف۔8) ''وہ لوگ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور (دین) کو اپنی سانسوں سے بجھا دیں حالانکہ اللہ تو اپنے نور کو پورا کر کے رہے گا اگرچہ کفار کو ناگوار گزرے''۔ ھو الذی ارسل رسولہ بالھدیٰ و دین الحقّ لیظھرہ علی الدّین کلہ ولو کرہ المشرکون۔ (صف۔9) ''وہ (اللہ) وہی تو ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اس دین کو کل دینوں پر غالب کر دے اگرچہ مشرکین کو ناگوار گزرے''۔ لہذا جس مسئلہ میں پوری امت متفق ہے یقیناً وہ حق ہے اور جس مسئلہ میں اختلاف ہے وہ امرِ حق اس ہی اختلاف کا کوئی موجود پہلو ہے' کیونکہ حق معدوم نہیں ہو سکتا اور چونکہ حق کا وجود ہر زمانہ میں اور ہر لمحہ میں لازمی اور لابدی ہے۔ اس لیے کوئی زمانہ اور کوئی ساعت اور کوئی وقت حق سے خالی نہیں ہو سکتا۔

ختمِ نبوت کی بہترین دلیل :

اگر صدہا برس تک مسلمانانِ عالم صحابہ 'اہل بیت' تابعین' سب کا اس پر اجماع رہا ہے کہ آنحضورؐ کے بعد کوئی نبی نہ آیا ہے نہ آئے گا تو اگر اس کے بعد کوئی مدعی نبوت پیدا ہوا اور بعض مسلمانوں نے مان بھی لیا تو یہ دعویٰ نبوت یقیناً غلط اور باطل ہے کیونکہ دین حق کا وجود ہر ساعت اور ہر زمانہ میں لازمی ہے اور حق سے کوئی زمانہ خالی نہیں ہو سکتا لہذا جو بھی نظریہ جس کو دین سے نسبت ہو اگر اس کی یہ حالت ہو کہ وہ نظریہ معدوم رہ کر کسی وقت لباسِ وجود پہن لے وہ یقیناً ناحق ہے۔ اگر حق ہوتا تو کسی وقت بھی معدوم نہیں ہو سکتا تھا۔ اس فرق کو ہر شخص ذہن نشین کرے کہ کسی نظریہ کا وجود اس کے حق ہونے کی دلیل نہیں ہو سکتا لیکن کسی نظریہ کا فقدان اور عدم اس کے ناحق اور باطل ہونے کی دلیل ہے۔

امرِ حق اختلافات ہی کے اندر کی کوئی چیز ہے :

اگر کسی مسئلہ دینی میں اختلاف ہے اور اس کے دو یا اس سے زیادہ پہلو ہیں تو یہ اختلاف اپنے تمام پہلوؤں کو لیکر اس امر کا اعلان کر رہا ہے کہ کل امت کا اس پر اجماع اور اتفاق ہے کہ امر حق ان پہلوؤں کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں ہے اس کو اجماع مرکب کہتے ہیں مثلاً شبِ قدر کس رات میں ہے ؟ جس میں قرآن نازل ہوا ہے۔ اس پر اجماعِ امت ہے کہ یہ شب ماہِ رمضان المبارک کی ہے لہذا غیر ماہ رمضان کا نظریہ اگر کسی وقت وجود میں آئے تو وہ باطل ہو گا کیونکہ پوری امت خطاء پر اجماع نہیں کر سکتی۔ اب تاریخوں کا اختلاف ہے جو مثلاً انیس سے لے کر انتیس تک ہر شبِ طاق کے لیے ہے۔ اس اختلاف کے معنی یہ ہوئے کہ کل امت اس پر متفق ہے کہ مذکورہ راتوں ہی میں کی کوئی رات ہے جو شبِ قدر ہے اگر کسی وقت مذکورہ راتوں کے علاوہ کسی اور رات کے لیے کوئی دعویٰ کرے تو وہ یقیناً ناحق ہے کیونکہ اگر وہ حق ہوتا تو نظریہ حق کا وجود ہر زمانہ میں موجود رہتا۔ اسی طرح اگر نماز میں بحالتِ قیام ہاتھ کھولنے یا باندھنے میں

اختلاف ہے تو جس طرح یہ غلط ہے کہ دونوں باتیں صحیح ہیں اسی طرح یہ بھی غلط ہے کہ دونوں صورتیں غلط ہوں اور حق کوئی تیسری چیز ہو جس کا کوئی وجود نہیں۔ اسی طرح اگر خلافت کے بارے میں کہ بعدِ رسول حضرت ابو بکر خلیفہ بر حق ہیں یا حضرت علیؑ تو جس طرح دونوں نظریے حق نہیں ہو سکتے اسی طرح دونوں نظریے غلط اور باطل بھی نہیں ہو سکتے۔ ان ہی دونوں نظریوں میں سے کوئی ایک نظریہ حق ہے کیونکہ حق معدوم نہیں ہو سکتا۔ اگر وضو کے آخری فرض میں یعنی پیروں کے دھونے اور مسح کرنے میں اختلاف ہے تو کوئی تیسری چیز نہیں ہو سکتی جو حق ہو۔ ان ہی دو باتوں میں سے کوئی ایک بات ہے جو حق ہے کیونکہ حق کی بقا کا اللہ ضامن ہے۔ اسی طرح اگر پوری امت اس امر پر متفق رہی ہے کہ جنگِ جمل، جنگِ صفین، واقعہ قتل حضرت عثمان، واقعہ کربلا ان واقعات کے وقوع سے صداقتِ قرآن پر کوئی حرف نہیں آتا۔ قرآنِ کریم نے ان واقعات کے ممکن الواقع ہونے سے کہیں انکار نہیں کیا۔ ان واقعات کے وقوع کو ماننے والا ہرگز منکرِ قرآن نہیں ہو سکتا بلکہ ان واقعات کے وقوع کی قرآنِ کریم نے اشارتاً اور حدیث نبوی نے صراحتاً خبر دی ہے (جیسا کہ ہم آئندہ بیان کریں گے) لہذا ان واقعات کے وقوع سے اللہ اور رسولؐ کی تکذیب نہیں بلکہ تصدیق ہوتی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ یہ واقعات اللہ اور رسولؐ کے خبر دینے کی وجہ سے نہیں ہوئے بلکہ اللہ اور رسولؐ نے جو واقعات کہ ہونے والے تھے ان کے بارہ میں خبر دی اب اگر کوئی صاحب اپنی نئی منطق سے یہ کہنے لگیں کہ ان واقعات کو صحیح ماننے سے قرآن کی تکذیب ہوتی ہے اور قرآنِ کریم ان واقعات کو غیر ممکن الوقوع قرار دیتا ہے تو یہ جدید نظریہ جس کا کہیں پہلے وجود نہ تھا خود حرفِ غلط ہے۔ اس کے حق ہونے کا کوئی امکان ہی نہیں کیونکہ اگر یہ نظریہ حق ہوتا تو ہر زمانہ میں اس کا وجود ہوتا۔ مسلمان سب نہیں تو سب میں سے کچھ تو اس نظریہ کے حامل اور حامی رہتے۔ حق کا کہیں تو وجود ہوتا۔ اسی طرح اگر تمام امت کا اس پر اتفاق رہا ہے کہ بدلیل قرآنی مقتولین فی سبیل اللہ زندہ ہیں مردہ نہیں ہیں یہ زندگی کا لفظ مجازی اور غیر حقیقت نہیں ہے اور اب اس کے بعد کوئی صاحب

حیاتِ شہداء کے صاف منکر ہو جائیں اور کہہ دیں کہ یہ زندگی حقیقت نہیں بلکہ نام نہاد' مجازی' محض برائے گفتن ہے اور خدا تعالیٰ کی راہ میں مارے جانے والے انسانوں کی یہ نام نہاد زندگی شرعی طور پر ذبح کیے جانے والے جانوروں گائے' بیل' بکری' مرغی سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی حالانکہ خدا تعالیٰ جانوروں سے تشبیہ دیتا ہے کفار کو ان هم الا کالانعام بل هم اضل سبیلا (فرقان۔44)۔ یہاں یہ ہے کہ صرف عام مومنین کو نہیں بلکہ شہداء مومنین کو عوام کالانعام قرار دے رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر یہی نظریہ حق ہوتا تو ہر زمانہ میں مسلسل اور متواتر رہتا۔ اگر کُل امت نہیں تو امت کے کچھ افراد تو اس نظریے کو اپناتے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کُل امت باطل پر مجتمع ہو جائے اور حق جس کی حفاظت کے لیے وعدۂ خداوندی ہے معدوم ہو جائے۔

قرآنِ کریم کو دافعِ اختلافِ اُمت نہیں قرار دیا جا سکتا:

ممکن ہے کوئی صاحب کہیں کہ جس جس مسئلہ میں اختلافِ امت ہے اس اختلاف کو قرآنِ کریم کے ذریعہ سے کیوں نہ دور کیا جائے اول تو یہ مسئلہ تفصیل طلب ہے کہ آیا قرآنِ کریم نے دین کے تمام جزئیات کو خود حل کرنے کی ضمانت کی ہے؟ اہلِ نظر جانتے ہیں کہ قرآنِ کریم نے صلوٰۃ و زکوٰۃ تک کے جزئیات کو بھی بیان نہیں کیا۔ نماز کے رکعات اس کی مرتب صورت رکعت میں رکوع کا ایک اور سجدہ کا دو ہونا۔ سفر میں قصر ہر نماز کے لیے ہے یا کسی کسی میں اگر کسی کسی میں ہے تو کس کس میں جو نماز قصر ہو گی وہ کتنی کم ہو گی۔ صرف ایک آخری سجدہ یا دونوں سجدے یا پوری ایک رکعت یا زیادہ' زکوٰۃ کس مال پر ہے؟ کتنے مال پر ہے؟ کتنے عرصہ میں ہے؟ زکوٰۃ کی مقدار کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ کچھ بھی تفصیل نہیں ہے۔ بقول شخصے کہ قرآنِ کریم سے تو کتے اور بلی کی بھی حرمت ثابت نہیں ہے۔ پھر یہ بحث بڑی اہم ہے کہ کیا احکامِ شریعت عموماً آیاتِ قرآن آنے پر دیے گئے؟ یا یہ کہ قرآنِ کریم نے عموماً نبیؐ کے دیے ہوئے احکام کی جہاں جہاں مناسب سمجھا تائید کی ہے۔ میرا نظریہ مستقل طور پر یہ ہے کہ باستثنا بعض

جملہ احکامِ شریعت، حلال و حرام کی تشخیص، عبادات کا تعین، فرائض کا تقرر یہ سب سرکارِ رسالتؐ نے عالمِ مشیت الٰہی ہونے کی حیثیت سے نافذ کیے اور سرکار کے نافذ کیے ہوئے احکام کی قرآنِ کریم نے وقتاً فوقتاً تائید کی ہے اور جب کسی سے پہلے واضح کی ہوئی چیز کی تائید کی جاتی ہے تو تائید میں بیانِ جزئیات کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہمارا یہ نظریہ خود آیاتِ قرآنی سے ثابت ہے لیکن اس بحث کو ہم یہاں چھیڑنا نہیں چاہتے۔ اس بحث سے قطع نظر کرتے ہوئے قرآنِ کریم کو دافعِ اختلاف اس لیے نہیں قرار دیا جاسکتا کہ ہر اختلاف کرنے والا اپنے نظریہ کی بناء قرآنِ کریم ہی کو قرار دیتا ہے جو ختمِ نبوت کے قائل ہیں وہ بھی اس ہی قرآن سے ثابت کرتے ہیں اور جو ختمِ نبوت کے منکر ہیں وہ بھی اس ہی قرآن سے اپنا مدعا ثابت کرتے ہیں۔ حیاتِ جناب عیسیٰؑ بھی اسی قرآن سے ثابت کی جاتی ہے اور ان کی موت بھی اس ہی قرآن سے، وضو میں پیروں کا دھونا بھی اسی قرآن سے اور مسح پا بھی اسی قرآن سے۔ خلافتِ علی مرتضیٰؑ بھی اس ہی قرآن سے اور خلافتِ خلیفہ اول بھی اسی قرآن سے، حیات شہداء بھی اسی قرآن سے اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ موتِ شہدا بھی اسی قرآن سے ثابت کرنے کی کوشش ہے۔ جنگِ جمل و جنگِ صفین کا وقوع بھی اس ہی قرآن سے اور ان جنگوں سے انکار کی کوشش بھی اس ہی قرآن سے غرضیکہ ہر شخص اپنے نظریہ کو جائز اور ناجائز قرآن سے دکھا رہا ہے اور ہر باطل پسند الفاظ قرآن کو اپنے خود ساختہ معانی کے سانچے میں ڈھال رہا ہے۔ اسی وجہ سے قرآنِ کریم نے اپنے آپ کو اختلافاتِ امت کا حکم نہیں قرار دیا بلکہ پیغمبرؐ کو اور صرف پیغمبرؐ کو حکم قرار دیتے ہوئے فرمادیا **فلا و ربّك لايومنون حتّى يحكّموك فيما شجر بينهم ثمّ لايجدوا فى انفسهم حرجاً ممّا قضيت ويسلّموا تسليماo** (نساء :65) "اے نبیؐ! تیرے رب کی قسم یہ لوگ مومن نہ ہوں گے تاآنکہ اپنے درمیانی ہر اختلاف میں تم کو حَکَم اور فیصلہ کن قرار دیں اور جو کچھ بھی تم فیصلہ کردو اس کے لیے وہ اپنے دلوں میں کوئی تنگی نہ محسوس کریں بلکہ (تمہارے فیصلہ کو) ایسا مانیں جو ماننے کا حق ہے۔ چنانچہ قرآنِ کریم کی اس قرارداد پر کہ اللہ ہمیشہ حق

کی حفاظت کرے گا نبی کریمؐ نے فیصلہ کن الفاظ میں فرمادیا کہ میری امت خطا یعنی ناحق پر کبھی مجتمع نہ ہو گی۔ اسی وجہ سے میں نے یہ واضح کردیا ہے کہ جو نظریہ دینی امتِ مسلمہ میں کسی وقت بھی معدوم رہا ہو اور اس نظریہ کے خلاف کُل امت مجتمع رہی ہو اور پھر کسی وقت بدقسمتی سے وہ نظریہ معرضِ وجود میں آیا ہو اس نظریہ کے حق ہونے کا کوئی امکان نہیں البتہ جو نظریات ہر زمانہ میں پیہم اور متواتر و مسلسل چلے آتے ہوں امرِ حق ان ہی میں سے کوئی ایک نظریہ ہے جس کو عقل سلیم، قرآن کی تاویل مسلم، حدیثِ ثابت اور تاریخ کے مسلمہ اور متفقہ واقعات کی روشنی میں تلاش کرنا چاہیے۔

ہماری تاریخ کلیتہً نہ لائقِ تسلیم ہے نہ لائقِ انکار:

تاریخ کی حیثیت سے جو کچھ موجود ہے ان سب کی حیثیت ایک جیسی نہیں۔ اس تاریخ میں وہ چیزیں بھی ہیں جن کو پوری امت نے بغیر کسی اختلاف کے تسلیم کیا ہے اور سب یک زبان اور یک قلم ہیں۔ دوسری طرف وہ وہ چیزیں بھی ہیں جن کے بارے میں اختلاف ہے۔ ہر چیز کی مضبوطی اور ہر شے کا استحکام ایک جیسا نہیں ہوتا بعض چیزیں انتہائی مضبوط ہوتی ہیں بعض کی مضبوطی کا درجہ اس سے کم ہوتا ہے۔ انتہائی مضبوط اور مستحکم چیزوں میں اختلاف اور قیل و قال کی گنجائش نہیں ہوتی۔ اس لیے وہاں کوئی اختلاف ہو ہی نہیں سکا۔ جن چیزوں کی مضبوطی کا درجہ نسبتاً کم ہوتا ہے اس میں اختلاف ہو سکتا ہے وہاں نقد و تبصرہ کی ضرورت ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھیے کہ سلاطین مغلیہ کا ہندوستان پر حکمران رہنا اتنی مضبوط چیز ہے کہ اس سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں۔ اسی طرح ان کی باہمی ترتیب کہ بابر، بابر کے بعد ہمایون، ہمایوں کے بعد اکبر، اکبر کے بعد جہانگیر، جہانگیر کے بعد شاہجہان، شاہجہان کے بعد اورنگ زیب، اس سے کون عقل مند انکار کر سکتا ہے لیکن تخت نشینی کے وقت ان کی عمریں کیا تھیں، وفات کے وقت ان کے سن و سال کیا تھے؟ یہ چیزیں بیان میں آنے کے باوجود بھی اتنی مضبوط نہیں ہو سکتیں جتنا کہ ان بادشاہوں کا یکے بعد دیگرے حکمران ہونا۔ اسی طرح

ان بادشاہوں کے زمانہ کے ایک طرف وہ نمایاں اور مضبوط واقعات ہیں جو ایک مسلمہ حقیقت ہیں۔ دوسری طرف وہ واقعات اور جزئیات ہیں جن میں افراط و تفریط کا امکان ہے۔ یہی حال ہماری تاریخ کا ہے۔ اس تاریخ کے وہ امور جو الم نشرح بغیر کسی اختلاف کے مسلمانوں کے ہر مذہب و ملت میں مسلّم اور مشہور ہیں وہ تاریخ کی روح ہیں۔ ان سے انکار نہیں ہو سکتا۔ ان سے انکار کرنا دین سے انکار کرنا ہے۔ تاریخ نام ہے واقعات کا اور واقعات سے بے نیاز ہو کر نہ کارِ دنیا ہو سکتا ہے نہ کارِ دین۔ قرآن یہ تو کہہ سکتا ہے کہ محمدؐ اللہ کے رسول ہیں لیکن یہ بتانا کہ محمدؐ کون ہیں یہ واقعاتی چیز ہے۔ قرآن یہ تو کہہ سکتا ہے کہ کعبہ جو مکہ میں ہے اس کا حج واجب ہے لیکن مکہ کون سا شہر ہے اور کعبہ کونسی عمارت ہے یہ واقعاتی چیز ہے۔ قرآن یہ تو کہہ سکتا ہے کہ نماز روبقبلہ ہو کر پڑھو مگر قبلہ کس جانب ہے یہ واقعاتی چیز ہے۔ قرآن یہ بتا سکتا ہے کہ روزۂ رمضان فرض ہے' روزہ صبح صادق سے شروع ہوتا ہے اور دن کے ختم ہونے تک رہتا ہے لیکن یہ بتانا کہ رمضان شروع ہو گیا' اب صبح ہو گئی' اب شام ہوئی قرآن کا کام نہیں یہ واقعاتی چیز ہے۔ اس کو الگ سے معلوم کرنا ہو گا۔ ایک جلسے کے لیے مکمل اشتہار دیا جاتا ہے جس میں جلسے کی جگہ' جلسے کی تاریخ' جلسے کا وقت' مقررین کے نام سب کچھ موجود ہے لیکن اس اشتہار میں سب کچھ ہوتے ہوئے محض اشتہار سے نہ یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ جو جگہ لکھی تھی وہ یہ ہے' جو تاریخ لکھی تھی وہ آج ہے' جو وقت لکھا تھا وہ آگیا' جن مقررین کو لکھا تھا وہ یہ ہیں۔ یہ تمام چیزیں آپ کو الگ سے معلوم کرنا ہوں گی کیونکہ یہ سب واقعاتی چیزیں ہیں۔ واقعات سے نہ دنیا میں کوئی بے نیاز ہو سکتا ہے نہ دین میں۔ واقعات کا تشخص تاریخ سے ہوتا ہے۔ گزرے ہوئے واقعات کا تاریخِ ماضی سے موجودہ واقعات کا موجودہ تواریخ سے۔ لہذا جہاں تاریخ ہر زبان ہر قلم اور ہر بیان میں ایک ہو اس سے انکار انتہائی بے ذوقی اور بے عقلی کی دلیل ہے البتہ جہاں اختلاف ہو وہاں اس درجہ تفحص کرنا ہو گا کہ شک و شبہ مٹ کر یقین کی حد نظر آ جائے۔ تاریخ کے وہ واقعات جن کا تعلق ہزاروں مسلمانوں سے ہو وہ واقعات جو کھلے میدانوں کے ہوں

جن کو ہر طبقہ کے مسلم اور غیر مسلم مانتے، لکھتے، کہتے چلے آئے ہوں اور کسی نے ان کو دروغ بہتان، افسانہ نہ کہا ہو وہ واقعات تو کیونکر مشتبہ ہو سکتے ہیں۔ تاریخ کا تو وہ واقعہ بھی نہیں جھٹلایا جا سکتا جس کا تعلق صرف ایک ہی متنفس سے ہو کسی چھپی ہوئی جگہ سے ہو، عام نگاہوں سے مخفی ہو لیکن ہو بلا اختلاف سب کا مانا ہوا۔ ہجرتِ نبیؐ کے سلسلہ میں قرآنِ کریم نے صرف اتنا کہا ہے کہ غار میں نبیؐ تنہا نہ تھے بلکہ وہاں نبیؐ کے ساتھ ایک اور بھی تھے۔ وہ کون تھے؟ کیا نام تھا؟ کس خاندان سے تھے؟ اس کا قرآن میں کوئی ذکر نہیں۔ قرآن کسی معین ذات کو ماننے پر مجبور نہیں کر رہا ہے لیکن مسلمانوں کا ہر فرقہ بلا اختلاف یہ مانتا چلا آتا ہے کہ وہ حضرت ابو بکر تھے۔ اس نام کا بلا اختلاف ہونا دلیلِ صحت ہے۔ نہ شیعوں کو یہ شکایت ہے کہ کسی کی حمایت میں یہ افسانہ گھڑ لیا گیا نہ سنی حضرات کو یہ شکایت ہے کہ شیعوں نے کسی تعصب کی وجہ سے اختلاف کیا ہے۔ اسی طرح قرآنِ کریم نے کسی مستورہ پر تہمتِ بے جا لگائے جانے کا ذکر کر کے فرمایا کہ یہ بہتانِ عظیم ہے۔ کس پر تہمت لگائی گئی تھی؟ قرآن کریم نے کسی کا نام نہ لیا۔ تاریخ نے یہ بتایا کہ یہ تہمت ام المومنین پر لگائی گئی تھی۔ تاریخ کا یہ بیان سنی شیعہ مسلمانوں کے ہر فرقہ میں متفق علیہ اور بلا اختلاف ہے۔ لہٰذا تاریخ کے اس بیان اور تعین نام کو کیوں نہ حقیقتِ واقعی سمجھا جائے۔ حضرات شیعہ کسی مسئلہ میں حضرت ابو بکر یا حضرت عائشہ پر لاکھ تنقید کریں لیکن آج تک کسی نے یہ نہیں کہا کہ غار میں آنحضرتؐ کے ساتھ حضرت ابو بکر نہیں کوئی اور تھا یا قرآن نے جس بی بی کی پاکدامنی کی گواہی دی وہ حضرت عائشہ نہ تھیں کوئی اور بی بی تھیں۔ روضہ رسولؐ میں حضرت ابو بکر اور حضرت عمر کے دفن ہونے کا واقعہ کوئی قرآنی واقعہ تو نہیں صرف تاریخی واقعہ ہے مگر بلا اختلاف ہے۔ اس لیے سنی شیعہ دونوں میں سے کوئی بھی اس واقعہ کا منکر نہیں۔ اگر تاریخ بلا اختلاف یہ بتاتی ہے کہ رسول اکرمؐ کے بعد مسلمانوں نے حضرت ابو بکر کی بیعت کی اور وہ عامۃ المسلمین کے خلیفہ فرمانروا اور صاحبِ اقتدار ہوئے اور ان کے بعد ان کی وصیت سے حضرت عمر ہوئے اور ان کے بعد حضرت عثمان اور ان کے بعد حضرت علیؑ خلیفہ ہوئے

تو اس تاریخی حقیقت کو سنی، شیعہ دونوں فرقوں نے بلا اختلاف تسلیم کیا اور کر رہے ہیں۔ کسی کو تاریخ کے مسلمہ واقعات سے انکار نہیں۔ اگر تاریخ یہ بتاتی ہے کہ حضرت عمر کے زمانہ خلافت میں فتوحات کی وسعت ہوئی اور دور دراز کے علاقے اور ممالک زیرِ نگین ہوئے تو شیعوں کو کبھی اس سے انکار نہیں ہوا۔ اسی طرح جنگِ جمل اور جنگِ صفین، جنگِ نہروان اور واقعہ قتل حضرت عثمان ہر اسلامی فرقہ کے نزدیک بلا اختلاف تاریخی مسلمات ہیں۔ اب ان واقعات سے انکار کرنا ایک طرف قرآن کو جھٹلانا ہے کیونکہ قرآن فیصلہ کر چکا ہے کہ امرِ حق کا وجود ہر زمانہ میں رہے گا۔ وہ معدوم نہیں ہو سکتا۔ اگر حق یہی ہوتا کہ یہ جنگیں نہیں ہوئیں تو یہ نظریہ حق ہر زمانہ میں ہوتا، ناپید نہیں ہو سکتا تھا۔ دوسری طرف قولِ نبیؐ کو جھٹلانا ہے۔ سرکار فیصلہ کر چکے ہیں کہ میری امت (پوری) باطل پر مجتمع نہیں ہو سکتی۔ باطل پر یہ اجماعِ امت ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں ہو سکتا۔ اگر ان جنگوں کا ہونا امر باطل ہوتا تو یہ مسئلہ ایک لمحہ بھی بلا اختلاف نہ رہتا۔ پھر پوری امت کا ان جنگوں پر متفق ہونا امت کا اس امر پر اجماع کرنا قرار پا گیا کہ ان جنگوں کا وقوع کسی بیانِ قرآن اور کسی آیتِ قرآن کی صداقت کو مجروح نہیں کرتا بلکہ قرآن نے تو ایسے واقعات کے وقوع کی اور ایسے قتال اور بغاوت کی اشارتاً خبر دی ہے جیسا کہ ہم آئندہ اس کو واضح کریں گے۔ اب تاریخ کی مسلمہ ان جنگوں سے انکار کرنا قرآن و حدیث کا انکار ہے اور اپنی تمام ملت کو بے دین قرار دینا ہے۔

شیعہ اجماعِ امت کے قائل ہیں:

ہم نے اجماعِ امت کا لفظ اپنے پہلے کتابچہ ''صحابیت کا قرآنی تصور'' میں بھی لکھا ہے اور اب بھی ہم برابر یہ لفظ استعمال کر رہے ہیں۔ ادھورا اور جزئی اجماع اس وقت تک کوئی چیز نہیں جب تک اس میں معصوم کی شرکت نہ ہو۔ جس اجماع کی خبر آپ دے رہے ہیں نہ تو وہ کل امت کا اجماع ہے نہ اس میں کسی معصوم کی شرکت ہے جب آپ اس جزئی اجماع کو تسلیم کرتے ہیں جس میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف شامل

ہوں تو ہم اس اجماع کو کیوں نہ تسلیم کریں جس میں پوری امت متفق ہو۔ اور اگر پوری امت نہ ہو تو ان میں سے کوئی فرد شامل ہو جس کی عصمت و طہارت کی خبر قرآن کریم کے آیہ تطہیر نے دی۔ رسولؐ کے اہل بیت ایک طرف امت کے بہترین افراد ہیں دوسری طرف وہی امت کے امام ہیں ان کے بغیر کوئی اجماع حقیقتاً اجماعِ امت نہیں۔

کیا مسلمانوں کی تاریخ عجمی سازش کا نتیجہ ہے؟

عجمی سازش یہ ایک لفظی پردہ ہے جو ہمیشہ عرب کے مومن نما غیر مومنین کی سیہ کاریوں کو چھپانے کے لیے اختیار کیا جاتا ہے۔ سرکار مدینہؐ کے عہدِ مبارک میں صرف ایک عجمی کا پتہ چلتا ہے یعنی سلمان فارسی۔ یہ وہ مقتدر اور معتبر صحابی ہیں جو دین اسلام میں سب کے نزدیک ممدوح اور کامل الایمان ہیں۔ کفار بے شک ان پر یہ تہمت لگاتے تھے کہ قرآن کے مصنف اصل میں سلمان ہیں اور سلمان قرآن تصنیف کر کے محمدؐ کو دیتے ہیں۔ اس کا ذکر خود قرآن نے کیا ہے "لسان الذی یلحدون الیه اعجمیٌ وھٰذا لسان عربیٌ مبین" (سورہ نحل : 103)۔ وہ جس کی طرف یہ لوگ قرآن کو منسوب کرتے ہیں وہ تو عجمی ہے اور یہ قرآن کھلا ہوا زبانِ عربی ہے"۔ پہلے کفار نے قرآن کو عجمی سازش قرار دیا پھر ان کی دیکھا دیکھی کچھ مسلمانوں نے تاریخ کو عجمی سازش قرار دے دیا غرضیکہ عجمی سازش سے نہ قرآن بچا نہ تاریخ بچی۔ حالانکہ نہ قرآن عجمی سازش ہے نہ تاریخ۔ اگر تاریخ میں کچھ غلط سلط چیزیں آگئی ہیں تو وہ بعض حکومتوں کا دورِ حکومت ہے۔ الناس علیٰ دین ملوکھم۔ عجم غریب تو محکوم تھا۔ اس کو حکومت اور خلافت سے کیا تعلق تھا۔ عجم کی خلافت تو کیا ہوتی خلافت کی مسند پر تو وہ مدنی انصار بھی نہ آسکے جن کی جابجا قرآن نے مدح کی ہے اور یہ انصار خود خلافت کے تو کیا قریب آسکتے تھے ان کو تو یہ بھی حق نہ تھا کہ شوریٰ میں شامل ہو کر ہونے والے خلیفہ کے بارے میں رائے ہی دے سکیں۔ یہ وہ ہے اسلامی جمہوریت جس کا نام رکھا جاتا ہے۔ خلیفہ ہو تو قریش اور مجلسِ شوریٰ میں رائے دے سکے تو قریش۔ پھر یہ

منطق بھی عجیب ہے کہ خلافت رسولؐ کے گھر والوں میں رہے گی تو یہ قیصر و کسریٰ جیسی ملوکیت ہو جائے گی مگر رسولؐ کا اپنا قبیلہ ہونے کی وجہ سے قریش میں رہے گی تو یہ ملوکیت نہ ہو گی۔ غیر قریش کتنا ہی قابل ہو، متقی ہو، عادل ہو مگر وہ چونکہ رسولؐ کے قبیلہ کا نہیں اس لیے حقدارِ خلافت نہیں۔ یہاں تک کہ قریش کا وہ شخص تک انصار سے افضل و اعلیٰ اور حقدارِ خلافت ہے جو نہ سابقین اولین میں ہو نہ مہاجرین میں ہو۔ جس کے ایمان لانے کے وقت کی حالت اتنی خطرناک اور مشکوک ہو کہ قرآن کریم تک نے مولفتہ القلوب کہہ دیا ہو۔ کفار نے قرآن کو عجمی سازش کیوں کہا تھا؟ اس کا کیا تُک تھا؟ صرف اس لیے کہ قرآن نے اہل عرب کی سخت سرزنش کی تھی۔ کہیں فرمایا الاعراب اشدّ کفراً ونفاقاً (توبہ :97) کہیں اہل مکہ کے لیے فرمایا۔ وان کانوا من قبل لفی ضلال مبینo (سورۃ جمعہ)۔ کہیں اعراب کے ساتھ اہلِ مدینہ کے لیے فرمایا من الاعراب منافقون ومن اهل المدینة مردوا علی النّفاق الخ (توبہ :101)۔ کہیں فرمایا۔ قالت الاعراب آمنّا قل لم تومنوا ولکن قولوا اسلمنا۔ (حجرات :14) کہیں فرمایا۔ من الناس من یقول آمنا باللّٰہ وبالیوم الاٰخر و ماھم بمومنین (بقرۃ :8)۔ غرض کہ قرآن کریم نے عرب کی وہ لے دے کی کہ کفار کو یہ خیال ہو گیا کہ عرب کو اتنا سخت سست کوئی عجمی ہی کہہ سکتا ہے۔ اسی طرح تاریخ بھی جن بعض بعض چہروں کو داغدار دکھاتی ہے وہ بھی اتفاق سے عربی نژاد بلکہ مکی اور مدنی ہیں۔ اس لیے تاریخ کو بھی عجمی سازش کہہ دیا گیا۔ اگر قرآن نے عرب کے بجائے عجم کی مذمت کی ہوتی اور تاریخ بھی عرب کے بجائے عجم کے پیچھے پڑی ہوتی تو اس صورت میں یہ نہ کہا جاتا کہ یہ سازش عجم ہے مگر نہ قرآن غلط گوئی کر سکتا تھا نہ تاریخ کو یہ موقع تھا کہ وہ رسول کے عہد کے مسلمانوں کو یا رسول کے قریب العہد لوگوں کو عجم بتا دے۔ تاریخ کا یہ پہلو تو مجبوراً قرآن کے ساتھ رہا اور قرآن سے مطابقت کے سوا اس کے لیے کوئی راستہ ہو ہی نہ سکا۔ عجمی سازش کہنے والوں سے کوئی پوچھے کہ کعبہ میں تین سو ساٹھ بت لا کر کیا عجم نے رکھ دیے تھے؟ کعبہ کا برہنہ اور سیٹی

عجاتے ہوئے طواف کرنا اہلِ عرب کو کیا عجم نے سکھایا تھا؟ کیا فحاشی اور بے حیائی پر یہ فخر یہ اشعار کسی عجم کے ہیں؟

ومثلك حبلى قد طرقت و مرضعٍ
قالتها عن ذی تمائم محول
اذا ما بکیٰ من خلفها الضرفت لهٗ
بشقّ و تحتی شقّها لم تحوّل

ترجمہ لکھتے ہوئے حیا آتی ہے۔ مگر شاعر کی بے حیائی اور اس کے ذکر میں یہ بے حیائی۔ پھر بعثتِ نبیؐ پر صاحبِ خلقِ عظیم کو انتہائی جور و جفا' ظلم و تعدی کا نشانہ کیا عجم نے بنایا تھا؟ کیا وہ عجم تھے جنہوں نے مرنجاں مرنج نبی کو اپنے گھر' اپنے وطن سے نکلنے پر مجبور کر دیا تھا؟ کیا نبیؐ پر مدینہ پہنچ جانے کے بعد چڑھائی عجم نے کی تھی؟ یہ نبیؐ کا جھوٹ موٹ مکاری سے کلمہ پڑھنے والے جن کو قرآن کریم نے منافقین' فاسقین' مذبذبین اور کیا کیا کچھ کہا ہے کیا یہ عجمی تھے؟ کیا یہ مخلفین جو کلمہ گو ہونے کے باوجود گھروں میں بیٹھے رہتے تھے اور میدانِ جہاد میں جانا گوارا نہ کرتے تھے وہ عجمی تھے۔ جو لوگ نبیؐ کو برستی تلواروں میں اور نرغہ کفار میں چھوڑ کر چلے جاتے تھے کیا وہ عجمی تھے؟ جن لوگوں کو قرآن نے بار بار طالبِ دنیا کہا۔ منکم من یرید الدنیا (آل عمران: 152) بل تؤ ثرون الحیاۃ الدنیا (اعلیٰ: 16) تریدون عرض الدّنیا (انفال: 67)۔ کیا یہ لوگ عجمی تھے؟ یہ بات بھی دیکھتے جایئے کہ قرآنِ کریم نے ان کی دنیا طلبی کو صیغہ ماضی میں نہیں بلکہ ہر جگہ صیغہ مضارع میں بیان فرما کر ظاہر کر دیا کہ یہ دنیا طلبی ختم نہیں ہوئی بلکہ ماضی کی طرح یہی ان کا مستقبل ہے۔ میدانِ قتال تو پھر خطرناک جگہ ہے جو لوگ خطبہ نمازِ جمعہ میں نبیؐ کو کھڑا چھوڑ کر خرید و فروخت اور لہو و لعب کے لیے چلے جاتے تھے کیا وہ عجمی تھے؟ کیا تقسیم صدقات میں نبیؐ کی تقسیم کو نا منصفانہ کہنے والے اور نبیؐ پر الزام لگانے والے نبیؐ کو کچے کانوں کا کہنے والے نبیؐ کو اذیت دینے والے اور جہاد کے لیے نبیؐ کے حکم دینے پر زمین کا بوجھ بن

کر چمٹ جانے والے کیا یہ لوگ عجم کے تھے؟ اب بتایئے کہ جن لوگوں کے مزاج کی افتاد بروئے قرآن یہ ہو اور ایسے حرکات جن کی طبیعت ثانیہ بن گئی ہو کیا ایسے لوگوں کا مسلمانوں میں فتنہ و فساد کی آگ کو بھڑکا دینا اور آمادہ خونریزی ہو جانا اور جس دین میں وہ ناخوشی سے آئے تھے اس دین سے خوش ہو کر ان کا نکل جانا کوئی تعجب کی بات ہے؟ ان لوگوں کا یہ کردار قرآن اور قرآن کی مطابقت میں تاریخ اگر بیان کرے تو اس کو فتنہ عجم قرار دینا بجائے خود فتنہ کبریٰ ہے اگر عجمی سازش نے مسلمانوں کی تفسیر' تاریخ' کلام اور فقہ سب کو پلٹ کر رکھ دیا تو عرب کہاں سو رہے تھے اور پاسبانِ حرمین کہاں تھے؟ کوئی تو اپنے گھر کی صحیح تاریخ بتاتا' کوئی کتاب تو عجمی سازش سے بچتی۔

عجمی سازش سے کیا مراد ہے؟

اگر عجمی سازش سے شیعہ مراد ہیں اور یہ مطلب ہے کہ ان لوگوں نے اپنے مسلک کی حمایت میں منافقوں کے قتلِ عام کا واقعہ جو عہد رسولؐ کا تھا اس کو ایسا چھپا دیا کہ جو نہ کسی سنی زبان پر آسکا نہ کوئی سنا قلم لکھ سکا نہ کسی کو یاد رہا پھر ان لوگوں نے جمل اور صفین کے معرکے تصنیف کیے' واقعہ قتل حضرت عثمان گھڑا کہ اہلِ مدینہ بھی اپنے امیر کا صحیح واقعہ وفات یعنی طبعی موت کو' اپنے ہاتھوں سے ان کو غسل دینا' کفن پہنانا اور ہزاروں کا مل کر جنازہ اٹھانا' نماز جنازہ پڑھنا' دفن کرنا سب بھول گئے اور اب ان کے سامنے صرف ان کے قتل اور خون آلود قمیص کا بے بنیاد طلسمی منظر رہ گیا اور وہ اس طلسم کو حقیقت سمجھنے لگے' پھر ان لوگوں نے حضرت معاویہ کا برسرِ منبر اور عین خطبوں میں علیؑ مرتضیٰؑ پر سبّ و طعن کرنا اور تادیر اس سلسلہ کا قائم رہنا تصنیف کر لیا اور تمام ملتِ اسلامیہ کو عجموں کے ان گھڑے ہوئے افسانوں کا یقین آگیا یہ عجموں نے کیوں کیا؟ آپ یہی کہیں گے کہ اپنے مذہب کی حمایت میں۔ تو جناب والا یہ عجم اتنی دور کیوں چلے گئے۔ یہاں تک ان کو چلنے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ سرے ہی سے کیوں نہ چلے' انہوں نے یہ کیوں نہ کہہ دیا کہ غارِ ثور میں آنحضرتؐ کے ساتھ خلیفہ اول نہ تھے کوئی اور تھا' وہ

تہمت جس کی نفی قرآن نے کی ہے اس سے مراد حضرت عائشہ نہیں کوئی اور ہیں۔ حضرت عائشہ کو (معاذ اللہ) نبیؐ نے علیؑ کے کہنے سے طلاق دے دی تھی اس لیے وہ علیؑ کی دشمن ہو گئی تھیں۔ یہ دشمنی جنگِ جمل کا سبب ہوئی۔ پھر ان لوگوں نے یہ تسلیم ہی کیوں کیا کہ رسولؐ کے بعد خلیفہ ہوئے حضرت ابو بکر پھر حضرت عمر پھر حضرت عثمان۔ اس کی بجائے یہی کیوں نہ کہا کہ علی مرتضٰی ہی پہلے دن سے بااقتدار خلیفہ ہوئے اور آخر دم تک خلافت کرتے رہے۔ آج تک شیعوں سے اس کا جواب طلب کیا جاتا ہے کہ اگر خلافت علی کا حق تھا تو انہوں نے جنگ کیوں نہ کی۔ اگر عجمی سازش والے منافقین کے یکسر قتل کیے جانے کو چھپا سکتے تھے اور جنگِ جمل و صفین وغیرھما کو تصنیف کر سکتے تھے تو ان کو کیا مشکل تھی کہ وہ علی مرتضیٰؑ کا خلیفہ اول و ثانی سے قتال کرنے کا گرما گرم واقعہ بھی تصنیف کر کے شیعوں کو اعتراضِ مذکور کے جواب سے سبکبار کر دیتے کہ پھر کوئی یہ سوال ہی نہ اٹھا سکتا لیکن جن چیزوں کا کوئی وجود ہی نہ تھا وہ تاریخ میں آتیں کیسے اور اگر آتیں تو کوئی نہ کوئی مردِ خدا پیدا ہو کر ترکی بہ ترکی جواب دے کر تردید کر دیتا۔ یہ کرامات تو آج کل کی ہے کہ جو صحیح واقعات ہوں ان کو افسانہ کہا جائے اور جو من گھڑت اور بے حقیقت دماغی اختراع ہو (کہ نبیؐ نے چن چن کر ایک ایک منافق کو قتل کر دیا تھا یا اپنے قلمرو سے نکال دیا تھا) اس کو واقعہ اور قرآنی واقعہ قرار دے دیا جائے۔

حیاتِ شہداء سے انکار انکارِ قرآن ہے :

کہا جاتا ہے کہ آیتِ قرآنیہ میں جو شہداء کے لیے لفظِ احیا' ہے اس کے معنی زندہ ہیں کے نہیں بلکہ احیاء کے معنی ہیں مردہ قوموں کو زندہ کرنے والے ورنہ قیامت تک ان کی زندگی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ان کو مردہ کہنے سے صرف احترامًا روکا گیا ہے جیسے کہ ذبیحہ کو مردہ نہیں کہا جاتا۔

خلافت کا وعدۂ خداوندی :

وعداللّٰہ الذین آمنوا منکم وعملوا الصّٰلحٰت لیستخلفنّھم

فی الارض کما استخلف الّذین من قبلهم ولیمکنّن لٰهم دینهم الّذی ارتضٰی لهم و لیبدّ لنهم من بعد خوفهم امناًط یعبدوننی لا یشرکون بی شیئاًط ومن کفر بعد ذالك فاولٰئك هم الفٰسقون o۔(سورہ نور :55)

ترجمہ : تم میں سے جو ایمان لا چکے اور نیک عمل کرتے رہے اللہ تعالیٰ نے ان سے وعدہ کیا ہے کہ وہ ضرور انہیں زمین میں خلیفہ بنائے گا جیسا کہ اس نے ان کو خلیفہ بنایا تھا جو ان سے پہلے بھی اور وہ ان کے دین کو جسے اس نے ان کے لئے پسند فرمایا ہے ضرور تمکین دے گا اور ضرور ان کے خوف کو امن سے بدل دے گا۔ وہ میری ہی عبادت کریں گے اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گے اور جو اس کے بعد ناشکری کرے گا وہی لوگ فاسق ہیں۔

درج بالا آیت سے ہمارے بھائیوں نے تین نتائج اخذ کئے ہیں :

(۱) خلافت ارضی کے متعلق

(۲) تمکین دین کے بارے میں

(۳) خوف کو امن سے بدلنے کے سلسلے میں

اگر آپ یہ فرمائیں کہ وعدہ کیے جانے والے حضرات کو آیت نے آمنوا اور عملوا الصالحات کہہ کر صیغہ ماضی میں بیان کیا ہے اور اس ماضی کے صیغہ سے آپ نے صحابہ کی تخصیص سمجھ لی اور آپ کے نزدیک یہ بات بنی کہ جو لوگ مومن اور نیک ہو چکے تھے وعدہ ان سے ہوا اور جو لوگ آئندہ اوقات میں مومن اور نیک ہوں گے۔ ان سے یہ وعدہ نہ ہوا تو پھر یہ بھی کہیے کہ قرآن مجید نے جس قدر بھی احکام یاایها الذین آمنوا کہہ کر دیئے ہیں وہ سب صرف صحابہ کو دیئے گئے ہیں۔ آئندہ اوقات کے مومن ان احکام کے محکوم نہیں ہیں جیسے یاآیّھاالّذین آمنوا اطیعوا الله واطیعوا الرسول واولی الامر منکم۔(سورہ نساء :59)''اے وہ لوگو جو ایمان

لائے ہو اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول اور اولی الامر کی جو تم میں سے ہیں"۔
کہہ دیجئے کہ اللہ' رسول' اولی الامر کی اطاعت صرف صحابہ پر فرض ہے۔ بعد کے مسلمانوں پر نہیں۔ کیا یہی سمجھ کر آپ ان اطاعتوں سے دست بردار ہو رہے ہیں۔ افسوس' لیکن اگر اللہ' رسول' اولی الامر کی اطاعت صرف صحابہ پر ہے تو اس کے معنی خود بخود یہ ہوئے کہ صحابہ خود اولی الامر نہیں بلکہ وہ تو اولی الامر کی اطاعت کرنے والے ہیں۔ اگر آیہ استخلاف میں آمنوا اور عملوا الصالحات کے صیغہ ماضی ہونے کی وجہ سے خلافت کا وعدہ صرف صحابہ سے ہے تو سورۂ عصر میں فرمایا جا رہا ہے والعصر انّ الانسان لفی خسر الاّ الذین آمنوا وعملوا الصّالحات وتواصوا بالحقّ وتواصوا بالصّبر۔ "عصر کی قسم' انسان خسارہ میں ہے سوائے ان کے جو ایمان لائے اور انہوں نے نیکیاں کیں اور حق اور صبر کی وصیت کی"۔ یہاں آمنوا' عملوا' تواصوا یہ سب صیغے ماضی کے ہیں۔ یہاں بھی کہہ دیجیے کہ اخروی نجات صرف صحابہ کے لیے ہے بعد والی ساری امتِ مسلمہ خسارہ میں ہے اور قیامت تک کے سب مومنین دوزخی ہیں (پناہ بخدا) اگر آمنوا اور عملوا الصالحت سے صحابہ کی تخصیص ہو گئی تو خود آپ کا حشر کیا ہو گا؟ اور اگر یہ فرمائیں کہ ہم نے صرف آمنوا اور عملوا الصالحات سے صحابہ کی تخصیص نہیں سمجھی بلکہ وعدۂ خلافت والی آیت میں ہے منکم (تم میں سے) یہ ضمیر خطاب اور ضمیر حاضر ہے اس سے ثابت ہو رہا ہے کہ یہ وعدہ صرف صحابہ سے ہے کیونکہ وہی حاضر تھے تو جناب والا قرآن نے اپنے صدہا احکام میں خطاب اور حاضر ہی کے صیغے استعمال کیے ہیں۔ کتب علیکم الصّیام کما کتب علی الّذین من قبلکم "تم پر روزے فرض کیے گئے جس طرح کہ تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیے گئے تھے۔ واللّٰہ الغنّی وانتم الفقراء (سورۃ محمد: 38)۔ اللہ غنی ہے اور تم نادار ہو۔ وما اوتیتم من العلم الاّ قلیلاً۔ "تم کو علم نہیں دیا گیا مگر تھوڑا۔ اقیموا الصلوٰۃ واتوا الزکٰوۃ۔ "نماز کو قائم کرو اور زکٰوۃ ادا کرو۔ اطیعوا اللّٰہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم۔ "اطاعت کرو اللہ کی' اور اطاعت کرو ان کی

جو تم میں سے رسول اور اولی الامر ہیں۔قل لا اسئلکم علیه اجراً الاّ المودّة فی القربیٰ۔ "رسول کہہ دو کہ میں تم سے تبلیغ پر سوائے محبتِ اہل بیتؑ کے اور کچھ نہیں مانگتا۔ تو اب فرمادیجئے کہ یہ سب احکام صرف صحابہ کے لیے ہیں۔ آئندہ مسلمانوں پر نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، اطاعتِ خدا اور رسول و اولی الامر کچھ بھی نہیں۔ افسوس کہ آپ نے وعدۂ خلافت میں صحابہ کی تخصیص کر کے قرآنی احکام اور قرآنی بشارتوں کو حرفِ غلط قرار دے دیا۔ کہیے کہ آپ کا بنایا ہوا یہ قلعہ کہ وعدۂ خلافت صحابہ رسول سے ہوا کھڑا رہ گیا یا مسمار ہوا۔

صرف ان تین کا آپ کو نظر آنا اور وہ چوتھا جس نے وعدہ کیا ہے کہ وہ خود خلیفہ بنائے گا اس کا نظر نہ آنا کیا یہ بھی کسی عقیدت کی بنا پر ہے۔ ہم کو اس آیت میں تین ہی نہیں بلکہ سات چیزیں نظر آرہی ہیں (۱) اللہ خود خلیفہ بنائے گا (۲) جیسے کہ وہ پہلے حضرات کو خلیفہ بنا چکا ہے (۳) اور ان کے لیے ان کے اس دین کو تمکین دے گا جس دین کو اللہ نے ان کے لیے پسند کیا ہے (۴) ان کے خوف کے بعد ان کے خوف کو امن سے بدل دے گا (۵) وہ صرف میری فرمانبرداری کریں گے اور کسی شے کو میرا شریک نہ کریں گے (۶) کچھ لوگ اس خلافتِ حقہ کے قائم ہونے کے بعد اس خلافت کے منکر ہوں گے (۷) یہ انکار کرنے والے فاسقین ہوں گے (سورۂ منافقوں میں اللہ نے فاسقین کہا ہے منافقین کو) اب ہم کو ان ساتوں امور کے متعلق بیان کرنا ہے۔

اب ہم ان ساتوں چیزوں کی تفصیل کرتے ہیں۔

(۱) اللہ نے وعدہ کیا ہے کہ وہ خود خلیفہ بنائے گا اور خود خلیفہ بنانے کے لیے مزید توضیح کردی یہ فرما کر کہ جس طرح پہلے حضرات کو اللہ نے خلیفہ بنایا تھا اور یہ ظاہر ہے کہ اللہ نے کسی وقت اور کسی مرحلہ میں بھی قرار دادِ خلافت کے لیے نہ کبھی کسی سے رائے لی نہ کسی کی رضامندی پر نظر کی بلکہ جب خلافت کے ابتدائی مرحلہ پر معصوم فرشتوں نے اتجعل فیها من یّفسد فیها ویسفك الدماء کہہ کر ایک حد تک رائے زنی کی تھی تو خداوندِ عالم نے انّی اعلم

مالا تعلمون کہہ کر ان کو خاموش کر دیا تھا اور فرشتوں کو بتا دیا تھا کہ تمہارا کام صرف تعمیل حکم اور خلیفہ کو مان لینا ہے نہ یہ کہ تم خود کوئی رائے زنی کرو۔ آدمؑ ہوں یا نوحؑ 'ابراہیمؑ ہوں یا اسمٰعیلؑ واسحاقؑ ویعقوبؑ ہوں یا یوسفؑ و داؤدؑ ہوں یا سلیمانؑ 'موسیٰؑ ہوں یا عیسیٰؑ 'زکریاؑ ہوں یا یحییٰؑ غرضیکہ آدمؑ سے لے کر نبی خاتمؐ تک جس کو بھی خلیفہ بنایا خود اللہ نے بنایا۔ نہ بندوں سے مشورہ لیا نہ کسی کو مشورہ دینے کا حق دیا۔

(۲) لہذا جس طرح قبل میں اللہ تعالیٰ بلاشرکت غیرے خود خلیفہ بناتا رہا ہے بالکل اسی طرح اب بھی وہ خود ہی خلیفہ بنائے گا۔ اللہ اب تک خلیفہ بناتا رہا ہے ہوا تا نہیں رہا۔ اب بھی بنائے گا بنوائے گا نہیں۔ اب بتایئے کہ آیت کی یہ پہلی نشان دہی کن حضرات کے حق میں طے پائی۔ کیا ائمہ اثنا عشر کے سوا کوئی اور ہے جس کو بندوں کی رائے سے قدرت نے بے نیاز رکھ کر خود خلیفہ بنایا ہو۔ غیر معصوم انسانوں کو تو خلیفہ بنانے کا کیا حق ہوتا جبکہ موسیٰ علیہ السلام نبی ہوتے ہوئے اپنی رائے اور اپنے اختیار سے کسی کو اپنا قوتِ بازو اور وزیر نہ بنا سکے۔ خدا تعالیٰ ہی سے عرض کیا کہ تو میرے بھائی ہارون کو جو میرے اہل سے ہے میرا گواہ' میرا وزیر' میرا شریکِ کار بنا دے۔ امت نے کبھی بھی خلیفہ نہیں بنایا اور یہ ہو بھی کیسے سکتا تھا۔ خلیفہ پہلے ہوتا ہے امت بعد میں بنتی ہے نہ یہ کہ امت پہلے ہو اور خلیفہ بعد میں ہو۔ اس کے ساتھ آیت یہ بھی بتا رہی ہے کہ یہ وعدہ خلافت ہر مومن صالح سے نہیں ہوا کیونکہ منکم کہہ کر بتایا جا رہا ہے کہ وہ مومنین صالحین میں سے مخصوص ہیں جن کی خصوصیت اور انتخاب ایمان اور عمل صالح کے معیار پر ہے۔ یہ وعدہ خلافت ان سے ہوا ہے جہاں ایمان و عمل صالح انتہائی درجہ کمال پر ہو جس کی بنا پر اس صاحب ایمان کو کل ایمان کہا جائے اور اب دوسروں کا ایمان نام ہو' اس کی محبت کا۔ اسی طرح جہاں عمل صالح کا کمال ہوگا وہاں رجسِ گناہ کا گزر بھی نہ ہوگا' وہاں نیکی

میں بدی کی آمیزش نہ ہوگی اسی کا نام عصمت و طہارت ہے لہٰذا آیت سے جہاں یہ ثابت ہے کہ اللہ بغیر کسی کی رائے زنی کے خود خلیفہ بنائے گا وہاں یہ بھی ثابت ہوا کہ معصومین اور طاہرین کو خلیفہ بنائے گا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اللہ پاک و پاکیزہ تو قرار دے کسی کو اور خلیفہ بنائے کسی اور کو' اور یہ صورت ہو جائے کہ جن کو اللہ نے پاک و پاکیزہ قرار دیا ان کو خلیفہ نہ بنایا اور جن کو خلیفہ بنایا ان کو اس نے پاک و پاکیزہ نہ قرار دیا۔ البتہ قرآنِ کریم خبر دے رہا ہے کہ حضرات اہل البیت وہ ہیں جن سے ہر رجس کے دور رکھنے کا اور جن کی انتہائی تطہیر کا الٰہی ارادہ ہے اور رہے گا۔ یہ وہ حضرات ہیں جن کی انتہائی پاکیزگی اللہ کی مراد ہے لہٰذا یہی حضرات آمنوا و عملوا الصالحات کی مکمل تصویر و تفسیر ہیں اور ان ہی سے اللہ کا وعدہ خلافت ہے۔

(۳) اب رہی ان کے لئے تمکینِ دین جس سے لوگوں نے غلبہ اور حکومت مراد لیا ہے۔ حالانکہ آیت پہلے ہی فیصلہ کر چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ اب بھی اسی طرح خلیفہ بنائے گا جس طرح اس سے پہلے (انبیاء کو) خلیفہ بنا چکا ہے تو جو انداز انبیاء کی تمکین کا رہا ہے وہی انداز تمکین کا ان کے لیے ہوگا۔ انبیاء سابقین میں سے ہر ایک کو غلبہ 'اقتدار' حکومت کا موقع حاصل نہیں ہوا۔ تاریخ و حدیث کو اگر بالکل چھوڑ دیا جائے تو صرف قرآنی شہادتیں بار بار ثابت کر رہی ہیں کہ انبیاء علیہم السلام عموماً اہل زمانہ کے مظلوم اور مقہور رہے اور ان کی ساری زندگی مغلوبیت اور مظلومیت میں گزری۔ افکلّما جاءکم رسولٌ بما لا تھویٰ انفسکم استکبرتم ففریقاً کذّبتم وفریقاً تقتلون۔ (بقرہ: 87) ''تمہارے پاس جب بھی کوئی رسول تمہاری خواہشوں کے خلاف آیا تو تم نے تکبر کیا یعنی اپنے آپ کو ان سے بہتر و برتر سمجھا۔ پس کسی گروہ انبیاء کی تم نے تکذیب کی اور کسی گروہِ انبیاء کو تم قتل کرتے رہے۔ ویقتلون الانبیاء بغیر حقo (آل عمران: 112)۔ ''تم نے انبیاء خدا کو

کیوں ناحق قتل کیا؟ انّ القوم استضعفونی و کادوا یقتلونی۔(اعراف :150)" جناب ہارونؑ حضرت موسیٰؑ سے کہہ رہے ہیں کہ بھائی قوم نے مجھے کمزور اور ناتواں کر دیا بلکہ قریب تھا کہ وہ مجھے قتل کر دیں۔ غرض کہ انبیاء کی اکثریت کو تادم آخر جھٹلایا جاتا رہا اور ان کو قتل کیا جاتا رہا۔ صرف معدودے چند نبی ہیں جن کو غلبہ اور اقتدار حاصل ہوا۔ اگر ہزار میں سے ایک کو اقتدار اور غلبہ ملا، تو نو سو ننانوے بے اقتدار اور مظلومانہ زندگی گزار کر چلے گئے لیکن اللہ کے بنائے ہوئے خلیفہ برحق سب ہیں۔ اسی طرح یہاں بھی ہونا چاہیے تاکہ سنتِ اللہ میں تبدیلی نہ ہو اور اللہ کی فرمائی ہوئی تشبیہ کما استخلف الذین من قبلھم غلط نہ ہو اگر یہاں ہر خلیفہ بااقتدار اور باحکومت ہوگا اور کوئی بھی خلیفہ اپنی پوری زندگی مظلومیت میں نہ گزارے گا تو آیت صاف کہہ رہی ہے کہ یہ لوگ سابق کے خلفا کی طرح نہیں ہیں ان سے اللہ کا وعدہ خلافت نہیں ہے۔ پہلے تو ہزاروں میں سے ایک بااقتدار ہوا تھا لیکن یہاں جس کو دیکھو ہر ایک بااقتدار ہے جو دلیل آپ کی انتہائی مضبوط سمجھی ہوئی تھی وہ آپ کے انتہائی خلاف اور میرے مسلک کے لئے انتہائی موافق ہے۔آپ کا یہ فرمانا "تاریخ کے مطابق حضرت علیؑ کی چند سالہ اور حضرت حسنؑ کی چند ماہ کی پریشان خلافت کے علاوہ باقی کسی امام کو خلافت میسر ہی نہیں آئی" جناب والا! یہی تو دلیل ہے اس امر کی کہ ان حضرات سے اللہ نے اس خلافت کا وعدہ فرمایا ہے جو خلافت پہلے کے انبیاء کو دے چکا ہے۔ اگر انبیاء مظلوم و مقتول ہوتے رہے مگر خلیفہ برحق رہے تو یہ بھی ان ہی جیسے تو ہیں۔ ہاں خلیفہ بارہ ہیں اور جب تک وہ بارہواں آنہ جائے قیامت نہیں آسکتی پھر اللہ کا وعدہ تمکین اور اقتدار پورا ہو جائے گا۔ اس آخری امام (مہدیؑ) کو وہ حکومت اور غلبہ اور وہ اقتدار حاصل ہوگا جو نہ اب تک کسی آنکھ نے دیکھا ہو نہ کسی کان نے سنا ہو۔ زمین عدل وانصاف سے بھر جائے گی

اور ظلم وجور حرف غلط کی طرح مٹ جائے گا۔ مشرق سے مغرب تک ان کے دین (اسلام) کا علم سربلند ہوگا۔ اگر آدمؑ کے لئے ملائکہ سربسجود ہوئے تھے تو خاتم الخلفاء (مہدیؑ) کے لئے حضرت عیسیٰؑ اپنے رکوع و سجود میں ان کی اقتداء کریں گے۔ دنیا باقی ہے' وعدہ تمکین باقی ہے۔ دین اسلام کے تمام ادیان عالم پر غالب آنے کا وعدہ خدا باقی ہے۔ آپ مستقبل کی چیز ماضی میں کیوں ڈھونڈ رہے ہیں۔ اگر آپ یا کوئی آپ کا ہم نوا یہ فرمائے کہ وعدہ تمکین میں تو ضمیر جمع ہے لھم دینھم۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک کے لئے وعدہ تمکین نہیں ہے بلکہ ہر ایک کے لئے ہے تو میں عرض کروں گا کہ ایک لمحہ کے لئے آیات قرآن پر نظر فرمالیجئے۔ خدا تعالیٰ نے ہمارے نبیؐ کے عہد میں جو بنی اسرائیل آنحضور کے سامنے تھے ان کو پکار پکار کر صیغہ خطاب میں فرمایا اذ نجّینٰکم من آل فرعون یسو مونکم سوءَ العذاب یذبحّون ابناء کم و یستحیون نساء کم و فی ذالکم بلاء من ربکم عظیم ”اے بنی اسرائیل ہم نے تم کو آل فرعون سے نجات دی جو تم کو بدترین دکھ پہنچا رہے تھے۔ تمہارے بیٹوں کو ذبح کرتے اور تمہاری بیٹیوں کو زندہ چھوڑ دیتے تھے اور یہ تمہارے رب کی طرف سے تمہاری بڑی آزمائش تھی“۔ حاضر الوقت جن بنی اسرائیل سے خطاب ہے نہ یہ فرعون کے زمانہ میں تھے نہ ان کو آل فرعون نے کوئی دکھ پہنچایا تھا نہ ان کے بیٹوں کو ذبح کیا جارہا تھا۔ یہ سب تذکرہ ان کے آباؤ اجداد کا ہے۔ رفعنا فوقکم الطّور ہم نے اسے بنی اسرائیل تم پر کوہ طور کو بلند کیا حالانکہ کوہ طور حاضر الوقت بنی اسرائیل پر نہیں بلند کیا گیا۔ یہ ذکر بھی ان کے آباؤ اجداد کا ہے۔ انزلنا علیکم المنّ والسلویٰ ”اے بنی اسرائیل ہم نے تم پر من و سلویٰ نازل کیا“۔ حاضر الوقت بنی اسرائیل پر کوئی من و سلویٰ نہیں اترا یہ ذکر بھی ان کے آباؤ اجداد کا ہے۔ ثم اتخذتم العجل ”پھر تم نے گئوسالہ بنایا“۔ حالانکہ گئوسالہ انہوں

نے دیکھا تک نہیں تھا۔ یہ ذکر بھی ان کے آباواجداد کا ہے۔ اذقتلتم نفساً ''اے بنی اسرائیل جبکہ تم نے ایک آدمی کو قتل کیا'' جس آدمی کے قتل کا ذکر ہے وہ مقتول آج سے صدہا برس پہلے ان کے آباؤاجداد کا قتل ہوا تھا۔ واذ قلتم یا موسی لن نومن لك حتّٰی نری الله جهرةً ''جب تم نے کہا کہ اے موسیٰ ہم اللہ کو صاف دیکھے بغیر تم پر ایمان ہرگز نہ لائیں گے'' واذ قلتم یا موسٰی لن نصبر علی طعام واحد ''اے بنی اسرائیل جبکہ تم نے کہا کہ اے موسیٰؑ ہم ایک کھانے پر ہرگز صبر نہ کریں گے''۔ حالانکہ حاضر الوقت بنی اسرائیل حضرت موسیٰؑ کے زمانہ میں تھے کہاں؟ یہ سب ان کے آباؤ اجداد کا ذکر ہے لیکن کیا قرآن مجید نے موجوہ قبیلہ بنی اسرائیل سے سابقہ امور کی نسبت دے کر کوئی غلط بیانی کی ہے ہرگز نہیں۔ کیونکہ حاضرین وقت ہوں یا گزشتگان ان سب کا گھرانہ ایک ہے یہ آپس میں ایک دوسرے کے ہم خیال ہیں۔ ان سب کے رجحانات ایک ہیں لہذا ایک کی بات سب کی بات ہے' اس سے ثابت ہوا کہ ایک گھرانے کے افراد جو باہم ہم خیال ہوں' جو رجحانات میں یکساں ہوں' ان میں سے جو چیز بعض کے بارے میں ہوگی وہ چیز ازروئے قرآن سب کے بارے میں ہوگی۔ ایک کی حکومت سب کی حکومت ہے۔ ایک کا اقتدار سب کا اقتدار ہے۔ ایک کے لئے تمکین سب کے لئے تمکین کہی جائے گی۔ ایک کے لئے خوف کے بعد امن سے تبدیلی سب کے لئے امن سے تبدیلی ہے۔ مہدی دین اور ان سے پہلے کے ائمہ یہ تو وہ ایک گھرانہ ہے جو روحانیت میں' نورانیت میں عصمت و طہارت میں امامت و خلافت میں ہر طرح سے ایک ہیں۔ لوگوں نے بھی تو حضرت عیسیٰؑ کی قوم کے غلبہ واقتدار کو خود حضرت عیسیٰؑ کا اقتدار اور تمکین فی الارض قرار دیا ہے حالانکہ خود حضرت عیسیٰؑ کو اس دنیا میں نہ کوئی غلبہ حاصل ہوا نہ کوئی اقتدار وہ تو انتہائی مغلوب و مظلوم رہے اور غلبہ واقتدار حاصل ہوئے بغیر اٹھا لئے

گئے۔ اب اگر ان کے متبعین ان کے بعد غالب آگئے اس طرح یہ غلبہ خود حضرت عیسیٰؑ کا غلبہ قرار پا گیا۔ یہ بات تو اظہر من الشمس ہے کہ انبیاء میں سے غلبہ صرف معدودے چند حضرات کو ملا ہے لیکن قرآن مجید نے ان معدودے چند انبیاء کے غلبہ کو کل انبیاء کا غالب آنا قرار دے کر فرمایا ہے۔ کتب اللّٰہ لاغلبنّ انا و رسلی انّ اللّٰہ قویٌ عزیز (سورہ مجادلہ :21) ''اللہ نے کہہ دیا ہے کہ میں اور میرے مرسلین ضرور ضرور غالب آئیں گے یقیناً اللہ قوی اور غالب ہے''۔

۴۔ اس کے بعد آیت میں ہے۔ ولیبدّ لنھّم من بعد خوفھم امناًo (سورہ نور :55) ''اور ضرور ضرور اللہ ان کے خوف کو امن سے بدلے گا۔ اس جملہ سے صاف پتہ چلتا ہے کہ تمکین اور اقتدار حاصل ہونے تک ان خلفاء کا پورا زمانہ مسلسل خوف و مغلوبیت میں گزرے گا۔ اور یہ خوف مسلسل اس وقت زائل ہو گا جس وقت یہ برسر اقتدار آئیں گے۔ اقتدار سے پہلے نہ خوف زائل ہو گا نہ امن و سکون حاصل ہو گا۔ اگر اس نکتہ پر توجہ کی جائے تو آپ کے بااقتدار خلفاء پر یہ بات پوری نہیں اترتی کیونکہ ہر خلیفہ خلافت واقتدار حاصل ہونے سے پہلے ہی بے خوف اور امن میں تھا۔ یہ نہیں کہ خلافت واقتدار ملنے سے ان کو امن نصیب ہوا ہو۔ اور اقتدار حاصل ہونے کی گھڑی تک وہ خائف اور مغلوب تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی نصرت اور فتح پہلے یہ آچکی تھی اور دین خدا میں افواج داخل ہو چکی تھیں۔ اب یہ کس سے مغلوب اور خائف تھے۔ یہ نکتہ بھی ائمہ اہل بیتؑ پر پورا اترتا ہے کیونکہ فتح مبین ہو جانے پر بھی وہ جانتے تھے کہ جو خلافت اور حق اقتدار اللہ نے ہم کو عطا کیا ہے ہم کو اس اقتدار سے محروم رکھا جائے گا ہمارے گھر پر یورش ہو گی ہم کو گھر جلا دینے کی دھمکی دی جائے گی اور پھر ہر زمانہ میں کوئی نہ کوئی طاقت ہمارے مقابل رہے گی اور ہم کو ہر طرح کمزور کیا جائے گا۔ ہمارے بچے' جوان' بوڑھے تہ تیغ کئے جائیں گے۔

ہماری مستورات اور یتیموں پر کوئی رحم نہ کھائے گا۔ ہم کو قید خانوں میں رکھا جائے گا لہذا وقت سے پہلے بھی خوف اور وقت آنے پر بھی مصائب و آلام کا سامنا ہوگا۔ یہ ہیں وہ حضرات جن کی پوری زندگی خوف میں گزری۔ ان کو امن و سکون اس ہی غلبہ و اقتدار سے حاصل ہوگا جس کے وہ اور اہل نظر منتظر ہیں۔

اس کے بعد آیت میں ہے :

یعبدوننی جس کا ترجمہ ہے "وہ میری فرماں برداری کریں گے"۔ اب فرمایئے کہ فرماں برداری پوری یا ادھوری؟ ایسی فرماں برداری جس میں نافرمانی کا شائبہ بھی نہ ہو؟ یا ایسی کہ فرماں برداری اور نافرمانی دونوں مخلوط ہوں یقیناً فرماں برداری سے مراد ہے مکمل فرماں برداری۔ خالص فرماں برداری جس میں نافرمانی کا اختلاط نہ ہو اور یہ صورت اور صفت صرف معصوم کی ہے غیر معصوم کی نہیں ہو سکتی۔ یہی ہمارا مسلک ہے۔

۷۔ ۶ آخر آیت میں ہے۔ **و من کفر بعد ذالك فاولئك هم الفاسقون** اس قرار داد خلافت کے بعد جو انکار کرے گا وہی لوگ فاسق ہیں اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ اس قرار داد خلافت سے انکار ہوگا۔ لہذا یہ خبر بھی ائمہ اہلبیتؑ پر پوری اتری۔ منکرین خلافت کو آیت نے فاسقین فرمایا ہے اور سورہ منافقون میں اللہ نے فاسقین کو فاسقین کہا ہے۔ لہذا قرار داد خلافت کے وقت منافقین کا وجود قرآن سے ثابت اور ہویدا ہے۔

اس آیت سے ثابت ہے کہ مخصوص مومنین صالحین سے اللہ نے بالکل اسی طرح خلیفہ بنانے کا وعدہ کیا ہے جس طرح قبل میں اللہ خود خلیفہ بناتا رہا ہے یہ آیت اس وعدہ کا ذکر کرتی ہوئی نبیؐ پر اتری اور کم از کم آیت اترنے پر تو نبیؐ کو بھی علم ہو گیا کہ خلافت کا وعدۂ الٰہی کن لوگوں سے ہے۔ چونکہ مفہوم آیت کی تبلیغ نبیؐ پر فرض تھی اس لئے آنحضرتؐ کے لئے ضروری تھا کہ نزول آیت کے بعد ان کو بھی باخبر کر دیں۔ جن

سے اللہ نے وعدہ خلافت کیا ہے اور امت کے عامتہ الناس کو بھی مطلع کردیں جن پر وہ خلیفہ اور حکمران ہوں گے۔ تاکہ ہونے والا خلیفہ بھی اپنی جگہ مطمئن ہو جائے اور امت بھی اپنی بے خبری کی وجہ سے **ومن کفر بعد ذالك فاولئك هم الفاسقون** کی زد میں ناکردہ گناہ نہ آجائے۔ لہذا مسلمانوں کی تاریخ میں کوئی واقعہ صریحہ ایسا ہونا چاہیے کہ نبیؐ نے اپنی امت کے مجمع عام میں خبر دے دی تھی کہ میرے بعد وعدہ خلافت اللہ تعالیٰ نے فلاں شخص سے کیا ہے لہذا تم دل و جان سے اس کی اطاعت کرنا اور اس کی اطاعت کو اللہ اور رسول کی اطاعت سمجھنا۔ یہ بات کتنی عجیب ہے کہ اللہ نے خلفائے امت سے وعدہ کیا' ذکر وعدہ کرتے ہوئے نبیؐ پر آیتِ قرآنی نازل کی مگر نبیؐ نے تو ہونے والے خلفاء کو بتایا نہ امت کو مطلع کیا۔ اس صورت میں تبلیغ رسالت کی کیا حیثیت رہی اور امت کو انتشار و افتراق سے بچانے کی جو بالکل آسان تدبیر تھی اس کو کیوں نظر انداز کر دیا۔ اس طرح تو امت کے انتشار و افتراق کی ساری ذمہ داری نبیؐ پر آتی ہے۔ وعدۂ خلافت تو ہوا اس زور شور سے کہ آیت کے ہر فعل پر لام تاکید اور نونِ تاکید آرہا ہے مگر تبلیغِ آیت کے لیے نبیؐ کی طرف سے کوئی اہتمام نہیں۔ معاذ اللہ۔ ثم معاذ اللہ۔ اب ہم یہ بتانے پر مجبور ہیں کہ ہاں اللہ نے وعدۂ پُر تاکید خلافت کے لیے فرمایا۔ آیت نازل کی اور نبیؐ نے بالآخر آخری حج سے فارغ ہو کر واپسی میں ساری امت کو جمع کر کے سنا دیا کہ **من کنت مولاہ فعلی مولاہ**۔

اخبار ہو یا اخبار کا مدیر بہتان لگانا شرع اسلام اور مسلک اہلبیت میں گناہ عظیم ہے ہمارا اصل مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کو حدیث' تفسیر' فقہ' تاریخ سے بے تعلق کر دینا ایسی بنیاد ہے کہ جس پر ہر عمارت کو بلند ہونے کا موقع مل جاتا ہے۔ اس ابتداء کی انتہا جو کچھ بھی ہو جائے کم ہے۔ ہر شخص اپنا مطلب نکالنے کے لیے قرآن کا سہارا لینا چاہتا ہے۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ موسیقی اور عریانی کے دل دادہ سالہا سال سے یہ کہہ رہے ہیں کہ غنا کی حرمت دکھاؤ' قرآن میں کہاں ہے؟ مستورات کے چہرہ کا پردہ دکھاؤ قرآن میں کہاں ہے؟ قرآن میں تو غضِ بصر کا حکم اور غضِ بصر تو جب ہی ہو گا کہ

چہرہ کھلا ہوا ہو۔ قرآنِ کریم میں تو لایبدین زینتھنّ الاّ ماظھر منھا (نور : 31) ہے۔ یعنی یہ کہ ”مستورات اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں مگر جو حصہ خود بخود ظاہر ہے“۔ لہٰذا اگر زینت سے مراد جسم ہے تو چہرہ 'ہاتھ' قدم الاّ ماظھر منھا سے مستثنیٰ ہو گئے اور اگر زینت سے مراد آرائش ہے تو جسم اور چہرہ کے چھپانے کا کہیں حکم ہی نہ رہا۔ محض آرائش اور وہ بھی مخفی آرائش کے نہ دکھانے کا حکم ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ کتے اور بلی کا قرآن سے حرام ہونا دکھاؤ۔ خود مجھے ایک ایسے عربی کے فاضل سے واسطہ پڑا ہے جن کا کہنا یہ تھا کہ میں مانتا ہوں کہ شراب پینا رجس ہے 'گناہ ہے' اس سے اجتناب کا حکم ہے لیکن قرآن نے اس کو حرام نہیں کہا' جس کے لیے مجھے ایک مستقل رسالہ لکھنا پڑا۔ ڈاڑھی رکھنے کا حکم قرآن میں دکھاؤ۔ عموماً یہ سوال ہوتا ہے۔ ایسے لوگ قرآن کا محض نام یاد کیے ہوئے ہیں۔ قرآن کی آیات کو یاد نہیں کرتے کہ قرآن صرف اطیعوا اللّٰہ نہیں کہہ رہا ہے وہ اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم بھی کہہ رہا ہے۔ قرآن یہ بھی کہتا ہے من یّطع الرّسول فقد اطاع اللّٰہ ۔ جو رسول کی اطاعت کرے گا وہ یقیناً اللہ کا مطیع ہو گیا۔ قرآن یہ بھی کہتا ہے کہ اے رسولؐ! یہ ایمان لانے والے مومن نہ ہوں گے مگر اس وقت جبکہ اپنے باہمی ہر اختلاف کا تم کو حَکَم بنائیں اور جو فیصلہ تم کرو اس سے دل تنگ نہ ہوں بلکہ اس کو پورے طور پر مانیں۔ اب جب کہ مسلمان رسولؐ اور اولی الامر کا دامن چھوڑ کر سنی شیعہ دونوں کے ستہ اربعہ (کتب حدیث) سے دست بردار ہو جائیں تو احتساب کون کرے ؟ حساب تو بے باق ہوا۔

حیاتِ شہداء :

بعض حضرات شہداء کی حیات سے انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کو مردہ کہنے سے قرآن نے صرف ان کے احترام کے لیے روکا ہے۔ ہم نے اس کی تردید کرتے ہوئے کہا تھا کہ اگر صرف مردہ کہنے سے روکا گیا ہوتا تب تو کسی حد تک یہ واہمہ پیدا ہو

سکتا تھا کہ یہ بندش ان کے احترام کے لیے ہے لیکن اس کے ساتھ یہ فرمانا کہ مردہ سمجھو بھی نہیں، بالکل واضح کر رہا ہے کہ یہ محض احترام نہیں کیونکہ بعض باتیں احتراماً یا اخلاقاً کہنے کی نہیں ہوتیں لیکن واقعیت سمجھی ضرور جاتی ہے۔ کسی بات کا نہ کہنا تو انسان کے بس میں ہے مگر واقعہ کو واقعہ نہ سمجھنا انسان کے بس کی بات نہیں اور انسان تو انسان یہ بات تو بندہ ہو یا خدا کسی کے بھی بس کی بات نہیں۔ شہداء کو مردہ سمجھ کر مخاطب خود اپنی بے بسی دکھا رہے ہیں تو کیا خدا ایسا ظالم ہے کہ جو بات کسی کے بس کی نہیں یہاں تک کہ خود اس کے بھی بس کی نہیں اس کا حکم وہ اپنے بندوں کو دے کر تکلیف مالا یطاق کا فاعل بنے۔ اور زبردستی اپنے بندوں کو نافرمان قرار دے۔ اگر آپ شہید کو مردہ نہ بھی کہیں لیکن سمجھیں کہ وہ مردہ ہے تو یہ بھی تو اللہ کے حکم کی نافرمانی ہے کیونکہ جہاں وہ یہ کہہ رہا ہے کہ شہداء کو مردہ نہ کہو وہاں وہ یہ بھی کہہ رہا ہے کہ ان کو مردہ سمجھو بھی نہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ احیاء کے معنی یہ ہیں کہ شہداء مردہ قوموں کو زندہ کرنے والے ہیں حالانکہ احیاء جمع ہے حیّ کی اور حیّ کے معنی ہیں زندہ، نہ کہ زندہ کرنے والا۔ اگر حیّ کے معنی زندہ کرنے والے کے ہو سکتے ہیں تو خدا کو میت کیوں نہ کہا جائے جبکہ وہ لاکھوں زندوں کو مردہ کرنے والا ہے ان زندوں کو جو حقیقتاً زندہ ہیں اور مردہ کرنا بھی ان کا حقیقی معنوں میں ہے جبکہ لوگوں کی کہی ہوئی مردہ قومیں حقیقتاً مردہ نہیں مجازاً مردہ ہیں اور ان کا زندہ کرنا بھی حقیقتاً زندہ کرنا نہیں۔ یہ بھی مجاز ہے تو پھر لفظ میت اللہ کے لیے جو حقیقی زندوں کو حقیقی مردہ کرنے والا ہے کیوں نہ کہا جائے۔ ہم تو صرف یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ جب حیّ کے معنی مجاز در مجاز یہ ہیں کہ شہید مردہ قوموں کو زندہ کرنے والے ہیں تو اسی طرح کیا اس کی اجازت ہے کہ اللہ کو بھی زندوں کو مردہ کرنے والے معنی لے کر میت کہہ سکتے ہیں۔

یہاں لفظ مردہ اور لفظ زندہ دونوں لفظ مجازی نہیں حقیقی معنی میں ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ کیا کسی کی نظر میں قرآن کریم کی کوئی آیت ہے جس میں لفظ حیّ کو مردہ قوموں کو زندہ کرنے والے کے معنی میں استعمال کیا گیا ہو یا کوئی بھی صفت مشبہ

ایسے معنی میں آیا ہے جیسے حُبلیٰ جس کے معنی ہیں حاملہ عورت کے اور عطشان جس کے معنی ہیں پیاسے کے تو کیا حبلیٰ حاملہ کرنے والی عورت کے لیے بھی آسکتا ہے ؟ اور کیا عطشان اس شخص کو بھی کہہ سکتے ہیں جو دوسروں کو پیاسا کر رہا ہو۔ ہم پھر ایک بار کہتے ہیں کہ قرآن کریم نے شہداء کے لیے ایک جگہ فرمایا ہے۔ لاتقولوا لمن یقتل فی سبیل اللّٰہ اموات بل احیآء ولکن ولا تشعرون۔ ”خدا کی راہ میں قتل کیے جانے والوں کو مردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں مگر تم شعور نہیں رکھتے“۔ یعنی تم اس حیات کو سمجھ نہیں سکتے۔ لوگ ہم پر اعتراض کرتے ہیں کہ ہم شہید کو متوفی نہیں مانتے۔ قرآن کریم نے شہداء کو متوفی ماننے سے نہیں روکا۔ روکا ہے ہم کو اس کو مردہ کہنے اور مردہ سمجھنے سے اس لیے ہم اس کو مردہ نہیں مانتے۔ اب رہا اس کے سر کا الگ ہو جانا اور جسم کا الگ بے حس و حرکت ہونا اور اس کا دفن ہونا بے شک یہ سب چیزیں ایسی ہیں کہ ان چیزوں کی موجودگی میں یہ بات کہ وہ زندہ ہیں اس کو ہم نہیں سمجھ سکتے یہی ہماری لاشعوری تو ہے جس کی قرآن کریم خبر دے رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ ان حالات میں تم ان کا زندہ ہونا سمجھ نہیں سکتے لیکن وہ ہیں زندہ۔

جب خدا کہتا ہے کہ تم سمجھ نہیں سکتے تو یہ قرآنی خبر تو غلط ہو گئی کیونکہ لاتقولوا اور لاتشعرون کا خطاب کفار سے تو ہو ہی نہیں سکتا۔ مسلمانوں ہی سے ہے اور سب ہی مسلمانوں سے ہے کسی کا استثناء تو نہیں ہے چونکہ پہلے مسلمان صحابہ ہی ہیں لہذا لاتشعرون کا پہلا مخاطب بھی گروہِ صحابہ ہوا اور ہم سب بھی مسلمان ہیں لہذا لاتشعرون میں ہم سب داخل ہیں تو پھر یہ بات کیسی بنی کہ قرآن کریم لاتشعرون کہہ رہا ہے ان سے جو سمجھ رہے ہیں، سمجھ سکتے ہیں، سمجھ گئے ہیں تو پھر لاتشعرون کہنے والا ہی خود نا سمجھ ہوا کہ لوگ تو سمجھ رہے ہیں اور وہ یہ سمجھ رہا ہے کہ لوگ نہیں سمجھتے۔ اب ہم کس کی بات کو صحیح سمجھیں قرآن کی بات یا لوگوں کی۔

قرآن کریم میں ذبیحہ کو مردہ کہنے سے کہیں نہیں روکا گیا :

لوگ کہتے ہیں کہ ذبیحہ کو بھی مردہ کہنے سے روک دیا گیا ہے اور اپنے ثبوت میں درج ذیل تین آیات پیش کرتے ہیں :

۱۔ انما حرّم علیکم المیتۃo (سورہ بقرہ :173)

۲۔ حرّمت علیکم المیتۃo(سورہ مائدہ :3)

۳۔ الاّ ان یّکون میتۃo(سورہ انعام :145)

ان آیات سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گی کہ ذبیحہ کو قرآنِ کریم نے چونکہ مردہ نہیں کہا اس سے ثابت ہوا کہ اس کو احتراماً زندہ کہا ہے۔ ان کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے نام پر ذبح ہونے والے بکرے کو زندہ بتایا گیا ہے۔ کس دلیل سے ؟ اس دلیل سے کہ اس کو میتۃ یعنی مردہ نہیں کہا گیا تو ان کے نزدیک بات یہ بنی کہ مردہ ہوا وہ جس کو قرآن نے میتۃ کہا اور زندہ ہوا وہ جس کو میتۃ نہیں کہا۔ لیکن میں تمام حفاظِ قرآن' قراء قرآن اور عربی سے کچھ بھی شغف رکھنے والوں میں سے ہر انسان سے التماس کرتا ہوں کہ وہ ہر سہ آیات آخری الفاظ تک دیکھیں اور غور کریں۔

۱۔ انّما حرّم علیکم المیتۃ والدّم ولحم الخنزیر وما اھلّ بہ لغیر اللّٰہ (بقرہ رکوع ۲۱) سوائے اس کے نہیں کہ اللہ نے حرام کیا ہے تم پر مردہ کو اور لحم خنزیر کو اور اس کو جو اللہ کے سوا اور کسی کے نام پر ذبح کیا گیا ہو۔

۲۔ حرّمت علیکم المیتۃ والدّم ولحم الخنزیر وما اھلّ لغیر اللّٰہ بہ والمنخنقۃ والموقوذۃ والمتردیۃ والنّطیحۃ وما اکل السبع الاّ ماذکیّتم وما ذبح علی النّصب وان تستقسموا بالازلام ذالکم فسق۔

''حرام کیا گیا تم پر مُردہ اور خون اور خنزیر کا گوشت اور وہ جو غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا گیا ہو اور گلا گھونٹ کر مارا جانے والا اور مار پیٹ کر کے مارا جانے والا اور گرا کر مارا جانے والا اور وہ جس کو درندہ نے کھایا ہو' سوائے اس صورت کے کہ تم نے اس کو ذبح کر لیا ہو اور وہ جانور جو پرستش کے لیے نصب کی ہوئی

چیزوں پر بھینٹ چڑھانے کے لیے ذبح کیا گیا ہو اور وہ جسے تیروں کے ذریعے سے تقسیم کرو' یہ سب پلیدگی اور گندگی ہے''۔

۳۔ **قل لا اجدفی ما اوحی الیّ محرّماً علیٰ طاعم یطعمه الاّ ان یّکون میتةً اودماً مسفوحاً اولحم خنزیر فانّه رجسٌ اوفسقاً اهلّ لغیراللّٰه به۔**

''اے رسولؐ کہہ دو کہ جو وحی مجھ پر کی گئی ہے اس میں کسی کھانے والے پر کوئی چیز حرام کی ہوئی نہیں پاتا مگر یہ کہ وہ مردہ ہو یا بہایا ہوا خون ہو یا خنزیر کا گوشت ہو' پس یقیناً وہ پلیدگی ہے یا جس کو غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا گیا ہو''۔

ان ہر سہ آیات میں میتہ کو الگ حرام کہا گیا ہے۔ خون کو الگ حرام کہا گیا ہے' خنزیر کو الگ حرام کہا گیا ہے غیر اللہ کے ذبح کیے جانے والوں کو درندوں کے کھائے ہوئے کو غرضیکہ ہر ایک کے حرام ہونے کے لیے الگ لفظ سے ذکر کیا گیا ہے۔ تینوں آیتوں میں میتہ صرف خود سے مرنے والے کو کہا گیا ہے۔ مارے جانے والے جانور کو میتہ نہیں کہا' چاہے وہ خنزیر ہو یا بتوں کی بھینٹ کے لیے ذبح کیا ہو یا کسی اور طرح پر مارا ہوا جانور ہو۔ یہ اس لیے کہ اہلِ زبان عرب خود بخود مرنے والے جانوروں کو میتہ کہتے تھے اور جان کر مارے جانے والے جانوروں کو میتہ نہ کہتے تھے چنانچہ قرآنِ عربی نے بھی مارے جانے والے جانوروں کو میتہ نہ کہا۔ یہ بندوبست نہ کسی اعزاز کے لیے ہے نہ کسی احترام کے لیے ہے نہ صرف رائج زبان کی مطابقت ہے ورنہ خداوند عالم کیوں خنزیر اور بتوں کے چڑھاوے وغیرہ کا احترام کرتا۔

اب میں آپ سے سوال کرتا ہوں کہ کیا خدا تعالیٰ نے شہداء کو بھی اسی طرح احتراماً مردہ نہیں کہا جس طرح اس نے کاٹے ہوئے خنزیر کو مردہ نہیں کہا۔ پہلے تو آپ نے شہداء اور ذبح شرعی والے بکروں کو برابر کر دیا تھا اب آپ نے آیات قرآنی کی دلیل سے شہید اور خنزیر دونوں کو برابر کر دیا کہ جس طرح قرآن کریم نے خنزیر کو مردہ نہیں کہا اسی طرح شہید کو بھی مردہ نہیں کہا۔

قرآن کریم نے شہداء کو حقیقتاً زندہ کہا ہے مجازاً زندہ نہیں کہا :

بعضوں کا یہ خیال ہے کہ شہداء کو احتراماً زندہ کہا گیا ہے' ورنہ قیامت تک ان کے زندہ ہونے کا تصور تک نہیں ہو سکتا۔ اب یہ کہا جا رہا ہے کہ شہداء حقیقتاً تو ہیں مردہ' ان کو قرآن کریم نے صرف احتراماً اور مجازاً زندہ کہا ہے۔ میں قرآن مجید کی دونوں آیات کو جو شہداء کے بارہ میں ہیں مع ترجمہ پیش کر کے اس نظریہ کی تنقید کرتا ہوں :

۱۔ ولا تقولوا لمن یّقتل فی سبیل اللّٰہ اموات بل احیاء ولکن لاّ تشعرونo (سورہ بقر رکوع ۱۹ آیت 154)

''اور تم لوگ خدا کی راہ میں قتل کیے جانے والوں کو مت کہو کہ وہ مردہ ہیں' بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تم شعور نہیں رکھتے''۔

۲۔ ولا تحسبنّ الذین قتلوا فی سبیل اللّٰہ امواتاً بل احیاء عند ربھّم یرزقونo 169 فرحین بما آتاھم اللّٰہ من فضلہ و یستبشرون بالّذین لم یلحقوا بھم من خلفھم الاّ خوفٌ علیھم ولاھم یحزنونo 170 یستبشرون بنعمۃ من اللّٰہ و فضل و انّ اللّٰہ لا یضیع اجر المومنینo (آل عمران رکوع 17)

''تم خدا کی راہ میں مارے جانے والوں کو ہرگز مردہ نہ سمجھو بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے رب کے نزدیک' ان کو رزق دیا جاتا ہے۔ اس حالت میں کہ جو کچھ اللہ نے اپنے فضل سے ان کو دیا ہے اس سے فرحناک اور شاداں ہیں اور وہ ان حضرات کے بارے میں خوش خبری پاتے ہیں جو ابھی ان کے پیچھے ہیں اور ان شہداء سے ابھی ہرگز نہیں ملے ہیں۔ اس امر کی کہ ان پر بھی کوئی خوف نہیں ہے اور وہ بھی محزون نہ ہوں گے یہ لوگ اللہ کی جانب سے آئندہ نعمت اور مہربانی کی بشارت پاتے ہیں اور اس بات کی بھی خوشخبری پاتے ہیں کہ اللہ محسنین یعنی نیک بندوں کے اجر کا ضائع کرنے والا نہیں ہے''۔

ان دونوں آیتوں کو سامنے رکھ کر کوئی بھی مسلمان یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ زندگی صرف ایک لفظی زندگی ہے جس کی حقیقت کچھ بھی نہیں۔ اللہ کا یہ فرمانا کہ تم شہداء کی زندگی کا شعور نہیں رکھتے۔ یہ بھی مجازی جملہ ہے ان کو اموات مت کہو۔ یہ بھی مجاز ہے۔ ان کو اموات مت سمجھو یہ بھی مجاز ہے۔ وہ زندہ ہیں' یہ بھی مجاز ہے ان کو قیامت سے پہلے رزق دیا جاتا ہے۔ یہ بھی غلط ہے۔ وہ شہید ہونے کے بعد اپنے برادران ایمانی جو ابھی دنیا میں ان کے پیچھے ہیں اور ابھی وہ شہداء سے ہرگز نہیں ملے ان کی بات ان کے نیک انجام ہونے کی بشارت پاتے ہیں۔ یہ بھی کوئی چیز نہیں۔ پھر شہادت کے بعد جو خوشخبری ان کو نعیم جنت کے بارے میں دی جارہی ہے اور ان سے جو وعدہ کیا جارہا ہے کہ تم مطمئن رہو۔ اللہ تم جیسے نیک بندوں کے اجر کو ضائع نہ کرے گا' یہ سب لایعنی۔ کیونکہ وہ تو شہید ہو کر بالکل مردہ ہیں۔ مردہ بھی ایسے کہ ان کی روح تک ناپید ہو چکی۔

۱۔ آیت نمبر ۲ میں شہداء کے بارے میں ہدایت ہے کہ ان کو مردہ کہنا تو کیا مردہ سمجھو بھی نہیں۔

۲۔ وہ زندہ ہیں۔

۳۔ ان کو رزق دیا جاتا ہے۔

۴۔ جو نعمت خدا ان کو دے چکا ہے اس سے وہ خوش ہیں۔

۵۔ شہداء کو خوشخبری دی جاتی ہے کہ تمہارے برادران ایمانی جو ابھی تمہارے پیچھے ہیں اور تم سے آکر ابھی ملے نہیں ہیں ان کا انجام بھی بخیر ہے۔

۶۔ ان کو آئندہ کے لئے بھی بشارت دی جاتی ہے کہ اللہ کی نعمت اور مہربانی تم کو حاصل ہوگی۔

۷۔ شہداء سے وعدہ کیا جاتا ہے کہ اللہ ان کے اجر کو ضائع نہ کرے گا۔

کیا یہ تمام چیزیں صاف نہیں بتارہی ہیں کہ شہداء بعد شہادت قیامت سے پہلے زندہ ہیں اور یہ رزق اور یہ فرحت اور دنیا میں باقی ماندہ مومنین کے بارے میں ان کو خوشخبری کا دیا جانا اور آئندہ بھی ان شہداء کو نعیم خلد کے ملنے کی بشارت اور نعیم جنت

سے ان کا اجر قرار پانے کا وعدہ الٰہی یہ سب کچھ شہداء کی اس ہی زندگی کے واقعات ہیں جو شہادت کے بعد اور قیامت سے پہلے کے عرصے کے ہیں۔

آیت میں خصوصیت سے دو چیزیں مقابلہ کی ہیں۔ فرحین بما آتا هم الله من فضله ''وہ خوش ہیں اللہ کی اس نعمت سے جو اللہ ان کو دے چکا ہے۔ یہاں عطاء نعمت کے لئے ماضی کا صیغہ ہے آتا هم اس کے بعد یستبشرون بنعمة من الله ہے جس میں آئندہ نعمت کی بشارت ہے۔ یہاں سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ جس پائی ہوئی نعمت سے وہ خوش ہیں یہ نعمت اس عالم برزخ کی ہے جو بعد شہادت اور قبل قیامت ان کو ملی ہے اور جس نعمت کی بشارت اور آئندہ کے لئے یہ وعدہ ہے کہ ان کے اجر کو اللہ ضائع نہ کرے گا۔ یہ ذکر روز جزا اور قیامت کا ہے۔

جب کوئی لفظ مجازاً استعمال کیا جاتا ہے تو وہاں حقیقت کے کہنے اور سمجھنے سے روکا نہیں جاتا:

اگر کوئی متکلم کسی لفظ کو مجازی معنی میں استعمال کرتا ہے تو وہ خود یہ چاہتا ہے کہ سننے والا اس کو مجاز ہی سمجھے۔ حقیقت نہ سمجھ بیٹھے اس لئے بولنے والا ایسا کوئی نہ کوئی قرینہ اپنے کلام میں رکھتا ہے جس سے سننے والے پر یہ ثابت ہو رہا ہو کہ یہاں لفظ کا استعمال مجازاً ہوا ہے حقیقتاً نہیں ہوا۔ لیکن دونوں آیتوں کو اچھی طرح دیکھئے۔ کیا ان میں کوئی لفظ بھی ایسا ہے کہ جس سے ساری یہ داستان مجازی سمجھی جاسکے۔ اگر شہداء کو احیاء (وہ زندہ ہیں) مجازاً کہا گیا ہوتا تو لا تشعرون کہنے کا کوئی تک نہ تھا۔ (لیکن تم شعور نہیں رکھتے) کیونکہ مجازی زندگی کو ہر شخص سمجھ سکتا تھا جیسے کہ ہمارے مخاطب حضرات بھی اپنی دانست میں یہی سمجھ رہے ہیں کہ میں سمجھ رہا ہوں۔ دوسرے یہ کہ جب کوئی لفظ مجازاً استعمال کیا جاتا ہے تو وہاں حقیقت کے کہنے اور سمجھنے سے روکا نہیں جاتا۔ اور اگر دوسرے پہلو کے کہنے اور سمجھنے سے روک دیا جائے تو پھر وہ مجاز نہیں حقیقت ہے مثلاً اگر کوئی شخص حکیم اجمل خاں کی طرف اشارہ کر کے کہے کہ یہ ارسطو ہیں تو اس کے

آگے کہنے والا یہ نہیں کہہ سکتا کہ ان کو اجمل خان نہ سمجھنا۔ کیونکہ کہنے والا ان کو اجمل خان سمجھ کر مجازاً ارسطو یا بقراط کہہ رہا ہے لیکن جس وقت کہنے والے کا اشارہ خود ارسطو ہی کی طرف ہو کسی اور کی طرف نہ ہو اور اب وہ ارسطو کی طرف اشارہ کر کے کہے کہ یہ ارسطو ہیں تو اس جملہ کے بعد کہنے والے کو پورا حق ہے یہ کہنے کا کہ ان کو اجمل خاں نہ کہنا' ان کو اجمل خاں نہ سمجھنا کیونکہ بولنے والے نے لفظ ارسطو حقیقی اور واقعی معنی میں استعمال کیا ہے۔ لہذا اگر خدا تعالیٰ نے شہداء کو احیاء (وہ زندہ ہیں) صرف مجازاً کہا ہوتا تو اس کے ساتھ یہ نہ فرماتا کہ ان کو مردہ نہ کہنا' ان کو مردہ نہ سمجھنا کیونکہ مجاز میں حقیقت فہمی سے روکا نہیں جاتا۔

مخالف پہلو کی نفی اسی وقت ہوتی ہے جبکہ لفظ حقیقی معنی میں بولا جارہا ہو

جن بتوں کی پرستش کی جارہی تھی یا کی جارہی ہو وہ حقیقی معنی میں بے جان ہوتے ہیں لہذا قرآن مجید سورۂ نحل رکوع 2 آیت 21 میں ان بتوں کے لئے فرمایا گیا ہے۔ اموات غیر احیاء یہ بت بے روح ہیں زندہ نہیں ہیں۔ چونکہ آیت میں لفظ اموات حقیقی معنی میں آیا تھا اس لئے اموات کا مخالف پہلو یعنی احیاء کی نفی کی گئی اسی طرح شہداء کو احیاء کہہ کر ان کے اموات ہونے کی نفی کر دی گئی لہذا شہداء کے لئے لفظ احیاء بھی اسی طرح حقیقی معنی میں ہے جس طرح لفظ اموات بتوں کے لئے حقیقی معنی میں ہے۔

یرزقون سے مراد قیامت کا رزق نہیں ہو سکتا

شہداء کے لئے آیت میں ہے بل احیاء عند ربھم یرزقون "بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے رب کے نزدیک' ان کو رزق دیا جاتا ہے۔" ہمارے اس ترجمہ پر اعتراض ہے کہ رزق دیا جاتا ہے۔ یہ ترجمہ کیوں کیا گیا۔ رزق دیا جائے گا کیوں نہیں کہا تا کہ ہمارے مفسرین اس وعدہ رزق کو قیامت پر ٹال سکیں۔ دراصل مضارع عربی میں حال اور مستقبل دونوں زبانوں کے لئے ہوتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ زمانہ حال پہلے ہے۔ مستقبل

اس کے بعد ہے۔ یہ کوئی عقلمندی تو نہیں ہو سکتی کہ جو پہلے ہے اس کو پھلانگ کر مستقبل پر کود پڑیں۔ حال کے بغیر مستقبل آہی کیسے سکتا ہے‘لوگ تو اسی ترجمے پر معترض ہیں جو حال کی بنا پر کیا گیا ہے ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ حال تو حال اس کے مفہوم میں ماضی بھی داخل ہے کیونکہ یرزقون ایک قرارداد کا ذکر ہے اور جب بھی مستقل طور پر کوئی قرارداد بیان کی جاتی ہے اس میں عموماً ماضی‘ حال مستقبل سب ہی زمانے ہوتے ہیں وہاں صیغوں سے بحث ہی نہیں رہتی کہ ماضی کا صیغہ ہے یا مضارع کا۔ خود اپنی زبان میں دیکھ لیجئے مثلاً جس نے ڈھونڈا اس نے پایا۔ جو اچھا کرتا ہے اس کو اچھا کہا جاتا ہے۔ جو اچھا کرے گا اس کو اچھا کہا جائے گا۔ پہلے جملے میں ماضی ہے دوسرے میں حال ہے۔ تیسرے میں مستقبل ہے لیکن پہلا جملہ ہو یا دوسرا یا تیسرا ہو ہر ایک جملہ ماضی‘ حال اور مستقبل ہر زمانے کے لئے ہے ماضی والے جملے کو ماضی سے تخصیص نہیں۔ حال والا جملہ حال میں منحصر نہیں۔ مستقبل والا جملہ مستقبل سے مخصوص نہیں۔ یہی اسلوب قرآنی قرارداد کا ہے۔ یاایھا الذین امنوا۔ اس میں آمنوا صیغہ ماضی ہے مگر مخاطب وہ بھی ہیں جو اس وقت ایمان لا چکے تھے اور وہ بھی ہیں جو آیت کے بعد قیامت تک کسی وقت بھی ایمان لائیں۔ سورۂ والعصر میں الا الذین آمنوا و عملوا الصالحات کہہ کر نیک مومنین کو بشارت دی گئی ہے۔ صیغے ماضی کے ہیں لیکن بشارت ان کو بھی ہے جو اس وقت تک ایمان لا کر نیک ہو چکے تھے اور ان کو بھی ہے جو آیت کے بعد قیامت تک کسی زمانہ میں بھی مومن اور نیک ہوں یا مثلاً فرمایا جاتا ہے الذین یکنزون الذھب والفضۃ الخ o (توبہ :34)۔ جو لوگ سونا اور چاندی کو خزینہ بنا کر رکھتے ہیں اور خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے ان کی پیشانیوں اور پشتوں کو ان سے داغا جائے گا یا جیسے یوذون اللہ و رسولہ الخ جو لوگ اللہ اور رسول کو اذیت دیتے ہیں الخ صیغے مضارع کے ہیں مگر حال اور مستقبل ہی کے لئے نہیں بلکہ ماضی‘ حال‘ مستقبل ہر زمانے کے لئے ہیں۔ اسی طرح شہداء کے لئے یرزقون کہہ کر ایک مستقل قرارداد بیان کی جارہی ہے۔ اب جو آیت سے پہلے شہید ہو چکے ان کو ماضی میں بھی رزق ملا‘ حال میں بھی مل رہا

ہے، مستقبل میں بھی ملے گا اور جو لوگ آیت کے بعد شہید ہوئے آیت نے ان کے بھی رزقِ مستقبل کی خبر دی۔ کیونکہ شہادت مستقبل میں ہے تو رزق بعد شہادت بھی مستقبل ہوا۔

رزقِ مذکور شہداء کی شہادت کے بعد ہے لہذا وقتِ قتل سے وقتِ رزق بہر حال مستقبل ہے

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ شہداء چونکہ مردہ ہیں اس لئے ان کو قیامت میں رزق دیا جائے گا۔ اس سے پہلے نہ وہ خود ہیں نہ ان کی روح ہے نہ ان کو رزق دیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں یہ آیت پیش کی جاتی ہے۔

والذّین ھاجروا فی سبیل اللّٰہ ثمّ قتلوا اوما توالیرزقنّھم اللّٰہ رزقاً حسناً (سورۃ حج :58)

(مفہوم) اور وہ لوگ جو اللہ کی راہ میں ہجرت کریں پھر وہ اللہ کی راہ میں مارے جائیں یا (راستے کی تکلیفوں کی تاب نہ لاکر طبعی موت) مر جائیں اللہ ان کو احسن رزق عطا فرمائے گا (قیامت کو جب وہ اٹھائے جائیں گے''۔

''مضارع پر لام تاکید اور نون مشددہ داخل ہو تو وہ مستقبل کے لئے مختص ہو جاتا ہے''۔

اس جگہ آیت کی شانِ نزول اور آیت کا مفہوم توڑ موڑ کر بیان کیا گیا ہے ''راستے کی تکلیفوں کی تاب نہ لاکر طبعی'' یہ سب لفظ اپنی طرف سے بڑھائے گئے ہیں۔ آیت میں تو صرف ماتوا ہے لیکن ہم بحث کو مختصر کرنے کے لئے تصرفات بے جا سے صرفِ نظر کرتے ہیں اور یہ بات مانے لیتے ہیں کہ رزق کا وعدہ مستقبل ہی میں کیا گیا ہے۔ مگر کون سا مستقبل؟ وہ جو قتل کے بعد کا ہے اور قیامت سے پہلے ہے۔ رزق جبکہ بعد قتل ہے تو وہ رزق قتل کے وقت کا مستقبل تو ہو گا ہی کیونکہ رزق قتل کے عین وقت

پر تو نہیں مل رہا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ ایک لمحہ کے بعد دوسرا لمحہ اس کا مستقبل ہے۔
کتنے افسوس کی بات ہے کہ وعدہ خلافت کے لئے جو آیت پیش کی گئی تھی وہاں بھی ہر جگہ لام تاکید اور نون مشدّدہ ہے۔ لیستخلفنّھم ولیمکنن لھم ولیبدّ لنّھم ہم ضرور ضرور خلیفہ بنائیں گے اللہ ضرور تمکین دے گا ان کے دین کو اور ضرور ضرور ان کے خوف کے بعد خوف کو امن سے بدل دے گا۔ یہاں تو اللہ کا یہ وعدہ خلافت اور وعدہ تمکین تو اتنا جلد وفا ہو جانا چاہئے کہ دفن رسول کا بھی انتظار نہ کیا جائے دو چار گھنٹہ کی بھی دیر نہ ہو مگر وہی وعدہ کرنے والا جب شہداء کے لئے کہے لیرزقنّھم تو یہاں اس امر پر زور لگایا جاتا ہے کہ اللہ کا یہ وعدہ قیامت سے اس طرف پورا ہی نہ ہو۔ یہ تو کوئی انصاف کی بات نہ ہوئی کہ بالکل وہی لفظ جب اپنے لئے ہو تو وہ بہتری فوراً پوری ہو جائے اور جب دوسروں کے لئے ہو تو قیامت ہے کہ وہ قیامت پر ٹالا جائے۔ اگر لیرزقنّھم کا رزق قیامت سے پہلے نہیں تو لیستخلفنّھم میں کہتے کہ خلیفہ بھی اللہ آخرت میں بنائے گا۔ ورود امام مہدیؑ تو اسی دنیا میں ہوگا اور قیامت سے پہلے ہی ہوگا تو اللہ کے وعدۂ تمکین کو امام مہدیؑ سے متعلق کیوں نہیں سمجھتے۔ مفسرین کا اس پر انتہائی زور شور کہ لیرزقنّھم میں چونکہ لام تاکید اور نون تاکید ہے اس لئے یہ مستقبل کے لئے ہے اس سے آخر کونسی بات بن گئی بات تو اس وقت بنتی نظر آتی جب یہ ثابت ہو جاتا کہ لام تاکید اور نونِ تاکید جب مضارع پر آتا ہے تو وہ خبر قیامت سے پہلے پوری نہیں ہوتی لیکن اس کا ثابت کرنا تو رہا در کنار وہ یہ کہنے کی بھی ہمت نہیں کر سکتے۔ مستقبل کے معنی قیامت کے تو نہیں ہیں۔ مستقبل تو ہر آنے والا لمحہ ہے۔ شہید کے قتل ہونے کے بعد جو دوسرا لمحہ ہے کیا وہ مستقبل نہیں ہے؟ جب شہید کا رزق بعد قتل ہے تو وہ رزق قتل کا مستقبل نہ ہوا؟ ہمارے مفسرین نے یہ نہ سوچا کہ جس رزق کا محض شہدا سے بالتخصیص وعدہ کیا جا رہا ہے اگر اس رزق سے رزقِ جنت مراد ہے تو شہداء کی تخصیص کیا رہی۔ جنت میں تو ہر جنتی کو حسب دلخواہ رزق ملے گا۔ اگر یہ کہا جائے کہ شہداء کو وہاں جو خاص رزق ملے گا اس کو قرآن کریم نے رزق حسن فرمایا ہے لہذا وہ اعلیٰ درجہ کا رزق ہو

گا۔ تو میں یاد دلاتا ہوں کہ اللہ نے تو رزق دنیا کو بھی رزق حسن فرمایا ہے چنانچہ سورۃ نحل رکوع 10 میں فرمایا گیا ہے۔ ضرب اللّٰہ مثلاً عبداً مملوکاً لایقدر علٰی شیٔ ومن رزقناہ منّا رزقاً حسناً فھو ینفق منہ سراً وجھراً ھل یستوٗن ٥ اللہ مثال بیان کرتا ہے کہ ایک تو وہ غلام ہے جو خود دوسرے کی ملکیت ہے اس کا کسی شے پر بس نہیں اور ایک وہ ہے جس کو ہم نے رزقِ حسن دیا ہے۔ وہ اپنے رزق میں سے مخفی اور آشکارا جس طرح چاہے خرچ کرے کیا یہ دونوں برابر ہیں تو جب اللہ کا دنیا میں دیا ہوا رزق بھی رزق حسن ہے تو اہل جنت کا رزق کیوں نہ رزقِ حسن ہوگا جو شہید اور غیر شہید ہر جنتی کو ملے گا۔ اس صورت میں شہید کی کوئی تخصیص تو نہ ہوئی۔ تخصیص کی صورت تو یہی ہے کہ عام مومنین کو تو رزق ملے گا جنت میں قیامت کے بعد لیکن شہید چونکہ زندہ ہیں اس لئے ان کو بعد شہادت قیامت سے پہلے ہی رزق ملتا رہے گا۔ ہم پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ مستقل قرارداد کو پیش کرنے کے لئے ماضی ہو یا مضارع۔ اس کا اثرو نفوذ ہر زمانہ پر ہے وہاں اس کی بحث کہ صیغہ ماضی کا ہے یا مضارع کا یہ بے کار ہے مفسرین نے اپنی پیش کی ہوئی آیت مذکورہ میں والذین ھاجروا فی سبیل اللّٰہ ثم قتلوا اوماتوا کا ترجمہ ماضی قرار دے کر (ہرگز نہیں) کیا حالانکہ ھاجروا' قتلوا' ماتوا' یہ سب ماضی تھے مگر ترجمہ مضارع کا کیا گیا ہے۔ ماضی میں ترجمہ ہوتا تو اس طرح ہوتا جن لوگوں نے ہجرت کی پھر وہ قتل کئے گئے یا مر گئے۔ مگر ترجمہ یوں کیا ہے کہ ”اور وہ لوگ جو اللہ کی راہ میں ہجرت کریں پھر وہ اللہ کی راہ میں مارے جائیں یا مر جائیں“۔ کتنی حیرت کی بات ہے کہ ایک ہی آیت ہے جس کے ماضی کو آپ قرار دے رہے ہیں استمرار اور استمرار جو واقعاً استمرار ہی کی صورت میں ہے اس کو قرار دے رہے ہیں غیر استمرار یعنی لیرزُ قنّھم نہ ماضی کے لئے ہے نہ حال کے لئے ہے۔ نہ قیامت سے پہلے کے پورے مستقبل کے لئے ہے' وہ ہے محض قیامت کے لئے دیدار قیامت کے منتظر پہلے اس قیامت کو دیکھ لیں۔ اب ہمارے ناظرین نہایت لطف اندوز ہوں گے یہ دیکھ کر کہ فاضل مفسرین نے آیہ مذکورہ کو (والذّین ھاجروا فی سبیل اللّٰہ ثمّ

قتلوا اوما توا لیرز قنّھم اللہ رزقاً حسناً) بس یہاں تک نقل فرمایا ہے تاکہ ٹھونس ٹھانس کر اس رزق کو قیامت سے مخصوص کر دیں حالانکہ قرآن کریم میں اس کے بعد فرمایا جاتا ہے (لید خلنّھم مدخلاً یرضونہ) (سورہ حج :59) اللہ ضرور ضرور ان شہداء کو ایسے مسکن (جنت) میں داخل کرے گا جس کو یہ پسند کریں گے۔ چونکہ اس عبارت آیت سے یہ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ جس رزق کا وعدہ شہداء سے ہو رہا ہے۔ یہ وہ رزق ہے جو ان کو جنت میں پہنچنے سے پہلے ملتا ہے اس لئے مفسرین نے اس جملہ کو پردہ میں رکھا یہ پردہ ہم کو اٹھانا پڑا۔ اب سورج کی طرح یہ بات کھل گئی کہ شہداء کو جنت میں داخل کرنے سے پہلے ہی سے رزق دیا جاتا ہے جس کے بعد ان کو جنت کا مسکن جس کو وہ پسند کریں گے دیا جائے گا۔

جس آیت کو مفسرین نے بڑے زور شور سے پیش کیا تھا اور فرمایا تھا کہ عربی کے مبتدی تک جانتے ہیں کہ لام تاکید اور نون تاکید مضارع پر آتا ہے تو وہ مستقبل کے لئے مخصوص ہو جاتا ہے اور اس سلسلے میں وہ ہم پر قرآن کے جاہل مطلق ہونے کی پھبتی تک کسنے کے لئے تیار ہو گئے تھے۔ اس ہی آیت نے مکمل طور پر یہ ثابت کر دیا کہ چونکہ شہداء زندہ ہیں اس لئے ان کو قتل کے بعد رزق دیا جاتا ہے اور قیامت آنے پر ان کو ان کی پسند کا مسکن (جنت میں) دیا جاتا ہے۔ اب وہ خود فیصلہ فرمالیں کہ قرآن کا جاہل مطلق کون ہے۔ آیات قرآن کا جاننا اللہ اور راسخون فی العلم کا کام ہے۔ ممکن ہے لوگ اپنی ذات کو اللہ یا راسخون فی العلم کا کوئی فرد سمجھتے ہوں لیکن ہم نہ اللہ ہیں نہ راسخون فی العلم میں سے ہیں۔ جو کچھ قرآن کریم میں نظر آجاتا ہے یہ سب راسخون فی العلم کا صدقہ ہے اور ان کے دامن سے وابستگی کا نتیجہ ہے اور راسخون فی العلم محمدؐ و آلِ محمدؐ کے سوا کوئی نہیں۔ اب میں قرآن مجید سے مثال پیش کر کے ثابت کرتا ہوں کہ لام تاکید و نون مشددہ ہونے کے باوجود مضارع میں ماضی، حال، مستقبل ہر ایک زمانہ ہو سکتا ہے۔

لتجدنّ اشدّ النّاس عداوۃً للّذین آمنوا الیھود والّذین اشرکوا (سورۃ المائدہ آیت 82) ”اے رسولؐ تم ایمان لانے والوں سے شدید ترین عداوت

رکھنے والا پاؤ گے یہود کو اور ان کو جو مشرک ہیں"۔ اب دیکھئے یہ سورۂ مدنی ہے جو بعد ہجرت نازل ہوا۔ نبیؐ ہجرت سے تیرہ برس پہلے مشرکین کی انتہائی عداوت اور انتہائی اذیت رسانی کا ہر نقشہ دیکھ چکے تھے۔ ان مشرکین کی عداوت اور اذیت رسانی ہی بالآخر حضورؐ کی ہجرت کا سبب ہوئی لہذا نبیؐ سے یہ خطاب کہ تم مشرکین کو مومنین کا سخت دشمن پاؤ گے۔ اس حالت میں ہوا ہے جبکہ نبیؐ ان کو اپنا اور مومنین کا سخت دشمن پا چکے تھے لہذا التجدن کا لام تاکید اور نون مشددہ صرف مستقبل ہی سے مخصوص نہیں کر رہا ہے بلکہ یہ مشرکین کا وہ استمراری عمل ہے جو ماضی، حال مستقبل ہر زمانے میں رہا ہے اور رہے گا اور ایسا رہے گا کہ جو پکے مشرک اور مشرکین کے سرغنہ ہیں وہ نمائشی مسلمان ہونے کے بعد بھی اپنی سرشت نہ چھوڑیں گے اور پکے مومنین سے ان کی عداوت کسی وقت میں بھی زائل نہ ہو گی اور اس میں کس کو شک ہو سکتا ہے کہ اہل بیتِ نبیؐ سے زیادہ پکے مومن اور کون ہوں گے لہذا یہ مشرک اسلام کا چولا بدل کر بھی اہل بیتؑ کے خلاف صف آرائی کریں گے اور اس بات پر تلے رہیں گے کہ اہل بیتؑ کا خاتمہ کر دیں۔ ان کے بچے بچے کو قتل کر دیں۔ چنانچہ سب کچھ کر گزرے مگر دشمنی کی آگ اس پر بھی نہ بجھی۔ اب یوں سمجھئے کہ قرآن کریم خبر دے چکا ہے کہ مومنین سے عداوت تو کسی نہ کسی حد میں ہر کافر کو ہو گی لیکن اشد الناس عدٰوۃً یعنی سب سے زیادہ شدید ترین عداوت صرف یہودی اور مشرکین کو ہے اور رہے گی لہذا بہترین مومنین (اہل بیتؑ) سے جن لوگوں نے شدید ترین عداوت کی کہ ان کے بوڑھے 'جوان' بچے ہر ایک کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا وہ کون تھے 'ازروئے قرآن ایسی شدید عداوت یا یہود کر سکتے تھے یا مشرکین تو پھر وہ لوگ ان ہی دو میں سے ایک ہیں اور یہ طے شدہ ہے کہ یہ لوگ نہ اب یہودی ہیں نہ پہلے یہودی تھے تو پھر لامحالہ مشرک ہوئے۔ پہلے بھی مشرک تھے مگر کھلے ہوئے تھے۔ اب بھی ہیں وہی جو تھے اور ان کا وہی کردار ہے جو تھا تو پھر دل بھی وہی ہے جو تھا اور دل میں بھی وہی ہے جو تھا۔ قرآنی شہادت عین حق ہے کہ حقیقی اور مکمل مومنین سے انتہائی عداوت یہود و مشرکین ہی کر سکتے ہیں ورنہ مومن تو

مومن دوسرا کافر بھی ایسی شدید عداوت نہیں کر سکتا۔ غرض کہ مشرکین کی عداوت کو نبیؐ سالہا سال تک بچشم خود دیکھ چکے تھے۔ اب رہی یہودیوں کی انتہائی عداوت تو یہ بھی ظاہر ہے کہ اس آیت کے نزول سے پہلے اگر یہودیوں کی شدید دشمنی کے واقعات رونما نہ ہو چکے ہوتے تو خداوند عالم یہ کبھی گوارا نہیں کر سکتا تھا کہ یہودیوں نے ابھی کوئی شدید عداوت کی نہ تھی اور وہ قرآن کریم کے الفاظ میں اشتہار عام دے دیئے کہ اے مومنین یہ یہودی تم سے انتہائی عداوت کریں گے۔ ایسی بات عالم الغیب رازدارانہ انداز میں تو اپنے نبیؐ سے کہہ سکتا تھا لیکن قرآن کوئی ڈھکی چھپی بات تو نہیں رہ سکتا تھا۔ پھر یہ کیسے ممکن اور مناسب تھا کہ یہودیوں کی عداوت کھل جانے سے پہلے ہی خدا تعالیٰ ان کو مومنین کا شدید ترین دشمن کہہ کر ان کو دشمنی پر اکسادے اور جو لوگ ابھی دشمن نہیں ہیں ان کو دشمن اور پکا دشمن کہہ کہہ کر دشمن بنا دے۔ ایک طرف مومنین کو یہودیوں کے خلاف مشتعل کردے دوسری طرف یہودیوں کو مومنین سے دشمنی کے لئے کھڑا کردے لہٰذا ہر صاحب عقل سمجھ سکتا ہے کہ قرآن نے یہودیوں اور مشرکین کو مومنین کا سخت ترین دشمن اس وقت کہا جب کہ یہ دونوں گروہ آیت کے پہلے سے شدید عداوت کھلم کھلا کر رہے تھے۔ مفسرین کا لام تاکید اور نون مشددہ محض مستقبل سے مختص نہ رہا بلکہ ماضی اور مستقبل دونوں زمانوں میں استمرار عداوت ظاہر کر رہا ہے۔

قرآن کریم میں بعض زندہ لوگوں کو مُردہ کہا گیا ہے لیکن کسی مُردہ کو زندہ نہیں کہا گیا

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ قرآن کریم میں مجازی طور پر کہیں مُردوں کو زندہ اور زندوں کو مردہ کہا گیا ہے۔

یہاں دو دعوے ہیں پہلا دعویٰ یعنی "مُردوں کو زندہ کہنا" بے دلیل ہے۔ قرآن کریم نے کہیں بھی کسی مردہ کو زندہ نہیں کہا۔ مفسرین کے علم میں کوئی ایسی آیت تھی تو اس کو پیش کر دیتے اور اگر کوئی آیت نہ ملی تھی اور نہ ملے گی تو قرآن کریم جو ام

الکتاب ہے اس پر کیوں بہتان باندھا۔ یہ جرم توام المومنین پر بہتان باندھنے سے بھی کہیں زیادہ ہے کیونکہ یہ بہتان تو خدا تعالیٰ پر ہوا۔ اگر ان کا مطلب ان دوآیتوں سے ہے جن میں شہداء راہ خدا کو زندہ کہا گیا ہے تو وہاں تو مُردوں کو زندہ نہیں کہا بلکہ زندوں کو زندہ کہا ہے جو اظہر من الشمس ہو چکا۔ پھر زیر بحث آیت میں اگر وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ان میں زندہ کہا گیا ہے ان کو جو مردہ ہیں تو اس دعوے کی دلیل اور اس دعوے کی مثال خود یہی آیت تو نہیں ہو سکتی اس کی مثال یا دلیل میں کوئی اور آیت پیش کرنا تھا۔ خود دعویٰ تو دلیل نہیں ہو سکتا۔ البتہ ہم اس کو مانتے ہیں کہ قرآن کریم نے بعض زندوں کو مردہ کہا ہے کیونکہ زندگی نام ہے۔ مختلف صلاحیتوں کا اگر کوئی شخص ان میں سے کوئی صلاحیت کھو بیٹھا تو چونکہ وہ صلاحیت ختم ہو گئی وہ شخص اس صلاحیت کے اعتبار سے جزءً مردہ ہو گیا مثلاً جس کی بصارت زائل ہو گئی وہ قوت بصارت کے اعتبار سے مردہ ہو گیا۔ جس کی سماعت زائل ہو گئی وہ قوت سماعت کے اعتبار سے مردہ ہو گیا۔ جو عقل اور قبول ہدایت کی صلاحیت کھو بیٹھا وہ عقل و فہم کے اعتبار سے مردہ ہو گیا۔ بہر حال زندہ شخص کو کسی صلاحیت کے مفقود ہو جانے کی وجہ سے مردہ کہا جا سکتا ہے لیکن جو ہو ہی کلیتہً مردہ اور معدوم اس کو کسی اعتبار سے بھی زندہ نہیں کہا جا سکتا۔ ہست کے ساتھ ہزاروں نیست کہے جا سکتے ہیں لیکن نیست کے ساتھ ہست کہنے کا کوئی سوال ہی نہیں مثلاً آپ انسان ہیں تو اس ''ہیں'' کے ساتھ ہزاروں نہیں والے جملے کہے جا سکتے ہیں جیسے کہ ''آپ انسان ہیں خدا نہیں'' ہیں' نبی نہیں ہیں' امام نہیں ہیں' جن نہیں ہیں' فرشتہ نہیں ہیں' آسمان نہیں ہیں' زمین نہیں ہیں' دریا نہیں ہیں' پہاڑ نہیں ہیں' پرندہ نہیں ہیں' درخت نہیں ہیں' حیوان نہیں ہیں' یہاں نہیں وہاں نہیں ہیں' ایسے نہیں ویسے نہیں ہیں' اِتنے ہیں اُتنے نہیں' اب ہیں جب نہیں ہیں' غرض کہ ہزاروں

نہیں آسکتے ہیں کیونکہ آپ ہیں لیکن جو ہے ہی نہیں وہ کیا ہے؟ کون ہے؟ کیسا ہے؟ کب ہے؟ کتنا ہے؟ کہاں ہے؟ یہ سوال سب مہمل ہیں کیونکہ وہ ہے ہی نہیں لہذا جو زندہ ہے وہ کسی نہ کسی اعتبار سے مردہ ہو سکتا ہے لیکن مردہ کسی اعتبار سے بھی زندہ نہیں ہو

سکتا۔آپ جب یہ مان چکے کہ اللہ تعالیٰ بہت سے زندہ لوگوں کو بھی مردہ کہتا ہے تو اسی سے انہیں یہ درس عبرت حاصل کرنا چاہئے تھا کہ جو زندوں کو بھی مردہ کہتا ہو وہ کسی مردہ کو زندہ کیسے کہہ دے گا۔اس کا زندوں کو مردہ کہنا ہی اس کی دلیل ہے کہ اس کی نظر میں معیارِ زندگی اتنا اونچا ہے کہ اس معیار پر زندہ بھی زندہ نہیں قرار پاتے وہ صاحب نظر جب کسی کو زندہ کہے گا تو وہ کیسا مکمل زندہ ہو گا۔ لیکن آپ معیارِ قدرت کو اتنا گرا رہے ہیں کہ وہ زندہ کہہ رہا ہے ان کو جن میں کوئی بھی زندگی نہیں بلکہ بالکل مردہ ہیں۔

قرآنِ کریم میں روح کا لفظ انسانی جان کے لئے ضرور آیا ہے اس کی نفی کرنا غلط ہے

بہت سے لوگ سرے سے اس روح ہی کے منکر ہو گئے جس کی آمد و شد کا نام حیات و موت ہے لیکن ہم ان کے عقائد و نظریات کو بے روح سمجھ سکتے ہیں۔ ان کی ذات کو بے روح نہیں مان سکتے کیونکہ ان کے عقائد تو ہیں خود ان کے لیکن ان کی روح صنعت پروردگار ہے جس سے انکار ممکن نہیں۔ بعض حضرات کہتے ہیں :

> قرآن کریم پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان ترکیب عناصر ہی سے عبارت ہے اور ترکیب عناصر ہی سے اس میں زندگی آجاتی ہے اور عدم ترکیب سے ختم ہو جاتی ہے۔ روح نامی کوئی ایسی چیز ہی نہیں جو داخل ہو کر جسم کو زندہ کر دیتی ہو اور خارج ہو کر مردہ۔ جیسے کہ قرآن کریم میں روح کا لفظ انسانی جان کے لئے آیا ہی نہیں بلکہ یہ لفظ تعلیم ربانی، وحی الٰہی کے لئے آیا ہے"۔

وہ مزید کہتے ہیں کہ :

> "قرآن کریم کی رو سے روح نامی کوئی چیز ایسی موجود نہیں جس کے ادخال و اخراج سے جسد خاکی میں جان پڑتی ہو یا نکل جاتی ہو قرآن کریم کی رو سے روح بمعنی صرف قرآن کریم ہے"۔

اول تو ترکیب عناصر کا انحصار صرف انسان سے کرنا ایک مہمل اور لایعنی چیز ہے جبکہ کائنات کے ہر جسم کے لئے ترکیب عناصر موجود ہے۔ یہاں تک کہ عنصر جن چیزوں کو کہا جاتا ہے وہ بھی مجرد نہیں بلکہ مرکب ہیں اور ہر عنصر اپنی جگہ عناصر سے مرکب ہے۔ اگر زندگی محض ترکیب عناصر کا نام ہے تو ہر جسم کائنات کو آپ زندہ کیوں نہیں کہتے؟ جس کو آپ مردہ کہتے ہیں ترکیب عناصر اس میں بھی موجود ہے۔ آب و خاک و آتش و ہوا سب اپنی جگہ ہیں اور ایسے ممتزج ہیں کہ الگ کوئی بھی چیز نظر نہیں آسکتی۔ صرف وہ حرارت زائل ہوتی ہے جو روح کی وجہ سے تھی ورنہ عنصری حرارت مطلقاً زائل نہیں ہوئی۔ ورنہ گوشت کا مزاج گرم نہ ہوتا اور کھانے والے کے جسم میں وہ گرمی پیدا نہ کرتا۔ پھر وہ اس کو مردہ کہتے کیوں ہیں۔ ان کی اس منطق سے تو زندہ مردہ کی تفریق ہی غلط ہے۔ سب ہی زندہ ہیں۔ اگر جسم مردہ سے ترکیب عناصر مفقود ہو گئی ہوتی تو جسم مردہ کے اعضاء حتیٰ کہ دل آج زندہ جسم کا جزء کیسے بنائے جاتے۔ جسم مردہ کے اعضا آج زندوں کو اس ہی لئے تو دیئے جارہے ہیں کہ ان اعضاء مردہ میں ترکیب عناصر تو سب موجود ہے فقط روح نہیں ہے جب یہ اعضاء باروح انسان کو دے دیئے جاتے ہیں تو اس کی روح ان اعضاء بے روح میں بھی جاری و ساری ہو جاتی ہے۔ زندہ کا خون لے کر محفوظ کر لیا جاتا ہے۔ اس میں ترکیب عناصر موجود ہے لیکن بے روح ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب تک وہ سرنج یا شیشی میں ہے بے حرکت ہے اب اس میں دوران اور گردش نہیں کیونکہ روح نہیں۔ حرکت میں لانا روح کا کام ہے۔ وہ خون جب کسی روح کے سپرد کیا اور جسم زندہ میں داخل ہوا تو فوراً حرکت میں آگیا اور رگوں میں دوڑنے لگا۔ لہذا یہ غلط ہے کہ زندگی محض ترکیب عناصر کا نام ہے۔ ان کا یہ فرمانا کہ از روئے قرآن زندگی ترکیب عناصر سے عبارت ہے۔ یہ کس آیت قرآنی نے بتایا ہے۔ شاید انہوں نے شاعرانہ تخیل کو قرآن سمجھ لیا کیونکہ ایک شاعر نے کہا ہے ؎

زندگی کیا ہے؟ عناصر میں ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے؟ انہی اجزاء کا پریشاں ہونا

کیا اس طرح کے اشعار کو وہ قرآن کریم سمجھ بیٹھے ہیں ؟ حالانکہ قرآن کہاں اور شعر کہاں ؟
ماعلّمنٰہ الشعر وما ینبغی لہ ان ھو الاّ ذکر و قرآن مبینo (سورہ یٰسین :69)

قرآن کریم نے ترکیبِ عناصر کو زندگی نہیں کہا

قرآن کریم فرماتا ہے :

ثمّ خلقنا النّطفة علقةً فخلقنا العلقة مضغةً فخلقنا المضغة عظاماً فکسونا العظام لحماً ثمّ انشاناہ خلقاً آخر فتبارك اللّٰه احسن الخالقینo (سورہ مومنون آیت 14)

"پھر ہم نے نطفہ کو منجمد خون بنایا پس ہم نے منجمد خون کو لوتھڑا بنایا، پس ہم نے لوتھڑے کو ہڈیاں بنایا، پس ہم نے ہڈیوں کو گوشت کا جامہ پہنایا، پھر ہم نے کچھ دیر میں اس کو ایک دوسری پیدائش (روح) دی، پس باعظمت ہے اللہ جو بہترین خالق ہے" انصاف سے کہئے کہ نطفہ سے خون اور خون سے لوتھڑا اور لوتھڑے سے ہڈیاں اور ہڈیوں پر گوشت، یہ تمام مراحل کیا ترکیبِ عناصر کے بغیر ہی طے ہو رہے تھے ؟ ہر گز نہیں۔ لیکن ان تمام مراحل طے ہونے پر بھی وہ زندہ نہیں تھا۔ یہ دوسری پیدائش جس کو کہا گیا ہے یہ روح ہی تو ہے، جواب تک نہ تھی۔

قرآن میں روح بمعنی انسانی جان، ملاحظہ فرمائیے

کیا یہ آیت قرآنی اب تک انہوں نے نہیں دیکھی ؟ فاذا سوّیتہ و نفخت فیہ من روحی فقعوا لہ ساجدین (اے فرشتو) جب میں جسم آدم کو مکمل کر دوں اور اس جسم میں اپنی پیدا کی ہوئی روح پھونک دوں تو تم فوراً اس کے لئے سجدہ کرتے ہوئے جھک جانا"۔ پہلے اللہ تعالیٰ نے سویتہ فرمایا یعنی "جب میں اس جسم کو مکمل کر لوں" ظاہر ہے کہ جسم کی تکمیل ترکیب عناصر کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ اس کے بعد فرمایا کہ "اور جسم میں اپنی روح پھونک دوں تو پھر سجدہ میں دیر نہ ہو"۔ یہاں روح سے مراد انسانی جان نہیں تو اور کیا ہے ؟ کہ جس کا ادراک فوراً فرشتوں کو ہو سکے۔ یہاں روح

سے مراد وحی، قرآن، روح القدس، روح الامین تو نہیں ہو سکتا جس کو جسم آدم میں پھونکا جارہا ہو۔ اول تو جسم بے جان پر وحی، علم، حکمت وغیرہ کا القاء کیسا۔ دوسرے ان چیزوں کا فوری ادراک فرشتوں کو ہو کیسے سکتا ہے کہ اب اس جسم میں وحی اتر آئی یا علم و حکمت کا القاء ہو گیا۔ کسی جسم بے جان کا باروح ہونا تو اسی صورت میں معلوم ہوا کرتا ہے کہ جو جسم اب تک بے حرکت تھا اب حرکت میں آگیا اور ہلنے جلنے لگا۔ اسی طرح جسم زندہ کے مردہ ہونے کا علم ہوتا ہے کہ جسم متحرک اب ساکن ہو گیا اور سانس کی حرکت تک ختم ہو گئی لہٰذا بے جان کا جان دار ہونا اور جان دار کا بے جان ہونا حرکت اور سکون ہی سے معلوم ہوتا ہے۔ اس حرکت و سکون سے علم اور وحی کے نزول و انقطاع کا ادراک نہیں ہو سکتا۔ یہ بات الگ ہے کہ ہر روح زندگی کے خصوصیات الگ الگ ہوتے ہیں۔ پرندوں کی روح زندگی میں پرواز کی طاقت ہے۔ مچھلی کی روح زندگی میں تیرنے کی طاقت ہے یا نسان کی روح زندگی میں نطق و فہم کی طاقت ہے۔ نبیؐ کی روح زندگی میں کمال نبوت، علم و حکمت کی طاقت ہے اس لئے آدم کی روح زندگی اپنے ساتھ کمالاتِ نبوت لے کر آرہی ہے لیکن اصل شے تو زندگی ہے اور ادراک کرنے والوں کو سب سے پہلے تو زندگی ہی کا ادراک ہو گا۔ نبوت اور کمالاتِ نبوت کا تو فوری ادراک نہیں ہو سکتا۔

جب قرآن کریم میں روح بمعنی وحی وغیرہ آتا ہے تو وہاں لفظ نفخ نہیں آتا

بے شک قرآن کریم میں لفظ روح کہیں بمعنی وحی ہے کہیں بمعنی مَلَك ہے کہیں بمعنی روح القدس اور روح الامین ہے لیکن ایسے کسی موقع پر لفظ روح کے ساتھ لفظ نفخ (پھونکنا) نہیں آتا بلکہ ایسے مواقع پر لفظ تنزیل، انزال، نزول، القاء، ارسال وغیرہ استعمال ہوتا ہے۔ بطور مثال دیکھئے:

(۱) ینزّل الملائکة بالرّوح من امره علیٰ من یّشاء من عباده (سورہ نحل :2)

(۲) یلقی الرّوح من امره علی من یّشاءُ من عبادہٖ (سورہ مومن :15)

(۳) و کذلك اوحینا الیك روحاً من امرنا (سورہ شوریٰ :52)(٤) فارسلنا الیها روحنا فتمثّل لها بشراً سویاًo(سورہ مریم :17)

لیکن جب لفظ نفخ کے ساتھ یا روح کے ذکر میں لفظ نفخ (پھونکنا) آتا ہے تو وہاں لفظ روح صرف بمعنی جان ہے جس کی مثال ہم جناب آدم کے بارے میں دے چکے پھر روح بمعنی جان اسی لفظ نفخ کے ساتھ حضرت عیسیٰ کے بارے میں ہے۔

مریم ابنة عمران التی احصنت فرجها فنفخنا فیه من روحنا o(سورہ تحریم :12) ہم مریم دختر عمران کی مثال دیتے ہیں جس نے اپنی پاک دامانی کی حفاظت کی۔ پس ہم نے اس میں اپنی ایک روح پھونک دی۔ پھر فرمایا جاتا ہے۔ انّما المسیح عیسیٰ ابن مریم رسول اللّٰه وکلمته القٰها الیٰ مریم و روح منه o (نساء :171)۔ عیسیٰ بن مریم تو صرف اللہ کے رسول ہیں اور اللہ کا ایک بول ہیں جس کو اللہ نے مریم کی طرف ڈالا اور اللہ کی جانب سے ایک روح ہیں یعنی ایک جان ہیں۔ پھر حضرت عیسیٰؑ ہی کے بارے میں فرمایا جاتا ہے واذ تخلق من الطین کهیئة الطیر باذنی فتنفخ فیها فتکون طیراً باذنیo(مائدہ :110)۔ اے عیسیٰ جب تم مٹی سے پرندہ کی شکل کی طرح ایک شکل بناتے تھے میرے اذن سے پس تم اس میں (روح) پھونک دیتے تھے پس وہ میرے اذن سے پرندہ ہو جاتا تھا۔ پھر ایسے ہی کلمات سورۂ آل عمران میں جناب عیسیٰ کی زبانی قرآن نے بیان فرمائے۔ انّی اخلق لکم من الطّین کهیئة الطّیر فانفخ فیه فیکون طیراً باذن اللّٰهo(آل عمران :49) میں پیدا کرتا ہوں۔ تمہارے لئے ایک پرندہ کی شکل پس اس میں (روح) پھونکتا ہوں۔ پس وہ اذنِ خدا سے پرندہ ہو جاتا ہے۔ غرضکہ آیات قرآنیہ سے بالکل واضح ہو رہا ہے کہ جب لفظ روح وحی وغیرہ کے لئے آتا ہے وہاں لفظ نفخ نہیں آتا۔ کیونکہ وحی اور اس کی مثل یہ ایسی چیزیں نہیں کہ ان کو کسی جسم میں پھونک کی طرح بھرا جائے لیکن جب روح کا ذکر جان کے معنی میں ہوتا ہے تو وہاں لفظ نفخ (پھونکنا) آتا ہے یا جب کسی انسان کو روح کہا جاتا ہے تو وہاں بھی لفظ روح جان ہی کے معنی میں آتا ہے۔ کیونکہ

انسان بذاتِ خود عین وحی یا عین علم نہیں ہے۔

مفسرین کا یہ فرمانا کہ قرآنِ کریم نے لفظ روحی بمعنیٰ جان کہا ہی نہیں قرآنِ کریم بار بار ان کے اس دعوے کی تردید کر رہا ہے۔ اب وہ لوگ اپنی قرآن فہمی کا خود فیصلہ کریں اور سوچیں کہ وہ کس طرح دفتر قرآن کو اُلٹ پلٹ کرنے کا نام انہوں نے رکھا ہے تفسیر القرآن بالقرآن۔ قرآن کریم ان حضرات سے بزبانِ حال کہہ رہا ہے ؎

سُورتیں اُلٹی تھیں اب معنیٔ قرآں اُلٹے

ہاتھ روکو نہ کہیں دفترِ امکاں اُلٹے

امام بارۂ عباسیہ چوک برف خانہ فلیمنگ روڈ لاہور پر ایک صاحبِ محترم کا عتاب

وہ فرماتے ہیں :

''ہمارے شیعہ دوستوں کا ایک امام باڑہ عباسیہ نام کا چوک برف خانہ فلیمنگ روڈ لاہور میں ہے جس کی دیواروں پر سر بازار ائمہ سلام اللہ علیہم کے اسمائے گرامی اور جناب امیر المومنین علی علیہ السلام کے فضائل کے اشعار مرقوم ہیں جن میں ایک لمبی نظم سامنے کی دیوار پر لکھی ہے۔ یوں تو اس نظم کا ہر شعر خلافِ قرآن ہے لیکن ایک شعر میں یہ تصور دیا گیا ہے کہ خدا تعالیٰ نے جبریل امینؑ کو حضرت علیؑ کی طرف بھیجا تھا۔ لیکن وہ محمدؐ کے پاس چلا گیا۔ شعر یہ ہے 'خود موقع پر پہنچ کر ملاحظہ فرمائیں۔ اگر رات کا وقت ہو تو ٹارچ ہمراہ لے جائیں۔ بالکل سامنے لکھا پائیں گے ؎

جبریل کہ آمد زپسِ خالقِ بے چوں

در پیشِ محمدؐ شدہ مقصود علی بود

کیا امامیہ مشن اسے مٹا کر عند اللہ ماجور ہو گی''

ان صاحب کو ائمہ سلام اللہ علیہم اور امیر المومنین کے فضائل کے اشعار کا سر بازار ہونا زیادہ دکھ دے رہا ہے۔ شاید انہوں نے فضائل علیؑ مرتضٰی کی ضد میں اس قرآن کو بھی خیرباد کہہ دیا ہو جس میں صرف علی مرتضٰیؑ کی شان میں تین سو آیاتِ مدح ہیں جیسے کہ عالمِ اہل سُنت حضرت احسنؔ جائسی فرماتے ہیں ۔

منم سنی و لیکن از تعصب الاماں گوئم
پسندِ خاطر انصاف از دنیا و ما فیہا
ز تفسیر کلام اللہ چومی پرسی شود ناطق
کہ سہ صد آیہ نازل شد بشان شوہر زہراؑ

غالباً ہمارے محترم اس قرآن کے ماننے والے ہیں جس میں علی مرتضٰیؑ اور ائمہ کی کوئی فضیلت ہی نہیں ہے تب ہی تو وہ فرماتے ہیں۔ ''اس نظم کا ہر شعر خلافِ قرآن ہے'' بے شک ان کے قرآن کے ضرور خلاف ہو گا۔ رہا وہ تصور جو شعر مذکور سے محترم نے اخذ فرمایا ہے۔ اس کے متعلق تو میں بعد میں عرض کروں گا' البتہ میرے اور صاحب شعر کے مسلک کے یہ تصور بالکل خلاف ہے جو تصور انہوں نے شعر مذکور سے اخذ فرمایا ہے وہ شعر کو نہ سمجھنے کی بنا پر ہے۔ شاعر کی نگاہِ تصور شبِ ہجرت نبی اکرمؐ کے بیت الشرف کی طرف ہے۔ وہ دیکھ رہا ہے کہ نبیؐ کے فرشِ رشک عرش پر علی مرتضٰیؑ خواب راحت میں ہیں اور خود نبی اکرمؐ مکہ سے جدا ہو کر راہ مدینہ میں ہیں۔ علیؑ کہیں ہیں نبیؐ کہیں ہیں۔ جبریل امین علی مرتضٰیؑ کی شان میں آیہ ومن النّاس من یشری نفسہ ابتغاء مرضات اللہ واللہ رؤف بالعباد ہ (بقرۃ : 207) لے کر نبی کریم کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں کیونکہ منزل وحی سرکار ہیں علیؑ نہیں ہیں اور وہ وحی الٰہی جس کے مقصود علیؑ ہیں نبیؐ تک پہنچاتے ہیں اور یہ صورت صرف ایک اسی آیت کی نہیں وہ تین سو آیات جن سے قدرت کو مدحِ علیؑ مقصود ہے نبیؐ ہی پر نازل ہوئیں جبکہ مقصود آیات ہے علیؑ کی ذات۔

انہوں نے شعر کے کس لفظ سے یہ مطلب پیدا کیا کہ جبریلؑ کو آنا تو تھا علیؑ

کے پاس مگر وہ غلطی سے محمدؐ کے پاس پہنچ گئے۔ شاعر کا تو صرف یہ مطلب ہے کہ وحی آئی نبیؐ پر اور مقصود وحی علیؑ تھے کیونکہ مقصود علیؑ کی مدح تھی۔ اتنا صاف شعر بھی وہ سمجھنے کی کوشش نہ کریں اور نہ سمجھ سکیں جو انہی کی ہی طرح کے ایک انسان کا کلام ہے تو اللہ کا کلام جہاں متکلم بھی بے مثل اور کلام بھی بے مثل وہ ان کی سمجھ میں کیسے آئے گا۔ اگر علیؑ اور اولادِ علیؑ کے ناموں کی وجہ سے ان کو امام باڑہ عباسیہ سے ضد ہے اور ان کو تمنا ہے کہ وہ مٹا دیئے جائیں تو وہ یہ نام کہاں کہاں سے مٹائیں گے۔ نبی کریمؐ نے تو شب معراج عرش پر لکھا ہوا دیکھا لا اله الا الله محمد رسول الله ایّدته بعلیٍ ''اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں، محمدؐ اللہ کا رسول ہے، میں نے محمدؐ کی تائید و نصرت کی ہے علیؑ کی ذات سے''۔ (شفاء قاضی عیاض اور تفسیر درِ منثور سیوطی) ''امامیہ مشن'' سے آپ چاہتے ہیں کہ وہ فضائل اہل بیت اور ان کے اسماء گرامی کو امام باڑہ عباسیہ سے مٹا دیں۔ یہ عمل ان ہی کو مبارک ہو، ہم ان کے فضائل کو مٹانے والے نہیں بلکہ اپنے لوحِ دل پر نقش کئے ہوئے ہیں۔ البتہ وہ عرشِ خدا سے علیؑ کا نام مٹا دیں تو ہم جانیں۔ اگر جنت کی طرف ان کا گزر ہو تو بابِ جنت کو بھی اچھی طرح دیکھ لیں اور کسی ٹارچ سے پہلے دیکھ لیں کہ وہاں تو یہ نام لکھے ہوئے نہیں۔ اگر کہیں وہاں بھی امام باڑہ عباسیہ کی طرح یہی نام ہوئے تو نہ معلوم ایسی جنت کو بھی وہ اپنے لئے پسند کریں گے یا نہیں اور ایسی جنت ان کو بھی پسند کرے گی یا نہیں۔

معترض کی ایک نئی ایجاد کہ جو کچھ کرتا ہے جسم کرتا ہے روح کوئی چیز نہیں

چنانچہ ان کا خیال ہے کہ:

''روح کے متعلق ایک تصور یہ بھی دیا جاتا ہے کہ جسم انسانی میں اصل حاکم تو ہے روح۔ جسم یا اعضاء تو محض اوزار ہیں جن سے وہ کام لیتی ہے یعنی بالکل اسی طرح جیسے ترخان حاکم اور آری تیشہ اس کے اوزار۔ اگر ترخان کسی کا شہتیر کاٹ کر ناکارہ کر دے تو قصور

ترخان کا ہے آری کا نہیں۔ یہ روح کے وجود کی بڑی قاطع دلیل لائی گئی ہے لیکن قرآن کی رو سے انسانی جسم پر صادق نہیں آتی۔ جیسے اللہ نے بے حیائی کی سزا سو کوڑے رکھی ہے جو روح کی نہیں بلکہ جسم کو لگانے کا حکم دیا ہے۔ فلہٰذا جو کچھ ہے جسم ہی میں ہے"۔

ان معترض کا دعویٰ یہ ہے کہ روح تو کوئی چیز ہے ہی نہیں۔ اچھا بُرا جو کچھ کرتا ہے جسم کرتا ہے۔ ان کا نظریہ (اگرچہ ان کا آخری جملہ "فلہٰذا جو کچھ ہے جسم ہی میں ہے" گول مول جملہ ہے۔ وہ جو کچھ جو جسم ہی میں ہے اسی ہی کا نام تو روح ہے۔ وہ جو کچھ روح کے سوا اور کیا ہے' وہی روح ہے جو جسم میں آتی بھی ہے جاتی بھی ہے) اگر کسی شخص نے دن کو رات اور رات کو دن کہنے والا کبھی نہ دیکھا ہو تو وہ ہمارے ان عزیز کو دیکھ لے۔ دنیا کا ہر عالم و جاہل خوب جانتا ہے کہ فاعل افعال کی روح ہے۔ جسم چونکہ تابع روح ہے اس لئے وہ روح کا اسی طرح آلہ کار ہے جس طرح صناعوں اور کاریگروں کے اوزار۔ فرق اتنا ہے کہ اوزار بیرونی چیزیں ہیں اور اعضاء ہیں روح کا داخلی عملہ جس کو فطرت نے روح سے وابستہ کر دیا ہے۔ ہاتھ پیروں میں نہ فہم ہے نہ خواہش نہ ارادہ۔ ان کو کچھ معلوم نہیں کہ وہ کیا کر رہے ہیں؟ کہاں جا رہے ہیں؟ جو کچھ کر رہے ہیں کس لئے کر رہے ہیں؟ ہلانے والا ان کو ہلاتا ہے تو وہ ہل جاتے ہیں' ٹھہراتا ہے تو وہ ٹھہر جاتے ہیں۔ روح کی حکومت ہے یہ اس کے تابع ہیں۔ اتنی صاف اور صریح بات کے لئے نہ کسی ثبوت کی ضرورت نہ کسی دلیل کی احتیاج مگر ہمارے عزیز اس بدیہی بات کے بھی منکر ہیں جو ایسی بدیہی بات سے انکار فرما دیں۔ ان کا کسی عقلی اور علمی بات کا انکار کیا کوئی تعجب خیز ہو سکتا ہے؟ وہ مزید کہتے ہیں:

"اللہ نے بے حیائی کی سزا سو کوڑے رکھی ہے جو روح کی نہیں بلکہ جسم کو لگانے کی سزا ہے"۔

ہمارے معترض صاحب زانی کے بدن پر سو کوڑوں کی سزا سے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ گنہگار بدن ہے اس لئے کوڑے بھی بدن پر لگائے جاتے ہیں لیکن وہ یہ بھول

گئے کہ جن اعضاء نے زنا کیا ہے وہ کوڑوں کے لگائے جانے کے وقت بھی بالکل محفوظ اور مستور رکھے جاتے ہیں۔ کوڑے ان اعضاء پر نہیں لگائے جاتے جو زنا کے لئے استعمال ہوئے ہیں۔ کیا یہ کوڑے مرد کے اس عضو پر لگائے جاتے ہیں جس نے بے حیائی کی ہے یا عورت کے اس عضو کے داخلی حصہ میں لگائے جاتے ہیں جو صرف بے حیائی ہوا تھا؟ تہمت زنا کی سزا میں بھی کوڑے لگائے جاتے ہیں لیکن کیا منہ سے اس زبان کو نکلوا کر جس نے تہمت لگائی تھی؟ شراب خواری کی سزا میں بھی کوڑے ہیں۔ لیکن کیا اس منہ کے اندر جس نے شراب پی ہے؟ اچھا یہ بھی کہئے کہ جب سزا جسم کی ہے روح کی نہیں ہے تو اگر دس کوڑوں ہی میں مجرم کی جان نکل گئی تو کیا باقی کوڑے روح نکل جانے کے بعد بھی جسم مردہ پر مارے جائیں گے یا اگر مجرم سزا پانے سے پہلے مر گیا تو کیا مرے پیچھے سو دُرّے لگائے جائیں گے؟ اس سلسلہ میں ایک چور کی حکایت یاد آئی جو مساجد اور محافل وغیرہ سے جوتے چرایا کرتا تھا ایک مرتبہ وہ پکڑا گیا۔ قاضی نے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔ چور نے حلف کہا کہ ان ہاتھوں نے کبھی چوری نہیں کی۔ چور کے کسی رازدار نے آہستہ سے کہا کہ تم کو جوتے چراتے ہوئے برس گزر گئے اور اب تم جھوٹا حلف اٹھا رہے ہو۔ چور نے بھی آہستہ سے جواب دیا کہ میری قسم غلط نہیں ہے۔ میں نے کبھی کوئی جوتا ہاتھ سے نہیں چرایا بلکہ اچھا جوتا دیکھا تو بغیر جھکے پاؤں میں ڈالا اور چل دیا۔ میرے عزیز' چور کی سزا میں بھی ہاتھ کا کاٹنا اس لئے نہیں کہ ہاتھ سے چوری کی تھی بلکہ اس لئے ہے کہ چور ہر معاشرہ اور ہر جگہ کے لئے خطرناک ہے۔ ہر شخص کٹا ہوا ہاتھ دیکھ کر جان جائے کہ یہ شاطر بدمعاش ہے جس کو بار بار کی چوری میں یہ سزا ملی ہے۔ اگر اس کو کوڑوں کی سزا ملے تو یہ ہر زمانہ میں اور ہر جگہ ہر شخص کے لئے شناخت کا ذریعہ نہیں ہو سکتا۔ آپ کے نزدیک تو مذکورہ حکایت کے چور کے پیر کاٹنا ہوں گے۔ اس لئے پیروں سے چوری کی تھی۔ اور تہمت لگانے والے کی زبان پر کوڑے لگائے جائیں گے اور شراب خوار کے منہ میں اور زانی وزانیہ کے دوسرے اعضاء پر۔ باقی بدن تو بے گناہ ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک قابل انسان کیوں یہ سب خرافات مول لے

رہا ہے۔روح کے بجائے جسم بے شعور کو فاعل افعال کہناروح کے وجود سے مرنے کے بعد ہی نہیں بلکہ زندگی میں بھی انکار کرنا اور اپنی سخن پروری سے یہ تاثر دینا کہ مردہ تو مردہ زندہ میں بھی روح کوئی چیز نہیں حیات شہداء سے انکار کی غلطی ان سب کا باعث بن رہی ہے۔

بے حیائی کی سزا میں جو سو کوڑے بدن پر لگائے جاتے ہیں محض اس لئے کہ جس روح نے جرم کیا ہے وہ اس بدن سے الگ نہیں ہے۔اسی جسم میں ہے۔سزا روح کی ہے جسم کی نہیں ہے۔اگر کوڑوں کے پورا ہونے سے پہلے روح نکل گئی تو اب سزا میں کوڑے نہیں لگائے جا سکتے۔کیونکہ گنہگار اس جسم میں نہ رہا۔اب صرف جسم بے گناہ رہ گیا۔سیدۂ طاہرہ حضرت فاطمہ زہراؑ کے گھر جلانے کا جو سامان بعدِ رسولؐ ہو رہا تھا وہ اس لئے تو نہ تھا کہ دوسرا فریق اس گھر کو گنہگار سمجھ رہا تھا‘ اس کا حساب اور تشدد تو گھر والوں پر تھا۔گھر کو تو صرف گھر والوں کی وجہ سے جلانے کا ارادہ تھا۔جنابِ والا میدانِ قتال میں قتال ہوتا ہے باہم انسانوں میں‘ کسی کے لباس اور پوشش سے قتال نہیں ہوتا لیکن چونکہ کوئی بھی انسان بے لباس اور بے پوشش نہیں ہوتا اس لئے اس انسان کی وجہ سے اس کے لباس اور پوشش کو پہلے کاٹا جاتا ہے۔اس کا لباس اگر اس کے جسم سے الگ کہیں رکھا ہو تو اس کو کون کاٹے گا۔جس طرح جسم کا لباس اس کا جامہ اور ملبوس ہے اسی طرح روح کا لباس اس کا جسم ہے۔جسم برابر تحلیل ہوتا رہتا ہے۔پہلے اجزاء جسم ختم ہو کر نئے اجزا شامل جسم ہوتے رہتے ہیں اور ایک مدت کے بعد بالکل کایا پلٹ ہو جاتی ہے۔بعض اوقات مجرم برسوں کے بعد ہاتھ آتا ہے۔اگر مجرم پچاس برس کے بعد بھی ملے گا تو بے حیائی کی سزا میں اب بھی سو کوڑے جسم ہی پر لگائے جائیں گے حالانکہ جرم کے وقت جو جسم تھا اب وہ کچھ سے کچھ ہو چکا ہے جرم کے وقت کے اجزاء بدن زائل ہو چکے اور ان کی جگہ دوسرے اجزا ہو گئے جرم کے وقت جسم اور تھا وزن اور تھا‘ اب جسم اور وزنِ جسم اور ہے لیکن ہزاروں تبدیلی کے باوجود کوڑے لگائے جائیں گے کیوں جسم بدل گیا لیکن جسم میں روح وہی ہے جس نے جرم کیا تھا اگر سزا جسم کی

ہوتی تو اس بدلے ہوئے بے گناہ جسم کو سزا نہ دی جاتی انہوں نے دوزخ میں جلنے کے لئے قرآنی آیت نہیں دیکھی اللہ فرماتا ہے کہ اہل جہنم کی کھال جلتی رہے گی اور ہم اس کھال کی جگہ دوسری کھال بدلتے رہیں گے یہ لاکھوں کوڑوں دفعہ کی بدلی ہوئی کھال وہ تو نہیں جو جرم کے وقت تھی۔ تو کیا 'کرے کوئی' بھرے کوئی' نہیں سزا اصل میں روح کی ہے۔ وہ روح جس لباس میں بھی ہو۔ چونکہ ایمان 'کفر' نیکی' بدی سب روح کے افعال ہیں اور ان افعال کی مکمل جزاء کا دن یوم الدین اور روزِ قیامت ہے۔ اس لئے ہر روح کا مومن کی ہو یا کافر کی نیک کی ہو یا بد کی اس کا جزاء کے لئے قیامت تک باقی رہنا ضروری ہے۔ اگر مرنے کے بعد روح معدوم محض ہو گئی اور مطلقاً فنا ہو گئی تو جزا پائے گا کون؟ خداوند عالم اس جیسی روح تو ہزاروں پیدا کر سکتا ہے مگر یہ پیدا کی ہوئی روح وہ تو نہ ہو گی جس نے نیکی' بدی کی تھی۔ اس لئے ہم بعد مُردن ہر روح کی بقاء کے قائل ہیں تاکہ امر جزاء معطل نہ ہو جائے اور ایمان بالقیامتہ برائے نام نہ رہ جائے۔ روح مومن کی ہو یا کافر کی مرنے کے بعد اس کو جزا پانے کے لئے باقی رکھا جاتا ہے۔ وہ صاحب تو زندگی میں بھی روح نامی چیز کے منکر ہیں اور مرنے کے بعد تو ان کے نزدیک نبیؑ ہوں یا عام افراد ہر ایک معدومِ محض ہے۔ اس کی روح تک فنا ہو چکی پھر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کا نبیؑ کے لئے یا ائمہ کے لئے بار بار سلام'' علیہ اور سلام علیہم لکھنا یہ کیا ہے وہ کس کو سلام کہہ رہے ہیں؟ ان کو جن کی روح اول تو کبھی بھی نہ تھی اور اب تو وہ مطلقاً معدوم ہے پھر یہ سلام کیسا اور کس پر؟ ان حضرت نے محض اس بناء پر کہ ہم ہر مومن و کافر کی روح کو معدوم نہیں سمجھتے ایک طرف تو یہ الزام دیا ہے کہ ہم ہر متوفیٰ کو زندہ سمجھتے ہیں۔ پھر شہداء کی تخصیص کیا رہی۔ جناب والا روح کا موجود ہونا اور بات ہے اور اس کا زندہ ہونا اور بات ہے۔ ہم ہر متوفیٰ کو زندہ نہیں سمجھتے عام مرنے والوں کی روح رہتی ہے لیکن مرنے کے بعد وہ ہر عمل سے معطل کی جا چکی ہے۔ اب وہ کوئی عمل نیک یا بد کر نہیں سکتی اس کا تعلق دارِ عمل سے اُٹھ گیا لیکن وہ متوفیٰ جو بعد وفات زندہ ہیں وہ مقامِ عمل میں ہیں اور عملِ خیر میں مصروف رہتے ہیں۔ وہ رزق پاتے ہیں جبکہ عام

مرنے والے ان تمام امور سے معطل ہیں۔ دوسری طرف ان صاحب نے روح کے موجود رہنے پر یہ اعتراض فرمایا ہے کہ ہم نے خدا کے مقابلہ میں روح کو بھی باقی سمجھ لیا جبکہ اس کو فانی سمجھنا چاہئے تھا یہ اعتراض بقاء اور فنا کے مفہوم کو نہ سمجھنے کی بنا پر ہے اللہ کو باقی اس کی موجودگی کی بنا پر نہیں کہا جاتا بلکہ اللہ باقی ہے' اس معنی سے کہ نہ اس کی فنا ممکن ہے نہ کوئی اس کو فنا کرنے پر قادر ہے اور اللہ کے سوا ہر شے فانی ہے اس معنی سے کہ اس کی فنا عقلاً ہر وقت ممکن ہے اور اللہ ہر وقت اس کی فنا پر قادر ہے یہ مفہوم ہے کہ جس کی بنا پر کوئی بھی موجود اللہ کے سوا باقی نہیں بلکہ ہر موجود اپنی موجودگی میں بھی فانی ہے باقی بالذات صرف خدا ہے اس کے سوا جس کو اور جب تک اللہ موجود رکھے وہ ضرور موجود رہے گا یہ بقا' اور یہ وجود بالذات نہیں بلکہ تحت مشیتِ پروردگار ہے۔ وجود تو وجود ذی حیات کا قیام و قعود بھی اس کی اپنی طاقت نہیں بحول اللہ و قوتہٖ اقوم و اقعد۔

شہداء شہادت کے بعد بھی زندہ رہ کر طلبگارِ آخرت رہتے ہیں

بعض حضرات نے یہ مانا ہے کہ جنگ احد میں مسلمانوں کا کوئی دستہ کسی جگہ مقرر کیا گیا تھا۔ "جب فتح ہو گئی تو اس دستے کے اپنے افراد میں اس مقام کو چھوڑ دینے اور نہ چھوڑنے میں اختلاف ہو گیا یعنی جس دستے کی غلطی سے مصیبت آئی تھی اس میں بھی سارے قصوروار نہ تھے"۔ ان کا خیال ہے کہ جنگ احد میں جس جماعت سے اداء فرض میں کوتاہی ہوئی خدا تعالیٰ نے اس کے اظہار میں ان کی رعایت نہیں کی اس نے تو اپنے برگزیدہ نبیوں کے سہو پر بھی پردہ نہیں ڈالا" یہ اشارہ محترم کا اس ہی دستے کی طرف ہے جس کو نبیؐ نے پہاڑ کی گھاٹی پر مقرر کیا تھا جس کی اکثریت نے خلاف حکم نبویؐ اپنی جگہ چھوڑ دی۔ انہوں نے بڑے گھوم پھیر سے یہ مان لیا ہے کہ یہ آیت اس ہی دستے کے بارے میں آئی۔ حتیٰ اذا فشلتم و تنازعتم فی الامر و عصیتم من بعد ما ارٰکم ماتحبّون منکم من یریّد الدّنیا و منکم من یریّد الاٰخرۃ ○ (سورہ آل

عمران :152) یہاں تک کہ تم نے ہمت ہار دی اور امر نبیؐ کے بارے میں تم نے تنازع کیا اور جس وقت اللہ نے تمہاری محبوب فتح دکھادی تم نے نافرمانی کی تم میں سے کچھ دنیا چاہتے ہیں اور کچھ آخرت چاہتے ہیں۔ یہ سب لفظ اس ہی دستے کے بارے میں ہیں۔ فشلتم تم نے ہمت ہار دی۔ تنازعتم فی الامر تم نے حکمِ نبیؐ کے بارے میں تنازعہ کیا عصیتم تم نے نافرمانی کی یہ سب ماضی کے صیغے ہیں۔ اب اس کے بعد ان نافرمانوں کے لئے جنہوں نے خلافِ حکمِ نبوی اپنی جگہ چھوڑ دی فرمایامنکم من یرید الدنیا اور ان فرماں برداروں کے لئے جو نبیؐ کی فرماں برداری میں اپنی جگہ رہ کر شہید ہو گئے فرمایا ومنکم من یرید الاٰخرۃ پہلے کے تمام صیغے ماضی کے تھے۔ مگر نافرمانوں کی طلب دنیا اور فرماں برداروں کی طلبِ آخرت کے لئے ماضی کا صیغہ نہیں بلکہ مضارع اور استمرار کا صیغہ استعمال کر کے بتادیا کہ جنہوں نے حُب دنیامیں نافرمانی کی تو وہ نافرمانی محض کی ہی نہیں بلکہ کریں گے بھی یہ عمل محض ماضی نہیں بلکہ استمرارِ عمل ہے اور جنہوں نے حُب آخرت میں جانیں دے دیں ان کی طلب آخرت محض ماضی ہی نہیں ہے بلکہ مستمر اور جاری رہنے والی ہے۔ یہ شہداء بعد شہادت بھی طالبِ آخرت رہیں گے یعنی عمل خیر، اللہ کی اطاعت و عبادت کرتے رہیں گے۔ ورنہ دونوں جگہ پہلے الفاظ کی طرح لفظ اَرَادَ بصیغہ ماضی آتا اور اس کا مفہوم یہ ہوتا کہ تم میں سے بعض نے ارادۂ دنیا کیا اور تم میں سے بعض نے ارادۂ آخرت کیا اگر شہداء کا ارادۂ آخرت ان کی شہادت پر ختم ہو چکا ہوتا اور وہ شہید ہو کر مردہ ہو چکے ہوتے تو ان کا ارادۂ آخرت صیغہ مضارع اور فعل استمراری میں کیوں بیان فرمایا جاتا؟ کیا اللہ کو یہ معلوم نہ تھا کہ جو مر چکے تو نہ اب وہ رہے اور نہ ان کا ارادہ رہا۔ حیاتِ شہداء کی بزبان قرآن یہ ایک اور شہادت ہے۔ جن طالبانِ دنیا نے نبیؐ کی موجودگی میں حکم نبیؐ کی نافرمانی کی کیا ایسے لوگوں سے بعد وفات نبیؐ اس کی توقع ہو سکتی ہے کہ یہ حکم نبوی کی تعمیل کریں گے۔ کوہِ اُحد کی بالائی گھاٹی سے حکم نبویؐ کو پسِ پشت ڈال کر نیچے اترنے والے کفار کے دوسرے حملہ کے وقت نچلے میدان میں ہی اگر ثابت قدم رہتے اور میدان میں یہ لوگ حبِ آخرت کا جذبہ دکھاتے تو یہ بعید نہ تھا کہ

خدا تعالیٰ ان کی سابقہ لغزش کا ذکر ہی نہ فرماتا اور اگر ذکر فرماتا بھی تو موجودہ استقامت کو دیکھ کر اس لغزش کو صرف صیغہ ماضی میں بیان فرماتا۔ اللہ تو ایسا ظالم نہیں کہ صرف وقتی خطاء کو جبکہ خاطی لوگوں نے فوراً ہی راہِ خطا کو چھوڑ کر راہ ثواب اختیار کر لی صیغہ استمرار میں بیان فرمائے جس سے ثابت ہو رہا ہے کہ یہ لوگ جس طرح اس گھاٹی پر نہ ٹھہرے اسی طرح اب میدان میں بھی نہ ٹھہرے بلکہ اپنے ساتھ نہ معلوم کتنوں کو اور لے گئے۔ جب یہ لوگ گھاٹی پر تھے اس وقت منشاء الٰہی یہ تھا کہ یہ لوگ وہاں سے نہ اتریں اور اب جب اتر آئے تو ان کا فرض تھا کہ اب میدان چھوڑ کر پھر پہاڑ پر نہ چڑھیں مگر جس طرح یہ لوگ اترنے میں جلدباز تھے اسی طرح پھر چڑھ جانے میں بھی جلدباز تھے۔ اترے تھے حبِ مال میں اور پھر چڑھے تھے حبِ جان میں۔ حبِ آخرت نہ وہاں نہ یہاں۔ پھر کہاں اور کب ؟ قرآن کریم نے اس اتار چڑھاؤ دونوں کو بیان کر دیا۔ ان حضرات نے ان اترنے چڑھنے والوں کی جو شاندار حمایت کی ہے وہ لائق صدداد ہے۔ ان کو بار بار صحابہ کہہ کر لفظ صحابہ کے وقار کو برباد کیا ہے۔ جب یہ طے شدہ ہے کہ ایسے لوگوں کے علاوہ وہ حضرات بھی تھے جنہوں نے کبھی راہ فرار نہیں اختیار کی تو کیا ضرورت ہے کہ ایسے خالص اور مخلص حضرات میں دوسری غیر خالص جنس کو بھی ملایا جائے۔

ہم پر اعتراض ہے کہ ہم جنگِ اُحد سے متعلقہ آیات مجیدہ کو صحابہ کی ہجو اور مذمت کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں حالانکہ وہی آیات سرمہ چشم بصیرت ہیں۔ جیسے کہ ہم اکثر ثابت کرتے آئے ہیں کہ قرآن کریم کی رو سے جماعت صحابہ کے افراد نہ ایک جیسے تھے اور نہ بشری تقاضوں کے مطابق سہو و خطا سے مبرا تھے۔ جنگِ احد میں جس جماعت سے ادائے فرض میں کوتاہی ہوئی خدا تعالیٰ نے اس کے اظہار میں ان کی رعایت نہیں کی۔ اس نے تو اپنے برگزیدہ نبیوں کے سہو و خطا پر بھی پردہ نہیں ڈالا اور ان کی بشریت کو اجاگر کر دیا ہے۔

بعض حضرات نے اپنے رسالوں اور اپنی مختلف کتابوں میں کوہِ احد سے اترنے

اور پھر پہاڑ پر چڑھنے والوں کو صحابہ کے لفظ سے یاد کیا ہے حالانکہ ہم نے تو اس قسم کے افراد کے لئے لفظ صحابہ کے استعمال سے حد درجہ پرہیز کیا ہے۔ اگر ان کے بقول اللہ نے اپنے برگزیدہ نبیوں کے سہو پر بھی پردہ نہیں ڈالا' تو کیا وہ بروزِ قیامت ان سے باز پرس نہ کرے گا کہ میں نے تو اپنے برگزیدہ نبیوں کے بھی سہو پر پردہ نہیں ڈالا اور تم نے اپنے پسندیدہ لوگوں کے سہو پر نہیں بلکہ بالا ارادہ اور دیدہ دانستہ میرے حبیب کو نرغہ کفار میں چھوڑ جانے والوں کے گناہ عظیم پر ہزاروں پردے ڈالے اور درپردہ ان کو میرے انبیاء کا ہم سر بنادیا۔ دیکھو یہ ایک لاکھ چوبیس ہزار نبی تمہارے سامنے موجود ہیں۔ کیا ان میں سے کوئی ایک بھی ایسا ہے جو میدان قتال چھوڑ کر چلا گیا ہو؟ انبیاء تو میرے انبیاء ہیں' وہ لوگ جو نبی نہ تھے مگر باخدا تھے میدان جہاد تو کبھی انہوں نے بھی نہیں چھوڑا' کیا تم نے میری آخری کتاب میں جنگ احد ہی کے بیان کے سلسلہ میں میرا یہ بیان نہیں پڑھا۔ وکایّن من نبیٍ قٰاتل معهٗ ربیّون کثیرٌ فما وهنوا لما اصابهم فی سبیل اللّٰه وما ضعفواْ وما استکانوا واللّٰه یحب الصابرینo (پارہ نمبر 4' سورہ آل عمران' آیت نمبر 146) "اور کتنے ہی نبی ہیں کہ ان کے ساتھ بہت سے اللہ والوں نے قتال کیا تو جو مصیبت راہ خدا میں ان پر پڑی تو نہ انہوں نے ہمت ہاری اور نہ وہ کمزور پڑے اور نہ وہ تھکے اور اللہ صابرین سے محبت رکھتا ہے"۔ پچھلی امتوں کے اللہ والوں کی تو یہ مدح و ستائش اور امتِ مرحومہ کا یہ حال' ملاحظہ فرمایئے:

۱۔ حتّی اذا فشلتم وتنازعتم فی الامر وعصیتم من بعد ماارٰکم ماتحبّون منکم من یریّد الدّنیا و منکم من یرید الاخرۃo (آل عمران 152)

"یہاں تک کہ تم نے ہمت ہار دی اور نبیؐ کے حکم خاص میں تم نے تنازعہ کیا اور جب ہم تمہاری محبوب فتح دکھا چکے تو تم نے نافرمانی کی۔ تم میں سے کچھ ہیں جو دنیا چاہتے ہیں اور کچھ ہیں جو آخرت چاہتے ہیں"۔

۲۔ انّ الّذین تولّوا منکم یوم التقی الجمعان انّما استزلّھم الشّیطان ببعض

ماکسبوا ولقد عفااللّٰہ عنہم انّ اللّٰہ غفورٌ حلیمo (آل عمران:155)
"جو لوگ (احد میں) جنگ کے وقت بھاگ گئے ان کو ان کے سابقہ کردار کے سبب سے شیطان نے میدان میں جمنے نہ دیا اور ضرور ضرور اللہ نے ان سے درگزر کیا اور اللہ بخشنے والا بردبار ہے"۔

۳۔ اذ تصعدون ولا تلوٗن علیٰ احدٍ و الرّسول یدعوکم فی اُخراکمo (آل عمران:155)
"جب تم (پہاڑ پر) چڑھے چلے جاتے تھے اور کسی کو پیچھے پھر کر نہ دیکھتے تھے اور رسولؐ تم کو تمہارے پیچھے سے پکار رہے تھے"۔

یہ آیات صرف جنگِ اُحد کے بارے میں ہیں جنگ حنین کا یہی نقشہ اس کے علاوہ دوسری جگہ صفحہ قرآن پر کھینچا گیا ہے۔ حالانکہ حنین کی جنگ فتح مکہ کے بعد نبیؐ کی آخری جنگوں میں سے ہے لیکن اس قسم کے لوگوں کا جو آغاز تھا وہی انجام ہوا اور جیسے شروع میں تھے ویسے ہی آخر تک رہے۔

ان آیتوں میں ہمارے معترضین کو کہیں بھی ہجو' مذمت' منقصت نظر نہیں آئی بلکہ ہر جگہ مکارم و محاسن ہی نظر آرہے ہیں۔ اگر ان آیات میں مکارم و محاسن کا دریا ٹھاٹھیں مار رہا ہے تو شاید ان کے نزدیک مذمت اور انتہائی مذمت اس آیت میں ہوگی۔ انّ اللّٰہ یحبّ الذّین یقاتلون فی سبیلہٖ صفًا کانّھم بنیان مّرصوص (پارہ 28' سورہ صف آیت 4) "اللہ ان لوگوں سے محبت رکھتا ہے جو پرا باندھ کر راہ خدا میں قتال کرتے یں (ایسے ثابت قدم) گویا کہ وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں"۔ یا پھر ان کو مذمت اس آیت میں نظر آتی ہوگی۔ انّما المومنون الّذین اٰمنوا باللّٰہ و رسولہ و اذا کانوا معہ علیٰ امرٍ جامعٍ لم یذھبوا حتّٰی یستاذنوہ o (سورہ نور:62) "مومنین تو صرف وہ ہیں جو اللہ اور رسولؐ پر ایمان لائے اور وہ جب کبھی بھی ایسے کام پر رسولؐ کے ساتھ ہوئے جہاں ان کو جمع رہنا چاہئے تو وہ رسولؐ سے اذن لئے بغیر ہرگز نہیں گئے"۔

ہمارے معترض بار بار قرآن کریم کی تکذیب کرتے ہوئے ان جانے والوں کی غلطی کو کبھی سہو کہتے ہیں کبھی بشریت کا دخل بتاتے ہیں کبھی ارادہ سے مبرا غیر ارادی طور پر غلطی کا ہو جانا دکھاتے ہیں کبھی یہ کہ انہوں نے سمجھ لیا کہ فتح ہو چکنے کے بعد ہماری ڈیوٹی ختم ہو چکی تھی، کبھی یہ کہ جو کچھ ہوا سہواً ہو گیا۔

کتنے افسوس کی بات ہے کہ قرآن کریم تو صاف کہہ رہا ہو کہ جنگ احد کے موقع پر یہ گھاٹی کے چھوڑ دینے والوں کا عمل بالا رادہ تھا اور جو کچھ یہ لوگ آئندہ کریں گے بالا رادہ ہی کریں گے لیکن ہمارے معترضین کہتے ہیں کہ جو کچھ ہوا سہواً ہو گیا۔ آیت قرآنی میں تو خود لفظ ارادہ موجود ہے۔ **منکم من یرید الدنیا و منکم من یرید الاٰخرۃ** کیا یرید کا مصدر ارادہ نہیں ہے؟ جو لوگ گھاٹی سے نیچے اتر آئے وہ بھی بالا رادہ اترے اور جو کھڑے رہے وہ بھی بالا رادہ ہی اپنی جگہ قائم رہے۔ ارادہ کے ساتھ جو عمل ہو گا اس میں سہو کیسا؟ اور سہواً جو کام ہو گا اس میں ارادہ کیسا؟ اسی طرح جو نیچے والے مع ان اوپر والوں کے جب میدان چھوڑتے ہیں تو ارادۃً ہی چھوڑتے ہیں سہو کا کوئی سوال ہی نہیں۔ رسولؐ ان کو پکار رہے ہیں۔ یہ لوگ رسولؐ کی آواز اور پکار کو سن رہے ہیں۔ پھر یہ کیسا سہو ہے جو رسولؐ کی پکار سے بھی زائل نہیں ہوتا۔ یہ بات بھی غلط ہے کہ ان لوگوں نے سمجھا کہ فتح ہو چکنے پر ڈیوٹی ختم ہو گئی۔ یہ بات کہ ڈیوٹی ختم ہو چکی انہوں نے کیوں نہیں سمجھی جنہوں نے وہیں مستقیم رہ کر اپنی جانیں دے دیں۔ اس کے علاوہ یہ ہے کہ یہ اکثریت کا سمجھ لینا کہ ہماری ڈیوٹی ختم ہو گئی۔ اس وقت ممکن تھا کہ ڈیوٹی لگانے والے پیغمبرؐ نے اس امر کی صراحت نہ کی ہو کہ ڈیوٹی کب تک رہے گی۔ نبیؐ نے ڈیوٹی تو لگا دی مگر کب تک یہ کچھ کہا ہی نہیں اگر ایسا مانا جائے تو سارا الزام نبیؐ پر آتا ہے کہ جو مصیبت نبیؐ اور مسلمانوں پر آئی وہ تمام تر نبیؐ کے گومگو، مبہم اور ناقص و ناتمام حکم دینے کی بنا پر آئی۔ اس صورت میں اللہ کا عتاب معاذ اللہ نبیؐ پر ہونا چاہئے نہ کہ ان پر جن کو کوئی واضح حکم ملا ہی نہ تھا۔ پھر اگر یہ مرحلہ آ بھی گیا تھا کہ باہم یہ بات زیر بحث تھی کہ ڈیوٹی ختم ہو چکی یا نہیں تو ایک دو آدمی نیچے اتر کر ڈیوٹی لگانے والے پیغمبر سے آکر

دریافت کر سکتے تھے کہ ہماری ڈیوٹی باقی ہے یا ختم ہو چکی اگر یہ بھی نہ کیا تو یہ لوگ نیچے اتر کر اسی جانب تو آتے جہاں نبیؐ موجود تھے اگر یہ لوگ نبیؐ کو اپنی صورت دکھا کر عرض کر دیتے کہ ہم لوگ یہ سمجھ کر چلے آئے کہ اب ہماری ڈیوٹی ختم ہو چکی اور کچھ لوگ یہ سمجھ کر وہیں رہ گئے کہ ڈیوٹی ہماری بدستور باقی ہے تو آنحضورؐ ضرور کچھ فرماتے یا یہ فرماتے کہ تم نے درست سمجھا ان کو بھی بلا لو یا یہ فرماتے کہ تم نے غلط سمجھا جاؤ اپنی جگہ جاؤ مگر یہ کچھ بھی نہیں۔ اگر انہوں نے یہ سمجھا ہوتا کہ ڈیوٹی ختم ہو چکی تو قرآن ان کو مرید دنیا کیوں کہتا کیونکہ کفار کا چھوڑا ہوا مال اٹھانا حبِ دنیا نہیں ہے بلکہ وہ اللہ کا دیا ہوا مسلمانوں کا حق ہے اپنے حق کو لینا دنیا طلبی نہیں ہے۔ دین کو چھوڑ کر اللہ اور رسولؐ کے حکم کے خلاف مالِ دنیا پر گرنا دنیا طلبی ہے۔ اگر اوپر سے نیچے آنے والوں کا اور نیچے سے اوپر جانے والوں کا یہ عمل سہواً ہوتا تو اس کو نافرمانی اور عصیاں نہ کہا جاتا کیونکہ سہوی عمل میں گناہ نہیں ہوتا۔ روزے میں اگر کوئی شخص بھول کر کچھ کھا لے تو وہ گنہگار نہیں ہے۔ پھر یہاں بھول کس بات کی تھی۔ کیا رسولؐ کا رسولؐ ہونا بھول گئے تھے یا اپنا مسلمان ہونا بھول گئے تھے۔ یا حکم جہاد کو بھول گئے تھے یا بھولے سے یہ سمجھ لیا تھا کہ جہاں ہم ہیں یہ میدانِ جہاد نہیں ہے۔ ہم اس وقت کہیں اور ہیں لہذا ہم ادھر دوڑے ہوئے جا رہے ہیں جہاں لڑائی ہو رہی ہے یا بھولے سے یہ سمجھ لیا تھا کہ رسولؐ خود پہاڑ پر ہیں ہم کو ان کے ساتھ ہونا چاہئے آخر بھولے کس بات کو تھے جو یہ کہا جائے کہ جو کچھ ہوا سہواً ہوا۔ جانے والے تو از روئے قرآن (منکم من یرید الدنیا) ارادۃً گئے تھے۔ میں اس بحث سے بالکل بے تعلق ہوں کہ یہ جانے والے کون تھے اور کون نہ تھے مگر یہ جاننا چاہتا ہوں کہ پھر ان جانے والوں کی حمایت اور اللہ رسولؐ اور قرآن سب کی مخالفت کیوں کی جا رہی ہے اور یہ کس غرض کے لئے ہے۔ بہر حال آپ کا یہ فرمانا کہ گھاٹی سے نیچے آنے والوں کا اتر آنا اور نیچے والوں کا پہاڑ پر چڑھ جانا ارادہ کے بغیر سہواً تھا۔ یہ کسی طرح بھی سمجھ میں نہیں آسکتا۔ اگر یہ بات کو نباہنا ہی تھا تو آپ نے یہ کیوں نہ فرما دیا کہ اوپر والوں کے پیر کسی چکنے پتھر سے پھسل گئے تھے اور وہ غریب بلا ارادہ پھسلتے ہوئے نیچے

آ گئے تھے اور اس کی تائید میں قرآن مجید کی یہ آیت فٹ کر دیتے انما استزلھم الشیطان۔ان کو تو شیطان نے پھسلا دیا تھا'' تو قرآن سے یہ بات بنتی یا نہ بنتی لیکن آپ کے لفظ سہواً اور بلا ارادہ کے کچھ معنی تو ہو جاتے۔کیونکہ اوپر سے نیچے پھسل کر آ جانا ممکنات سے ہے البتہ نیچے والوں کا اوپر چلا جانا یہ ایسی قیامت ہے کہ یہ بات کون مانے گا کہ یہ لوگ پھسل کر نیچے سے اوپر جا پہنچے۔ معترضین کا یہ کہنا کہ جماعت صحابہ کے افراد نہ ایک جیسے تھے اور نہ بشری تقاضوں کے مطابق سہو و خطا سے مبرا تھے۔یہ تو بالکل صحیح ہے کہ جماعت میں سب ایک جیسے نہ تھے۔ان میں سچے مومن بھی تھے اور کہنے کے مسلمان بھی تھے۔اس اختلاط کا امتیاز امتحان کے وقت ہی ظاہر ہوتا ہے۔جیسے کہ آیت نے طے کر دیا کہ مومن صرف وہ ہیں جو امر جامع کے وقت اذن کے بغیر رسولؐ سے ہرگز جدا نہ ہوئے۔یہ بھی صحیح ہے کہ سہو و خطا سے مبرا نہ تھے۔ان حضرات نے ان جانے والوں کو تقاضوں کے تحت سہو و خطاء سے مبرا کر دیا کیونکہ جب سہو و خطاء بشری تقاضوں کے مطابق ہوئی تو ان کی خطا خطا نہ رہی۔اب تو خطا اس کی ہوئی جس نے بشر کو خطا کے مطابق بشری تقاضے دیے۔اب بشر نہ بشری تقاضوں کو چھوڑ سکتا ہے نہ خطا سے بچ سکتا ہے۔اللہ نے خطا پر مجبور بھی کر دیا اور خطا پر مستوجب عذاب بھی بنا دیا۔اس سے زیادہ اللہ کا معاذ اللہ اور کیا ظلم ہو گا۔پھر نبیؐ اور وہ مومن جو ثابت قدم رہے وہ سہو و خطا سے مبرا ہوئے اور بشری تقاضوں سے پاک ہوئے۔تو کیا صرف وہ چلے جانے والے بشر تھے اور یہ ثابت قدم رہنے والے نہ بشر تھے نہ ان میں بشری تقاضے تھے؟

عفو کے معنی درگزر کرنے کے ہیں بخشش آخرت اور نجات کے نہیں ہیں

گنہگار کے لئے عفو اور مغفرت یہ دو لفظ بولے جاتے ہیں۔ناواقف حضرات ان دونوں لفظوں کا مفہوم ایک سمجھ لیتے ہیں۔انہوں نے جہاں لفظ عفو دیکھا سمجھ لیا کہ بس بخشش ہو گئی۔حالانکہ عفو اور چیز ہے مغفرت اور چیز ہے۔اسی غلط فہمی کا یہ نتیجہ ہے کہ جنگ احد سے راہ فرار اختیار کرنے والوں کے لئے قرآن کریم میں لفظ عفو دیکھ کر سمجھ لیا

کہ اللہ نے ان کے گناہ کو یکسر معاف کر دیا اور بخش دیا جس کی آخرت میں اب کوئی باز پرس نہ ہوگی۔ مجبوراً ان دونوں لفظوں کا امتیاز ہم کو دکھانا پڑ رہا ہے۔ عفو کہتے ہیں درگزر کرنے کو، چشم پوشی اور طرح دینے کو گناہ کو یکسر بخش دینے کا یہاں کوئی ذکر ہی نہیں۔ لفظ مغفرت کے معنی ہیں بخش دینے کے۔ عفو ایسی چیز ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ عام بندے بھی اپنے مخالف کو عفو کر سکتے ہیں اور کرتے رہتے ہیں لیکن کسی گناہ کا یکسر بخش دینا کہ اب آخرت کا اس پر کوئی مواخذہ ہی نہ ہو بندے تو بندے یہ کام نبی کا بھی نہیں۔ چنانچہ فرمایا جاتا ہے ومن یغفر الذنوب الا اللہ (پارہ نمبر 4، سورہ آلِ عمران آیت نمبر 135) "گناہوں کو اللہ کے سوا کون بخش سکتا ہے؟" عفو و درگزر وہ ہے جس کا تعلق دنیا سے ہے اور مغفرت وہ بخشنا ہے جس کا تعلق آخرت سے ہے۔ خدا تعالیٰ نے کہیں بھی یہ نہیں فرمایا کہ جنگ سے ان منحرف ہو جانے والوں کو یعنی بھاگ جانے والوں کو ہم نے بخش دیا۔ صرف یہ فرمایا ہے کہ ہم نے ان سے درگزر کیا، چشم پوشی کی طرح دی۔ اس کے بعد فرمایا کہ اللہ غفور اور حلیم بھی ہے۔ یہاں اللہ نے محض اپنی صفتِ غفوری کو بیان فرمایا ہے۔ اس صفت کو میدان جنگ سے ان چلے جانے والوں سے کوئی نسبت نہیں دی اور یہ ہرگز نہیں کہا کہ اللہ ان کے لئے غفور اور حلیم ہے۔ اس نے اپنے آپ کو غفور اور حلیم کہہ کر اس طرف اشارہ کیا ہے کہ ہم نے اس وقت صرف عفو اور درگزر کیا ہے۔ بخشا کسی کو نہیں۔ لیکن ہم یہ یاد دلاتے ہیں کہ ہم غفور (بخشنے والے بھی ہیں) جس کے معنی حقیقتاً یہ ہیں کہ اس عفو کے بعد اگر یہ لوگ سب یا بعض اپنے کئے ہوئے جرم سے بصدق دل تائب ہو جائیں اور آئندہ اس قسم کے حرکات نہ کریں اور اپنے فرار کو قرار سے اور لغزش کو ثبات قدم سے بدل دیں تو یہ عفو بھی مغفرت سے بدل جائے گا۔ اور یہ جرم یکسر بخش دیا جائے گا کیونکہ اللہ غفور اور حلیم ہے لیکن اگر انہوں نے آئندہ اپنی اصلاح نہ کی، جرم سابق سے تائب نہ ہوئے اور جنگ حنین تک یہ اپنے اسی نقشہ کو دہراتے رہے تو اس عفو کے بعد وہ مغفرت کے ہرگز مستحق نہ ہوں گے۔ اس لئے اس نے عفا اللہ عنھم کی طرح غفر اللہ لھم نہیں فرمایا۔ بلکہ یہ ظاہر کرنے

کے لئے کہ ہم نے صرف در گزر کیا ہے تم بھی ان سے در گزر کرو (لیکن چونکہ ہم نے ان کو بخشا نہیں ہے لہذا) دعا کرو کہ ہم ان کو بخش بھی دیں اگر عفو کے معنی بخش دینے کے ہوتے تو جرم تو بخشا گیا اب نبیؐ سے بخشش جرم کی دعا کے لئے اللہ کیوں کہہ رہا ہے۔

یہاں یہ بھی سمجھ لیجئے کہ نبیؐ سے بخشش جرم کی دعا کرانے کا مطلب کیا ہے؟ فقہ اسلام نے اس امر کو واضح کیا ہے کہ کسی زندہ کافر کے لئے بھی اس مقصد سے دعاء مغفرت ہو سکتی ہے کہ وہ دیندار اور مشرف باسلام ہو کر لائق مغفرت ہو جائے لیکن کسی بے دین کے مرنے کے بعد اس کے لئے دعائے مغفرت کرنا حرام ہے۔ کیونکہ اب اس کے دیندار اور مومن ہونے کا کوئی سوال نہیں۔ اس معنی میں حضرت ابراہیمؑ نے آزر کی زندگی میں اس کی مغفرت کی یعنی دیندار ہو کر بخشے جانے کی دعا کی لیکن اس کے مرنے کے بعد دعا کرنا چھوڑ دی۔ اسی معنی میں ان مجرمین کے جرم کی بخشش چاہنے کے لئے نبیؐ سے کہا جا رہا ہے کہ اے نبیؐ تم اس امر کے خواہاں رہو کہ یہ لوگ کئے ہوئے جرم سے تائب ہو کر آئندہ استقامت اختیار کریں جو ان کی مغفرت کا سبب ہو جائے ورنہ ان کے لئے استغفار کرنے کا حکم نبیؐ کو اس صورت میں تو نہیں کہ یہ لوگ آج کی طرح ہر آنے والے کل میں اسی طرح دوڑتے بھاگتے بھی رہیں۔ آئندہ بھی یہ لوگ تمہارا ساتھ نہ دیں، تمہاری پکار کو نہ سنیں، تم کو نرغہ کفار میں چھوڑ چھوڑ کر جاتے رہیں مگر تم ان کی بخشش کے طلبگار رہو۔ بخشش کی صورت یہی ہے کہ در توبہ کھلا ہوا ہے۔ اصلاع عمل کا موقع ہے۔ کافر اپنے کفر کو چھوڑ دے اللہ غفور ہے۔ منافق اپنے نفاق کو چھوڑ دے اللہ غفور ہے۔ مجرم اور گنہگار اپنے جرم کو چھوڑ دے اللہ غفور ہے لیکن اگر نہ چھوڑے تو بھی اللہ غفور ہے؟ نہیں، ہر گز نہیں، پھر وہ شدید العقاب ہے۔ پھر اس کا عذاب شدید ہے۔ اس صورت میں نہ پیغمبرؐ استغفار کر سکتے ہیں نہ پیغمبرؐ کا استغفار کارآمد ہو سکتا ہے جیسا کہ سورۂ منافقون میں فرمایا گیا ہے۔ سواءٌ علیھم استغفرت لھم ام لم تستغفر لھم لن یّغفر اللہ لھم ''ان کے لئے برابر ہے 'اے نبیؐ! تم ان کے لئے استغفار کرو یا نہ کرو' اللہ ان کو ہر گز نہ بخشے گا۔ دوسری جگہ فرمایا جاتا ہے کہ اے نبیؐ تم ان کے لئے ستر مرتبہ

بھی استغفار کرو مگر بے سود ہے۔ کیونکہ وہ اپنے جرم کو چھوڑ نہیں رہے ہیں۔ جب تک جرم نہ چھوڑیں گے ہم تمہاری دعائے مغفرت کو بھی سننے والے نہیں۔ نبیؐ سے یہ خطاب صرف ان کی مغفرت نہ ہونے کا حتمی اور یقینی دکھانے کے لئے ہے۔ ورنہ نبی سے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ کوئی بھی نامناسب دعا کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر مجرم ارتکاب جرم کے بعد اس دنیوی سزا کا بھی مستوجب ہو جاتا ہے جو انتظاماً، تادیباً، عبرتاً دی جاتی ہے۔ یہ دنیوی سزا حقیقی سزا نہیں ہوتی، اور اس سزائے آخرت کی بھی مستوجب ہو جاتی ہے جو عمل کا واقعی بدلہ ہے۔ وہاں کی سزا انتظاماً تادیباً اور عبرتاً نہیں ہوتی لہذا دنیا کی سزا چونکہ انتظاماً ہے اگر خاص صورت حالات میں یہ سزا منافی حکمت ہے اور درگزر کرنا مطابق حکمت ہے۔ تو سزا کو نظر انداز کر دیا جائے گا۔ کیونکہ واقعی سزا کا دن آ رہا ہے۔ یہ دنیوی سزا تھی۔ انتظام کو درست کرنے کے لئے، لیکن صورت حال یہ ہو گئی کہ اب سزا دینے میں شیرازۂ انتظام درہم برہم ہوتا ہے اس لئے غرض سزا جو تھی وہ مفقود ہو گئی۔ مثلاً اتنے زیادہ لوگوں نے اور اتنی کثرت نے وہ جرم کیا ہے کہ اب ان سب کو سزا دینے میں اسلام کی ہوا اکھڑتی ہے۔ دین کو ضعف اور کفر کو طاقت پہنچتی ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ لڑائی سے منہ موڑ کر چلے جانے والی سزا موت سے کم نہیں ہے تو یہ لوگ جس موت سے بچنے کے لئے میدان سے چلے گئے تھے کیا اب آسانی سے اسی موت کے سامنے سر جھکا دیں گے۔ موت ہی سے بچنے کے لئے تو نبیؐ کو چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ اب یہ موت کی سزا دیکھ کر نبیؐ کے پاس لگے رہیں گے اور اب نبیؐ کو نہ چھوڑ جائیں گے۔ اور نبیؐ سے جدا نہ ہو جائیں گے۔ اس وقت کفر اور اسلام کا تصادم ہے۔ مقابلہ پر کفار کا گروہ ہے اور یہ بات سب جانتے ہیں کہ جس وقت دو پارٹی مدمقابل ہوں اگر کسی ایک پارٹی کے آدمی اپنی پارٹی سے جدا ہو کر نکل جاتے ہیں تو وہ اپنی طاقت کو قائم رکھنے کے لئے مقابلے کی پارٹی اور مقابلے کی طاقت میں شامل ہو جاتے ہیں لہذا اتنی کثرت کو سزا کی بنا پر مسلمانوں کے گروہ سے نکال کر کفار کی طاقت میں شامل کر دینا کوئی حکمت عملی نہیں ہے۔ کم سے کم اس وقت اتنا تو ہے کہ یہ لوگ اگر اسلام کا بازوئے

شمشیر زن نہیں بنتے' اگر مردانہ وار کفار سے جہاد نہیں کرتے تو یہی غنیمت ہے کہ کفار کے ساتھ رہ کر دینداروں پر تو اپنی تلواریں نہیں برسا رہے ہیں۔ اگر یہ لوگ اپنی طاقت سے دینداروں کی طاقت نہیں بڑھا رہے ہیں تو یہاں سے الگ ہو کر دشمن میں شامل ہو کر دینداروں کے مقابلہ میں تو نہیں آرہے ہیں۔ یہ سب کچھ میں از روئے قرآن کہہ رہا ہوں کہ نبیؐ کو جب ان لوگوں سے درگزر کرنے کے لئے کہا گیا تو اس سے پہلے قرآن نے یہ تمام نقشہ کھینچ کر رکھ دیا اور یہ واضح کر دیا کہ عفو کے حکم کی غرض وغایت کیا ہے۔ ارشاد قرآنی ہے ان ہی احد کے میدان سے ادھر ادھر چلے جانے والوں کے بارے میں۔

فبما رحمةٍ من اللّٰہ لنت لھم ولو کنت فظاً غلیظ القلب لانفضّوا من حولك فاعف عنھم واستغفر لھم و شاورھم فی الامر (سورہ آل عمران آیت نمبر 159)

"اے نبیؐ! تم اللہ کی رحمت سے ان لوگوں کے لئے نرم رہے ہو اور اگر تم سخت گیر اور سخت دل ہوتے تو یہ لوگ کبھی کے تمہارے پاس سے ادھر ادھر منتشر ہو جاتے پس تم ان سے درگزر کرو اور ان کے لئے بخشش چاہو اور جو کام مشورے کے لائق ہیں۔ ان کاموں میں ان سے بھی مشورے کر لیا کرو"۔

کیا اس پوری عبارت سے ظاہر نہیں ہو رہا ہے کہ ان لوگوں سے عفو و درگزر کا حکم اس لئے ہو رہا ہے کہ ان کا سختی سے احتساب ہو گا تو یہ لوگ تمہارے پاس سے ہٹ کر کسی اور طرف لگ جائیں گے۔ ان کا اب تک بھی تمہارے گرد و پیش رہنا محض اس وجہ سے ہے کہ تم نے ہمیشہ ان سے نرمی کا برتاؤ کیا ہے۔ کبھی سخت گیری اختیار نہیں کی ورنہ اگر تم سختی سے ان کے کردار کا احتساب کرتے تو یہ کبھی کا تم کو چھوڑ دیتے لہذا جس طرح تم نے اب تک ان کے طرزِ عمل سے درگزر کیا ہے۔ اب بھی اسی طرح درگزر کرو جس طرح تم نے اب تک ان کو شریک مشورہ رکھا ہے اب بھی شریک مشورہ رکھو تاکہ یہ لوگ تمہاری سختی اور بے رخی دیکھ کر تم کو چھوڑ چھاڑ کر نہ چلے جائیں۔ مقصد

ارشادِ الٰہی صاف ہے کہ ان لوگوں کا تمہارے پاس سے ہٹ کر منتشر ہو جانا ایک تو یہ کہ ان کے اصلاح پذیر ہونے کا امکان ختم ہو جائے گا دوسرے یہ کہ یہ لوگ تمہارے گروہ سے نکل کر مخالف گروہ کفار کا دست وباوز بنیں گے لہذا یہ کسی پہلو پر بھی مفید نہ ہوگا۔ یہ ہے اس عفوو درگزر کی حقیقت جس کو بخشش جرم کا پروانہ سمجھا جارہا ہے۔ میں ان لوگوں سے سوال کرتا ہوں کہ یہ میدان جنگ کو چھوڑ کر چلے جانے والے تو پھر بھی کلمہ گو تھے کیا لفظ عفو کا استعمال قرآن کریم نے ان یہود و نصاریٰ اور کفار کے لئے نہیں کیا جو نبیؐ آخر کی تکذیب کررہے تھے اور نبیؐ کے انتہائی دشمن تھے کیا اللہ تعالیٰ ان کفار کے لئے لفظ عفو کہہ کر ان کفار کو عذاب آخرت سے بری کررہا ہے اور ان کے کافر رہتے ہوئے بھی ان کو بخش رہا ہے۔ میں قرآن مجید سے چار آیات پیش کرتا ہوں جن میں یہود و نصاریٰ وغیرہ کفار سے عفو اور درگزر کرنے کا ذکر ہے۔ فرمایا جاتا ہے :

۱۔ ودّ کثیر" من اهل الکتاب (سورہ بقرہ آیت نمبر 109)

اہل کتاب یہود و نصاریٰ کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد باری ہے فاعفوا وا صفحوا حتّٰی یاتی اللّٰه بامرہ ٥ (سورہ بقرہ :109)۔ "اے مسلمانو تم ان اہل کتاب کو عفو کرو اور درگزر کرو تا اینکہ اللہ اپنا حکم لائے۔" کیا یہاں عفو اور درگزر سے مراد ان کے جرم و گناہ کا بخش دینا ہے ؟ نہیں' بلکہ مقصد یہ ہے کہ تم ان سے جب تک ہمارا حکم آئے کوئی انتقام نہ لو اور جواباً کوئی اقدام نہ کرو۔

۲۔ قدجاءکم رسولنا یبیّن لکم کثیراً ممّا کنتم تخفون من الکتب و یعفوا عن کثیرٍ (المائدہ رکوع 4 آیت 15)

اے یہودیو تمہارے پاس ہمارا رسولؐ آگیا ہے جو تورات میں سے تمہاری بہت سی چھپائی ہوئی باتوں کو ظاہر کرتا ہے اور تمہاری بہت سی باتوں کو عفو کر دیتا ہے۔ کیا یہاں عفو سے مراد یہودیوں کے بہت سے گناہوں کو بخش دیتا ہے کہ اب گناہوں کی آخرت میں ان سے باز پرس نہ ہو گی ؟ نہیں ! عفو سے مراد محض درگزر' چشم پوشی ہے اور جوابی کارروائی کا نہ کرنا ہے۔ آخرت سے اس

عفو کا کوئی تعلق نہیں۔

۳۔ ان ہی یہودیوں کے بارے میں رسولؐ سے فرمایا جاتا ہے۔ ولاتزال تطّلع علیٰ خائنۃٍ منھم الاّ قلیلاً منھم فاعف عنھم واصفح انّ اللّٰہ یحبّ المحسنین (المائدہ رکوع 3 آیت 13)

''اے رسولؐ تم معدودے چند کے سوا یہودیوں کی اکثریت کی طرف سے ہمیشہ خیانت دیکھتے رہو گے۔ پس تم ان سے عفو کرو اور چشم پوشی کرو۔ اللہ نیک لوگوں کو (اپنے دشمن سے درگزر کرنے والوں کو) محبوب رکھتا ہے۔ کیا یہاں عفو سے مراد یہودیوں کے جرم و گناہ کو بخش دینے سے ہے؟ نہیں' بلکہ محض درگزر اور چشم پوشی اور جواب کے لئے نہ کھڑا ہونا ہے۔

۴۔ ثمّ اتّخذ تم العجل من بعدہ و انتم ظالمونo ثم عفونا عنکم من بعد ذالکo (پارہ 1' سورہ بقرہ' آیت 52)

''اے یہودیو تم نے پھر گوسالہ بنالیا جبکہ تم ظالم تھے پھر ہم نے تم سے عفو کیا۔ اگر عفو سے مراد یہاں یہ ہوتی کہ ان کو عذاب آخرت سے بری کر دیا اور بخش دیا تو پھر ان ہی لوگوں کے لئے اسی قرآن میں عذاب و عقاب کی کیوں خبر دی جاتی۔ یہاں بھی عفو سے مراد وقتی سزا کو برطرف کر کے مہلت دینا ہے۔

لفظ عفو کے ساتھ جب تک آخرت کی تصریح نہ ہو اس سے عفوِ دنیا ہی مراد ہو گا

لفظ عفو کے لئے ہم دکھا چکے ہیں کہ اس سے مراد دنیوی سزا سے درگزر کرنا ہوتا ہے۔ آخرت کی درگزر کے لئے اور وہاں کی سزا کے ختم کر دینے کے لئے لفظ مغفرت ہے۔ اس لئے اگر آخرت کی رستگاری مراد ہوتی ہے تو یا تو لفظ عفو کے ساتھ لفظ مغفرت الگ سے آتا ہے یا لفظ عفو کو آخرت تک موثر بنانے کے لئے لفظ آخرت کی تصریح کر دی جاتی ہے جیسے کہ آخر سورہ بقرۃ میں یہ دعا ہے: واعف عنا و اغفرلنا وارحمنا انت مولانا فانصرنا علی القوم الکافرینo ''اے معبود ہم سے

در گزر کر اور ہم کو بخش دے اور ہم پر رحمت نازل فرما تو ہی ہمارا سرپرست ہے۔ پس تو کفار کے مقابلہ میں ہماری مدد کر"۔ دعائے عفو کے بعد دعائے مغفرت الگ ہے یعنی ہم کو دنیا میں بھی سزا سے محفوظ رکھ اور آخرت میں بھی۔ لفظ آخرت کی تصریح اسی لئے کی گئی ہے کہ یہ عفو محض دنیا ہی میں محدود نہ رہے کیونکہ لفظ عفو کے بعد اگر لفظ آخرت یا لفظ مغفرت نہ ہو تو اس سے مراد اخروی در گزر ہرگز نہ ہو گا بلکہ وقتی اور دنیاوی در گزر ہو گا۔ ام المومنین پر تہمت لگانے والے کا نام مسطح بتایا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ وہ اہل بدر سے بھی تھے اور ام المومنین اور ان کے والد بزرگوار سے قرابت قریبہ بھی رکھتے تھے۔ مسطح بدری مذکور کے اس جرم تہمت پر ان کے ان اقرباء نے یہ طے کیا کہ اب آئندہ ہم مسطح کی مالی مدد نہ کریں گے۔ اس پر یہ آیت آئی۔ ولا یاتل اولوا الفضلِ منکم والسّعة ان یؤ تواالوی القربیٰ (پارہ 18' سورہ نور' آیت 22)۔ مستطیع لوگ یہ عہد نہ کریں کہ وہ اپنے اقربا کو (مالی مدد) نہ دیں گے۔ اس کے بعد فرمایا جاتا ہے والیعفوا ولیصفحوا۔ ان کو عفو اور در گزر کرنا چاہئے۔ یہاں بھی عفو سے مراد ہے انتقام نہ لینا' یہ نہیں کہ تم اس کے گناہ کو بخش دو۔

زمانہ نزول وحی میں لوگ اپنے متوفی آباؤ اجداد کے بارے میں نبیؐ سے سوال کرتے تھے۔ مثلاً یہ کہ ان کا کیا حشر ہوا اور ان پر کیا گزری۔ اس پر آیت نازل ہوئی۔ یا ایھا الذین اٰمنوا لا تسئلوا عن اشیاء ان تبدلکم تسؤ کم (سورہ مائدہ آیت ۱۰۱)۔ "ایمان لانے والو ان چیزوں کے بارے میں سوال مت کرو جن کا اظہار تم کو ناگوار گزرے گا اس کے بعد فرمایا جاتا ہے۔ عفا اللہ عنھا۔ اللہ نے ان چیزوں کے بارے میں تمہارے سوال کرنے سے در گزر کیا یعنی تم کو ناگوار گزرنے والی خبر نہ بتائی۔ یہاں بھی عفو سے مراد محض در گزر اور چشم پوشی ہے۔ کسی جرم کی بخشش مراد نہیں ہے۔

میں نے تو موجود ہئیت سے کہیں یہ لفظ بھگوڑا استعمال ہی نہیں کیا، البتہ آیت قرآنی کے ترجمہ میں بھاگنا' منہ موڑنا' چلا جانا ضرور کہا ہے۔ اگر کسی کو اس پر اعتراض

ہے تو ان لفظوں کا مناسب اور صحیح ترجمہ بتادے۔ ولیتم مدبرین کا ترجمہ تم پیٹھ پھیر کر بھاگ گئے نہیں تو اور کیا ہے۔ ان الذین تولوا منکم کا ترجمہ یقیناً جو لوگ تم میں سے بھاگ گئے نہیں تو اور کیا ہے کیا میں اس کے ترجمہ میں تشریف لے گئے کہتا۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ جو بات قرآن نے کہی ہے اس کا غصہ مجھ پر۔ میری کیا مجال تھی کہ قرآن کریم کے کہے بغیر میں کچھ بھی اپنے دل سے کہوں اللہ ہر مسلمان کو اس سے محفوظ رکھے کہ وہ منشاء قرآنی کے خلاف کہے اور جو ایسا کرتے ہیں اللہ ان کو راہِ راست پر لائے۔ اگر بھاگ جانا' منہ موڑنا' چلا جانا' ہمت ہار دینا' حکم نبیؐ پر تنازع کرنا' نبیؐ کے حکم کی نافرمانی کرنا' میدان چھوڑ کر پہاڑ پر چڑھ جانا' رسولؐ کی پکار کو نہ سننا' طلبگارِ دنیا ہونا۔ آپ کو ناگوار ہے تو جس قرآن کے یہ الفاظ ہیں آپ اسی سے پوچھئے قرآن تو یہی جواب دے گا کہ میرے خدا نے وہی کہا جو دیکھا اور ایک بار نہیں اُحد سے حنینِ تک دیکھتا رہا۔ خدا نے تو یہ کہا ہے کہ اے رسولؐ تم ہمیشہ ان لوگوں کی طرف سے سب کچھ دیکھتے رہنے کے باوجود نرم برتاؤ کرتے رہے ہو تم نے سختی سے کبھی ان کا احتساب نہیں کیا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ یہ لوگ تمہارے پاس جنگ میں نہیں رہے تو جنگ کے علاوہ اور موقع پر تو رہے۔ اگر تم ان پر سختی کرتے تو یہ کبھی کے چلے گئے ہوتے۔ لہذا اب بھی بدستور ان سے درگزر کرو اور ان کی بخشش چاہو۔ اور ان سے مشورہ کر لیا کرو تاکہ یہ لوگ تمہاری بے رخی دیکھ کر تم کو چھوڑ چھاڑ کر نہ چلے جائیں۔ نبیؐ سے شاورھم فی الامر کوئی ان لوگوں کے اعزاز و احترام میں نہیں کہا گیا بلکہ تالیفِ قلب کے پہلو سے کہا گیا ہے۔ نبیؐ سے ان سے مشورہ کرتے رہنے کو کہا گیا ہے۔ یہ تو نہیں کہا گیا کہ ان کے مشورہ پر عمل بھی کرو۔ اور وہی کرو جو وہ کہیں۔ مخالف کے مشورے کی مخالفت خود صحیح راستہ سامنے لے آتی ہے۔ مشورے کے دو پہلو الگ الگ ہیں مشورہ کرنے والا ایک وہ شخص ہے جس کا علم و فہم کم ہو جس کی نظر میں وسعت نہ ہو وہ مشورہ کیا کرتا ہے دوسروں کے علم و فہم اور وسعت نظر سے فائدہ اٹھانے کے لئے اور دوسروں کا مشورہ ماننے کے لئے۔ ایک مشورہ کرنے والا وہ ہے۔ جس کا علم و فہم جس کی وسعتِ نظر جس

کی حکمت و قابلیت سب پر فائق ہو وہ دوسروں سے مشورہ اصولِ حکمت کی بنا پر ضرور کر سکتا ہے لیکن اس کا مشورہ دوسروں کی بات ماننے کے لئے نہ ہو گا بلکہ دوسروں سے اپنی بات منوانے کے لئے ہو گا۔ لہذا نبی حکیم کا مشورہ دوسروں کی بات ماننے کے لئے نہ ہو گا بلکہ اپنی بات منوانے کے لئے ہو گا۔

شیعوں کے روحِ میت سے خطاب پر اعتراض

بعض حضرات کہتے ہیں :

"شیعہ مذہب کی نماز میں ایک تلقین درج ہے جو ہر غیر شہید میت تک کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر اور میت کو اس طرح مخاطب کر کے پڑھی جاتی ہے کہ اے فلاں ابن فلاں تیرے پاس دو فرشتے آئیں گے اور تجھ سے سوال کریں گے کہ تیرا رب کون ہے ؟ نبی کون ہے ؟ امام کون ہے ؟ تو جواب دینا کہ میرا رب اللہ ہے' نبی محمدؐ ہیں اور امام علیؑ ، حسنؑ ، حسینؑ ' زین العابدینؑ تا امام مہدی علیہم السلام ہیں۔ ہم پوچھتے ہیں کہ جب زید' بکر' عمرو اچھے بُرے مرنے کے بعد سب زندہ ہیں تلقین سنتے ہیں اور فرشتوں کو جواب دیتے ہیں' جو نیک ہیں جنت کے میوے کھاتے ہیں تو براہ نوازش بتایا جائے کہ شہداء کی تخصیص کا کیا مطلب ؟ کہ شہید زندہ ہیں"۔

ہم پہلے ہی یہ واضح کر چکے ہیں کہ بعد وفات زندہ ہونا اور بات ہے اور وفات پانے والے کی روح کا موجود ہونا اور بات ہے۔ روح ہر مومن و کافر کی رہتی ہے کیونکہ اس کو اچھا' بُرا بدلہ ملنا ہے۔ مگر تنہا روح کا موجود ہونا زندگی نہیں ہے کیونکہ مرنے والوں کی روح مکلّف نہیں رہی۔ اس پر ایمان و عمل کی ذمہ داری نہیں رہی اب نہ اس سے ایمان کا مطالبہ ہے نہ عمل کا اس کو جسے ماننا تھا مان چکا تھا اور جو کچھ اس کو کرنا تھا کر چکا ہم ہر مرنے والے کو خواہ وہ مومن ہی ہو زندہ نہیں سمجھتے۔ زندہ صرف وہ ہیں جن کی زندگی کی اللہ نے خبر دی ہے اور جن کو حی لایموت نے زندہ کیا ہے وہ عامل خیر رہتے ہیں' رزق پاتے ہیں جب کہ عام مرنے والوں کے لئے یہ غلط ہے کہ وہ عالمِ برزخ میں

جنت کے پھل کھاتے ہیں۔ روح جبکہ مجرد اور بے جسم ہو تو اس کے کھانے پینے کا سوال کیا۔ لیکن مرنے والے کی روح ضرور موجود رہتی ہے۔ جس سے سوال بھی ہوتا ہے اور وہ جواب بھی دیتی ہے۔ آپ اپنے آپ کو کتنا ہی بے روح کہیں لیکن سوال آپ سے بھی ہو گا۔ ہماری اس تلقین کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ ہمارے بارے میں بہت سے لوگ غلط افواہ پھیلاتے ہیں کوئی کہتا ہے کہ شیعہ علیؑ کو اللہ مانتے ہیں، کوئی کہتا ہے کہ یہ لوگ علیؑ کو نبی مانتے ہیں۔ یہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جبریل کو علیؑ کے پاس آنا تھا، غلطی سے آنحضورؐ کے پاس پہنچ گئے۔ کوئی کہتا ہے کہ یہ کعبہ کو نہیں مانتے اس کا حج نہیں کرتے۔ یہ قرآن پر ایمان نہیں رکھتے، یہ مسلمان نہیں ہیں اور یہ بات تو عام ہے کہ یہ لوگ صحابہ کو نہیں مانتے مگر کوئی اس پر غور نہیں کرتا کہ لفظ صحابہ کو وسعت دے کر خود آپ نے ایسے لوگوں کو شامل کر لیا جن کو ماننا آسان نہیں رہا۔ ہم ان حضرات کو یقیناً مانتے ہیں جنہوں نے ہر میدان میں بنیان'' مرصوص بن کر جہاد کیا۔ جنہوں نے کبھی آنحضورؐ کو ہجومِ کفار میں نہیں چھوڑا۔ جنہوں نے حکم نبیؐ کی تعمیل میں مارا جانا گوارا کر لیا مگر وہ گھاٹی سے نہ اترے۔ نہ میدان چھوڑ کر پہاڑ پر چڑھے نہ انہوں نے نبیؐ کی تندرستی میں نبیؐ کا ساتھ چھوڑا نہ بیماری میں۔ نہ انہوں نے نبیؐ کے جہاد سے منہ موڑا نہ نبیؐ کی صلح سے۔ وہ نبیؐ کے دفن تک نبی سے وابستہ رہے اور اس کے بعد نبیؐ کے ارشادات کی تعمیل کو اور اہلِ بیتِ نبوت کی رضا جوئی کو اپنا نصب العین قرار دیا۔ ایمان لانے کے بعد ان کا خاتمہ ایمان پر ہوا۔ لیکن آپ ایسے حضرات کے علاوہ ان کو بھی صحابہ کہتے ہیں جن میں مذکورہ صفات کا کوئی بھی نشان نہیں۔ مگر آپ چاہتے ہیں کہ ہم ان کو بھی مانیں۔ یہ ہمارے بس کا روگ نہیں۔ ہمارا قصور صرف اتنا ہے کہ مانتے ہم سب کو ہیں مگر جو جیسا ہے ویسا ہی مانتے ہیں۔ مسلمان کے دفن کے وقت چونکہ کم و بیش ہر فرقہ کے دوست احباب، ہمسایہ، ہم پیشہ جمع ہو جاتے ہیں اس لئے اس موقع پر عقائد حقہ کا تذکرہ ہم جہاں مرنے والے کی روح سے کرتے ہیں وہاں سب کے سامنے ہم اپنے دلی عقائد کا اظہار کر کے مذکورہ غلط افواہوں کی تردید کرتے ہیں خطاب میت سے ہوتا ہے مگر مرنے والے کے

ساتھ سب زندوں کو بھی سناتے ہیں کہ ہمارا رب اللہ کے سوا کوئی نہیں، ہمارے نبی صرف محمد مصطفیٰؐ ہیں۔ ہمارے امام صرف دوازدہ (۱۲) ہیں جن کو امامت اللہ نے دی اور اعلان نبیؐ نے فرمایا۔ ہمارا دین اسلام ہے۔ ہمارا قبلہ صرف کعبہ ہے ہماری کتاب صرف قرآن ہے۔ موت اور موت کے بعد ایمان و عمل کا احتساب بر حق ہے۔ روزِ قیامت آنا ہے جزا و سزا جنت و نار بر حق ہے۔

مسئلہ تلقین پر اعتراض

کہتے ہیں کہ تلقین اردو یا پنجابی میں نہیں ہوتی بلکہ عربی میں ہے :

اسمع افهم يا فلان بن فلان اذا اتاك الملكان المقربان رسولين...... الخ اب غور فرمائیے گا کہ ایک غیر عربی کو زندہ ہوتے ہوئے تو عربی پڑھنے کے لئے چار پانچ سال درکار ہوتے ہیں۔ اگر کسی پنجابی کو عربوں کے ہاں بھی رکھا جائے تو پھر بھی عربی سیکھنے میں سال چھ مہینے لگ ہی جائیں گے لیکن یہاں حالت یہ ہے کہ جو نہی تارِ نفس کا سلسلہ ختم ہوتا ہے الف با تک سے لابلد کسی غیر عرب کی جان نکلتی ہے تو وہ صرف زندہ نہیں بلکہ عربی دان بھی ہو جاتا ہے"۔

ہمارے معترض صاحب روح مجرد کا قیاس روح مع الجسم پر کر رہے ہیں۔ یہ نہیں سمجھتے کہ روحِ مقید کی صلاحیت قید جسم کے سبب سے محدود اور کمزور ہو جاتی ہے لیکن قید جسم سے آزاد ہونے کے بعد اس کی صلاحیت کا ہم اندازہ نہیں لگا سکتے۔ مادی جسم کے ساتھ روح ایک گھنٹہ میں چار پانچ میل سے زیادہ مسافت طے نہیں کر سکتی مگر روح مجرد کے لئے ایک لحہ میں بعد المشرقین بھی کوئی چیز نہیں۔ موجودہ زندگی میں بھی ہر روح کی طاقت ایک جیسی نہیں۔ نوع انسانی کے ایک ہوتے ہوئے ہر انسانی روح کی

طاقت برابر نہیں۔ روح انسانی میں از روئے قرآن یہ بھی طاقت ہے کہ وہ تختِ بلقیس چشم زدن سے پہلے ملک سبا سے شام کے علاقہ میں لے آئے۔ گہوارے میں کلام کرے۔ رات کے ایک حصہ میں مکہ سے مسجدِ اقصیٰ تک پہنچ کر واپس آجائے پیدا ہوتے ہی سجدہ الٰہی میں گر پڑے۔ بغیر کسی کتاب دنیا اور انسان دنیا کی تعلیم کے عالمِ کتاب و حکمت ہو اور علم و حکمت کا آباد اور معمور شہر ہو۔ کیا وہ معلم اس پر قادر نہیں ہے کہ وہ روح کو ہر بات اور ہر زبان کے سمجھنے کی صلاحیت اپنے ارادۂ تکوینی سے عطا کر دے۔ اگر ایک عربی ناخواندہ اپنے ناخواندہ ہونے کی وجہ سے مفہوم تلقین نہیں سمجھ سکتا تو اس دنیا میں کروڑوں ایسے ہوتے ہیں کہ وہ کوئی نہ کوئی زبان تو بول لیتے ہیں لیکن اس زبان کو بھی نہ لکھ سکتے ہیں نہ پڑھ سکتے ہیں۔ ایسے ناخواندہ محض سے بقول قرآن قیامت میں کیسے کہا جائے گا کہ لے اپنا نامہ اعمال پڑھ لے ''اقراء کتابک'' (بنی اسرائیل آیت 14) وہ اللہ کے کہتے ہی پڑھ بھی لے گا اور پڑھ کر یہ کہے گا۔ مال ھذا الکتاب لایغادر صغیرۃً ولا کبیرۃً الاّ احصاھا (سورہ کہف آیت 49)۔ ''یہ نوشتہ کیسا ہے کہ اس میں کوئی چھوٹی بڑی بات کہنے سے باقی ہی نہیں رہی''۔ اب یہ خواندہ بھی ہو گیا اور اس کی یادداشت بھی اتنی تیز کہ اپنا کیا ہوا ہر چھوٹا بڑا کام اس کو یاد آگیا۔ جبکہ وہ زندہ رہتے ہوئے بہت کچھ بھول جاتا تھا۔ اور یاد دلانے سے بھی یاد نہیں آتا تھا۔ پھر یہ نامہ اعمال کس زبان میں ہو گا۔ کیا یہ ہو گا کہ کسی کا عربی میں، کسی کا فارسی میں کسی کا اردو میں کسی کا ہندی میں، سندھی میں، پشتو میں، پنجابی میں، بنگالی میں، یونانی میں، عبرانی میں، لاطینی میں۔ تو پھر ان لکھنے والے ملائکہ کے لئے قدرت نے کوئی کالج کھولا ہو گا۔ جس میں ہر زبان کے پروفیسر ہوں گے۔ اور ان ملائکہ کو ہر زبان کا لکھنا پڑھنا سکھاتے ہوں گے۔ پھر جنت اور دوزخ میں باہم گر گفتگو ہو گی یہ کس زبان میں ہو گی۔ اہل جنت اور اہل دوزخ کی ملائکہ سے بھی گفتگو ہو گی یہ کس زبان میں ہو گی۔ غرض کہ مخالفین نے تلقین کا مذاق اڑا کر قرآن اور دین کا مضحکہ فرمایا ہے۔

معترضین کا دعویٰ ہے کہ موت کی ساعت اور قیامت کے دن کے درمیان کسی بھی ظاہری یا باطنی زندگی کا قرآن کی رو سے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا

مخالفین مذکورہ دعویٰ کرتے ہوئے درج ذیل آیت کو دلیل بناتے ہیں :

ثمّ انّکم بعد ذالك لمیّتون ثمّ انّکم یوم القیامة تبعثونo(پارہ 18' سورہ مومنون)۔ ''پھر تم اس پیدا ہونے کے بعد زندگی گزار کر ضرور مر جاتے ہو۔ پھر تم مرنے کے بعد قیامت کے دن دوبارہ اٹھائے جاؤ گے''۔ ان کا دعویٰ ہے کہ آیات بالا میں اسی جسم کا سارا قصہ بیان کیا گیا ہے۔ جو مختلف مراحل سے گزر کر ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا اور ضرور مر جاتا ہے اور موت کے بعد پھر ثم کی ترتیب و توارد کے ساتھ ارشاد ہوا ہے کہ تم قیامت کے دن اٹھائے جاؤ گے۔ جس سے دوپہر کے سورج کی طرح عیاں ہے کہ موت کی ساعت اور قیامت کے درمیان کسی بھی ظاہری یا باطنی زندگی کا قرآن کی رو سے سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

آیاتِ بالا میں اسی جسم کا سارا واقعہ نہیں ہے بلکہ روح کا بھی دوسری آیت میں قصہ موجود ہے ثم انشاناہ خلقاً اخرط (پارہ 18' سورہ مومنون' آیت 14) ''پھر ہم نے اس جسمِ کامل کو دوسری پیدائش یعنی روح عطا کی۔ اب پہلی پیش کی ہوئی آیت سے اس آیت کو ملا کر دیکھئے۔ آپ کو صاف نظر آجائے گا کہ قیامت کے دن کسی کو پیدا نہیں کیا جائے گا۔ بلکہ اٹھایا جائے گا۔ کیونکہ ثم انکم یوم القیامة تخلقون نہیں ہے تبعثون ہے جس کا مصدر ہے بعث۔ یہ لفظ بعث اس وقت کہا جاتا ہے کہ جب چیز پہلے سے موجود ہو۔ ولادتِ نبیؐ اور بعثتِ نبیؐ کے دن الگ الگ ہیں۔ بعثتِ نبیؐ کا دن وہ ہے جس سے پہلے اور سالہا سال پہلے نبیؐ موجود تھے۔ بعثت کے دن آنحضور پیدا نہیں ہوئے بلکہ اس روز ان کو اللہ نے ہدایتِ خلق کے لئے کھڑا کیا اور اٹھایا لہذا بعثت کے لئے ضروری ہے کہ وجود پہلے سے ہو۔ آپ کی پیش کی ہوئی آیت میں بھی یہی لفظ بعث

ہے اور جگہ جگہ قرآن کریم میں روز قیامت کے لئے یہی لفظ بعث آیا ہے۔ جیسے من بعثنا من مرقدنا (پارہ 23، سورہ یٰسین، آیت 52) "قیامت کے روز اٹھائے جانے والے کہیں گے کہ ہم کو ہمارے مرقد سے کس نے اٹھادیا"۔ انّ اللّٰہ یبعث من فی القبور (پارہ 17، سورہ حج، آیت 7)۔ "جو قبروں میں ہوں گے اللہ ان کو اٹھائے گا" ثم بعثنا کم من بعد موتکم (پارہ ا، سورہ بقرہ، آیت 56) "پھر ہم نے تم کو تمہاری موت کے بعد اٹھایا"۔ چونکہ وہ روح جو جسم سے الگ کرلی گئی تھی اور وہ موجود تھی۔ اب پھر اس کا جسم سے اتصال کر دیا گیا جس کے لئے اکثر قرآنِ مجید میں لفظ بعث ہے یا کہیں کہیں لفظ احیاء (زندہ کرنا) آیا ہے۔ اگر ہمارے معترض کے بقول موت نے روح کو محض ناپید اور معدوم کر دیا ہوتا اور روح کا کہیں وجود ہی نہ رہا ہوتا تو قیامت کے روز اٹھایا جانا یا زندہ کرنا نہ کہا جاتا بلکہ پیدا کرنا، خلق کرنا کہا جاتا۔ اب تو خدا کے لئے کہہ دیجئے کہ موت کی ساعت اور قیامت کے دن کے درمیان روح کی موجودگی قرآن کی رو سے دوپہر کے اس سورج کی طرح روشن ہے جس پر کوئی بادل نہ ہو۔

ہمارے معترض فرماتے ہیں:

بروئے آیاتِ بالا 33 / 13 تا 17 جن میں بعثت کو صرف قیامت کے ساتھ وابستہ کر دیا ہے"۔

غنیمت ہے کہ لفظ بعثت آپ نے استعمال تو کیا مگر یہ بھول گئے کہ بعثت اسی کی ہوتی ہے جو پہلے سے موجود ہو۔ دوسری بھول آپ کی یہ ہے کہ آپ کے نزدیک اللہ نے بعثت کو صرف قیامت کے ساتھ وابستہ کر دیا ہے حالانکہ قرآنِ کریم کی رو سے قیامت سے پہلے اس دنیا میں بھی وفات پائے انسانوں کی بعثت ہوئی ہے۔ حضرت عیسیٰ کا مُردوں کو زندہ کرنا قرآنِ کریم نے بیان فرمایا ہے۔ اگر مرنے والوں کی روح معدوم ہو چکی ہوتی تو روحِ معدوم کے خالق حضرت عیسیٰؑ نہیں ہو سکتے تھے نہ قرآن نے ان کو خالقِ اموات کہا ہے۔ اس کے علاوہ قرآن کریم نے دو جگہ مُردوں کو اسی دنیا میں اٹھائے جانے کا ذکر فرمایا ہے۔

۱۔ جب بنی اسرائیل پر بجلی گری اور وہ لوگ ہلاک ہو گئے اللہ تعالیٰ نے دوبارہ ان کے جسموں میں روح ڈال کر ان کو اٹھا دیا۔ فرماتا ہے۔ **فاخذتکم الصّاعقة وانتم تنظرون ثم بعثناکم من بعد موتکم لعلّکم تشکرونo** (پارہ ۱ سورہ بقرہ آیت 55-56) "یعنی تم کو بجلی نے پکڑ لیا اور تم دیکھ رہے تھے، پھر ہم نے تمہاری موت کے بعد تم کو اٹھا دیا تاکہ تم شکر کرو"۔

۲۔ ایک بزرگ کا گزر کسی ویران آبادی کی طرف ہوا جہاں کے لوگ گرے ہوئے مکانوں کے نیچے دبے پڑے تھے۔ ان کی زبان پر حیرت سے یہ جملہ آیا کہ کس طرح اللہ ان کو ان کی موت کے بعد زندہ کرے گا۔ اللہ نے خود ان کی ہی روح کو قبض کر لیا۔ یہ سو برس تک وہیں مردہ رہے پھر اللہ نے ان کو زندہ کر کے اٹھا دیا۔ چنانچہ فرمایا جاتا ہے: **اوکا لّذی مرّ علیٰ قریةٍ وھی خاویةٌ علیٰ عروشھا قال انّٰی یحی ھذہ اللّٰہ بعد موتھا فاماته اللّٰہ مائة عام ثم بعثه۔** (پارہ 3 سورہ البقرہ آیت 259)

تقریباً ترجمہ آیت اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ آیاتِ قرآنیہ سے ثابت ہے کہ بعث بعد الموت اس دُنیا میں بھی ہوتا رہا ہے لہٰذا قرآن کریم اس جملے کی تردید کر رہا ہے کہ بعثت کو صرف قیامت کے ساتھ وابستہ کر دیا ہے۔

ہم نے اپنے کتابچہ "صحابیت کا قرآنی تصور" میں کہا تھا کہ شہداء کے بارے میں قرآنی لفظ احیاء (وہ زندہ ہیں) کے معنی ان کے نزدیک "زندہ ہیں" غلطی ہے۔ ان کے نزدیک صحیح معنی ہیں مردہ قوموں کو زندہ کرنے والے۔ ان کے اس قول پر ہم نے کہا تھا کہ مردہ قوموں کو زندہ کرنے والے انبیاء خدا سے زیادہ کون ہو سکتے ہیں اور انبیاء میں سید انبیاءؐ سب سے افضل ہیں۔ نہ ان سے زیادہ کوئی مردہ قوموں کو زندہ کرنے والا نہ ان سے زیادہ کوئی مستحق احترام، تو انہوں نے ان کے بارے میں کوئی آیت پیش نہ کی جس سے ظاہر ہوتا کہ سید انبیاءؐ کو ان کے احترام میں اور اس معنی میں کہ وہ سب سے

زیادہ مردہ قوموں کو زندہ کرنے والے ہیں۔ حیّ (زندہ) کہا گیا ہے اور ان کو احتراماً اور اعزازاً مردہ کہنے سے روکا گیا ہے اس کے برخلاف وہ انّك ميّت" و انّهم ميّتون ٥ (سورہ زمر، آیت 30) سے نبیؐ کی وفات کو عام لوگوں کی وفات سے برابری دے رہے ہیں۔ ناظرین غور فرمائیں کہ ہمارا یہ معارضہ کس درجہ مضبوط ہے کہ جس مجازی معنی میں شہداء کو زندہ کہا گیا تو جب وجہ مجاز اور زندہ کہنے کا سبب سید انبیاءؑ کے لئے بدرجہ اتم واکمل موجود ہے تو پھر آنحضور کے لئے یہ لفظ قرآن نے کیوں نہ کہا۔ لیکن وہ دوبارہ انّك ميّت" و انّهم ميّتون کو پیش کر کے موتِ نبیؐ پر مصر ہیں۔ حالانکہ ہم یہ کب کہہ رہے ہیں کہ جسدِ مقدس نبیؐ سے یا اجسادِ شہداء سے ان کی پاکیزہ ارواح جدا نہیں ہوئی تھیں لیکن جسموں سے نکل جانے کے بعد جن ارواح کو جسم مثالی دے کر اللہ زندہ رکھنا چاہے اس کو زندہ کہے اور مردہ کہنے اور سمجھنے سے سب کو روک دے، ان کو زندہ نہ مان کر اور مردہ سمجھ کر خدا اور رسولؐ، قرآن و حدیث سے دشمنی کیوں خریدیں۔ اسی ضمن میں ہم نے کہا تھا۔ "حالانکہ اگر وہ دیکھنا چاہتے ہیں تو اسی قرآن میں سید انبیاؐ کو بلکہ ان کے ساتھ مخصوص ارواحِ ایمانی کو قیامت تک عمال عاملین کا نگران قرار دیا گیا ہے: قلِ اعملوا فسيرى الله عملكم و رسوله والمؤمنون (پارہ نمبر ۱۱، سورہ توبہ، آیت 105) "اے رسولؐ کہہ دو کہ تم عمل کرو۔ عنقریب تمہارے عمل کو اللہ و رسولؐ اور مخصوص مومنین دیکھتے رہیں گے۔ "دیکھتے رہیں گے" قرآن ہی سے لائے ہیں۔ آیت میں فسیریٰ مضارع ہے؟ اور مضارع حال اور مستقبل کے لئے آتا ہے اور فعل یریٰ کا فاعل اللہ ہی ہے؟ اور اللہ اعمال عاملین کو دیکھتا رہے گا؟ اس سے اور زیادہ مزے دار بات سنئے۔ معترض کے خیال میں مضارع پر سیںؔ داخل ہو تو اسے مستقبل قریب کے لئے مخصوص کر دیتا ہے۔

ان کا غالباً مطلب یہ ہے کہ چونکہ یریٰ پر حرف سین ہے لہذا صرف مستقبل قریب کے لئے ہے جس کی رو سے اللہ اور رسول اور مخصوص مومنین لوگوں کے اعمال کو ہمیشہ نہ دیکھیں گے بلکہ صرف مستقبل قریب میں دیکھیں گے اور اس کے بعد رسولؐ

اور المومنون وفات پا کر نیست و نابود ہو جائیں گے اور ان کے ساتھ اللہ میاں بھی کہیں چلا جائے گا۔ وہ رسولؐ اور المومنون کے ساتھ ہونے کی وجہ سے اللہ کو بھی مٹا رہے ہیں۔

عربی ادب کے ادنیٰ طالب علم جہاں یہ جانتے ہیں کہ مضارع پر حرف سین مستقبل قریب کے معنی دیتا ہے وہاں یہ بھی جانتے ہیں کہ اس فعل کا وقوع مستقبل قریب میں شروع ہو کر مستقبل قریب ہی میں ختم ہو جائے یہ ضروری نہیں ہے بلکہ ہو سکتا ہے کہ وہ فعل مستقبل قریب سے چل کر قیامت تک جاری رہے۔ خدا پارہ ۲۹ سورۂ مزمل میں نماز شب کے سلسلہ میں مومنین سے فرماتا ہے علم ان سیکون منکم مرضیٰ ''علم خدا میں ہے کہ عنقریب تم میں سے لوگ بیمار ہوں گے لہذا تم سے جس قدر آسانی سے ہو سکے نماز تہجد پڑھو'' قیام لیل کا طول و اختصار' اپنی بیماری' مسافرت' روزی کمانے کی مشغولیت پر نظر رکھ کر قرار دو۔ اب بتایئے سیکون منکم مرضیٰ ''تم میں سے کچھ لوگ بیمار بھی ہوتے رہیں گے'' کیا یہاں یکون پر حرف سین کے آجانے سے یہ مطلب ہے کہ مومنین مستقبل قریب میں بیمار ہو کر پھر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مومنین اور ان کی آئندہ نسلیں قیامت تک کبھی بیمار نہ ہوں گے؟ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ بیماری اور دکھ درد کا سلسلہ مومنین میں قیامت سے پہلے ختم نہ ہو گا۔ اور مومنین میں سے کبھی نہ کبھی وہ روز قیامت تک بیمار ہوتے ہی رہیں گے لہذا ثابت ہوا کہ لوگوں کے اعمال کو اللہ' رسولؐ' المومنون قیامت تک دیکھتے رہیں گے اور رسولؐ' المومنون پیش خدا شاہد اعمال ہوں گے۔ یہیں سے یہ ثابت ہے کہ رسول' المومنون (ائمہ اثنا عشر) بعد وفات بھی زندہ اور ناظرِ اعمال ہیں۔ آیت میں فعل سیری ایک ہے جس کا فاعل اللہ' رسولؐ' المومنون ہیں تو اگر ایک فاعل یعنی اللہ کا اعمال کو دیکھتے رہنا مسلسل ہے تو رسولؐ اور المومنون کا اس ہی ایک فعل کا فاعل ہونا بتا رہا ہے کہ ان کا ناظرِ اعمال ہونا بھی مسلسل ہے۔ آیت مذکورہ کے بعد فرمایا جاتا ہے کہ وستردّون الی عالم الغیب والشھادۃ فینبّئکم بما کنتم تعملون (سورہ توبہ آیت 105 کا

بقیہ حصہ) تم عنقریب غیب و شہادت کے جاننے والے (خدا) کی طرف پلٹائے جاؤ گے۔ پس وہ خبر دے گا جو تم کرتے تھے ستر دون میں وہی سین ہے جس کا وہ خود ذکر کر چکے ہیں کہ مستقبل قریب کے لئے ہوتا ہے۔ فرمائیے کہ بندوں کا اللہ کی طرف پلٹنا جو مستقبل قریب ہے۔ اس مستقبل قریب سے کیا مراد ہے؟ اگر قیامت مراد ہے تو واضح ہوا کہ اللہ کے نزدیک قیامت بھی مستقبل قریب ہے لہذا "سیریٰ اللہ" والا مسئلہ اور واضح تر ہو گیا۔ اور اگر بندوں کے مستقبل قریب میں اللہ کی طرف پلٹنے سے بندوں کا مرنا مراد ہے تو ثابت ہوا کہ مر کر روحِ انسانی معدوم نہیں ہوتی اور انسان معدوم نہیں ہوتا بلکہ اس دنیا سے منتقل ہو کر اللہ کی طرف پلٹتا ہے۔ آیت مذکورہ قل اعملوا فسیری اللہ عملکم و رسولہ و المومنون کے جواب میں تین آیات پیش کی گئی ہیں۔

ا۔ قل یا قوم اعملوا علیٰ مکانتکم انّی عامل فسوف تعلمون من تکون لہ عاقبۃ الدّار (پارہ 8 سورہ انعام' آیت 135)

آیت کا ترجمہ وہ کرتے ہیں کہ "اے قوم تم اپنے مقام پر عمل کرتے جاؤ۔ میں اپنے مقام پر عمل کر رہا ہوں۔ پس تم جلدی جان لو گے کہ کامیابی کس کے حصہ میں آتی ہے۔ ان کے نزدیک کامیابی سے مراد وہ فتح ہے جو جہاد میں ہو۔ حالانکہ عاقبۃ الدار سے مراد اخروی کامیابی اور مسکن خلد بریں ہے لیکن ان کے نزدیک کامیابی کی انتہا اسی دنیا میں ہے۔ آخرت کا انتظار بیکار ہے ان سے کوئی پوچھے کہ اس آیت کو فسیری اللہ والی آیت سے کیا مناسبت ہے۔ اس آیت میں یہ کہاں ہے کہ رسولؐ بعد وفات بالکل مردہ ہیں۔ وہ کسی کا عمل نہیں دیکھ سکتے۔

۲۔ قل یا قوم اعملوا علیٰ مکانتکم انّی عامل فسوف تعلمون من یاتیہ عذاب" یّخزیہ ویحل علیہ عذاب" مقیم o (پارہ 24' سورہ زمر' آیت 39'40)

وہ اس کا ترجمہ کرتے ہیں کہ تم اپنے مقام پر عمل کرو میں اپنے مقام پر عمل کر

رہا ہوں پس تم عنقریب جان لو گے کہ (شکست کا) رسوا کن عذاب کس کو پہنچتا ہے۔ آیت کے آخری حصے کا ترجمہ ہی نہیں کرتے۔ یعنی ویحل علیه عذاب" مقیم۔ جس طرح پہلی آیت میں من تکون له عاقبة الدار کا ترجمہ کیا تھا فتح سے اسی طرح اس آیت میں عذاب" یخزیہ کا ترجمہ کیا ہے۔ لڑائی میں شکست کھانے سے۔ قیامت ہے کہ روز قیامت کے ثواب و عذاب کو دنیا کی فتح و شکست میں ختم کر رہے ہیں۔ یہاں سے ہم کو شک ہو رہا ہے کہ وہ قیامت کے قائل بھی ہیں یا نہیں۔ آیت مذکورہ کا صحیح ترجمہ یہ ہے' اے رسولؐ! کہہ دو کہ اے قوم تم اپنی جگہ عمل کرو میں بھی عمل کرنے والا ہوں تم عنقریب جان لو گے کہ رسوا کن عذاب (آخرت) کسکو پہنچتا ہے اور کس پر ہمیشہ رہنے والا عذاب نازل ہوتا ہے۔ یہ آیت بھی ہمارے حیاتِ نبیؐ کے دعوے کی کوئی تردید نہیں کرتی۔

۳۔ ان کی پیش کردہ تیسری آیت یہ ہے ویاقوم اعملوا علیٰ مکانتکم انّی عاملُ' سوف تعلمون من یّاتیه عذاب" یّخزیه و من هو کاذب" وارتقبوا انّی معکم رقیبo ولمّا جاء امرنا تجّینا شعیباً والّذین آمنوا معه برحمة منّا واخذت الذین ظلموا الصیحة فاصبحوا فی دیار هم جاثمین (پارہ 12 'سورہ ہود 'آیات 93'94)

اس آیت میں نہ قل ہے نہ آنحضورؐ کی طرف کوئی حکم ہے۔ نہ یہ آنحضورؐ کا قول ہے یہ تو جناب شعیبؑ پیغمبر کا قول ہے جو اپنی امت سے فرمار ہے ہیں۔ اس آیت میں شروع ذکر اور آخر ذکر دونوں جگہ حضرت شعیبؑ کا نام تک موجود ہے۔

یہ بیان اس طرح قرآن میں شروع ہوا ہے :

قالوا یا شعیب مانفقه کثیرا ممّا تقول وانّا لنراك فینا ضعیفا ولولا رهطك لرجمناك وما انت علینا بعزیزo قال یٰقوم ارهطی اعزّ

علیکم من اللہ وا تّخذتموہ و راء کم ظھریّاً انّ ربّی بما تعملون محیطo ویا قوم اعملوا علیٰ مکانتکم انی عامل سوف تعلمون من یاتیہ عذاب'' یخزیہ (پارہ 12' سورہ ہود آیت 91'92'93) الخ۔

یہ عجیب بات ہے کہ قولِ جناب شعیبؑ کو اللہ کا آنحضورؐ کی طرف حکم قرار دے رہے ہیں۔ جس آیت میں نام تک صاحبِ قول کا موجود ہے اس کو آنحضورؐ کی طرف لا رہے ہیں جس طرح اشدّاء علی الکفّار کی مدح کو فتح مکہ کے بعد کے ان مسلمانوں کی طرف لا رہے ہیں جنہوں نے صفین کا معرکہ گرم کیا جب نام والی آیت کو انہوں نے بدل کر رکھ دیا تو جس آیت میں نام نہیں تھے اس میں تو گنجائش ہی گنجائش تھی۔ بہر حال ان ہر سہ آیات کو پیش کر کے انہوں نے وقت ضائع کیا ہے۔ جس قرآن نے حیات نبیؐ کو بیان کیا ہے وہی قرآن حیاتِ نبیؐ کی نفی کیسے کر سکتا ہے۔ قرآن میں اختلاف کیسے ہو سکتا ہے؟

وہ کہتے ہیں:

> "کہ آنحضورؐ کو زندہ ماننا حضورؐ کی انتہائی توہین ہے۔ اگر یہ مانا جائے کہ حضورؐ زندہ ہیں اور حضورؐ کی موجودگی میں اسلام کو سینکڑوں حصوں میں تقسیم کر لیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ حضورؐ کے سامنے ہی بیت اللہ شریف میں چار الگ الگ مصلے قائم کر دیئے گئے اور آپ نے نبیؐ ہوتے ہوئے نہ فرقہ وارانہ مسائل ہی حل کئے نہ اللہ کے گھر کو صاف کیا۔

ان کے اس خیال کا لب لباب یہ نکلا کہ جو نافرمانیاں حضورؐ کی وفات کے بعد مسلمانوں نے کیں اگر حضورؐ کو زندہ مانا جائے تو حضورؐ پر الزام آتا ہے کہ آپ نے وہ نافرمانیاں کیوں ہونے دیں اور خود کیوں نہ مداخلت کی؟ ان سے کون کہے کہ نافرمانوں نے حضور اکرمؐ کی موجودگی ہی میں کیا کسر اٹھا رکھی تھی جس کے بارے میں قرآن کو جا بجا کہنا پڑا ولیتم مدبرین تولوا منکم' تنازعتم فی الامرو عصیتم' اذتصعدون الخ ترکوك قائما وغیر ذالك۔ اس وقت تو حضورؐ زندہ تھے۔ ان

نافرمانیوں سے کیا حضورؐ کی توہین نہیں ہوئی؟ اور اگر توہین کے ڈر سے آپ رسولؐ کو محض ایک مردہ سمجھنا چاہتے ہیں تو خدا تو زندہ ہے۔ آپ حی "لا یموت کو کیوں بھول گئے۔ اس دنیا میں کیا نہیں ہوا اور کیا کچھ نہیں ہو رہا ہے۔ اگر اللہ موجود ہے۔ زندہ ہے' باخبر ہے دخل دینا تو الگ رہا ٹس سے مس بھی نہیں۔ کہہ دیجئے کہ وہ بھی مردہ ہے۔ کچھ بھی نہیں بولتا۔ وہ کیوں بولے! جو کچھ اس کو کہنا تھا کہہ چکا۔ جو کچھ نبیؐ کو سمجھانا تھا سمجھا چکے۔ اب آزمائش ہے کہ کون مانتا ہے کون نہیں مانتا جیسے کہ طلبہ کو سب کچھ لکھانے پڑھانے کے بعد ممتحن امتحان لیتا ہے اور امتحان کے وقت اپنی جگہ خاموش بیٹھا رہتا ہے۔ نہ ممتحن صحیح کام کرنے والے کو داد دیتا ہے نہ غلط کام کرنے والے کو ٹوکتا ہے۔ اس لئے کہ اب تعلیم کا وقت نہیں امتحان کا وقت ہے جس کے بعد نتیجہ کا دن آرہا ہے جس کا نام روز جزا ہے۔

قرآن کریم سے حیاتِ نبیؐ پر دوسری دلیل :

آپ نے قرآن کریم میں یہ آیت بھی ضرور دیکھی ہو گی کہ نبیؐ بروز قیامت اپنے رب سے کہیں گے یاربّ انّ قومی اتّخذوا ھٰذا القرآن مھجورا (پارہ 19' سورہ فرقان آیت 30) "اے میرے رب میری قوم نے اس قرآن کو چھوڑ دیا تھا" لامحالہ نبیؐ کی یہ شکایت اپنے بعد ہی کے زمانے کی ہو گی۔ اگر نبیؐ اپنی وفات کے بعد معدوم ہو گئے اور ناظر اعمال نہ رہے تو یہ شکایت کیسی۔ خلافت کی خشتِ اول حضرت آدمؑ کے لئے قرآن طے کر چکا ہے کہ اللہ نے ان کو زمین پر آنے سے پہلے کل حقائق تعلیم فرما دیئے تھے وہ صاحبِ علم ہو کر زمین پر آئے۔ چونکہ سنتِ الٰہی کبھی نہیں بدل سکتی لہذا یہی سلسلہ آخر تک جاری رہا۔ اب ذرا اس آیت کو دیکھئے :

یا داود انّا جعلنٰك خلیفة فی الارض فاحکم بین الناس بالحق (پارہ 23' سورہ ص) "اے داودؑ ہم نے آپ کو زمین میں خلیفہ بنایا ہے۔ پس آپ لوگوں میں حق کے ساتھ حکم فرمایا کریں۔ یہ ہے خدا تعالیٰ کی عطا کردہ خلافتِ ارضی جو وہ اپنے

وعدہ کے مطابق عطا فرماتا ہے۔

یہ ہے خدا تعالیٰ کی عطا کردہ خلافت ارضی جس میں نہ اجماع امت کا دخل ہے نہ کسی کی رائے اور مشورے سے خلیفہ بنایا گیا ہے خود اللہ نے خلیفہ بنایا۔ یہی نشان تو ہے جس کو ہم ہر جگہ دیکھنا چاہتے ہیں۔

ہم اس نظریے کو تسلیم نہیں کرتے کہ اس دنیا میں جب بھی جس نے حکومت کی اس کی حکومت ہی اس کی دلیل ہے کہ وہ اللہ کا فرماں بردار اور اللہ کا بنایا ہوا خلیفہ ہے وہ چاہے فرعون ہو یا نمرود، یزید ہو کہ مروان۔ یہ عقیدہ ہمارا نہیں ہے۔

ہم سے پوچھا جاتا ہے کہ آیت مجیدہ (پارہ 23، سورہ ص) انی احببت حبّ الخیر عن ذکر ربّی o اور پارہ ا، سورہ بقرہ آیت 102 وما انزل علی الملکین کا ایک ترجمہ مولوی ثناء اللہ صاحب اہل حدیث کا اور دوسرا ترجمہ مولوی سید مقبول احمد صاحب کا ہے۔ ان دونوں میں سے کس بزرگ کی تفسیر رسولی ہے اور کونسا بزرگ رسولی تفسیر کا منکر ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ نبیؐ نے خود کوئی ترجمہ اردو زبان میں نہیں کیا۔ لہذا کوئی ترجمہ بھی رسولی نہیں ترجمہ کو تفسیر کہنا فریب کھانا اور فریب دینا ہے۔ اہل زبان اپنی زبان کو سمجھتے تھے، تفسیر کہتے ہیں اصطلاحی الفاظ کے مفہوم کو یا ان جزئیات کے بیان کو جو کلیاتِ ذکر کے تحت میں آتے ہیں اور قرآن نے خود ان کو بیان نہیں فرمایا بلکہ اس کا بیان نبیؐ پر چھوڑ دیا۔ جیسے صلوٰۃ، زکوٰۃ کا مفہوم شرعی کیا ہے۔ اس کی مقدار اور اس کے شرائط کیا ہیں یا جیسے لفظ اصحاب کہف کے تحت میں یہ کہ وہ کتنے تھے۔ ان کے نام کیا تھے۔ وغیر ذالک۔ یہ کہلائے گی تفسیر۔ رسولی تفسیر کا کوئی مسلمان اہل حدیث ہو یا شیعہ یا کچھ بھی کوئی بھی منکر نہیں ہو سکتا البتہ رسولی تفسیر کے حاصل کرنے کے ذرائع مختلف ہیں۔ کسی نے ان لوگوں کا ذریعہ اختیار کیا جو منزہ عن الخطانہ تھے اور ایک جیسے نہ تھے کسی کے پاس ان لوگوں کا ذریعہ ہے جو منزہ عن الخطاء اور معصوم ہیں جن کی پاکیزگی اور کمال پاکیزگی کا اور جن کے پاس علم الکتاب ہونے کا قرآن کریم نے اعلان کیا ہے۔

منافقین پر برابر پردے ڈالے جا رہے ہیں:

رسولؐ معاذ اللہ کچے کان کے ہیں کے متعلق میں نے عرض کیا تھا کہ یہ آیت سورہ توبہ کی ہے۔ آیت میں یہ قول کفار کا نہیں بتایا گیا بلکہ منافقین کا بتایا گیا ہے جو نماز پڑھتے تھے' زکوٰۃ دیتے تھے۔ ہم نے مذکورہ آیت کے ساتھ اس سے پہلی اور بعد کی آیت نقل کر کے واضح کر دیا تھا کہ رسول کو کچے کانوں کا کہنے والے منافقین تھے جن کو معترضین کافر کہہ کر منافقین کے وجود پر پردہ ڈال رہے ہیں کیونکہ ان کی کوشش ہے کہ آج کے مسلمانوں کو کسی طرح یہ تصور تک نہ پیدا ہو کہ عہدِ پیغمبرؐ میں کچھ لوگ منافقین بھی تھے۔ ہم پوچھتے ہیں کہ کیا قرآن کریم نے منافق کو منافق نہیں کہا؟ جب منافق کے لئے ایک صاف اور معین لفظ ہے تو اس کو چھوڑ کر لفظ کافر کہنے کی وجہ اور ضرورت کیا پیش آئی تھی۔ قرآن کریم نے منافق کی باطنی کیفیت کی بنا پر منافق کو کافر بھی کہا ہے اور اس کی ظاہری حالت کی بنا پر اس کو مومن و مسلم بھی کہا ہے اور اس کی دورنگی کی بنا پر اس کو منافق بھی کہا ہے لیکن اس کے لئے صریحی لفظ ہے منافق جس کے ساتھ کسی تشریح کی ضرورت نہیں' ورنہ جب منافق کو کافر کہا جائے گا تو یہ شرح ضروری ہوگی کہ وہ باطناً کافر ہے اور ظاہراً مومن ہے۔ اسی طرح جب اس کو مومن کہا جائے گا تو اس بات کا نشان دینا ہوگا کہ وہ ظاہراً مومن ہے باطناً نہیں۔ اگر ایک شخص یہ بیان کر دے کہ کل ایک آدمی کو شیر نے ہلاک کر دیا بعد میں معلوم ہوا کہ اس نے غلط کہا۔ شیر نے نہیں کسی آدمی نے ہلاک کیا تھا باز پرس کرنے پر وہ جواب میں کہہ دے کہ کیا نڈر اور بہادر آدمی کو شیر نہیں کہا جاتا تو یہ کوئی جواب ہوا۔ بے شک ایسے آدمی کو شیر کہا جاتا ہے مگر اس کا آدمی ہونا چھپایا نہیں جاتا۔ آدمی کو شیر کہنے کے لئے ضروری ہے کہ کسی انداز میں اس کا آدمی ہونا ظاہر کر دیا جائے ورنہ بیان کو دروغ اور غلط ضرور کہا جائے گا قرآن کریم نے منافق کو جہاں کافر کہا ہے وہاں اس کو مومن بھی کہا ہے کیونکہ منافق ایک اعتبار سے کافر ہے تو دوسرے اعتبار سے مومن ہے۔ اور دونوں اعتبار کو ملا کر

منافق ہے۔ قرآن کریم میں جہاں بھی یا ایھا الذین امنوا کہہ کر خطاب کیا گیا ہے اس خطاب میں مومن اور منافق سب شامل ہیں یا ایھا الذین امنوا کہہ کر جو حکم بھی اللہ نے دیا ہے اس حکم کے محکوم سب ہیں۔ نہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ حکم منافق کو نہیں دیا گیا نہ منافق کہہ سکتے ہیں کہ یہ حکم مجھ کو نہیں دیا گیا۔ جب اس خطاب میں ہر مدعی ایمان مخاطب اور محکوم ہے' چاہے وہ حقیقتاً مومن نہ ہو تو قرآن نے منافق کو بھی (اس کے دعوے کی بنا پر) ایمان لانے والا فرمایا۔

قرآنِ کریم نے منافق کو اس کے ظاہر کے اعتبار سے مومن کہا ہے:

جیسا کہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں کہ یا ایھا الذین امنوا کے خطاب میں اور اس کے بعد والے حکم میں مومن اور منافق سب ہیں اور اس طرح قرآنِ کریم منافق کو بھی ایمان لانے والا کہہ رہا ہے اسی طرح دوسری آیات قرآنی میں بھی لفظ مومن میں منافقین داخل ہیں۔ چنانچہ فرمایا جاتا ہے کما اخرجك ربك من بيتك بالحق وان فريقاً من المومنين لكٰرهون ٥ يجادلونك في الحق بعد ماتبين كانما يساقون الى الموت وهم ينظرون (پارہ 9' الانفال آیات 5-6)۔ (تقسیم مال غنیمت کا جھگڑا بھی) ایسا ہی ہے کہ اے نبی تم کو اللہ نے تمہارے گھر سے حق کے ساتھ نکالا تھا۔ اور اس وقت مومنین میں سے ایک گروہ یقیناً حکم خدا سے کراہت کر رہا تھا وہ اے نبیؐ تم سے امر حق کے بارے میں جھگڑتے ہیں جبکہ حق واضح ہو چکا ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کو کھلی آنکھوں موت کی طرف ہنکایا جا رہا ہے۔

جن لوگوں کو حکم خدا کی تعمیل مکروہ اور ناگوار تھی جو نبی سے حق کے واضح ہو جانے کے بعد جھگڑ رہے تھے' جو حکم خدا کی تعمیل کو موت کے منہ میں دھکیلا جانا سمجھ رہے تھے ان کو قرآن کریم مومنین ہی میں کا ایک فریق بتا رہا ہے۔ یہ علامتیں سچے مومنین کی تو ہو نہیں سکتیں لہذا ان کو مومن ان کے دعوے ایمان ہی کی بنا پر کہا جا رہا ہے یا تو یہ کل کے کل منافق تھے ورنہ یہ تو یقینی ہے کہ منافق اسی فریق میں سے تھے لہذا

ثابت ہوا کہ منافقین کو ان کے ظاہر اور ان کے دعوے کی بنا پر مومن کہا جا رہا ہے۔

دوسری آیت :

وان طائفتان من المومنین اقتتلوا فاصلحوا بینهما فان بغت احدٰ هما علی الاخرٰی فقا تلوا الّتی تبغی حتّٰی تفئی الیٰ امر اللّٰه فان فاء ت فاصلحوا بینهما بالعدل واقسطوا انّ اللّٰه یحب المقسطینo(پارہ 26' الحجرات آیت 9)

''اور اگر کسی وقت ایمان لانے والوں میں سے دو گروہ باہم قتال کریں تو تم دونوں کے درمیان اے مسلمانو اصلاح کرو۔ پس اگر ان میں سے کوئی ایک (صحیح رستہ پر نہ آئے) اور دوسرے گروہ کے مقابلہ میں بغاوت کرے تو تم سب گروہ باغی سے قتال کرو تاآنکہ وہ باغی گروہ حکم خدا کی طرف جھکے۔ پس اگر وہ باغی جھک گیا تو تم دونوں کے درمیان صلح و صفائی کرادو۔ اور انصاف سے کام لو۔ اللہ انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے''۔

اس آیت میں نبیؐ سے خطاب نہیں ہے بلکہ عام مسلمانوں سے ہے۔ صرف نبیؐ سے خطاب ہوتا تو اصلح کہا جاتا۔ اس سے ظاہر ہے کہ ایمان کے دعوے داروں کا اس درجہ سرکش ہو جانا کہ اس گروہِ باغی سے قتال عام مسلمانوں کا فرض ہو جائے اور باقاعدہ قتال کا بازار گرم ہو جائے اتنا سنگین واقعہ نبیؐ کی موجودگی میں نہیں بلکہ حضورؐ کے بعد ہی رونما ہو سکتا ہے۔ اب اندازہ لگایئے کہ جس گروہ کو اللہ تعالیٰ باغی قرار دے دے اور اس گروہ باغی کے قتل عام کا حکم دے دے کیا یہ گروہ واقعاً مومن ہو سکتا ہے ؟ اور اللہ قتل مومنین کا حکم دے سکتا ہے ؟ ہرگز نہیں۔ لیکن اللہ نے وان طائفتان من المومنین اقتتلوا کہہ کر اس باغی گروہ' مستوجب قتل کو بھی مومن کہا اور جس گروہ پر یہ بغاوت ہو رہی ہے اس کو بھی مومن کہا۔ جب گروہ باغی جو مستوجب قتل ہو مومن نہیں ہو سکتا تو پھر قرآن کریم نے اس کو مومن کیوں کہا؟ صرف اس لئے کہ وہ ایمان ظاہر کرتا ہے اور اپنے آپ کو مومن کہتا ہے۔ حالانکہ اس کے دل میں نورِ ایمان نہیں۔ لہذا آیات سے ثابت ہو رہا ہے کہ منافقین کو بھی قرآن کریم نے نظر بر ظاہر مومن کہا

ہے۔ آیت مذکورہ میں جس قتال اور بغاوت کا ذکر ہے یہ بے وجہ تو نہیں۔ یہ ہونے والی بات کب ہوئی۔ جمل، صفین، نہروان کی جن جنگوں کو آپ افسانہ بتاتے ہیں ان کی طرف قرآنِ کریم خود اشارہ کر رہا ہے۔

معترضین نے پوری کوشش کی ہے کہ منافقین کا لفظ تک کسی نگاہ میں نہ آئے۔ انہوں نے منافقین پر پردہ ڈالنے کا ایک اور طریقہ اختیار کیا اور یہ کہنے لگے کہ نبیؐ نے اپنی زندگی ہی میں تمام منافقین کا صفایا کر دیا تھا اور وفاتِ رسولؐ کے وقت جماعت صحابہ میں کوئی بھی منافق باقی نہیں تھا۔ آنحضورؐ نے اپنی زندگی میں جس طرح حکم خداوندی کے مطابق کافروں کا خاتمہ کر دیا تھا یعنی یا تو وہ ملک چھوڑ کر چلے گئے یا مومن ہو گئے اور یا ذمی بن کر دائیں ہاتھ سے جزیہ ادا کرتے رہے۔ ان کے قول کے مطابق قلمرو مصطفویؐ سے ایک ایک منافق کو چن چن کر ختم کر دیا گیا تھا۔

غرض کہ انہوں نے پہلے تو منافقین کا وجود ہی نہیں مانا جب اس میں کامیابی نہ دیکھی تو یہ نیا راستہ بنایا کہ منافقین تھے تو مگر ان کا خاتمہ کر دیا گیا تھا۔ منافقین دس، بیس، پچاس اور سو تو نہ تھے ان کی جماعت بڑی زبردست جماعت تھی جس میں اضافہ ہوتا چلا گیا تھا۔ یہاں تک کہ غلبہ اسلام سے بے بس ہو کر آخر میں ایک اور پوری جماعت اپنی جانوں کے بچانے کے لئے اسی صف میں داخل ہو گئی۔ اتنی بڑی جماعت کا قتلِ عام یوں تو نہیں ہو سکتا تھا کہ سب کو بلا کر کہہ دیا جائے کہ جھکاؤ گردن ماریں تلوار، انہوں نے حکم ہوتے ہی گردنیں جھکا لیں اور وہ لگے کٹنے۔ ایسے فرماں بردار ہوتے تو منافقین ہی کیوں ہوتے۔ اگر ایسے فرماں بردار ہوتے تو حکمِ نبیؐ کی مخالفت کر کے پہاڑ کی گھاٹی سے کیوں اترتے اور میدان سے رسولؐ کو پکارتا دیکھ کر کیسے چلے جاتے اور کیونکر ایسی لمبی تانتے کہ تین روز کے بعد پلٹتے۔ یہ لوگ یوں تو خوشی سے جانیں دینے والے نہ تھے۔ ان کا قتلِ عام باہمی شدید قتال اور خون ریز جنگ کے بغیر تو ہو نہیں سکتا تھا۔ اگر وہ مارے جاتے تو اس طرف کے بھی ان کے ہاتھ سے مارے جاتے اور جنگ کا ایک میدان تو فیصلہ کُن نہیں ہو سکتا تھا۔ میدان سے بھاگ جانے کے یہ دیرینہ مشاق تھے۔

مغلوب ہوتے تو کیا آج میدان ہی میں کھڑے رہتے۔ کوئی پناہ کی جگہ نہ ڈھونڈتے؟ آج بھاگ کر کل پھر سنبھل کر مقابلہ نہ کرتے۔ اسی طرح نہ معلوم کتنے معرکے پیش آتے۔ ہمارے معترضین تو اُحد اور حنین سے بھاگنے والوں کو پکا سچا مومن بلکہ اصحاب تک بتا رہے ہیں تو جب ان کے نزدیک سچے مومن بھی جن کی روک ٹوک کے لیے سر پر رسولؐ موجود ہیں جنگ سے بھاگ سکتے ہیں تو یہ لوگ تو بے شبہ تھے ہی منافق۔ جنگ سے بھاگنے میں ان کو اپنے کون سے ایمان کے رخصت ہونے کا ڈر تھا۔ اگر عہدِ نبیؐ میں منافقین سے جنگ پر جنگ ہوئی ہوتی اور ان کا بار بار قتل عام ہوا ہوتا تو دنیائے اسلام اس کو حرفِ غلط کی طرح کیسے مٹا دیتی اور کیسے مٹا سکتی۔ ایسے عظیم واقعہ کو عالمِ اسلام کیوں فراموش کرتا اور کیسے فراموش کر سکتا تھا۔ کوئی قلم تو لکھتا' کوئی کتاب تو بتاتی' کوئی زبان تو کہتی۔ سب کو نہیں تو بعض کو تو یاد رہتا کہ کس زمانہ میں یہ واقعہ ہوا۔ کس جگہ ہوا' کس طرح ہوا۔ یہ ذکر میں آتا۔ انہوں نے یہ تک نہ سوچا کہ جس عہد میں کفار سے جنگ پر جنگ ہو رہی تھی اگر اس ہی سلسلہ میں مومنین اور منافقین کی جنگ چھڑ جاتی تو یہ جنگ تنہا منافقین سے کیسے رہ سکتی تھی۔ اس جنگ میں منافقین کا ساتھ خوش ہو کر کفار نہ دیتے اور کفار کا ساتھ منافقین نہ دیتے۔ یہ دونوں ایک تو تھے ہی ایک ہو کر نہ لڑتے۔ جب وفاتِ نبیؐ کے وقت ایک بھی منافق باقی نہ تھا تو قتالِ منافقین کے واقعہ کو چھپاتا کون؟ وفاتِ نبیؐ کے وقت مجمع خالص مومنین کا مگر حق بات کوئی نہیں کہتا۔ تو پھر یہ بات تو نہ بنی کہ نبیؐ کی وفات کے وقت کوئی منافق باقی نہ تھا۔ 1914ء کی جنگ کوئی اسلامی اور دینی جنگ نہ تھی لیکن اگر آج کوئی کہے کہ جنگِ عظیم ہوئی ہی نہیں محض افسانہ ہے تو ہر مسلمان کہے گا کہ جھوٹ ہے' جھوٹ ہے۔ جنگ ضرور ہوئی تھی۔ اگر منافقین سے بہ حکمِ خدا قتال ہوا ہوتا تو اس قتال سے اگر کوئی انکار بھی کرتا تو ہر مسلمان شور مچا دیتا کہ جھوٹ ہے۔ دینی جنگ سے انکار کرنا دین سے انکار ہے۔ منافقین تو رہے الگ' خاتمہ تو کفار کا بھی نہ ہوا تھا۔ نبیؐ آخر دم تک کفار سے جہاد فرماتے رہے۔ آخری بیماری میں بھی جیشِ اسامہ کو علم دار بنا کر کفار سے لڑنے کے لیے بھیجنا چاہتے رہے اور

لشکرِ اسلام کی روانگی کا حکم دیتے رہے۔ اکابر صحابہ کو اسامہ بن زید کی ماتحتی میں جانے کا حکم دیتے رہے مگر مسلمانوں کی اکثریت نے سرکار کی بیماری کی شدت دیکھ کر مدینے سے اپنی روانگی کو مناسب نہ سمجھا یہ لوگ سمجھ گئے تھے کہ نبیؐ کی یہ بیماری خطرناک ہے۔ خدا جانے کس وقت وفات ہو جائے۔ غرضیکہ لشکر والے کچھ مدینے میں ہی تھے۔ کچھ مدینے کے باہر کچھ دور گئے تھے کہ آنحضورؐ کی وفات ہو گئی۔ اگر ان لوگوں کا مدینہ میں رہنے کا خواہشمند ہونا اور نبیؐ کی اس خطرناک حالت میں ان کا سفر کو گوارا نہ کرنا۔ اس عقیدت و محبت کی بنا پر تھا کہ نبیؐ کے آخر وقت میں ہم نبیؐ کو کیسے چھوڑ دیں۔ نبیؐ کی شرکت جنازہ سے ہم کیوں محروم رہیں تو یہ پہلو شرعاً کیسا ہی ہو مگر فطرۃً بُرا نہیں لیکن حقیقتاً اس التوا سفر کا سبب کیا نبیؐ کے جنازہ اور دفن میں شرکت کی آرزو تھی یا کوئی دوسری مصلحت تھی۔ یہ واقعات مابعد سے پوچھیے یا نبیؐ کے جنازے سے پوچھیے۔ غرضیکہ وفات کے وقت منافقین تو جُوں کے تُوں سب ہی موجود تھے۔ کفار کا بھی خاتمہ نہ ہوا تھا نہ کفار کو ختم کرنے کا کوئی حکم خدا آیا تھا۔ انہوں نے کفار کے خاتمہ کے ثبوت میں آیتِ قرآنی کا ذکر کیا ہے یعنی قاتلوا الذین لایومنون باللہ ولاباليوم الاخر۔ (پارہ 10، سورہ توبہ) لیکن یہ نہ دیکھا کہ حکمِ قتال صرف ان مشرکین اور اہلِ کتاب سے ہے جنہوں نے نقضِ عہد کیا تھا اور معاہدہ کے خلاف مسلمانوں کو قتل کیا تھا جس کا ذکر آغاز آیت میں تفصیل سے آچکا ہے ورنہ جن کفار نے اپنے عہد کو نہ توڑا تھا ان کو حکمِ قتال سے مستثنیٰ رکھا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا جاتا ہے: ''الاّ الذین عاھدتم عندالمسجد الحرام فما استقاموا لکم فاستقیموا لھم ان اللہ یحب المتقین'' (پارہ 10، سورہ توبہ، آیت 7)۔ مشرکین جو اپنے عہد کے پابند نہ رہے ان کے لیے اللہ کے نزدیک بھی کوئی عہد باقی نہیں سوائے ان کے جن سے تم نے المسجد الحرام کے نزدیک عہد کیا ہے پس جب تک وہ اپنے عہد پر قائم رہیں تم بھی اپنے عہد پر قائم رہو اللہ متقین کو درست رکھتا ہے۔ منافقین کے خاتمہ کے ثبوت میں دو آیات قرآنی پیش کی جاتی ہیں :

ا۔ ”یا ایھاالنبی جاھدالکفّار والمنافقین واغلظ علیھم وماوٰھم جھنم وبئس المصیر“ (پارہ 10 ‘سورہ توبہ ‘آیت 73 اور پارہ 28 ‘سورہ تحریم ‘آیت ۹)۔ اے نبیؐ کفار و منافقین پر سختی کرو اور ان کو سختی سے دباؤ۔ ان کا ٹھکانہ جہنم ہے جو بری جگہ ہے۔ یہ ایک آیت ہے جو دو جگہ آئی ہے۔

وہ حضرات آیت مذکور سے لفظ جاہد دکھا کر یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ نبیؐ کو حکم ہوا کہ تم کفار سے اور منافقین سے قتال کرو۔ لہٰذا انہوں نے حکمِ خدا کی تعمیل کی اور کفار و منافقین کو ختم کر دیا۔ یہ بات درست نہیں انہوں نے اسلامی جہاد کے فلسفہ قرآنی کو یا تو سمجھا ہی نہیں ہے یا دیدہ و دانستہ تجاہل کر رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے کفار سے بھی قتال کی اجازت نہیں دی جب تک وہ جنگ میں پہل نہ کریں:

جس قتال کو ہمارے معترضین اتنا سہل سمجھ رہے ہیں کہ ہر کافر و منافق کو صرف اس بناء پر کہ وہ کافر ہے یا منافق قتل کر دیا جائے قرآن اس کے سراسر خلاف ہے۔ قرآن کا اعلان عام ہے کہ ”لا اکراہ فی الدّین“ (پارہ 3 ‘آیت الکرسی)۔ دین کے لیے کسی کو مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ ”انا ھدیناہ السبیل اما شاکرا واما کفورا“ (پارہ 29 ‘سورہ دھر ‘آیت 3)۔ ہم نے راستہ دکھا دیا چاہے کوئی شاکر ہو جائے یا کافر رہے۔ ”من شاء فلیئومن ومن شاء فلیکفر“ (پارہ 15 ‘سورہ کہف ‘آیت 29)۔ جو چاہے وہ مومن ہو جائے چاہے وہ کافر ہو۔ ”لست علیھم بمصیطر“ (پارہ 3 ‘سورہ غاشیہ ‘آیت 22)۔ اے رسولؐ تم ان پر داروغہ نہیں جو ڈنڈے مار مار کر مومن بناؤ۔ سب سے پہلے اہلِ اسلام کو جو اذنِ قتال ملتا ہے اس کے الفاظ قرآنی کو دیکھیے: ”اذن للّذین یقاتلون بانّھم ظلموا وانّ اللّٰہ علیٰ نصرھم لقدیر“ (پارہ 17 ‘سورہ حج ‘آیت 39)۔ قتال کی اجازت دی جا رہی ہے ان کو جن سے قتال کیا جا رہا ہے۔ اس وجہ سے کہ ان پر ظلم کیا جا رہا ہے اور یقیناً اللہ ان کی مدد پر قادر ہے۔ قتال

کا یہ حکم ابتدائی اور بنیادی ہے جس میں قتال کی اجازت اس شرط پر دی جارہی ہے کہ قتال کی پہل کفار سے ہو تو تم بھی ان سے قتال کرو پھر دوسری جگہ فرمایا جاتا ہے۔ ”قاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم“ (پارہ 2' سورہ بقرہ' آیت 190)۔ ان سے قتال کرو جو تم سے قتال کریں۔ کیا قرآنِ کریم کی آیاتِ صریحہ یہ نہیں بتارہی ہیں کہ محض کسی کا کافر یا منافق ہونا قتال کے لیے وجہ جواز نہیں ہے۔ جواز اس وقت ہو گا جبکہ وہ قتال کریں دوسروں کے لیے تو میں کچھ نہیں کہنا چاہتا لیکن نبی اور امام کا قتال جب بھی ہو گا ان ہی لوگوں سے ہو گا جو قتال میں پہل کریں۔ جو لوگ کسی امام کے بارے میں بھی یہ سوال کرتے ہیں کہ امامت ان کا حق تھا تو منکرین امامت پر انہوں نے تلوار کیوں نہ اٹھائی وہ آیاتِ قرآن میں اس کی وجہ ملاحظہ فرمالیں۔ نبی اور امام سے جب تک قتال نہ کیا جائے وہ محض انکار نبوت و امامت پر کسی سے قتال نہیں کرتے لیکن جب ان سے قتال کیا جائے گا تو پھر ان کا ہاتھ نہ رکے گا۔ مقابلہ پر کوئی بھی ہو۔ خدا کی خدائی' نبی کی نبوت' امام کی امامت بزور شمشیر نہیں منوائی جاتی اور اگر کسی کو بزور اور جبر منواتا دیکھیں تو سمجھ لیں کہ وہ اللہ کی طرف سے نہیں ہے۔ چونکہ عہدِ نبیؐ میں منافقین نے کبھی قتال کیا ہی نہیں اس لیے نبیؐ خلاف حکم خدا ان سے کیسے قتال کر سکتے تھے اور یہ بات ہر بے عقل بھی سمجھ سکتا ہے کہ منافق تو کہتے ہی اس کو ہیں جو اپنے کفر کو چھپائے ہوئے ہو لہذا منافق سے یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ عہدِ نبیؐ میں نبیؐ سے قتال کر کے اپنے چھپے ہوئے عقیدۂ انکار نبوت کو طشت ازبام کر دے۔ وہ تو نبیؐ کے بعد بھی جب وارثِ نبیؐ سے قتال کرے گا تو اس وقت بھی اپنے انکارِ نبوت کو ظاہر نہ ہونے دے گا لہذا نہ منافقین نے نبیؐ سے قتال کیا نہ نبیؐ نے ان سے کوئی جوابی قتال کیا۔ نبیؐ فتوحات کی غرض سے قتال کرنے والے نہ تھے نہ محض اپنی نبوت کے انکار پر کسی کو قتل کرنے والے تھے۔ وہ الٰہی قانون پر عامل تھے اور دوسروں کو عامل بنانا چاہتے تھے۔ جو خود قانون کو پس پشت ڈال دے وہ دوسروں کو قانون پر کیا چلا سکتا ہے؟

معترضین نے آیت یا ایها النبي جاهد الكفار والمنافقين واغلظ

علیھم (پارہ 10' سورہ توبہ' آیت 73۔ پارہ 28' سورہ تحریم' آیت 9) کے سمجھنے اور سمجھانے میں یہ غلطی فرمائی ہے کہ وہ لفظ جہاد اور لفظ قتال کو مرادف اور بالکل ہم معنی سمجھ رہے ہیں۔ یہ غلط ہے۔ ہر جہاد قتال نہیں ہے بلکہ قتال صرف ایک قسم ہے جہاد کی۔ جہاد کے اقسام ہیں جو قتال کے علاوہ بھی ہیں۔ منطقی اعتبار سے یہ ہے کہ ہر قتال جہاد ہے لیکن ہر جہاد قتال نہیں ہے جیسے ہر انسان حیوان ہے لیکن ہر حیوان انسان نہیں ہے جہاد عام ہے اور قتال اس کی ایک خاص قسم ہے۔ محنت و مشقت برداشت کرنا بھی جہاد ہے۔ کوشش بلیغ کرنا بھی جہاد ہے کسی پر سختی اور تشدد کرنا بھی جہاد ہے اور قتال کرنا بھی جہاد ہے۔ جو کام انسان بلیغ کوشش اور جانفشانی سے کرتا ہے اس کو کہا جاتا ہے کہ اس نے بڑا جہاد کیا ہے لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا کہ بڑا قتال کیا ہے؟ چنانچہ والدین کے بارے میں فرمایا جاتا ہے "وان جاھدك لتشرك بی مالیس لك به علم فلا تطعھما" (پارہ 20' سورہ عنکبوت' آیت 8)۔ اگر تیرے والدین تجھ پر یہ سختی کریں کہ تو شرک اختیار کرے تو ان کی اطاعت نہ کر۔ یہاں لفظ جہاد موجود ہے مگر اس کے معنی قتال کے ہرگز نہیں۔ جہاد بالقلم بھی ہے جہاد باللسان بھی ہے۔ جہاد بالمال بھی ہے اور جہاد بالسیف بھی ہے۔ لیکن قتال بالقلم' باللسان' بالمال نہیں جس طرح وان جاھداك لتشرك میں جہاد سختی کرنے کے معنی میں آیا ہے بالکل اسی طرح جاھد الکفار والمنافقین میں جہاد سختی کرنے کے معنی میں آیا ہے جس کے معنی ہیں کہ اے نبیؐ کفار اور منافقین کو سختی سے دباؤ کہ وہ شتر بے مہار ہو کر تبلیغ دین میں روڑے نہ اٹکائیں اور امن میں خلل انداز نہ ہوں۔ ورنہ قتال کی شرط قرآن کریم نے جابجا یہ بیان کر ہی دی ہے کہ جب قتال میں کوئی پہل کرے اس وقت قتال کیا جائے۔ جو قتال کرے اس سے قتال کرو جو قتال نہ کرے اس سے قتال نہ کرو۔ یہاں نکتہ رس حضرات کے لیے ایک نکتہ بیان کیا جاتا ہے۔ دنیائے اسلام کو معلوم ہے کہ نبیؐ غزوات میں تشریف لے جاتے تھے۔ شمشیر بکف بھی رہتے تھے لیکن چونکہ آپ نبی رحمتؐ تھے خود سے آنحضور کسی کافر کے مقابلہ میں نہیں آئے نہ کسی سے نبرد آزما ہوئے لہذا قتال آپ کا کام

نہ تھا۔ یہ کارِ اُمت تھا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے سوائے ایک بدرِ صغریٰ کے موقع کے (جبکہ مسلمان قتال سے ہچکچا رہے تھے مسلمانوں کو غیرت دلانے کے لیے تنہا نبیؑ کو حکمِ قتال دیا لیکن مسلمانوں کو غیرت آئی اور نبیؑ کے تنہا قتال کرنے کی نوبت نہیں آئی) ہر جگہ عموماً حکمِ قتال 'اذنِ قتال' مدحِ قتال صیغہ جمع میں بیان فرمایا ہے۔ صرف نبیؑ سے خطاب کر کے صیغہ واحد میں قاتل 'اُقتل' نہیں فرمایا۔ ہم چند مثالیں پیش کرتے ہیں :۔

۱۔ اُذن للذین یقاتلونo (پارہ 7' سورہ حج' آیت 39)۔ قتال کی اجازت دی جارہی ہے ان لوگوں کو جن سے قتال کیا جارہا ہے۔ صیغہ جمع ہے۔ یہ نہیں کہ نبیؑ کو اجازت ہے جس سے کہ قتال کیا جارہا ہے۔

۲۔ فقاتلوا ائمّة الکفرo (پارہ 10' سورہ توبہ' آیت 12)۔ تم لوگ کفر کے سرداروں سے قتال کرو۔ صیغہ جمع میں حکم ہے۔ یہ نہیں کہ اے نبیؑ تم کفار کے سرداروں سے قتال کرو۔

۳۔ فاقتلوا المشرکین حیث وجدتموھمo (پارہ 10' سورہ توبہ' آیت 5)۔ تم لوگ مشرکین کو جہاں پاؤ قتل کرو۔ صیغہ جمع میں حکم ہے۔ یہ نہیں ہے کہ اے نبیؑ تم مشرکین کو قتل کرو۔

۴۔ قاتلوا الذین لایومنون باللّٰہo (پارہ 10' سورہ توبہ' آیت 29)۔ تم لوگ قتال کرو اللہ کے نہ ماننے والوں سے۔ صغیہ جمع میں حکم ہے۔ یہ نہیں کہ اے نبیؑ تم مشرکین کو قتل کرو۔

۵۔ قاتلوا المشرکین کافة کما یقاتلونکم کافةo (پارہ ۱۰' سورہ توبہ' آیت 36)۔ تم سب مل کر مشرکین سے قتال کرو۔ جیسے وہ مل کر تم سے قتال کرتے ہیں۔ وہی صیغہ جمع میں حکم ہے۔

۶۔ ان اللّٰہ اشتریٰ من المومنین انفسھم واموالھم بانّ لھم الجنّة یقاتلون فی سبیل اللّٰہ فیقتلون ویقتلونo (پارہ 10' سورہ توبہ' آیت 111)۔ مومنین جن کے جان و مال کو اللہ نے خرید اوہ راہِ خدا میں قتال کرتے ہیں۔ وہ قتل

کرتے ہیں اور قتل کر دیے جاتے ہیں۔ سب جمع کے صیغے ہیں۔

۷۔ ان اللّٰہ یحبّ الّذین یقاتلون فی سبیلہ صفاًo (پارہ 28' سورہ صف' آیت 4)۔ اللہ محبت رکھتا ان سے جو اس کی راہ میں پرا باندھ کر ثابت قدمی سے قتال کرتے ہیں۔ وہی جمع کا صیغہ ہے۔

۸۔ یا ایھا الذین آمنوا قاتلوا الذین یلونکم من الکفارo (پارہ 10' سورہ توبہ' آیت 123)۔ اے ایمان والو ان کفار سے قتال کرو جو (چڑھ کر) تمہارے پاس پہنچ جائیں۔

۹۔ وقاتلوا فی سبیل اللّٰہ الذین یقاتلونکم ولا تعتدواo (پارہ 2' سورہ بقرہ' آیت 190)۔ اور تم لوگ اللہ کی راہ میں ان سے قتال کرو جو تم سے قتال کریں اور تم (اپنی طرف سے پہل کر کے) زیادتی نہ کرو۔

۱۰۔ واقتلوھم حیث ثقفتموھمo (پارہ 2' سورہ بقرہ' آیت 191)۔ تم لوگ ان کو جہاں پاؤ قتل کرو۔

۱۱۔ ولا تقاتلوھم عند المسجد الحرام حتی یقاتلوکم فیہ فان قاتلوکم فاقتلوھمo (پارہ 2' سورہ بقرہ' آیت 191)۔ تم لوگ کفار سے مسجد الحرام کے قریب قتال نہ کرو جب تک کہ وہ حرم میں تم سے قتال نہ کریں اگر وہ تم سے قتال کریں تو پھر تم بھی بے شک ان کو قتل کرو۔ امر و نہی کے سب صیغے جمع کے ہیں۔

آیاتِ قرآنیہ کی مثالیں صاف بتا رہی ہیں کہ قتال بہ نفسِ نفیس نبیؐ کا کام نہیں بلکہ مجموعی امت کا فرض ہے لہٰذا اگر یا ایھا النبی جاھد الکفار والمنافقین (پارہ 10' سورہ توبہ) میں جہاد سے مراد قتال ہوتا تو یہ حکم بھی عام افرادِ امت کے نام صیغہ جمع میں ہوتا لیکن اس آیت میں تنہا نبیؐ کو پکارا گیا ہے اور تنہا نبیؐ سے جاھد "جہاد کرو" کہا جا رہا ہے۔ جاہدوا جمع حاضر کا صیغہ نہیں ہے۔ بلکہ جاھِد واحد امر حاضر کا صیغہ ہے۔ یہ حکم تنہا نبیؐ کو دیا جا رہا ہے۔ یہ قتال کا حکم نہیں ہے بلکہ کوشش اور سختی سے کفار اور

منافقین کو دبانے کا حکم دیا گیا ہے۔ لہذا نبیؐ نے منافقین سے کوئی قتال نہیں کیا کیونکہ منافقین نے کوئی قتال کیا ہی نہ تھا نہ منافقین کو یہ موقع تھا کہ وہ نبیؐ سے یا مسلمانوں سے کوئی قتال کر کے اپنے مخفی نفاق کو آشکارا کر دیں۔ اب رہے کفار، نبیؐ نے ان سے بھی کبھی کوئی قتال نہیں کیا۔ جب تک کفار نے قتال میں سبقت نہیں کی۔

اب دوسری آیت دیکھیے جس کو معترضین نے پیش کر کے منافقین کا عہدِ پیغمبرؐ میں ختم ہو جانا دکھایا ہے۔

"لئن لم ینته المنافقون والّذین فی قلوبهم مرضٌ والمرجفون فی المدینة لنغرینّك بهم ثمّ لا یجاورونك فیها الا قلیلاo مّلعونین اینما ثقفوا اُخذوا وقتّلوا تقتیلاًo سنّة اللّٰه فی الّذین خلوا من قبل ولن تجد لسنّة اللّٰه تبدیلاً" (پارہ 22، سورہ احزاب، آیت 60، 61، 62)

(ترجمہ) اگر منافقین اور مدینہ میں غلط خبریں پھیلانے والے اور وہ لوگ جن کے دلوں میں بیماری ہے باز نہ آئے تو ہم اے نبیؐ تم کو ان کے پیچھے لگا دیں گے۔ پھر وہ تمہارے پاس پڑوس زیادہ نہ رہنے پائیں گے۔ یہ پھٹکارے مارے جہاں جائیں گے پکڑے جائیں گے اور اچھی طرح قتل کیے جائیں گے۔ یہ وہ اللہ کی سنت ہے جو پہلے لوگوں کے بارے میں بھی رہی ہے اور اللہ کی سنت کبھی نہ بدلے گی"۔

ہمارے معترض نے اس آیت سے یہ دکھایا ہے کہ خداوندِ عالم نے اپنے نبیؐ کو حکم دے دیا کہ یہ منافق اگر مومن نہ ہوں اور اپنی منافقت کو نہ چھوڑیں تو تم ان کو قتل کر دو چونکہ ان کے نزدیک اللہ کا یہ حکم آگیا تھا لہذا رسولؐ نے تمام منافقین کو قتل کر دیا اور کوئی ایک منافق بھی باقی نہ رہا حالانکہ یہ بالکل غلط ہے کہ منافقین کو صرف اس جرم میں کہ وہ منافق کیوں ہیں مومن کیوں نہیں ہوتے، قتل کر دو۔ دین کے بارے میں کسی پر کوئی جبر نہیں ہے۔ کافر ہو یا منافق ہم دکھا چکے ہیں کہ جب تک یہ قتال نہ کریں ان کو

کافر یا منافق ہونے کی بنا پر قتل نہیں کیا جا سکتا۔ اب میں اس آیت کا صحیح مقام دکھاتا ہوں۔ آیت میں یہ لفظ ہے کہ اگر منافقین وغیرہ باز نہ آئے تو اے نبیؐ ہم تم کو ان کے پیچھے لگا دیں گے۔ یہاں دو چیزوں کو دیکھنا ہے۔ ایک یہ کہ منافقین کا ہے سے اور کس بات سے باز نہ آئے؟ دوسرے یہ کہ ہم اے نبیؐ تم کو ان کے پیچھے لگا دیں گے پھر وہ تمہارے پاس نہ رہ سکیں گے۔ یہاں پیچھے لگا دینے سے اور تمہارے پاس نہ رہ سکنے سے کیا مطلب ہے؟

واقعہ یہ ہے کہ یہ منافقین وغیر ہم مسلمان مستورات سے جبکہ وہ رفع حاجت وغیرہ کے لیے باہر نکلتی تھیں چھیڑ خانی کرتے تھے اور ان پر فقرے کستے تھے۔ ان کی بے دینی اور منافقت کو تو برداشت کیا جا سکتا تھا لیکن یہ طرزِ عمل لائق برداشت نہ تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ سے فرمایا کہ یہ منافقین وغیر ہم اگر اپنے حرکات سے باز نہ آئے تو ہم تم کو ان کے پیچھے لگا دیں گے پھر یہ تمہاے قرب وجوار میں نہ رہنے پائیں گے۔ یعنی ہم تم کو حکم دے دیں گے کہ ان کو مسلمان آبادیوں سے نکال دو اور شہر بدر کر دو۔ یہ مسلمان آبادیوں سے (نکالے جانے کے بعد) جہاں کہیں پائے جائیں گے پکڑے جائیں گے اور قتل کیے جائیں گے۔ یہ شہر بدر کرنے اور نکال باہر کیے جانے کی وہ سنتِ الٰہی ہے جو پہلے بھی رہی ہے اور آئندہ بھی رہے گی۔ میرے پاس قرآنِ کریم مترجم ترجمہ اردو از امام المحدثین مقتداء المفسرین شاہ رفیع الدین صاحب و موضح القرآن از حضرت شاہ عبدالقادر صاحب موجود ہے جس کو شیخ برکت علی غلام علی تاجر کتب لاہور نے چھاپا ہے۔ اس آیت کے بارہ میں تحریر فرماتے ہیں:۔

> ”جو لوگ بد نیت تھے۔ مدینے میں عورتوں کو چھیڑتے‘ ٹوکتے اور جھوٹی خبریں اڑاتے تھے‘ مخالفوں کے زور کی اور مسلمانوں کے بیچ کی‘ ان کو یہ فرمایا اور تورات میں بھی تقلید ہے کہ مفسدوں کو اپنے بیچ میں سے باہر کرو“۔

آیتِ مذکورہ ”لئن لم ینتہ المنافقون“ سے ملی ہوئی پہلے کی آیت خود بھی

اس چیز کو صاف کر رہی ہے کہ ان لوگوں کی مستورات سے چھیڑ خانی کرنے پر یہ آیت آئی ہے۔وہ یہ ہے:

"یا ایها النبی قل لا زواجك وبناتك ونساء المومنین یدنین علیهن من جلابیبهن ط ذالك ادنیٰ ان یعرفن فلایوذین وكان الله غفوراً رّحیماًoلئن لم ینته المنافقون والذین فی قلوبهم مرض والمرجفون فی المدینة لنغرینك"
(پارہ نمبر22 'سورہ احزاب' آیت59'60)

(ترجمہ) اے نبیؐ اپنی ازواج سے اور اپنی بیٹی نواسیوں سے اور مومنین کی مستورات سے کہہ دیجیے کہ وہ اپنی بڑی چادریں اپنے آپ سے ملائے رکھیں۔اس طرح ان کی پہچان ہوتی رہے گی (کہ یہ شریف ہیں آوارہ نہیں ہیں) پھر ان کو نہ ستایا جائے گا (گزشتہ کے لیے) اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔ ہاں اگر منافقین وغیرہم (اب بھی) باز نہ آئیں گے تو اے نبیؐ ہم تم کو ان کے پیچھے لگا دیں گے۔ پھر وہ تمہارے قرب وجوار میں زیادہ نہ رہنے پائیں گے۔ یہ پھٹکار مارے (مسلمانوں کی آبادی میں) جہاں پائے جائیں گے پکڑے جائیں گے اور اچھی طرح قتل کر دیئے جائیں گے کہ ممنوعہ علاقہ میں کیوں داخل ہوئے۔ یہی شہر بدر کرنے کا ہمارا وہ قانون ہے جو پہلے زمانہ میں تھا اور ہمیشہ رہے گا"۔

یہ ہے مذکورہ آیت کا صحیح نقشہ جس کو ہمارے معترض نے مشق ستم کر کے کچھ سے کچھ بنا دیا۔ ورنہ منافقین کو قتل کیا گیا نہ کہیں ان کی صفائی ہوئی۔ ہم نے آیہ قل لازواجك وبناتك کے ترجمہ میں بیٹی ' نواسیاں ازروئے قرآن لکھا ہے کیونکہ مسلمانوں کا بلا کسی اختلاف کے اس پر اجماع ہے کہ انسان پر بیٹی 'پوتی 'نواسی ' پرپوتی ' پرنواسی سب حرام ہیں۔ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ خود اپنی بیٹیاں حرام ہیں مگر بیٹی یا بیٹے

کی بیٹی حرام نہیں ہیں۔ قرآنِ کریم نے بیٹی 'پوتی 'نواسی' پر پوتی اور پر نواسی اور آئندہ تمام نسلوں کو سب کو بنات کہا ہے حرّمت علیکم امھاتکم وبناتکم (پارہ 4' سورہ نساء' آیت 23)۔ پوتی 'نواسی اور ان کی نسل سے پیدا ہونے والیوں کو بنات کے سوا اور کسی لفظ سے تعبیر نہیں کیا۔ چونکہ یہ حکم خدا کہ رسولؐ اپنی ازواج' بنات اور زنانِ مومنین سے کہہ دو' صرف آیت کے نزول ہی کے وقت کے لیے نہیں ہے بلکہ ہمیشہ کے لیے ہے۔ یہ حکم ان ازواج کے لیے بھی ہے جو اس وقت تھیں اور ان کے لیے بھی ہے جو آئندہ زوجیت میں آئیں۔ اس بیٹی کے لیے بھی ہے جو اس وقت تھی اور بالغہ تھی اور ان نواسیوں کے لیے بھی ہے جو آئندہ سن تمیز کو پہنچیں یا قیامت تک نبویؐ نسل سے پیدا ہوں۔ ان زنانِ مومنین کے لیے بھی ہے جو اس وقت موجود تھیں اور بڑی تھیں اور ان زنانِ مومنین کے لیے بھی ہے جو ابھی چھوٹی ہیں آئندہ بڑی ہوں گی یا پیدا ہوں گی۔ جو لوگ اس آیت کے لفظ بنات سے نبیؐ کی کئی بیٹیاں ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ اس کو غور سے پڑھیں اور وہ حضرات یا تو یہ کہہ دیں کہ دادا اپنی پوتی سے اور نانا اپنی نواسی سے نکاح کر سکتا ہے یا یہ دکھائیں کہ پوتی 'نواسی کا حرام ہونا قرآن کریم نے بنات کے علاوہ کسی اور لفظ میں بیان کیا ہے۔ اسی طرح جو لوگ امام حسنؑ اور امام حسینؑ کے ابناء رسولؐ (فرزندانِ رسولؐ) ہونے سے انکار کرنا چاہتے ہیں وہ حضرات یا تو یہ کہہ دیں کہ نانا اپنے نواسہ کی زوجہ سے نکاح کر سکتا ہے یا یہ دکھائیں کہ قرآنِ کریم نے نواسہ کی زوجہ کا حرام ہونا وحلائل ابنائکم الذین من اصلابکم (پارہ 4' سورہ نساء' آیت 23) اور حرام ہیں تم پر تمہارے ان بیٹوں کی بی بیاں جو تمہارے اصلاب سے ہوں) کے علاوہ کسی اور لفظ میں بیان کیا ہے۔ آنحضورؐ پر امام حسنؑ اور امام حسینؑ کی بیٹیاں اسی لیے تو حرام ہیں کہ وہ بھی بناتِ رسولؐ ہیں تو جب حسنؑ و حسینؑ کی بیٹی رسولؐ کی بیٹی ہے تو حسنؑ و حسینؑ رسولؐ کے بیٹے نہ ہوئے؟ اسی طرح امام حسنؑ اور امام حسینؑ کی ازواج آنحضورؐ پر اس ہی لیے تو حرام ہیں کہ وہ ازروئے قرآن حلائل ابنائکم ابناء رسولؐ کی ازواج ہیں۔ یاد رکھیے کہ امام حسنؑ اور امام حسینؑ تو کیوں نہ ابناء رسولؐ ہوتے

قرآنِ مجید تو فاطمہ زہراؑ کی نسل سے قیامت تک پیدا ہونے والے مردوں کو ابناء رسولؐ کہہ رہا ہے اور قیامت تک پیدا ہونے والی عورتوں کو بناتِ رسولؐ کہہ رہا ہے۔ البتہ ساداتِ اور امام حسنؑ و حسینؑ و فاطمہ زہراؑ میں جو بڑا فرق ہے وہ یہ ہے کہ سادات اولادِ رسولؐ ہیں اور سادات کو رسولؐ سے رشتہ ہے مگر نبوت اور رسالت سے رشتہ نہیں۔ ائمہ اہل بیتؑ اور خاتونِ جنت کو نبی اور رسولؐ سے بھی رشتہ ہے اور اس کے ساتھ نبوت اور رسالت سے بھی کیونکہ وہ حضرات اہل بیتِ نبیؐ بھی ہیں اور اہل بیتِ نبوت بھی۔ اہل بیت رسولؐ بھی ہیں اور معدنِ رسالت بھی۔

میرے معترض نے پورا زور اس پر لگایا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے نبیؐ کو حکم دیا تھا کہ کفار و منافقین تم سے قتال نہ بھی کریں ان کو بیٹھے بٹھائے بھی قتل کر دو۔ صرف اس لیے کہ وہ کفار اور منافقین ہیں۔ میں قرآنِ کریم سے دکھا چکا کہ نبیؐ اور امامؑ قتال کرنے والے سے قتال کرتا ہے ورنہ ہرگز قتال نہیں کرتا۔ لاکھ کوئی نبوت اور امامت کا منکر ہو۔ قرآن مجید صاف صاف کہہ رہا ہے کہ جب تک یہ لوگ قتال نہ کریں تم ان کی اذیت رسانی کو برداشت کرتے رہو چنانچہ آیہ مذکورہ لئن لم ینتہ المنافقون سے کچھ پہلے اسی سورۂ احزاب میں نبیؐ سے ارشاد ہوتا ہے :

> ولا تطع الکافرین والمنافقین ودع اذاھم و توکّل علی اللّٰہ و کفیٰ باللّٰہ و کیلا ० (پارہ 22' سورہ احزاب' آیت 48)
>
> ''اے نبیؐ! کفار و منافقین کی اطاعت تو کبھی نہ کرنا' البتہ جو اذیت کفار و منافقین پہنچائیں اس کو نظر انداز کرو' چھوڑو اور اللہ پر بھروسہ رکھو وہ بہترین کارساز ہے''۔

کہیے' آیت میں ''کفار و منافقین کو خواہ مخواہ بھی قتل کر دو'' یہ حکم ہے یا یہ ہے کہ ان کی اذیت دہی کو بھی نظر انداز کر دو' چھوڑ دو۔ یہاں قتال کرنے کا حکم ہے یا نہ کرنے کا ہے۔ اسی طرح سورۂ نساء میں فرمایا جاتا ہے اور ذکر ہے منافقین کا۔ ویقولون طاعۃٌ فاذا برزوا من عندک بیّت طائفۃ منھم غیر الّذی تقول واللّٰہ یکتب

مایبیّتون فاعرض عنهم وتوکّل علی اللّٰہ وکفیٰ باللّٰہ وکیلاo (منافقین تمہارے سامنے تو) کہتے ہیں کہ آپ کا حکم بسر و چشم منظور ہے مگر جب تمہارے پاس سے نکل کر جاتے ہیں تو کچھ لوگ ان میں سے کچھ اور صلاح مشورے کرتے ہیں اور تمہاری بات کو پلٹ دیتے ہیں۔ اللہ ان کے اس صلاح مشورہ کو لکھ رہا ہے۔ اے رسولؐ تم ان لوگوں سے چشم پوشی کرو اور اللہ پر توکل رکھو۔ اللہ تمہاری مدد اور حمایت کے لیے کافی ہے۔ کہیے اس آیت میں منافقین کو مار ڈالنے کا حکم ہے یا ان کو طرح دینے اور چشم پوشی کا ہے۔ میں یہ کہتا ہوں کہ جو لوگ منافقوں کا قتلِ عام تجویز کر کے منافقوں کا خاتمہ دکھانا چاہتے ہیں ان کو نبوت کی فکر ہونا چاہیے کیونکہ قرآن منافقوں کے قتلِ عام سے نبیؐ کو دع اذاهم، فاعرض عنهم کہہ کر روک رہا ہے اور تنہا منافقین ہی کے قتلِ عام سے نہیں بلکہ وہ کفار کے قتلِ عام سے بھی دع اذاهم کہہ کر روک رہا ہے مگر اس وقت جبکہ وہ قتال کریں۔ ہمارے کرم فرما کہتے ہیں کہ خلافت اور قلم دوات کے جھگڑے دشمنانِ اسلام کے کھڑے کئے ہوئے ہیں۔

دشمنانِ اسلام تو ان کے نزدیک حیاتِ نبیؐ ہی میں سب ختم ہو گئے تھے۔ یہ پھر کیسے زندہ ہو گئے کہ کوئی اسلام دوست ہی نہ رہا جس کے پاس زبان، قلم، حکومت ہوتی اور وہ ان اغلاط کی تردید کرتا۔ دنیا بھر کے مسلمانوں کو دشمنانِ اسلام کہنا یہ کام کسی اسلام دوست کو نہیں بلکہ دشمنِ اسلام ہی کا ہو سکتا ہے۔ جب میں کسی جماعت کو منافقین سمجھتا ہوں اور منافقین ٹھہرانے کی کوشش کر رہا ہوں تو میں اس کو مسلمان کیسے تسلیم کر سکتا ہوں اور مسلمان تسلیم کر لوں تو منافق کیسے ٹھہرا سکتا ہوں لیکن کسی منافق کے لیے بر سبیلِ تذکرہ اگر لفظ مسلمان یا لفظ مومن محض اس کے دعوے کی بنا پر کہا جائے اور پھر تنقید کرتے ہوئے اس کو غیر مسلم ثابت کیا جائے تو ہر شخص جانتا ہے کہ یہ تضاد نہیں ہے۔ میں پہلے دکھا چکا ہوں کہ قرآنِ کریم نے بھی ان کو اپنے دعوے کی بنا پر مومن و مسلم کہا ہے لیکن حقیقت کی بنا پر وما هم بمومنین بھی کہا ہے تو کیا قرآن کریم میں بھی تضاد ہے۔ امام حسینؑ سے جن لوگوں نے جنگ کی وہ کون تھے۔

ہر شخص کہے گا مسلمان۔ حضرت عثمان کے قاتل کون تھے ؟ مسلمان ! قاتلِ علی مرتضیٰؑ کون تھا ؟ مسلمان ! جنگِ اُحد سے جنہوں نے فرار کیا' جو حنین سے بھاگے کون تھے ؟ مسلمان ! رسولؐ کو کان کہنے والے کون تھے ؟ مسلمان۔ تقسیم صدقات پر رسولؐ کو ناانصاف کہنے والے کون تھے ؟ مسلمان ! اب اگر تنقید کسی کے لیے یہ ثابت کر دے کہ وہ مسلمان نہ تھے تو یہ تضاد نہیں۔ لفظ مسلمان حسب ظاہر کہنا کوئی گناہ یا غلط بات تو نہیں مسلمان تو مسلمان وہ تو ان میں بہت سوں کو صحابہ فرما رہے ہیں۔ میرے خیال میں جس بد نصیب نے رنگیلا رسول لکھا تھا آپ اس کو جواب دیتے تو یہ کہتے کہ تیری کتاب کے نام ہی میں تضاد ہے کیونکہ تو رسولؐ بھی مان رہا ہے اور رنگیلا بھی کہہ رہا ہے حالانکہ اس کے نام میں رسول اس کے عقیدہ کا لفظ نہیں۔ اس نے رسول کا لفظ رسول مان کر نہیں لکھا بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو اپنے آپ کو رسول کہتے تھے وہ معاذ اللہ رنگیلے تھے۔ قرآنِ کریم میں مذکور ہے کہ ہم نے ملائکہ سے کہا کہ آدمؑ کو سجدہ کرو۔ پھر فرمایا کہ جس نے سجدہ سے انکار کر دیا وہ ایک جن تھا۔ اب کچھ لوگ یہاں فوراً کہہ دیں گے کہ تضاد ہے۔ کہیں اس کو منجملہ ملائکہ قرار دیا کہیں اس کو جن کہہ دیا حالانکہ منجملہ ملائکہ اس کو قرار دیا گیا۔ اس کے ملائکہ میں شامل ہونے کی بناء پر اور جن فرمایا اس کی حقیقت کی بنا پر۔ ہم لوگ شیعہ ہیں۔ ہمارا نظریہ سب کو معلوم ہے مگر واقعات کے ذکر میں برابر یہی کہتے ہیں کہ یہ واقعہ خلیفہ اول کے زمانہ کا ہے اور فلاں واقعہ خلیفہ ثانی کے عہد کا ہے تو کیا یہاں بھی آپ فرما دیں گے کہ تم نے خلیفہ اول اور خلیفہ ثانی کہہ کر ہمارا عقیدہ قبول کر لیا اب تم شیعہ نہیں ہو۔

میں نے نہ فتح مکہ سے پہلے ایمان والوں کو سب کو مومن مانا ہے نہ بعد والوں کو سب کو مومن مانا ہے۔ پہلے والوں میں بھی مومن اور غیر مومن کا اختلاط تھا تو بعد والوں میں کیوں نہ ہوتا۔ میں نے تو یہ کہا تھا کہ بعد والے ہزار مومن ہوں لیکن پہلے والوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے جس کا مطلب صرف یہ ہے کہ بعد والے اگر حقیقتاً مومن ہوں بھی تب بھی وہ پہلے والے حقیقی مومنین کی از روئے قرآن برابری نہیں کر سکتے چہ

جائیکہ ہو بھی بعد کا کوئی اور۔ حفاظتِ جان کے لیے ایمان بھی ہو۔ خداوندِ عالم نے تو سندِ ایمان کل مہاجرین و انصار کو کبھی نہیں عطا کی بلکہ بعض کو دی ہے۔ السابقون الاوّلون من المهاجرين والانصار (پارہ 10' سورہ توبہ' آیت 100) میں تبعیض کا (مِن) موجود ہے جن کے لیے رضی اللہ عنہم ورضواعنہ فرمایا ہے۔ والذين آمنوا وھا جروا وجاھدوا فی سبیل اللہ والذین آووا ونّصروا اولئك هم المومنون حقاًo (پارہ10' سورہ انفال' آیت 74)

"جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے ہجرت کی اور خدا کی راہ میں جہاد کیا اور وہ جنہوں نے جگہ دی اور نصرت کی وہ لوگ سچے مومن ہیں"۔

ایمان کی حقیقت تو خدا ہی جانتا ہے لیکن یہاں آمنوا سے مراد صدق دل ہی سے ایمان لانا ہے۔ ہجرت میں بھی نیت تقربِ الٰہی ضروری ہے جس کا ہم ادراک نہیں کر سکتے۔ اب رہا جاھدوا فی سبیل اللہ۔ یہ ہے عمل جس کا ادراک ہو سکتا ہے۔ جاھدوا فی سبیل اللہ کا معیار تولوا منکمo (سورہ آل عمران آیت 155) ولیتم مدبرینo (سورہ توبہ' آیت ۲۵) عصیتم o (سورہ آل عمران آیت 152) اور اذتصعدون ولا تلوٗنo (سورہ آل عمران آیت 153) کی موجودگی میں ختم ہو جاتا ہے۔ اسی بناء پر میں برابر یہ کہتا چلا آرہا ہوں کہ ایسے لوگوں کو صحابہ کہہ کر صحابہ کی توہین نہ کریں۔ دوسری آیت دیکھیے۔

ثمّ ان ربّك للّذين هاجروا من بعد مافتنوا ثمّ جاهدوا وصبروا ان ربك من بعدها لغفور رحيمo (سورہ نحل آیت 110)

"پھر اے رسولؐ تمہارا رب توان کے لیے ہے جنہوں نے ہجرت کی مصیبت زدہ ہونے کے بعد (یہاں سے فتح مکہ کے بعد کے مدینہ آنے والے نکل گئے) پھر انہوں نے جہاد کیا اور صبر کیا تو تمہارا رب ان شرطوں کے بعد ضرور بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے"۔

جاھدوا کے بالکل ساتھ ہے صبروا، جس کے معنی یہ ہیں کہ صبر کے ساتھ میدانِ جنگ میں ٹھہریں۔ ظاہر ہے کہ جنگ سے فرار صبر نہیں ہے' بے صبری ہے۔ اس سے صاف عیاں ہے کہ فتح مکہ سے پہلے والے مسلمان بھی کُل کے کُل مومن نہیں بلکہ مہاجرین وانصار کے لیے بھی محض لفظ مہاجرین اور لفظ انصار کوئی سندِ ایمان نہیں تو بعد فتح مکہ والے مذکورہ شرائط کے بغیر کیسے مومن ہو سکتے ہیں؟ اللہ نے جو پہلے والوں اور بعد والوں سے ہر ایک سے اچھی جزا کا وعدہ کیا ہے وہ اپنی جگہ بالکل ٹھیک ہے۔ لیکن یہ وعدہ ہر زمانہ کے حقیقی مومن سے ہے۔ نمائشی اور کہنے کے مومن سے نہیں ہے۔ اچھی جزاء کی بنیاد تو ایمان ہے فتح مکہ کے بعد صرف وہی لوگ تو ایمان نہیں لائے جو اب تک نبیؐ سے برابر جنگ کرتے رہے تھے۔ فتح مکہ کے بعد تو دیار وامصار کے لوگ فوج در فوج ہو کر اللہ کے دین میں داخل ہوئے۔ ان میں جو لوگ صدق دل سے ایمان لائے اور وہ اپنی آخری زندگی تک مستقیم بھی رہے ان کو اچھی جزاء کیوں نہ ملے گی۔ قرآنِ مجید نے ایمانِ صادق کے بعد استقامت کی بھی شرط لگائی ہے۔ الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا فلاخوف علیھم ولاھم یحزنونo (پارہ 26' سورہ احقاف' آیت 13)۔ ''جنہوں نے (دل سے) کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے۔ پھر وہ ہمیشہ (راہِ حق پر) ثابت قدم رہے نہ ان پر خوف ہو گا نہ وہ رنجیدہ ہوں گے''۔ ایسے حضرات کے لیے ارشادِ الٰہی ہے۔ وکلاً وعد اللہ الحسنیٰ (پارہ 5' سورہ نسآء' آیت 95) ہر ایک سے اللہ نے اچھی جزا کا وعدہ کیا ہے۔ اگر ایمان ہی نہیں یا ایمان کے بعد استقامت ہی نہیں تو کیسا اگلا اور کیسا پچھلا۔

ہم نے اپنے کتابچے ''صحابیت کا قرآنی تصور'' میں تحریر کیا تھا کہ ''سب ہی مومنین نے راہِ فرار اختیار نہ کی تھی''۔ کسی جگہ ہم نے لکھا تھا' اس جماعت (کفار) نے مسلمانوں پر اچانک حملہ کیا تو بنا بنایا کام بگڑ گیا۔ مسلمان اس حملہ کی تاب نہ لا سکے۔ ادھر ادھر چلے گئے۔ خط کشیدہ ہمارے الفاظ پر ہمارے دوست معترض ہیں کہ تم تو خود ان کو مسلمان اور مومن کہہ رہے ہو' اس طرح تم نے ان کو مسلمان اور مومن مان لیا۔ مگر

کہنا اور بات ہے اور ماننا اور بات ہے۔ جس کا نام رستم رکھ دیا جائے اس کو رستم کہنا صِرف کہنا ہے' یہ ماننا نہیں ہے۔ صادق نامی کو صادق کہنا اس کو صادق ماننا نہیں ہے۔ جو مسلمان کہلاتا ہو اس کا تذکرہ لفظ مسلمان ہی سے ہو گا۔ ہمارے ایک عزیز نے خصوصیت سے ہم سے سوال کیا ہے کہ یہ کیا تضاد ہے کہ آپ لکھتے ہیں بھاری پیٹ والے اور چھپے رستم لیکن آپ کی حمائل شریف سید مقبول احمد صاحب کے ص 737 پر یخوفونک 39/36 کی تفسیر میں لکھا ہے کہ اے رسولؐ وہ تم سے صاف کہتے ہیں کہ علیؑ کو خلیفہ نہ بنائیے۔ اس سے ہمیں معاف رکھیے اور تم کو دھمکی دیتے ہیں کہ اگر آپ ایسا کریں گے تو ہم کفار سے جا ملیں گے۔ ایک طرف چھپے رستم اور دوسری طرف صاف صاف کہتے ہیں"۔

جناب والا! تضاد تو اس وقت ہوتا جب ہم نے تمام منافقین کو بھاری پیٹ والا اور چھپے رستم کہا ہوتا۔ ہمارے الفاظ تو ہیں کہ ان منافقین میں سے کچھ تو ایسے اوچھے اور ہلکے پیٹ کے تھے جو اپنے راز نفاق کو چھپائے رکھنے سے بعض اوقات بے بس ہو جاتے تھے اور ایسے حرکات کر بیٹھتے تھے جن سے ان کی منافقت کا راز کھل جاتا تھا اور مومن سمجھ جاتے تھے کہ یہ لوگ منافقین ہیں' لیکن کچھ منافقین ایسے محتاط اور بھاری پیٹ کے تھے جو کسی طرح اپنے نفاق کی ہوا بھی کسی کو نہ دیتے تھے۔ جب ہم ازروئے قرآن دو طرح کے منافق دکھا چکے ہیں تو مولوی مقبول احمد صاحب نے جن کا ذکر کیا ہے اور خود آپ نے بھی سیاہ نشان لگا لگا کر جن منافقین کی علامات کو بیان کیا ہے۔ یہ وہی اوچھے پیٹ والے ہوئے۔ اب وہ فرماتے ہیں کہ قرآنیں منافق کا نشان یہ ہے کہ وہ جنگ سے بھاگ جاتا ہے۔ یہی تو میں بھی کہہ رہا ہوں' بے شک یہ نشان مستقل ہے۔ ہر جگہ انسان تصنع کر سکتا ہے مگر تصنع میں جان نہیں دے سکتا۔ اس لیے یہ نشان بے خطا ہے۔ اب ہم کو یہ پوچھنا پڑا کہ منافق کا جو مستقل نشان ہے کہ وہ جنگ سے بھاگتا ہے اس سے ان کی مراد کیا ہے؟ منافق وہ ہے جو جنگ میں جانے سے بھاگتا ہے یا وہ بھی جو جنگ میں جا کر بھاگتا ہے۔ اگر صرف وہ ہے جو جنگ میں جانے سے بھاگتا ہے اور وہ نہیں ہے جو جنگ میں جا

کر بھاگتا ہے تو یہ کیوں؟ کیا اس لیے کہ یہ میدانِ جنگ تک آ تو گیا ہے۔ اب ٹھہرے یا نہ ٹھہرے اس سے اس کی مومنیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا تو اللہ کا مطلب یہ ہوا، تم مومن ہو تو جنگ میں چلے جاؤ، پھر چاہے کچھ دیر ٹہل ٹہلا کر چلے ہی آنا، انگلی کاٹ کے شہیدوں میں داخل ہو جاؤ، بلکہ انگلی کاٹے بغیر ہی تم غازی ہو جاؤ گے۔ کچھ دیر کے لیے چلے جاؤ۔ پھر تم کو تین تین دن کی چھٹی مل سکتی ہے۔ نتیجہ کے اعتبار سے تو دونوں کا خانہ ایک رہا جو جنگ میں نہیں گئے اور جو جا کر نہ ٹھہرے، بات تو ایک ہی ہوئی بلکہ ایک بھی کہاں؟ جس نے روزہ رکھا ہی نہیں۔ گنہگار تو وہ بھی ہے لیکن جو رکھ کر لذاتِ دنیا کے لیے توڑ دے وہ اس سے بھی زیادہ گنہگار ہے جو نماز نہ پڑھے وہ بھی گنہگار ہے لیکن جو شروع کر کے بیچ میں بالارادہ نیت توڑ دے وہ کہیں زیادہ گنہگار ہے۔ جو مستطیع ہونے پر حج نہ کرے گنہگار ہے۔ لیکن جو احرام باندھ کر بعض ارکان ادا کر کے بعض ارکان بلا عذر شرعی چھوڑ بھاگے وہ اس سے زیادہ گنہگار ہے۔ رہا درگزر کرنے کا مسئلہ تو نبی کریمؐ نے نہ ان کو سزا دی جو جنگ میں جا کر نہ ٹھہرے نہ ان کو سزا دی جو شریک جنگ ہی نہ ہوئے جن کو مخلفین کہا جاتا ہے ان کے بارے میں بھی فاعرضوا عنهم قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ ان لوگوں سے درگزر کرو۔ سیحلفون باللہ لکم اذا انقلبتم الیھم لتعرضوا عنھم فاعرضوا عنھم٥ "وہ لوگ جب تمہاری واپسی پر تم سے ملیں گے تو قسمیں کھائیں گے تاکہ تم ان سے کوئی تعرض نہ کرو پس تم ان سے تعرض نہ کرو"۔ (سورۂ توبہ آیت 95) چنانچہ فرمایا تھا۔ "جن ہستیوں نے اللہ کی رضا کے لیے گھر بار، مال و دولت سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ہجرت فرمائی اور جو خود فاقے رہ کر بھی دوسروں کی ضرورت کو ترجیح دینے والے تھے کیا ان کے متعلق باور کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے حصولِ اقتدار کے لیے جنگِ جمل و صفین کا میدانِ کارزار گرم کیا ہو"۔

کیا فتح مکہ کے بعد مکہ سے مدینے آنے والے مہاجر تھے:

ہم نے یہ دیکھ کر کہ ہمارے بعض احباب فتح مکہ کے بعد مدینے میں آ جانے

والے اہلِ مکہ کو بھی مہاجر قرار دے رہے ہیں ان کی گرفت کی اور جواباً عرض کیا کہ مہاجرین کا لفظ ان اہلِ مکہ کے لیے جو بعدِ فتح مکہ مدینہ میں آکر بس گئے معیارِ قرآنی کے خلاف ہے اور یہ بھی غلط ہے کہ انہوں نے گھر کے ساتھ بار 'مال' دولت سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ہجرت فرمائی تھی کیونکہ ان کو یہ ان کا سب کچھ چھوڑنے پر کون مجبور کرنے والا تھا۔ ان کا مال' ان کی دولت کس نے ان سے چھین لی۔ اب تک یہی لوگ تھے جنہوں نے نبیؐ اور مسلمانوں کو مکہ سے خالی ہاتھ نکلنے پر مجبور کیا تھا۔ یہی لوگ نبیؐ اور مسلمانوں پر ظلم کررہے تھے جس کی وجہ سے مصیبت کے مارے مسلمان اپنا گھر در سب کچھ چھوڑ کر اپنے وطن آبائی سے ہجرت کررہے تھے۔ اب ان کو کون مکہ سے نکال رہا تھا۔ ان کو کون مصیبت اور دکھ دے رہا تھا۔ قرآنِ کریم نے تو مہاجرین ان کو کہا ہے جن کو زبردستی ان کے گھروں سے نکالا گیا۔ اخرجوا من دیارھم۔ جن کو مکہ میں ہر طرح کی مصیبت دی گئی۔ من بعد ما فتنوا۔ ہمارے اس احتساب کے بعد انہیں یہ تسلیم کرنا چاہیے تھا کہ لفظ ہجرت اور مال و دولت کے چھوڑنے کے الفاظ محض جوشِ محبت میں سہواً بلا ارادہ لکھے گئے تھے کیونکہ صحیح بات کا تسلیم کرنا عیب نہیں بلکہ نہ تسلیم کرنا عیب ہے۔

وہ پھر کہتے ہیں کہ ایک گروہ (اہلِ مکہ بعد فتح مکہ) اللہ کے دین کے لیے گھر بار چھوڑ کر مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کر آیا تھا۔

ان کا لفظ ہجرت جو سراسر غیر قرآنی ہے اب بھی چل رہا ہے۔ جب قرآنِ کریم ان کو قرآنی مہاجر نہیں قرار دیتا تو وہ یہ کیوں قسم کھائے بیٹھے ہیں کہ جس ڈھب سے ہوگا قرآن کریم کی مخالفت کریں گے۔ ان لوگوں کا فتح مکہ کے بعد مکہ سے مدینہ آ جانا اللہ کے دین اور اللہ کی رضا کے لیے تھا؟ یہ ان کو کس نے بتایا اور کہاں سے معلوم ہوا۔ کیا یہ خبر ان کو قرآنِ کریم نے دی ہے؟ یا خود ان پر وحی آئی ہے یا وہ دلوں کی بات کے جاننے والے عالم الغیب ہیں۔ جو مسلمان اب بھی مکہ میں رہ گئے تھے وہ کیا اللہ کی رضا کے طالب اور دیندار نہ تھے؟ مکہ ویران تو نہ ہوا تھا۔ کیا دینداری مکہ چھوڑ کر مدینہ میں

آبسنے ہی پر منحصر تھی ؟ کیا مسلمان ہو کر بیت اللہ اور حرمِ خدا کی پاسبانی' دینداری اور موجب رضائے خدا نہ تھی۔ کیا واقعات اظہر من الشمس ہو کر یہ نہیں بتا رہے ہیں کہ مکہ سے ان کے مدینہ میں آنے کی صرف یہ وجہ تھی کہ جو اسلام دشمنی ہم دور بیٹھے کر رہے تھے۔ اب اسلام کا لبادہ اوڑھ کر قریب سے کریں۔

شیعہ کبھی نہیں کہہ سکتا کہ ثلاثہ یا ان کے بعد اور لوگ خلیفہ نہیں ہوئے۔ جنگ جمل و صفین کے تواتر سے انکار کر کے وہ کیوں ہم کو تواتر کا خواہ مخواہ منکر کہہ کر ہم پر بہتان باندھتے ہیں۔ ان کا یہ خیال عجیب ہے کہ ہم قرآن کے الفاظ محمد رسول اللہ کی شہادت پر رسالت محمدی کے قائل نہیں۔

برادر عزیز جو کچھ کہیے سوچ کر کہیے۔ آپ نے رسالت کو قرآن کی شہادت سے مانا تو قرآن کو قرآن کس کی شہادت سے مانا آپ کو یہ تو معلوم ہو گا کہ دور محال ہے اور سراسر باطل ہے یعنی یہ کہنا کہ ہم نے رسالت کو مانا قرآن سے اور قرآن کو مانا رسالت سے۔ یہ ہوا دور۔ یہ بات ایسی ہوئی کہ زید نے پیدا کیا بکر کو اور بکر نے پیدا کیا زید کو۔ نبیؐ کو کتاب سے نہیں مانا جاتا بلکہ کتاب کو نبی سے مانا جاتا ہے۔ پہلے مانی جاتی ہے نبوت' پھر نبوت منواتی ہے کتاب کو۔ آیہ محمد رسول اللہ تو آیا ہے صلح حدیبیہ کے بعد' یعنی ہجرتِ نبوی کے برسوں بعد ہزاروں لوگ مسلمان ہو چکے تھے۔ اس آیت سے پہلے ہی وہ کس شہادت پر ایمان لائے تھے۔ ان کو تو ایمان اس شہادت والی آیت پر لانا چاہیے تھا تو کہیے کہ یہ لوگ قرآن میں نام محمدؐ آنے تک نبوت پر ایمان ہی نہ رکھتے تھے ؟ معاذ اللہ

ہمارے کرم فرما کا یہ خیال درست نہیں کہ دنیا کی زندہ قومیں چاند اور مشتری پر کمندیں پھینک رہی ہیں اور ہم سابقہ خلافتوں کے چودہ سو سالہ جھگڑے لئے بیٹھے ہیں۔

جناب عالی ستاروں پر کمندیں پھینکنے والے زندہ قوم نہیں بلکہ وہ قومیں زندہ ہیں جو اپنی آخرت کی فکر کرتی ہیں اور اپنی عقبیٰ سنوارتی ہیں۔ ہمارے ائمہ اہلبیت کے متعلق تو یہ ملتا بھی ہے کہ کبھی انہوں نے یہ فرمایا کہ عرشِ خدا سے جو کچھ ادھر ہے وہ ہم سے پوچھ لو کبھی یہ فرمایا کہ میں آسمانی راستوں کو زیادہ سے زیادہ جانتا ہوں۔ کبھی یہ فرمایا

کہ کائنات کے پردے بھی اٹھا دیئے جائیں تو میرے یقین میں اب کوئی زیادتی نہیں ہو سکتی۔ وہ حضرات لوح محفوظ کا بچپن ہی میں مطالعہ فرماتے تھے۔ ان کے لیے ڈوبا ہوا آفتاب پلٹا۔ آپ کا تمام تر نظریہ یہ ہے کہ وہ قومیں زندہ ہیں جو اپنی آخرت اور عاقبت سے بے نیاز ہو کر ہمہ تن دنیا طلبی میں مصروف ہیں اور آخرت کے طلبگار مردہ ہیں۔ آپ کے نزدیک شہداء' انبیاء' سید الانبیاء' سب مردہ ہیں کیونکہ انہوں نے اپنی دنیا نہ بنائی۔ آخرت بنائی۔ جہاد سے بھاگ جانے والوں کی حمایت بھی آپ اس ہی لیے کر رہے ہیں کہ وہ طالب دنیا تھے۔ غرضیکہ حصول دنیا کے لیے جو لوگ سب کچھ کر رہے ہیں اور کر چکے ہیں آپ جان و دل سے ان کے ساتھ ہیں اور ایسے لوگوں کی کمند میں آپ خود پھنس چکے ہیں لیکن اس طرح میرے مہربان نہ دنیا بنتی ہے نہ آخرت۔ کیونکہ ستاروں پر کمند پھینکنے کے بجائے آپ کمندیں پھینک رہے ہیں۔ قرآن کریم پر اس سے نہ نفع دنیا ہے نہ نفع آخرت۔

آپ جمل اور صفین کے اس غازی کی کیوں حمایت کریں جس نے حُبِّ دنیا کو تین طلاقیں دے دی تھیں۔ آپ تو حمایت ان کی ہی کریں گے جنہوں نے اپنی کمندیں قرآن کو لے کر قرآن کے نام سے مسلمانوں پر پھینکیں۔ خلافت کے چودہ سو سال پہلے کے جھگڑے کون لیے بیٹھا ہے۔ ہم نے جھگڑا کب کیا اور جھگڑا کب سمجھا ہم تو عہدِ نبوی ہی سے اس مسئلہ کو طے شدہ سمجھتے ہیں۔ ہمارے سامنے نہ کوئی فیصلہ طلب قضیہ تھا اور نہ ہے۔ البتہ یہ خطاب قرآنِ کریم سے کیجئے کہ زندہ قومیں تو چاند اور مشتری کی سیر کرنے کے لیے ستاروں پر کمندیں پھینک رہی ہیں اور تو ہے کہ اسی جھگڑے کو لیے بیٹھا ہے کہ آدم کو سجدہ کس نے کیا تھا کس نے نہیں۔ خلافتِ الٰہیہ کو کس کس نے مانا' کس کس نے نہیں۔ وعدۂ خلافت کس سے ہوا کس سے نہیں۔ حنین میں کون ثابت قدم رہا کون نہیں ؟ اب ان قصوں سے فائدہ ؟

اہلبیتِ رسولؐ سے ہمارے بعض احباب کا برتاؤ :

ہمارے بعض احباب کہتے ہیں کہ امام حسنؑ نے سو' ساٹھ یا پچاس بے گناہ

عورتوں کو طلاق دی اب جبکہ ہم نے تاریخ کی یہ بات مان لی کہ حضرت حسنؑ نبی اکرمؐ کے نیک نواسے تھے اور پروردۂ آغوش نبوت تھے تو پھر تاریخ کی مذکورہ خبر کو ماننا ہمارے بس کا روگ نہیں۔

ناظرین غور فرمائیں ہمارے ان احباب کو حضرت حسنؑ کا نیک نواسہ رسولؐ، اور پروردہ آغوشِ نبوت ہونا صرف تاریخ نے بتایا ہے قرآن نے نہیں بتایا۔ ہر خبر تو ان کو ملتی ہے قرآن سے یہاں تک کہ انہوں نے رسالت کو بھی قرآن ہی سے مانا ہے۔ قرآن کو رسالت سے نہیں مانا۔ لیکن حضرت حسنؑ کا نیک نواسہ ہونا نہ ان کو قرآن نے بتایا نہ تفسیر القرآن بالقرآن نے۔ حضرت حسنؑ کا ذکر ہی ان کو قرآن میں نہ ملا۔ حضرت حسنؑ کا نیک نواسہ رسولؐ ہونا صرف اس تاریخ میں ملا جو نہایت کمزور ہے قرآن میں نہیں ہے۔

یہ ہے قرآن اور اہلبیتؑ سے انتہائی ضد اور اہلبیت طاہرینؑ سے انتہائی عداوت۔ ہمارے دوست نے نہ تو اس قرآن میں آیہ مباہلہ فقل تعالوا ندع ابنائنا و ابنائکم پڑھا ہے جس میں ان کو سب سے پہلے حضرت حسنؑ کا ذکر اور ان کا فرزندِ رسولؐ ہونا ان کا صغر سنی میں شریکِ کارِ نبوت ہونا ان کا خدا کے نزدیک صادق ہونا اور کاذبین کے مقابلہ کے لیے بھیجا جانا نظر آیا نہ ان کو اس قرآن میں آیت تطہیر انما یریداللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت ویطھرکم تطھیرا (پارہ 22، سورہ احزاب، آیت 33) نظر آئی جس سے ان کو ردائے نبیؐ میں حضرت حسنؑ کا ہونا اور نبیؐ کے ساتھ ساتھ ان کا انتہائی طاہر و مطہر اور بے رجس ہونا نظر آتا۔ ہمارے مخاطب کو وعدۂ خلافت والی آیتِ قرآنی میں نبیؐ کے غیر اور بیگانے تو سب نظر آئے لیکن حضرت حسنؑ ان کو اس آیت میں بھی نظر نہ آئے۔ نہ ہمارے موصوف کو قرآنِ کریم میں قل لا اسئلکم علیه اجرا الا المودة فی القربیٰ (پارہ نمبر 25، سورہ شوریٰ، آیت نمبر 23) نظر آیا جو موصوف کو نظر آتا کہ حضرت حسنؑ کی محبت اجرِ رسالت ہے۔ ہم موصوف کی اس صریح گستاخی پر کہ نہ تو اس نامِ عالی کے ساتھ لفظِ

امام ہے نہ ان کی نیکی اور نبیؐ کا نواسہ ہونے کی خبر قرآنی ہے یہ شعر پڑھ دینے پر مجبور ہیں :

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم
چشمہ آفتاب راچہ گناہ

میرے دوست کو فتح مکہ کے بعد کے مسلمانوں کے لیے تو آیہ قرآنی اشداء علی الکفار نظر آگیا لیکن امام ہمام عالی مقام فرزندِ رسول انامؐ سیدِ جوانانِ اہل جنت، وسیلہ حصولِ نجات و مغفرت، صاحبِ عصمت و طہارت، تفسیر کوثر، جگر گوشہ زہراؑ و حیدرؑ کے لیے قرآن بھر میں کوئی آیت نہ ملی۔ کس کا منہ ہے جو اس قمر کے سامنے آئے، کس کا بھائی ہے جو اس کے بھائی کا جواب ہو۔ کس کا باپ ہے جو اس کے باپ کا جواب ہو۔ کس کی ماں ہے جو اس کی ماں کا جواب ہو۔ کس کا نانا ہے جو اس کے نانا کا جواب ہو کس کی نانی ہے جو اس کی نانی کا جواب ہو کس کا دادا ہے جو اس کے دادا کا جواب ہو، کس کی دادی ہے جو اس کی دادی کا جواب ہو۔ زمین کے ذرے عرش کے ستاروں کی ہمسری نہیں کر سکتے۔ میرے مخاطب محترم کے قلم سے قدرت نے یہ جملہ لکھوا کر کہ تاریخ کہتی ہے کہ آپ (حسنؑ) نے سو، ساٹھ یا پچاس بے گناہ عورتوں کو طلاق دی تھی۔ حقیقت کو روزِ روشن کی طرح واضح کر دیا کیونکہ وہ تاریخ کے ہر مسلمہ کو فرماتے تھے کہ یہ عجمی سازش ہے جس نے صحابہ کی تاریخ کو داغدار کیا ہے۔ اب موصوف بتائیں کہ تاریخ اہلبیت اور تاریخ امام علیہ السلام کو کس نے داغدار کیا؟ یہ تو عجمی سازش نہیں ہو سکتی۔ یہ سازش تو عربی اور اموی ہی ہو سکتی ہے جن کو اہل بیتؑ اور امام علیہم السلام سے دشمنی تھی۔

☆☆☆

اِحقاقِ حق

یعنی

سوال و جواب

سوال : (i) سید الشہداء تو جنابِ امیر حمزہؓ تھے۔ امام حسینؑ کو یہ لقب شیعوں نے دیا ہے۔

(ii) (ا) شہید کی شہادت کی گواہی وہ جگہ دے گی جہاں وہ شہید کیا گیا چنانچہ شہادتِ امام حسینؑ کی گواہی زمینِ کربلا دے گی اور حضرت عثمانؓ کی شہادت کی گواہی قرآن شریف دے گا۔

(ب) حضرت عثمانؓ کی شہادت، حضرت امام حسینؑ کی شہادت سے اس لئے بھی افضل ہے کہ اُن پر چالیس دن پانی بند رہا۔ اور حضرت امام حسینؑ کو صرف تین دن پانی نہیں ملا۔

(iii) حضرت علیؑ سے مدد مانگنا ناجائز ہے بلکہ کفر ہے۔ کیوں نہ اللہ سے مدد مانگیں جب کہ علیؑ کی بہادری اور طاقت بھی اللہ کی دی ہوئی ہے۔

جواب : اس میں کوئی شک نہیں کہ جناب حمزہؓ کا لقب سید الشہداء ہے جو رسولِ اکرمؐ نے دیا ہے۔ سید الشہداء میں پہلا لفظ مضاف ہے اور دوسرا مضاف الیہ اس کے معنی ہیں ''شہیدوں کے سردار'' شہیدوں سے افضل و برتر'' اس معنی کے سامنے آتے ہی یہ سوچنا اور سمجھنا پڑے گا کہ یہاں جن شہداء سے جناب حمزہؓ کو افضل و برتر فرمایا گیا ہے

وہ کون سے شہداء ہیں؟ بالفاظ دیگر یہ امر معلوم ہونا چاہیے کہ حضرت حمزہؓ کو تمام شہداء سے برتر فرمایا گیا ہے یا شہداء کا کوئی مخصوص طبقہ ہے جس سے حضرت حمزہؓ برتر اور اس مخصوص طبقہ کے شہداء کے سردار ہیں؟ اگر یہاں لفظ شہداء سے مراد کل شہداء ہیں اور کوئی بھی شہید ایسا نہیں جو اس لفظ سے مستثنیٰ ہو اور جناب حمزہ بلا استثناء اور بلا شرط کل شہداء کے سردار ہوں تو شہداء میں انبیاء و مرسلین بھی ہیں اولیاء اور ائمہ طاہرین بھی ہیں جو برگزیدگان خدا اور معصومین ہیں تو اس صورت میں جناب حمزہؓ کا مرتبہ شہید ہونے والے انبیاء و مرسلین اور ائمہ معصومین سے بھی برتر ہوا جس کو کوئی بھی دیندار جو ضروریات دین سے کچھ بھی واقفیت رکھتا ہو ہرگز تسلیم نہیں کر سکتا کیونکہ حضرت حمزہؓ اپنی تمام تر ایمانی اور عرفانی بلندیوں کے باوجود نہ نبی ہیں نہ مرسل نہ امام ہیں نہ معصوم۔ اللہ کے چنے ہوئے نبی اور امام پر' اللہ کے قرار دیئے ہوئے طاہر اور معصوم پر غیر نبی کو غیر معصوم کو کیسے ترجیح دی جا سکتی ہے یہاں سے صریحاً ظاہر ہو گیا کہ جناب حمزہ کے لئے لفظ سید الشہدا میں شہداء سے مراد کل شہداء نہیں بلکہ انہیں شہداء کے کسی معین اور مخصوص طبقہ کا سردار کہا گیا ہے اور وہ معین اور مخصوص شہداء کا طبقہ وہی ہو سکتا ہے جو حضرت حمزہؓ کی جنس ہو کیونکہ تقابل کسی کا اس کی جنس ہی سے ہوا کرتا ہے جو جنس ارفع و اعلیٰ ہوتی ہے وہ خود بخود اس تقابل سے ہوتی ہے۔ حضرت علی مرتضیٰؑ کا لقب ہے امیر المومنین اور امام المتقین یعنی مومنین کے حاکم اور متقین کے امام۔ یہ ظاہر ہے حضورِ رسالت بھی مومن ہیں غیر مومن نہیں متقی ہیں غیر متقی نہیں لیکن یہاں لفظ مومنین یا متقین میں سرکار ہرگز شامل نہیں ہیں۔ بلکہ مومنین سے مراد بہ استثناء رسولؐ دوسرے مومنین و متقی ہیں۔ ایسے مستثنیات کلام میں عموماً ہوتے ہیں۔

سرکارؐ نے اعلان کرایا قولوا لا الہ الا اللّٰہ تفلحوا من قال لا الہ الا اللّٰہ فیدخل الجنۃ پہلے جملہ کے معنی ہیں لا الہ الا اللّٰہ کہو تو نجات پاؤ گے دوسرے کے معنی ہیں جو لا الہ الا اللہ کہے گا داخلِ جنت ہو گا۔ یہاں اگرچہ محمد رسول اللہ کا بظاہر

ذکر نہیں ہے لیکن کیا محض لا الہ الا اللہ کہہ دینے سے محمدؐ کو رسولؐ مانے بغیر بھی کوئی نجات پا سکتا ہے اور داخل جنت ہو سکتا ہے ؟ ہر گز نہیں۔ اگر باریک بینی سے غور کیا جائے تو اقرارِ رسالت کی شرط ان دونوں جملوں میں موجود ہے کیونکہ ہر جملہ میں نجات اور جنت کا وعدہ ہے ان وعدوں پر اعتبار وہی شخص کر سکتا ہے جو وعدہ کرنے والے کو صادقِ کامل مانتا ہو اور یہ سمجھتا ہو کہ وعدہ کرنے والے نے یہ وعدہ نمائندہ خدا ہونے کی حیثیت سے کیا ہے ورنہ کسی انسان کو محض اپنی طرف سے نجات اور جنت کا وعدہ کرنے کا حق کیا ہے ؟ اور جو وعدہ کسی ایسے بندہ کا ہو جو منجانب اللہ نہیں اُس کا اعتبار کیا ؟ لہٰذا ان دونوں جملوں میں اقرارِ رسالت کی شرط خود بخود آگئی اور جب اِقرارِ نبوت کی شرط آگئی تو نجات اور جنت کے وعدہ سے وہ لوگ مستثنٰی اور الگ ہو گئے جو منکر رسالت ہوں۔ علامہ قندوزی مفتی اعظم قسطنطنیہ نے جو حنفی ہیں ینابیع المودۃ میں سرکارِ رسالتؐ کا بیان ارشاد فرمایا ہے جس کے دو جملے ہیں۔

”علی خیر البشر من شك فيه فقد كفر“ یعنی علی خیر البشر ہیں جو اس میں شک کرے وہ یقیناً کافر ہے۔

”علی خیر البشر فمن ابی فقد کفر “ یعنی علی خیر البشر ہیں جو انکار کرے وہ کافر ہے۔

ظاہر ہے کہ جن کروڑوں بشر سے سرکارؐ نے علیؑ کو افضل فرمایا ہے ان میں خود سرکار داخل نہیں ہیں کیونکہ یہ مسلّم ہے کہ کوئی رسولؐ سے ہر گز افضل نہیں یہاں لفظ بشر سے سرکارؐ کی ذات یقیناً مستثنٰی ہے اسی طرح لفظ سید الشہداء جب امام حسین علیہ السلام کے لئے استعمال ہو گا تو ان کے والد حضرت علی علیہ السلام جو شہید ہیں اس لفظ شہداء سے یقیناً مستثنٰی ہیں کیونکہ یہ حدیث ہے اور خود سرکارِ رسالتؐ نے فرمایا ہے کہ حسنؑ و حسینؑ جوانانِ جنت کے سردار ہیں اور ان کے باپ اُن سے افضل ہیں۔

حدیث رسولؐ کو آپ کے ثقات علماء نے مستند کتابوں میں جا بجا متعدد رُواۃ کی سند سے بیان فرمایا ہے جس کو صاحب ینابیع المودۃ نے بھی اپنی کتاب مذکور کے بہت

سے ابواب میں مع حوالجات بیان فرمایا ہے۔ (کتاب اٹھا کر ملاحظہ فرمالیجئے) اسی حدیث سے امام حسین علیہ السلام کا سید الشہداء ہونا ثابت ہو گیا کیونکہ جوانان جنت میں تمام شہداء بھی ہیں، کل صالحین و متقین و زاہدین و عابدین و علماء بھی ہیں اور حسنؑ حسینؑ ان سب کے سید و سردار ہیں تو پھر یہ سید الشہداء ہوئے کہ نہیں؟ پھر ان کے باپ ان سے افضل ہیں تو علی مرتضیٰ شہداء کے سرداروں کے سردار ہوئے اور علی مرتضیٰ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم افضل ہیں تو آنحضرتؐ جوانانِ جنت کے سرداروں کے سردار ہوئے اس لئے ثابت ہوا کہ سید الشہداء کا لفظ کسی ایک ذات کے لئے منحصر ہو یہ ضروری نہیں بلکہ متعدد حضرات اپنے اپنے درجہ اور مقام کے اعتبار سے سید الشہداء ہو سکتے ہیں چنانچہ یہی لفظ سید الشہداء سرکارِ رسالتؐ نے حضرت جعفر طیار شہید کے لئے بھی فرمایا ہے چنانچہ کتاب ینابیع المودۃ میں جس کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں جامع صغیر علامہ سیوطی سے چالیسویں حدیث اس طرح بیان کی گئی ہے۔

''حاکم اور ضیا حضرت جابرؓ سے روایت کرتے ہیں جعفر بن ابی طالب سید الشہداء ہیں اور ان کے ساتھ فرشتے رہتے ہیں''۔

لہذا آپ کا یہ کہنا کہ سید الشہداء تو صرف حضرت حمزہؓ ہیں حسینؑ کو سید الشہداء کیوں کہا جاتا ہے کتنا مہمل ہو گیا۔ آپ کا یہ نظریہ کہ سید الشہداء ایک ہی ہو سکتا ہے بالکل باطل ہو گیا اور یہ ثابت ہو گیا کہ اپنے اپنے درجہ کے اعتبار سے اور اپنی صنف کے تقابل سے متعدد ہستیاں سید الشہداء ہو سکتی ہیں۔ جس طرح مراتب نبوت کے اعتبار سے کسی نبی کو کسی نبی پر تفضیل و ترجیح ہے۔ اسی طرح مراتب شہادت کے اعتبار سے درجات پست و بلند ہوتے چلے گئے ہیں۔ عام شہداءِ مومنین پر حضرت جعفر طیارؑ کو فضیلت ہے اور وہ سید الشہداء ہیں پھر ان شہداء پر جن میں جعفر طیار بھی ہیں حضرت حمزہؓ کو فضیلت ہے اور وہ سید الشہداء ہیں اس کے بعد ان شہداء پر جن میں حضرت حمزہؓ بھی ہیں امام حسینؑ کو فضیلت ہے اور وہ سید الشہداء ہیں بعد ازاں اُن شہداء پر جن میں حضرت امام حسینؑ بھی ہیں حضرت علیؑ کو فضیلت حاصل ہے اور وہ

سید الشہداء ہیں۔ آپ کو تو حضرت امام حسینؑ ہی کے سید الشہداء ہونے پر اعتراض ہے۔ ہمارے یہاں تو بطریق اہل بیت علیہم السلام انصار حسینؑ کے لئے یہ نبویؐ ارشاد موجود ہے کہ سرکارِ رسالتؐ نے فرمایا۔ اولئك سادات الشهداء فی اُمتی الی یوم القیامة ’’یعنی میری امت میں قیامت تک جتنے بھی شہداء ہیں انصار حسین اُن سب کے سید و سردار ہیں۔ جس کے فدائی سید الشہداء ہوں خود اس کے سید الشہداء ہونے میں کس کو شک ہو سکتا ہے ؟ حقیقت یہ ہے کہ آپ حضرات نے حضرت امام حسین علیہ السلام کو اُن کے صحیح اور واقعی درجہ پر دیکھا ہی نہیں ، آپ کے نزدیک زیادہ سے زیادہ ان کا تعارف ہے تو یہ ہے کہ وہ ایک اچھے اور ایمان دار تھے عالم تھے اور متقی تھے رسولؐ کے نواسے اور علیؑ و فاطمہؑ کے بیٹے تھے اور بس لیکن کیا اس سے اس ذاتِ رفیعہ کا کوئی امتیاز ہوا کوئی تخصیص ہوئی اور ان کے درجہ کی کوئی تعیین ہوئی ؟ ہرگز نہیں یہ صفات اخیارِ امت میں عام ہیں اور صلحاء امت میں مشترک ہیں آپ نے حسینؑ کو بھی ان ہی میں سے ایک سمجھ لیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ اُن کے مقابلہ میں ایسے اشخاص کو لانے لگے جن کو ان سے کوئی نسبت نہیں۔ یہی نہیں بلکہ دوسروں کو افضل و برتر ٹھہرانے لگے۔ حالانکہ آپ ہی کے یہاں وہ تمام تر چیزیں پورے ایک دفتر کی شکل میں موجود ہیں جو صریحاً ثابت کر رہی ہیں کہ پنجتن پاک (محمدؐ ، علیؑ ، فاطمہؑ ، حسنؑ ، حسینؑ) کائناتِ عالم کی وہ منتخب اور برگزیدہ ہستیاں ہیں جن کا ہمسر ، ہم مرتبہ نہ کوئی پیدا ہوا ہے نہ ہوگا یہ وہ معصوم ہیں جن کا واسطہ دے کر حضرت آدمؑ نے دُعا کی تو ان کی دعا قبول ہوئی۔ خداوندِ عالم نے علی کو امیر المومنین کے لقب سے اس وقت ملقب کیا کہ آدمؑ کی پیدائش بھی نہ ہوئی تھی۔ رسولؐ اور یہ حضرات ایک ہی نور سے ہیں ایک شجر سے ہیں۔ ان پر صدقہ حرام ہے۔ یہ آیتِ تطہیر کے مخاطب ہیں۔ مجلس چادر تطہیر کے ارکان ہیں ان کی انتہائی پاکیزگی کا آیہ تطہیر نے اعلان کیا ہے۔ یہ امت کے اجماع سے نہیں کسی غیر معصوم کی وصیت سے نہیں بلکہ خدا اور رسولؐ کی قرار داد سے امامِ امت ہیں۔ ان کی محبت ادائے اجرِ رسالت ہے۔ مومن ہے وہ جو ان سے محبت رکھے منافق ہے وہ جو ان سے

بغض رکھے۔ ان پر درود بھیجنا جزوِ نماز ہے۔ یہ حضرات وسیلۂ نجات ہیں یہ سب کے سب شفیع روزِ حشر ہیں یہ قاسمِ نار و جنت ہیں۔ جس کے ہاتھ میں ان کا دیا ہوا پروانہ نجات نہ ہو گا وہ صراط حشر سے گزر نہ سکے گا اور جہنم سے بچ نہ سکے گا۔ کہاں تک لکھوں اِن کا ذکر عبادت ان کے چہرہ پر نظر کرنا عبادت یہ سب کچھ بلکہ اس سے کہیں زیادہ آپ کے یہاں موجود ہے۔ میں ایک ایک لفظ دکھا سکتا ہوں یقین نہ آئے اور کوئی کتاب بھی دیکھنا نہ چاہیں تو اپنے باخبر علماء سے پوچھ لیجئے جو صاحبِ نظر ہوں۔ مولانا کوثر نیازی سے پوچھ لیجئے علامہ مودودی سے تصدیق کر لیجئے۔

افسوس کہ آپ عامیانہ باتیں کرتے ہوئے فرما رہے ہیں کہ :

"شہادت امام حسینؑ کی گواہی کربلا دے گی اور حضرت عثمانؓ کی شہادت کی گواہی قرآن شریف دے گا۔ حضرت عثمان کی شہادت حضرت امام حسینؑ سے افضل ہے کیونکہ ان پر چالیس دن پانی بند کیا گیا اور حضرت امام حسینؑ کو صرف تین دن پانی نہیں ملا"۔

عرض کرتا ہوں کہ اگر یہی منطق ہے کہ حضرت عثمان کی شہادت کی گواہی قرآن دے گا کیونکہ وہ قتل کے وقت قرآن پڑھ رہے تھے اس لئے ان کا مرتبہ کربلا والے سے زیادہ ہے تو پھر آپ ہی فرمائیں کہ حضرت حمزہؓ سید الشہداء کیسے ہوئے ان کی گواہی صرف دامن احد کی زمین دے گی نہ اس وقت قرآن ان کے پاس تھا نہ رسولؐ ان کے سامنے تھے۔ اس حساب سے تو حضرت عثمانؓ سید الشہداء ہوئے نہ کہ حمزہؓ۔ پھر آپ نے صرف حمزہؓ کے سید الشہداء ہونے پر کیوں زور دیا سرے سے انکار کرنا چاہیے تھا خصوصاً اس لئے بھی کہ حمزہؓ ہوں سید الشہداء یا جعفر طیار ہوں یا حسین ہوں یہ سب ایک ہی گھر کے افراد ہیں۔ اِن میں حضرت عثمانؓ کے گھر کا تو کوئی بھی نہیں۔ سیادتِ شہداء رہی ہر پھر کر ایک ہی گھر میں۔ پھر قرآنِ کریم کو سامنے کھولے ہوئے ان تینوں میں سے ایک بھی شہید نہیں ہوا اس صورت میں بقول جنابِ والا حضرت عثمانؓ کو صرف امام حسینؑ ہی پر کیوں فضیلت ہوئی قرآن کے سامنے ہونے کی بناء پر ان کو حضرت حمزہؓ

اور حضرت جعفر طیار دونوں پر فضیلت ہوئی اور سید الشہداء حضرت عثمانؓ ہوئے نہ کہ حمزہؓ و جعفرؓ۔ آپ یہ بھی لکھتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ پر چالیس روز پانی بند رہا یہ بات تو آپ کے اور آپ کے ہمنوا حضرات کے سوچنے کی ہے کہ چالیس روز بے آب رہ کر کوئی زندہ رہ بھی سکتا ہے یا نہیں۔ ممکن ہے کہ آپ کا مطلب یہ ہو کہ پانی کی چالیس روز بندش تھی مگر دودھ شربت لسی جیسے مشروبات مہیا تھے۔ میرے مہربان چالیس روز کی مدت کچھ کم نہیں ہوتی ایک معمولی آدمی بھی اگر چالیس روز محصور اور مقید اور خطرۂ جان میں مبتلا رہے تو واقعہ کی خبر دُور دُور پہنچ جائے گی چہ جائیکہ خلیفہ رسولؐ اور مقتدائے ملت۔ اس چالیس روز کی مدت میں آپ صاحبان کہاں سوئے رہے یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ خلافت کے برحق ماننے والے شمع خلافت کے پروانے اپنی اپنی جگہ عیش و آرام کی زندگی بسر کرتے رہے اور کسی کو یہ پروانہ ہوئی کہ خلیفہ رسولؐ پر کیا گزر رہی ہے۔ چالیس دن میں جب کہ زمانہ بھی حج کا تھا مدینہ تو مدینہ خلیفہ کی محصوری' بے کسی اور بے آبی کی خبر مصر' شام اور بصرہ تک ہر جگہ پہنچی ہو گی جہاں خلیفہ وقت کے اقرباء خاص تخت حکومت پر دندنا رہے تھے مگر خلیفۂ عصر کی حمایت کے لئے نہ کوئی باہر سے آیا نہ کوئی مدینہ سے نکلا۔

آپ کہتے ہیں کہ قرآن کریم ان کی شہادت کی گواہی دے گا تو کیا قرآنِ کریم یہ گواہی نہ دے گا کہ ان کی قوم و ملت نے ایسی بے رُخی اور بے وفائی اختیار کی کہ چالیس دن کی مدت میں کسی ایک کو بھی جوشِ نصرت نہ ہوا اور خلیفہ دن دہاڑے مدینہ کی آبادی میں اپنے گھر میں محصور اور بے آب رکھ کر قتل کر دیئے گئے۔ کیا قرآن صرف قتل کرنے والوں کی شکایت کرے گا اور ان لوگوں کی شکایت نہ کرے گا جن کے سکوت بیجا نے قتل کی اسکیم کو کامیاب بنا دیا؟ کیا یہ لوگ جو باخبر ہونے کے باوجود بے خبر بنے رہے اور عقیدت مند ہو کر خاموش بیٹھے رہے شریکِ قتل نہیں ہوئے؟

جو شخص کسی قوم کے فعل پر راضی رہے وہ خود بھی اس فعل کا فاعل ہے۔ اگر اس موقع پر آپ علیؑ اور علیؑ والوں کی طرف دیکھیں تو یہ بالکل غلط ہے۔ ذمہ داری

اپنے اہلِ مسلک پر ہوتی ہے دوسروں پر نہیں جن کا مسلک ہی جداگانہ ہے۔ یہ بھی اپنی کتابوں میں دیکھنے کی زحمت فرمالیجئے کہ قتل حضرت عثمانؓ کا فتویٰ کس بارگاہ سے صادر ہوا تھا اور اقتلوا نعثلاً کس محترمہ نے فرمایا تھا۔ ایک اور نکتہ لائق توجہ ہے وہ یہ کہ شہید ہونے والا خود کبھی اپنے ہاتھوں شہید نہیں ہوتا اس کو شہید کیا جاتا ہے۔ شہید کا شہید ہونا براہِ راست اس کا ذاتی فعل نہیں ہوتا۔ شہید کے درجات کی بلندی صرف اس بناء پر ہے کہ اس نے جہاد فی سبیل اللہ کے لئے ثابت قدم رہ کر یہ ٹھان لیا کہ اس راہ میں اگر میں قتل بھی کر دیا جاؤں تو مجھے بجان ودل سے منظور ہے میں قتل سے بچنے کیلئے نہ قتال میں کوتاہی کروں گا نہ کارزار کے میدان کو چھوڑ کر کسی گوشہ عافیت کی تلاش کروں گا اب اس کو کوئی قتل کر سکے یا نہ کر سکے اور وہ شہید ہو جائے یا نہ ہو جائے اس میں اس کے کسی ارادہ کا کوئی دخل نہیں وہ اپنے فرض کو ادا کر رہا ہے اور اس راہ میں شہید ہو جانے کو آمادہ ہے اس کی ذمہ داری اس سے زیادہ کچھ نہیں نیّة المومن خیر من عمله لہذا جن حضرات نے آمادۂ شہادت ہو کر قتال کیا وہ موقع پر شہید ہو جائیں یا نہ ہو جائیں شہادت کے حسنات ودرجات ان کو حاصل ہیں پھر جنہوں نے ہر معرکہ جہاد میں اپنی جان کو معرضِ شہادت میں پیش کیا ہو اور کسی معرکے میں شہادت سے بچنے کی راہ نہ ڈھونڈی ہو ان کو کتنی شہادتوں کا درجہ حاصل ہوگا خواہ وہ شہید نہ ہوئے ہوں کیونکہ ان کا کام شہادت کے لئے اپنے آپ کو پیش کر دینا تھا شہید ہو جانا ان کا کام نہ تھا۔ جناب اسماعیل علیہ السلام ذبیح اللہ اور ان کے بعد جناب عبداللہ (پدرِ سرکارِ رسالت) ذبیح اللہ اسی بناء پر تو ہیں کہ انہوں نے رضاء خدا کے لئے ذبح ہو جانا منظور کیا اگرچہ موقع پر ذبح نہیں ہوئے ان کی ذمہ داری تو صرف یہی تھی کہ وہ ذبح ہونے کے لئے اپنے آپ کو پیش کر دیں ذبح ہو جانا تو ان کا کام نہ تھا۔ اس سے اندازہ کیجئے کہ علی مرتضٰی جیسی ہستیوں کو جو تمام معارک جہاد میں ثابت قدم رہ کر اور بار بار اپنی جان کو شہادت فی سبیل اللہ کے لئے پیش کرتے رہے کتنی کچھ شہادتوں کے اعلیٰ درجات حاصل ہیں۔ اس حقیقت کے ساتھ اس پر بھی نظر ڈال لیجئے کہ جس معرکہ احد میں حضرت حمزہؓ کو

سید الشہداء کا لقب ملا اسی جنگ میں آپ کے ممدوح نے جن کو آپ امام حسینؑ سے بھی افضل بتا رہے ہیں جو کار نمایاں انجام دیا اس کی بناء پر وہ کس لقب کے مستحق ہوئے۔ حسین تو حسین ان کے کسی غلام حبشی نے بھی جان بچانے کے لئے کربلا جیسا ہولناک میدانِ کارزار نہ چھوڑا اور ہنس کھیل کر مشتاقِ شہادت ہو کر ہر ایک نے جان دے دی نہ فرار کے لئے ان کا پیر اٹھا نہ بیعتِ جفاکار کے لئے ان کا ہاتھ اٹھا لیکن جن کو آپ حسینؑ سے بھی افضل فرما رہے ہیں میری تو یہ مجال نہیں کہ میں ان کے خلافِ شان کوئی لفظ کہوں نہ میری یہ عادت ہے کہ میں خواہ مخواہ اسلاف کی توہین کروں میں نے یہ کہنا یا لکھنا کبھی گوارا نہیں کیا کہ حسینؑ کا مرتبہ حضرت عثمان سے بلند ہے اگرچہ یہ میرا ایمان ہے کہ پنجتن پاک علیہم السلام تمام کائناتِ عالم سے افضل واعلیٰ ہیں بلکہ وجہ تخلیق کائنات ہیں لیکن میں کیوں کسی کا نام لیکر تقابل کروں اب آپ نے جب ہم سے خود یہ کہا ہے کہ ''حضرت عثمان کی شہادت حضرت امام حسینؑ سے افضل ہے'' تو ہم مجبوراً عرض کرتے ہیں کہ جس معرکہ اُحد میں حضرت حمزہؓ سید الشہداء یعنی شہیدوں کے سردار قرار پائے اسی جنگ میں آپ کے ممدوح کس گروہ کے سردار قرار پائے اس کو خود اپنی ہی تاریخوں بلکہ تفسیروں سے معلوم کر لیجئے ہم نمونہ کے طور پر آپ کے شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی کتاب معارج النبوۃ کی عبارت نقل کر دیتے ہیں۔

''اصحاب در آں حین بر چہار قسم شدند جمعے جنگ کردند یا شہید شدند
وگروہے گریختند ودر زوایاء شعابِ جبل مخفی گشتند وبعضے بہ شہر رفتند و
قرار گرفتند و عثمان بن عفان از آں جملہ بود''۔

یعنی اصحاب اس وقت چار قسم کے ہو گئے ایک وہ جو جنگ کرتے رہے دوسرے وہ جو شہید ہو گئے تیسرے وہ جو بھاگ گئے اور پہاڑ کے گوشوں میں چھپ گئے چوتھے وہ جو شہر مدینہ میں جا کر اطمینان سے بیٹھ گئے اور حضرت عثمان انہی (چوتھی قسم کے) لوگوں میں سے تھے۔ اس کے ساتھ امام فخر الدین رازی کی تفسیر کبیر کو بھی دیکھ لیجئے۔

ومن المنهزمين عمر رضی الله تعالیٰ عنه الا انه لم يكن

فی اوائل المنهزمین ولم یبعد بل ثبت علی الجبل ومنهم
ایضاً عثمان رضی اللّٰہ تعالیٰ عنه انهزم مع رجلین یقال
لهما سعد وعقبة انهزموا لبعیدا ثم رجعوا بعد ثلاثة ایام

یعنی معرکۂ اُحد سے گریز کر جانے والوں میں سے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی ہیں مگر وہ نہ تو سب سے پہلے گریز کرنے والوں میں سے تھے اور نہ وہ گریزاں ہو کر دور گئے تھے بلکہ کوہِ اُحد ہی پر ٹھہرے رہے اور گریز کرنے والوں میں سے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی ہیں جن کے ساتھ دو آدمی سعد اور عقبہ بھی تھے یہ تینوں بہت دور پہنچ گئے تھے پھر یہ لوگ تین روز کے بعد واپس آئے۔ حضرت عثمان صحابی رسولؐ تو تھے ہی اس پر مستزاد یہ کہ دامادِ رسول بھی بتایا جاتا ہے اور حقیقی داماد کہا جاتا ہے لیکن یہیں سے اس حقیقت کا اظہار ہو جاتا ہے کہ جو واقعاً اور حقیقتاً رسولؐ اکرم کا داماد تھا وہ زخم پہ زخم کھا کر تن تنہا رسولؐ کی حفاظت کر رہا تھا جس نے سولہ کاری زخم کھائے مگر سینہ سپر بن کر جانِ رسولؐ کی حفاظت کی یہ ہے دامادی اور حق استادی۔ میں پھر یہ کہتا ہوں کہ میرا مقصد اس بیان سے کسی کی تنقیص نہیں ہے میں سمجھتا ہوں کہ انسان خاک کا پتلا ہے اور خطاء و نسیان سے مرکب ہے۔ خطرناک مواقع پر حواس باختہ ہو جانا خاکی انسان سے بعید نہیں ہے لیکن ان کا خاصانِ خدا سے تقابل کرنا اور ان خاصانِ خدا سے تقابل کرنا جن کا واسطہ انبیاء نے دیا ہو' جن کی سرشت پاک و پاکیزہ جو روحانیت و نورانیت کا مجسمہ ہوں کتنا بے محل اور مہمل ہے آپ حضرت عثمان کے قتل کو شہادت سمجھیں یا ان کی شہادت کو امام حسین علیہ السلام کی شہادت پر ترجیح دیں آپ اپنے نظریات کے لئے بااختیار ہیں لیکن بات ہم سے کہنے کی نہیں تھی اور کہی ہے تو ہم اتنا ضرور کہیں گے کہ قتل اور شہادت میں عام خاص کی نسبت ہے یعنی ہر شہید مقتول ہے لیکن ہر مقتول شہید نہیں۔ شہادت کے لئے شرط ہے کہ خدا کی راہ میں قتل کیا جائے یہ موقع موصوف کو معرکہ اُحد میں پورے طور پر مہیا تھا لیکن چونکہ مشتاقِ شہادت نہ تھے اپنے ہاتھوں بلکہ اپنے پیروں چل کر چھوڑ دیا۔ شہادت کے لئے فی سبیل اللہ قتل کئے

جانے کی شرط صاف بتارہی ہے کہ صرف وہ مقتول شہید ہے جس کے قتل کیے جانے کا سبب صرف اس کی دینداری ہو دینداری کے سوا اور کوئی وجہ مخاصمت یا عداوت یا جذبہ انتقام نہ ہو۔ یہ ظاہر ہے کہ قتل کرنے والا جب کسی کو اس کی دینداری کی عداوت سے قتل کرے گا تو پھر قاتل ہرگز دیندار نہ ہوگا اس لئے ضروری ہوا کہ اگر ایک طرف مقتول شہید ہے تو دوسری طرف اس کا قاتل بے دین اور غیر مومن ہے لہذا وہ صدہا لوگ جن کا موصوف کے قتل میں ہاتھ تھا وہ سب بے دین اور کافر ہوئے۔ ساتھ میں فتوائے قتل دینے والی ذات بھی یہی نہیں بلکہ ان لوگوں کے علاوہ جو عملاً خلیفہ کی جان کے دشمن اور قتل کرنے کے خواہش مند تھے وہ تمام لوگ بھی جو علم و اطلاع کے باوجود خاموش تماشائی بنے بیٹھے رہے جن کے سکوت و جمود نے قتل کی اسکیم کو کامیاب بنادیا بے دین ثابت ہوں گے لہذا اگر حضرت عثمان کو آپ شہید کہنا چاہتے ہیں تو ان تمام افراد کو جن میں اکابر ملت اور صحابہ رسولؐ سب ہی آجاتے ہیں بے دین کہنا پڑے گا۔ کیا حضرت عثمان کے قتل کرنے والوں کا قتل کرنا اور خاموش رہنے والوں کا خاموش رہنا صرف اس بناء پر تھا کہ یہ مسلمان کیوں ہیں مومن کیوں ہیں نماز کیوں پڑھتے ہیں روزہ کیوں رکھتے ہیں حج کیوں کرتے ہیں قرآن کیوں پڑھتے ہیں انصاف کیوں کرتے ہیں اللہ کے اطاعت شعار اور دیندار کیوں ہیں؟ نہیں ہرگز نہیں خود یہ لوگ (قاتلان و دشمنان عثمان) خدا اور رسولؐ کے ماننے والے تھے' نمازی تھے' روزہ دار تھے' پابندِ ارکانِ دین تھے' انصاف کے دشمن نہ تھے بلکہ خواہش مند تھے' انصاف چاہتے تھے' ناانصافی کے شاکی تھے۔ خائن' ظالم اور شرابی حکام و عمال سے بیزار تھے اور بار بار اُن کی شکایت بارگاہِ خلافت میں پیش کرتے تھے۔

آپ خود اپنی کتابوں کو اٹھا کر دیکھئے تو آپ کو وہ تمام واقعات معلوم ہو جائیں گے جو لوگوں کی عام بددلی اور خلیفہ سے ناراضی کا سبب ہوئے ہم کہاں تک بیان کریں۔ ہم خلیفہ کی انتہائی حمایت کرنا چاہیں اور ان کے ادب سے براہِ راست اُن کے بارہ میں کچھ نہ کہہ سکیں تو کم از کم اتنا ضرور کہیں گے کہ مروان جیسی خود غرض اور دنیادار

ہستیوں نے خلیفہ پر حاوی ہو کر ان کو ایسے راستہ پر لگا دیا تھا جس سے خلیفہ کے اقربائے خاص کے سوا تمام ملتِ اسلامیہ، صحابہ کبار امہات المومنین سب ہی کے دل و جگر میں ناسور ہو گئے تھے آخر میں حاکمِ مصر کے نام خلیفہ کے نام سے ایک خط روانہ ہوتا ہے کہ تم محمد بن ابی بکر کو جس کو ہم نے تمہاری جگہ عامل مصر قرار دیا ہے قتل کر دو یا کرادو اور خود اپنی جگہ قائم رہو۔ قاصد خلیفہ ہی کی سانڈنی پر سوار ہو کر چلتا ہے۔ راستہ میں محمد بن ابی بکر کے قافلہ کو وہ تیز رفتار قاصد نظر آجاتا ہے بلا کر اس کی تلاشی لی جاتی ہے تو وہ خط برآمد ہوتا ہے جس پر خلیفہ کی مُہر ثبت ہے یہ قافلہ پھر مدینہ واپس آتا ہے خلیفہ کے سامنے وہ پروانہ رکھا جاتا ہے وہ فرماتے ہیں کہ اس پر مُہر بھی میری ہے یہ سانڈنی بھی میری ہے مگر میں نے یہ خط لکھایا نہیں یہ مروان کا عمل ہے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ مروان کو سزایاب ہونا چاہیے لیکن مروان کو سزا دینے کے لئے خلیفہ آمادہ نہیں بات بگڑتی چلی گئی خلیفہ کو یقین تھا کہ اور لوگ تو میرے ہاتھوں زخمی ہو چکے ہیں کسی صحابی کو لاتوں سے پٹوایا ہے، کسی کو پتھروں پر گھسٹوایا ہے، کسی کو شہر بدر کر کے مدینے سے نکلوایا ہے اور یہ شکایت تو عام ہے کہ عام مسلمانوں کے مالی حقوق صرف بنی امیہ اور خاص طور پر مروان کے لئے مخصوص ہو چکے ہیں حتیٰ کہ وہ فدک جو سیدہ فاطمہؑ کو نہ دیا گیا تھا مروان کی جاگیر کر دیا گیا۔ افریقہ کے غنائم اور خمس کا زر کثیر مروان کی نذر کیا جا چکا ہے اس صورت میں عام لوگ تو میری نصرت کو کیوں نکلیں گے لیکن میری قوم و قبیلہ کے گورنر اور حکام خاموش نہیں بیٹھ سکتے ضرور میری مدد کو آئیں گے ان کو اطلاع بھی ضرور کر دی گئی ہو گی زیادہ توقع حضرت معاویہ سے تھی کیونکہ وہ سب سے بڑی طاقت کے مالک تھے اور برسوں سے شام کے گورنر کیا بادشاہ تھے لیکن وہ اپنی خلافت کے خواب دیکھ رہے تھے امداد کے لئے کوئی بھی نہ آیا۔

مروان اور مروان جیسے خود غرض اور دنیا داروں کے پیچھے خلیفہ کی جان گئی۔

یہ وہی مروان ہے جس کی شرارتوں کی وجہ سے رسولؐ نے مدینہ سے نکلوا دیا تھا اور بعد رسولؐ خلیفہ اول و ثانی نے بھی شہر بدر ہی رکھا تھا لیکن حضرت عثمان نے پھر مدینہ بلا کر

اپنا مقرب خاص بنالیا اور اپنی بیٹی بھی مروان سے بیاہ دی۔ حضرت عثمان نے اپنے مادری بھائی ولید بن عقبہ کو جس کے جہنمی ہونے کی خبر جناب رسول خداؐ نے دی تھی گورنر کوفہ بنایا۔ یہ شخص شرابی تھا' صبح کی نماز بھی نشہ کی حالت میں پڑھتا تھا (تاریخ مروّج الذہب مسعودی) موصوف نے اپنے رضاعی بھائی عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کو مصر کا حاکم قرار دیا جس کا قتل رسولؐ اللہ نے مباح فرمایا تھا۔ غرض کہ خلیفہ کی طرف سے اور خلیفہ کے نام سے پے در پے ناشدنی امور ہوئے کہ جن کی بناء پر حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے بھی سلام وکلام ترک کر دیا تھا جنہوں نے شوریٰ کے سلسلہ میں حضرت عثمان کو خلافت پیش کی تھی۔ (عقد الفرید)

ان واقعات سے جو مشتے از خروارے کے طور پر مختصراً بیان کیے گئے یہ امر بخوبی واضح ہو رہا ہے کہ موصوف کے مخصوصین کے علاوہ عام صحابہ وافراد ملت اسلامیہ خلیفہ سے انتہائی بد دل ہو چکے تھے جس کے نتیجہ میں خلیفہ قتل ہو گئے۔ موصوف اپنی جگہ لاکھ دیندار ہوں لیکن وجہ قتل اور وجہِ مخاصمت مقتول کی دینداری اور قاتلان کی بے دینی ہر گز نہیں اگر دیندار تھے تو دونوں طرف تھے۔ قتل کے اسباب اور محرکات کچھ اور تھے جن کی بناء پر ایک گروہ نے قتل کیا اور دوسرا گروہ خاموش رہا۔ ان حالات میں قتل ہو جانے کو شہادت کہا جائے گا یا نہیں اور مقتول شہید کہلائے گا یا نہیں اس کو قرآن کریم کے معیارِ شہادت پر خود پرکھ لیجئے۔

آپ کے اس نظریہ کا ''حضرت عثمان کی شہادت امام حسینؑ سے افضل ہے'' ہم جواب دے چکے لیکن طالبِ ہدایت کے لئے ہم دو عنوان قائم کرتے ہیں تاکہ صحیح تقابل سے صحیح نتیجہ برآمد ہو سکے پہلا عنوان ''مقامِ حسین'' دوسرا عنوان ''مرتبۂ شہادتِ حسین''۔

مقامِ حسینؑ :

مقامِ حسین کے ذکر کے لئے ایک دفتر درکار ہے اور وہ بھی ناکافی ہے ہم نہایت اختصار سے آپ کی کتاب ینابیع المودّۃ کے چند جملے لکھے دیتے ہیں جو آپ کی

دوسری مستند کتابوں میں بھی جا بجا ملیں گے۔ صاحب ینابیع المودۃ نے کتاب مودۃ القربیٰ (قدوۃ العارفین امیر سید علی بن شہاب ہمدانی) سے حدیثِ مبارک رسولِ اکرمؐ کو بیان کیا ہے۔

جناب ام سلمہ کے غلام ابو رباح سے روایت ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

(۱) ”اگر اللہ تعالیٰ کو اس بات کا علم ہوتا کہ روئے زمین پر علی، فاطمہ، حسن اور حسین سے کوئی زیادہ عزت والے بندے موجود ہیں تو اللہ تعالیٰ مجھے ضرور حکم دیتا کہ میں ان کو لے جا کر مباہلہ کروں لیکن اللہ تعالیٰ نے مجھے ان حضرات کے ساتھ جا کر مباہلے کا حکم دیا تھا اور یہ لوگ تمام مخلوق سے افضل ہیں اور انہی حضرات کے ساتھ میں نصاریٰ پر غالب ہوا۔ (صفحہ 387)

پھر حوالۂ مذکورۃ الصدر کے مطابق یہ حدیث مبارک بیان کی ہے۔

(۲) اصبغ بن نباتہ، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلعم کو فرماتے ہوئے سُنا کہ میں خود، علی، حسن، حسین اور حسین کے نو فرزند، پاک اور معصوم ہیں۔ (صفحہ 410)

پھر حدیث مبارک ذیل کو بیان کیا ہے

(۳) عکرمہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلعم نے عبدالرحمٰن بن عوف سے فرمایا اے عبدالرحمٰن تم میرے صحابی ہو اور علی بن ابی طالب میرے بھائی ہیں اور مجھ سے ہیں اور میں علیؑ سے ہوں۔ علیؑ میرے علم کا دروازہ ہیں اور میرے وصی ہیں۔ علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ اور حسینؑ شرافت اور بزرگی کے لحاظ سے تمام زمین والوں سے افضل ہیں۔ (صفحہ 419)

صفحہ مذکورہ پر یہ حدیثِ مبارک بھی مندرج ہے۔

(۴) سلیم بن قیس ہلالی سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ میں

نبی صلعم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ امام حسین علیہ السلام آپؐ کے زانو پر بیٹھے ہوئے تھے آنحضرت ان کی دونوں آنکھوں کو اور ان کے منہ پر بوسہ دے رہے تھے اور فرماتے تھے تو سردار ہے، سردار کا فرزند ہے تو امام ہے امام کا فرزند ہے تو حجت ہے حجت کا فرزند ہے تو نو حجتوں کا باپ ہے جن میں کا نواں قائم (عجل اللہ فرجہ) ہوگا۔

(۵) کتاب مودۃ القربیٰ (قدوۃ العارفین امیر سید علی بن شہاب ہمدانی) سے صاحبِ ینابیع المودۃ نے بیان فرمایا ہے۔ انس بن مالک نے رسول اللہ سے سُنا ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا ہم اولادِ عبدالمطلب ہیں۔ علی، حمزہ، جعفر، حسن، حسین اور مہدی (عجل اللہ فرجہ) جنت کے رہنے والوں کے سردار ہیں۔ اس حدیث سے بھی واضح ہو گیا کہ کسی گروہ پر اپنے اپنے درجہ کے اعتبار سے کئی سید و سردار ہو سکتے ہیں۔ جناب حمزہؑ و جعفرؑ عام اہل بہشت سے افضل اور حمزہؑ و جعفرؑ سے حسن، حسین اور مہدی علیہم السلام افضل اور ان تینوں حضرات سے حضرت علی مرتضٰی افضل اور حضرت علی مرتضٰی سے سرکار رسالت افضل لیکن اس پوری فہرست میں آپ کے کسی بھی ممدوح کا ذکر نہیں۔

(۶) وہ حدیث پیغمبر ہے جس کو آپ کے بہت سے علماء اعلام نے بہت سے اسناد اور رُوات سے بیان فرمایا۔ ینابیع المودۃ میں بھی اس حدیث کا تذکرہ جابجا مختلف ابواب میں موجود ہے یعنی سرکارؐ نے فرمایا کہ حسن و حسین جوانانِ جنت کے سید و سردار ہیں اور ان کے باپ اُن سے افضل ہیں۔

(۷) خود آپ کے ممدوح حضرت عثمان بیان فرماتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے خلقتِ آدمؑ سے چار ہزار سال پہلے مجھے اور علیؑ کو ایک نور سے پیدا کیا...... میرے لئے نبوت ہے اور علی کے لئے وصیت (وصی نبیؐ ہونا) ہے۔ (از مودۃ القربیٰ و ینابیع المودۃ)

(۸) ابن عباس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ آنحضرت نے فرمایا میں اور علیؑ ایک شجر

سے پیدا ہوئے دوسرے لوگ مختلف درختوں سے پیدا ہوئے میں اس درخت کی اصل ہوں اور علیؑ اس کی فرع ہیں۔ حسنؑ اور حسینؑ اس درخت کے پھل ہیں اور ہمارے شیعہ اُس درخت کے پتے ہیں۔ جس شخص نے ان میں سے کسی کا دامن تھام لیا نجات پا گیا اور جو الگ رہا وہ ہلاک ہو گیا۔ (از مودة القربیٰ و ینابیع المودة)

ہم نے محض نمونہ کے طور پر ان احادیثِ رسولؐ کو پیش کیا ہے اب کوئی بھی شخص ان ہستیوں سے کسی کو افضل کہہ کر رسولِ اکرمؐ کی تصدیق کرتا ہے یا تکذیب و تردید؟ مقامِ حسینؑ کا نمونہ تو تھا یہ اب ہم شہادتِ حسینؑ کا مقام دکھاتے ہیں۔

حسینؑ کی شہادت کا مقام و مرتبہ:

امام علیہ السلام کی شہادت سے پہلے خلاقِ عالم نے بار بار اپنے رسولؐ سے اس شہادت عظمیٰ کا تذکرہ فرمایا قتل گاہِ امام کی مٹی بھیجی اور رسولِ اکرمؐ اس خبر سے اتنا روئے کہ زمین تر ہو گئی۔

ا۔ مشکوٰۃ میں ام الفضل زوجہ عباسؓ (عم رسول) سے روایت ہے کہ میں رسول کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ میں نے یہ خواب دیکھا ہے کہ آپ کے جسم مبارک کا ایک ٹکڑا جسم سے جدا ہو کر میری گود میں ڈال دیا گیا ہے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا تم نے بھلائی کو دیکھا ہے انشاء اللہ فاطمہؑ کے فرزند پیدا ہو گا وہ تمہاری گود میں ہو گا۔ فرماتی ہیں کہ ایسا ہی ہوا میں اپنی گود میں لے کر حسین کو اپنے فرزند قثم کے ساتھ دودھ پلاتی تھی۔ ایک روز حضرتِ رسولؐ آئے اور حسین کو اپنی گود میں لیا میں نے دیکھا کہ رسولؐ کی دونوں آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی بندھی ہوئی ہے۔ میں نے سبب پوچھا تو فرمایا کہ اللہ نے جبرئیلؑ کے ذریعہ سے مجھ سے کہہ دیا ہے کہ عنقریب میری امت میرے اس فرزند کو قتل کرے گی میں نے متعجب ہو کر کہا کہ ایسا ہو گا تو

سرکار نے فرمایا کہ ہاں جبرائیلؑ نے مجھے سرخ مٹی بھی لا کر دی ہے۔ (از ینابیع المودۃ)

۲۔ یہی مضمون حدیث رسول بی بی عائشہؓ نے بھی بیان فرمایا ہے (ینابیع المودۃ۔ جمع الفوائد۔ صواعق محرقہ) بی بی کے بیان میں یہ بھی ہے کہ آنحضرت نے مقتل کا نام بھی لیا ہے۔ ”کربلا“

۳۔ انس بن حارث نے بھی رسول کے اس ارشاد کو بیان کیا ہے کہ میں نے خود سنا ہے کہ آپ نے کربلا کا نام لے کر شہادت حسینؑ کا ذکر فرمایا اور یہ بھی فرمایا کہ اس موقع پر تم میں سے جو بھی ہو وہ حسینؑ کی مدد کرے چنانچہ انس بن حارث نے خود اس حکم رسولؐ کی تعمیل کی اور کربلا میں نصرتِ امام کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔ (ینابیع المودۃ باب 60)

۴۔ امام احمد بن حنبل نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا کہ میرے پاس ایک فرشتہ آیا ہے جو اس سے قبل کبھی نہیں آیا اور مجھ سے کہا کہ آپ کا بیٹا حسینؑ قتل کر دیا جائے گا۔ آپ چاہیں تو میں اس سرزمین کی مٹی دکھا دوں جہاں وہ قتل ہوں گے یہ کہہ کر اس فرشتہ نے ایک سرخ مٹی دی۔ (صواعق محرقہ و ینابیع المودۃ)

۵۔ اسی مضمون کی حدیث حضرت انس نے بھی بیان کی ہے اور کہا ہے کہ آنحضرت نے وہ مٹی جناب ام سلمہ کی امانت اور حفاظت میں دی۔ (صواعق محرقہ و ینابیع المودۃ)

۶۔ ملا اور ابن احمد کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا! اے ام سلمہ جب یہ مٹی خون ہو جائے تو سمجھ لینا کہ حسینؑ قتل کر دیئے گئے ہیں۔ ام سلمہ نے کہا کہ میں نے اس مٹی کو ایک شیشی میں رکھ دیا تھا وہ مٹی قتلِ حسینؑ کے دن خون ہو گئی تھی یہ بھی فرماتی ہیں کہ امام حسینؑ کے قتل ہونے کے بعد رات کو میں نے کسی کہنے والے کو یہ کہتے ہوئے سنا۔

ایُّھا القاتلون جَھْلاً حُسَیْناً فابَشِرُوْا بالعذاب والتّذلیل
قد لُعنْتُم علیٰ لسانِ داؤد و موسیٰ و حاملِ الانجیل

یعنی اے حسینؑ کے جاہل قاتلو! تم کو عذاب اور ذلت کی بشارت ہو۔ تم وہی ہو جن پر داؤد، موسیٰ اور حامل انجیل (عیسیٰؑ) نے لعنت کی ہے۔ (صواعق محرقہ و ینابیع المودۃ)

۷۔ ابن سعد نے شعبی سے روایت کی ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ شام کی طرف جاتے ہوئے زمین کربلاء سے گزرے تو آپ اتنا روئے کہ زمین آپ کے آنسوؤں سے تر ہو گئی فرمایا کہ میں رسولؐ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپؐ رو رہے تھے میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں آپ کیوں رو رہے ہیں فرمایا! ابھی ابھی جبرائیل میرے پاس موجود تھے کہہ رہے تھے کہ میرا فرزند حسینؑ فرات کے کنارہ قتل ہو گا اس جگہ کو کربلا کہتے ہیں جبرائیل نے اس جگہ کی مٹی کی ایک مٹھی مجھے سنگھائی جس سے میں بے اختیار رونے لگا۔ یہ واقعہ امام احمد بن حنبل نے بھی بیان کیا ہے۔ (صواعق محرقہ و ینابیع المودۃ)

حاصلِ کلام یہ ہے کہ اس شہادتِ عظمیٰ سے پہلے پروردگارِ عالم نے انبیاء سابقین کو مطلع کیا اور انہوں نے ملول ہو کر قاتلانِ امام پر لعنت کی پھر قدرت نے اپنے آخری نبیؐ پر اس شہادت کے واقعات کی وحی کی جس سے آنحضرت بے قرار ہو کر روئے خاکِ مقتل بھی رسولؐ کو دی گئی جس کو ام سلمہ کی امانت میں دیا گیا بلکہ اسی کتاب ینابیع المودۃ و صواعق محرقہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ قدرت نے رسولؐ کو زمین کربلا بھی دکھائی۔ علی مرتضیٰؑ نے سفر جنگ صفین میں اس زمین کو پہچانا تو بہت روئے اور زمین کربلا کے الگ الگ مقامات دکھا دکھا کر بتایا کہ اِس جگہ یہ واقعہ ہو گا اور اُس جگہ وہ واقعہ۔ یہ واقعات اور بیانات تو تھے شہادت کے قبل کے۔ اب ہم اُن اہم واقعات کو مختصراً بیان کرتے ہیں جو شہادت کے وقت اور شہادت کے بعد رونما ہوئے۔

۱۔ ترمذی نے سلمٰی سے روایت کی ہے کہ انصار کی ایک عورت نے کہا کہ میں ام سلمہؓ (زوجۂ رسولؐ) کی خدمت میں حاضر ہوئی تو آپ رو رہی تھیں میں نے عرض کیا کہ آپ کیوں رو رہی ہیں؟ ام سلمہؓ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ کو خواب میں دیکھا ہے آپ کی ریش مبارک اور سر اقدس خاک آلود ہے۔ میں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسولؐ آپ کو کیا ہو گیا ہے؟ فرمایا میں ابھی ابھی قتل گاہِ حسین پر موجود تھا۔ (صواعق محرقہ و ینابیع المودۃ)

۲۔ اسی طرح حضرت ابن عباس نے رسول اللہ صلعم کو دوپہر کے وقت پریشان حال اور غبار آلود حالت میں دیکھا اور دیکھا کہ آپؐ کے ہاتھ میں ایک شیشی تھی جس میں خون موجزن تھا۔ ابن عباس نے دریافت کیا فرمایا حسینؑ اور اس کے اصحاب کا خون ہے۔ ابن عباس کہتے ہیں کہ اسی خواب سے میں متفکر ہوا اور بالآخر معلوم ہوا کہ اسی روز امام حسین شہید ہوئے۔ (صواعق و ینابیع)

۳۔ جناب اُمّ سلمہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے جنّات کے نوحوں کو یا تو وفاتِ رسولؐ کے دن سنا تھا یا اس رات کو سُنا جو شہادتِ حسین کے دن کے بعد آئی پھر ان نوحوں کو الگ الگ بیان کیا ہے جن میں سے ایک وہی نوحہ ہے جو ہم بیان کر چکے ہیں۔

ایّھا القاتلون جھلاً حسیناً الخ

۴۔ جب امام حسینؑ کا سر اقدس مع اہلِ حرم یزید کی طرف لے جایا جا رہا تھا تو وہ لوگ (اشقیا) ایک منزل پر اتر گئے اور شراب نوشی میں مشغول ہو گئے وہاں ایک راہب کا دیر تھا ناگاہ دیوار سے ایک ہاتھ نمودار ہوا اس ہاتھ میں لوہے کا قلم تھا اس ہاتھ نے دیوار پر خون سے لکھ دیا:

اترجو امّۃ قتلت حسیناً! شفاعۃ جدّہٖ یوم الحساب

کیا اب بھی حسین کے قاتل حشر کے دن حسین کے جدّ کی شفاعت کی امید رکھتے ہیں؟

فلا واللہ لیس لھم شفیع وھم یوم القیٰمۃ فی العذاب

نہیں خدا کی قسم ان کا کوئی شفیع نہیں ہے اور وہ لوگ روزِ قیامت عذاب ہی میں ہوں گے (صواعق وینابیع)

ان غیبی اشعار کا ذکر بہت سی کتابوں میں اور بہت زبانوں پر آیا ہے بلکہ ینابیع المودۃ ترجمہ صفحہ ۵۲۴ پر بیان کیا گیا ہے کہ ابن برقی نے ابو سعید سے اور وہ صالح سے روایت کرتے ہیں جو مسجدِ بنو سلیم کے امام تھے کہ مجھ سے بنو سلیم کے ایک معمر شخص نے بیان کیا کہ ہم نے سرزمین روم پر جنگ لڑی تھی وہاں گرجا گھر میں ایک عربی زبان میں کتاب تھی جس میں یہ شعر موجود تھا اتر جو امۃ الخ اس شعر کو دیکھ کر ہم نے اہل روم سے پوچھا کہ یہ عبارت کس نے لکھی ہے تو انہوں نے کہا کہ ہم کو اس کا علم نہیں۔ محمد بن سیرین نے کہا ہے کہ آنحضرت کی بعثت سے تین سو سال پہلے کا ایک پتھر پایا گیا جس پر سریانی زبان میں یہی شعر درج تھا۔

سلیمان بن یسار نے بیان کیا ہے کہ ایک پتھر پایا گیا جس میں یہ نظم تحریر تھی :

لابد ان ترد القیامۃ فاطمۃٌ   وقمیصھا بدم الحسینؑ ملطخ

ویل لمن شفعاءُہ خصمائہ   والصور فی یوم القیامۃ ینفخ

یعنی یقیناً اور لازماً قیامت کے روز فاطمہؑ اس حالت میں آئیں گی کہ ان کا کرتہ خونِ حسینؑ میں بھرا ہوا ہوگا۔ کیسے بد نصیب ہیں وہ لوگ کہ صور قیامت اس حالت میں پھونکا جائے گا کہ شفیعانِ روزِ محشر ان سے اپنے خونوں کا انتقام لینے کھڑے ہوں گے۔ (از صواعق وینابیع)

منصور بن عمار اور دوسرے آدمیوں نے روایت کیا ہے کہ یہ شعر سرزمین روم پر ایک گرجا میں تحریر تھا نہ معلوم کس نے لکھا تھا۔

(۵) حافظ ابو نعیم اپنی کتاب دلائل النبوۃ میں نصرۃ الازدیہ سے روایت کرتے ہیں کہ جب امام حسین علیہ السلام شہید کر دیئے گئے تو آسمان سے خون کی بارش ہوئی تھی جب ہم نے صبح کی تو ہمارے کجاوے اور گھڑے خون سے بھرے

ہوئے تھے۔ نصرۃ کی حدیث کے علاوہ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ آسمان سیاہ ہو گیا تھا اور دن کو ستارے دکھائی دینے لگے تھے اور جو پتھر اٹھایا جاتا تھا اس کے نیچے خون جوش مارتا ہوا نکلتا تھا۔ (حوالۂ سابقہ)

۶۔ امام زہری نے بیان کیا ہے کہ ملک شام میں جو پتھر بھی اٹھایا جاتا تھا اس کے نیچے تازہ خون موجزن ملتا تھا اور بیت المقدس سے جو بھی پتھر اٹھایا جاتا تھا اس کے نیچے سے تازہ خون جوش مارتا ہوا برآمد ہوتا تھا۔ ابو قبیل کا بیان ہے کہ جب امام حسینؑ شہید ہوئے تو سورج کو گرہن لگا اور ستارے ظاہر ہو گئے۔

۷۔ صاحب ینابیع المودۃ نے صواعق محرقہ سے بہت سے راویوں کے نام لے لے کر بعد شہادت ان تمام واقعات کو بیان کیا ہے۔ یعنی آسمان سے خون کا برسنا اور اس خون کے دھبوں کا کبھی کسی کپڑے سے نہ چھوٹنا۔ فرش اور برتنوں کا خون سے بھر جانا، سورج کو گرہن لگنا، ہر جگہ پتھروں کے نیچے سے خون کا برآمد ہونا اور قتلِ حسینؑ میں جو جو شخص شریک ہوا تھا موت سے پہلے اسی دنیا میں اس کا عبرت ناک عذاب میں مبتلا ہونا۔ چنانچہ ابو شیخ نے اور علامہ سبط بن جوزی نے بیان کیا ہے کہ ایک جگہ یہی ذکر ہو رہا تھا کہ شرکاء قتل حسینؑ میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جو دنیا ہی میں معذب نہ ہوا ہو تو ایک شخص نے کہا کہ ہوں تو میں بھی ان ہی میں سے لیکن مجھ پر تو کوئی عذاب نہ آیا۔ میں تو بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں اسی اثناء میں وہ چراغ کو درست کرنے کے لیے اٹھا آگ نے اس کو پکڑ لیا وہ آگ آگ کرتا ہوا دریائے فرات میں کود پڑا۔ اللہ کی شان کہ دریا بھی اس آگ کو نہ بجھا سکا اور وہ جل کر خاک ہو گیا۔ (از صواعق وینابیع)

ان واقعات سے جو محض مشتے نمونہ از خروارے ہیں پورے طور پر واضح ہو گیا کہ جو عظیم اہمیت اس شہادت کے لئے ہے کسی شہادت کے لئے نہیں۔ جب اس شہادت کے مقابلہ میں کوئی بڑے سے بڑی شہادت بھی نہیں آسکتی تو محض کسی کا قتل ہونا جس کے اسباب اور محرکات ہی کچھ اور ہوں اور اسبابِ شہادت سے مختلف ہوں

کیسے متوازن اور متقابل ہو سکتا ہے۔

ج: ہمارے مخاطب محترم کی آخری بات کہ "علیؑ سے مدد مانگنا ناجائز ہے بلکہ کفر ہے کیوں نہ اللہ سے مدد مانگیں جب کہ علیؑ کی بہادری اور طاقت اللہ کی دی ہوئی ہے"۔ یہ ایسی بات ہے کہ روتے ہوئے بھی ایک دم ہنس پڑیں۔

یا علیؑ مدد

علیؑ توجت اللہ، ولی اللہ، نفسِ رسولؐ، امامِ برحق، امیر المومنین، مقربِ بارگاہِ ذوالجلال، شہید اور زندہ جاوید ہیں مدد تو ہم ہر کس و ناکس سے مانگتے ہیں۔ شوہر زوجہ سے، زوجہ شوہر سے، اولاد سے، ماں باپ سے، احباب سے، راستہ چلتے سے، حکام سے، رعایا سے، عالم کا نظام ہی ایک دوسرے کے تعاون سے وابستہ ہے اگر اللہ کے سوا اور کسی سے مدد مانگنا کفر ہے تو معاذاللہ پہلا کافر خود خدا ہوا کیونکہ وہ اپنے بندوں سے مدد مانگتا ہے۔ ان تنصروا اللّٰہ ینصرکم (سورہ محمد آیت 7) یعنی اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا۔ پھر خداوندِ عالم اپنے رسولؐ کو حکم دیتا ہے۔ ناد علیاً مظھر العجائب تجده عونالك فی النوائب یعنی اے رسولؐ علیؑ کو پکارو جو عجائب کے ظہور کی جگہ ہیں تم ان کو اپنے مصائب میں مددگار پاؤ گے۔ چنانچہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اپنی کتاب مدارج النبوۃ میں فرمایا کہ ناد علیا الخ کا نزول ہمز یدیقین جنگِ اُحد میں ہوا۔ (از تاریخ احمدی)

اتنا ہی نہیں بلکہ خدائے تبارک و تعالیٰ نے مومنین کو بھی حکم دیا کہ وہ نجات چاہتے ہیں تو میرے رسولؐ کی مدد اور نصرت کریں فرماتا ہے فالذین آمنوا به وعزروه ونصروه......اولئك هم المفلحون (سورہ اعراف آیت 157) یعنی نجات پانے والے وہ ہیں جو رسولؐ پر ایمان لائے اور رسولؐ کی اعانت کی اور رسولؐ کی جنہوں نے نصرت کی۔ رسولؐ کی مدد کرنے ہی کی بناء پر مومنینِ مدینہ کا لقب انصار ہوا۔

حضرت عیسیٰؑ نے بھی اپنی قوم سے مدد مانگی اور فرمایا من انصاری الی اللّٰہ۔

یعنی تم میں کون لوگ راہ خدا میں میرے مددگار ہیں۔ حضرت ذوالقرنین نے بھی جن کی مدح وثناء قرآنِ کریم نے کی ہے لوگوں سے فرمایا اعینونی بقوۃ (آیۃ قرآنی) یعنی تم لوگ اپنی طاقت سے میری مدد کرو۔ اس کے علاوہ عام مومنین کو حکمِ خدا ہے تعاونوا علی البر والتقوٰی ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان (آیۃ قرآنی) یعنی تم لوگ نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کرو لیکن گناہ اور سرکشی پر تعاون نہ کرو۔ یہاں یہ نکتہ بھی کس قدر لطیف ہے کہ لفظ ''بر'' ہم عدد ہے۔ محمدؐ، علی دونا موں کا اور ادھر لفظ اثم بھی ہم عدد ہے دونا موں کا اور مواخات دونوں جگہ ہے جس کا باطناً مفہوم ہوتا ہے کہ تعاون کرو محمدؐ اور علیؑ سے لیکن تعاون نہ کرو ان دو سے۔ بہر حال اگر غیر خدا سے مدد چاہنا کفر ہو جائے تو ہدے سے لے کر نبیؐ تک اور نبیؐ سے لے کر خدا تک سب معاذاللہ کافر ہوئے جاتے ہیں مومن کوئی بھی نہ رہا۔ آپ کو جس بناء پر یہ احتمال ہوا ہے ہم اس کی وضاحت کئے دیتے ہیں۔ کفر ہے غیر خدا کی پرستش کرنا اور اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو معبود ماننا اسی طرح کفر ہے غیر خدا کو معبود مان کر اس سے مدد چاہنا اسی کی طرف اشارہ ہے ایاك نعبدو ایاك نستعین ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں۔ غالباً اس آیت کے دوسرے جملہ سے یہ وسواس پیدا ہوا ہے کہ غیر خدا سے مدد چاہنا کفر ہے۔ حالانکہ دوسرے جملہ کی وضاحت پہلے جملہ سے ہو چکی ہے کہ یہاں استعانت (مدد چاہنا) سے مراد ہر استعانت نہیں ہے کہ جس سے روکا گیا ہو بلکہ مفہوم آیت یہ ہے کہ ہم نہ تیرے سوا کسی کو معبود مانتے ہیں اور نہ معبود مان کر کسی سے مدد کے خواہاں ہیں۔ یہ آیت اور یہ جملہ اصل میں ان لوگوں کی تردید میں ہے جو غیر خدا کو معبود مانتے تھے اور معبود مان کر اُن سے اپنی حاجتیں طلب کرتے تھے یہ کفار کا شعار اور لیل و نہار تھے لیکن مومن نہ ماسوی اللہ کو معبود مانتا ہے اور نہ ماسوی اللہ کو معبود مان کر اس سے طلبِ حاجات کرتا ہے۔ مومن جس سے بھی مدد کا خواستگار ہوتا ہے وہ نبی ہوں یا علی، اللہ کے سوا کسی کو بھی معبود نہیں سمجھتا پھر یہ کفر کس طرف سے ہوا دُنیا ہو یا آخرت ہر جہان کی مراد کے لئے وسائل سے

مدد لینا ضروری اور ناگزیر ہے۔ شافی مطلق صرف خداوندِ عالم ہے لیکن وسائلِ شفاء اللہ کے سوا اور ہی چیزیں ہیں ان کو اختیار کئے بغیر شفاء نصیب نہیں ہو سکتی۔ ضرر رساں چیزوں سے پرہیز مفید چیزوں اور تدبیروں کا اختیار کرنا لازمی ہوگا اور جہاں ہم خود یہ فیصلہ نہ کر سکیں کہ مضر کیا ہے اور مفید کیا ہے وہاں کسی جاننے والے سے مدد لی جائے گی اسی طرح مجیب الدعوات بالذات اور علی الاطلاق پروردگار عالم کی ذات ہے لیکن محمدؐ و آلِ محمدؐ قبولِ دعا اور حصولِ مراداتِ دوجہان کے وسائل ہیں جیسا کہ امام شافعی نے فرمایا ہے **آل النبی ذریعتی...... وھم الیه وسیلتی...... ارجوبھم اعطیٰ غدا ...... بیدی الیمین صحیفتی** (از ینابیع المودۃ) یعنی آل نبیؐ میرا ذریعہ ہیں اور وہی درگاہِ خدا میں میرا وسیلہ ہیں۔ میں ان کے وسیلے سے امیدوار ہوں کہ کل (قیامت کے روز) میرا نامۂ عمل میرے داہنے ہاتھ میں دے دیا جائے گا۔ ہم پر اور امام شافعی ہی پر کیا منحصر ہے یہ حضرات تو انبیاء خدا کا وسیلہ ہیں۔ جنابِ آدمؑ کی دعا اسی وسیلے سے قبول ہوئی دنیا کی معمولی کشتیوں سے مدد لے کر پار ہونا تو کفر نہ ہو اور جو بقولِ رسولؐ کشتیِ نجات ہو اس سے مدد لینا کفر اور اس کو چھوڑ کر طوفانِ عذاب میں ڈوب جانا ایمان۔ فیصلہ کیجئے کہ ان حضرات سے مدد چاہنا کفر ہے یا مدد نہ چاہنا کفر ہے؟ **والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ**۔

سوال :۔ اگر کوئی انسان حرام کا مرتکب ہو جائے تو کیا اس کے باقی اعمال قابل قبول ہیں؟ مثلاً ایک آدمی شراب پیتا ہے یا چوری کرتا ہے تو اس کی نماز باطل ہوگی یا صحیح اور قبول؟ داڑھی مونڈنا حرام ہے۔ جو آدمی داڑھی منڈواتا ہے اس کے اعمال کیسے ہیں؟

جواب :۔باسمہ سبحانہ شرعی فرائض ووظائف مثلاً وضو، غسل، نماز اور روزہ وغیرہ کے لئے شریعت نے مکمل ضوابط و قوانین متعین کر دیئے ہیں وہ امور بھی متعین کر دیئے ہیں۔ جن کے بجا لانے سے یہ چیزیں وجود میں آتی ہیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ وہ امور بھی مقرر کر دیئے ہیں جن امور سے یہ چیزیں باطل اور کالعدم ہو جاتی

ہیں۔ یعنی یہ بتادیاہے کہ کن کاموں کے کرنے سے وضو، غسل، نمازاور روزہ وغیرہ صحیح طور پر ادا ہو جائیں گے۔ اور یہ بھی بتادیاہے کہ کن کاموں کے کرنے سے یا ہو جانے سے یہ چیزیں باطل اور کالعدم ہو جائیں گی۔

پہلی قسم کے کام جن سے یہ چیزیں قائم اور منعقد ہو جائیں واجبات اور افعال عمل کہلاتے ہیں اور دوسری قسم کے کام جن سے وہ عمل باطل ہو جاتا ہے ان کو مبطلات کہتے ہیں ضوابط مذکورہ چونکہ مکمل اور متعین ہیں لہذا ان کو نہ کم کیا جاسکتا ہے نہ بیش ۔کسی عمل کو باطل کرنے والی جو چیزیں متعین کر دی گئی ہیں ان کے علاوہ کوئی اور عمل خواہ وہ عمل معصیت ہی ہو اس عمل کو باطل اور کالعدم نہیں کریگا۔ مثلاً کئے ہوئے غسل جنابت کو صرف جنابت آئندہ ہی توڑ سکتی ہے۔ اور کوئی گناہ کے کرنے سے وہ غسل اپنی جگہ قائم رہیگا۔ یعنی غسل جنابت کرنے کے بعد اگر کوئی جھوٹ بولے یاچوری کرے تو گناہ اپنی جگہ گناہ ہے لیکن غسل قائم رہے گا۔ یا وضو کرنے کے بعد جھوٹ بولنے یا چوری کرنے سے وضو باطل نہیں ہو گا۔ کیونکہ غسل اور وضو کی توڑنے والی چیزیں جو معین نہیں ان میں سے کوئی امر پیش نہیں آیا۔ یہی حالت نماز اور روزہ وغیرہ کی ہے کہ ہر چیز کے مبطلات معین کئے جاچکے ہیں ان مبطلات کے علاوہ کسی اور گناہ کرنے سے نماز اور روزہ وغیرہ کو باطل نہیں کہا جاسکتا۔ خلاصہ یہ کہ جو گناہ اس عمل کے مبطلات میں نہیں بیان کیا گیا وہ اپنی جگہ انتہائی سنگین ہونے کے باوجود اس عمل کو باطل نہیں کرے گا اور اس گناہ کے ہوتے ہوئے بھی وہ وضو، غسل، نماز اور روزہ صحیح رہے گا کیونکہ ان میں سے ہر عمل کا وجود اور اس عمل کی بقاء شرعی ضوابط کی پابند ہے یہ تو جواب ہوا ان اعمال (وضو، غسل، نماز وغیرہ) کی صحت اور بقا کا۔

اب رہا مسئلہ قبولیت، تو قبولیت عمل سے مراد ہے اس عمل کا پسندیدہ خدا ہونا اور معبود کی طرف سے اس عمل کا موجب اجر ہونا۔ تو کسی عمل کو صحیح طور پر بجالانا یہ بندے کی ذمہ داری ہے اور اس عمل کو پسند کرنا اور اس پر اجر دینا یہ منجانب اللہ ہے۔ کسی عمل کا قوانین شریعہ کے تحت صحیح ہونا اور باطل نہ ہونا اور چیز ہے اور اس عمل کی

قبولیت یہ ایک دوسری چیز ہے اور ہو سکتا ہے کہ ایک عمل قانوناً صحیح ہو لیکن دوسرے عوارض اور اسباب کی بناء پر لائق قبول نہ ہو۔ صحت عمل کے لئے قبولیت عمل لازمی نہیں ہے۔ جس طرح سے بعض نیکیاں گناہوں کو زائل کر دیتی ہیں اسی طرح بعض گناہ نیکیوں کو ضائع کر دیتے ہیں۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا گیا ہے۔

لاتبطلوا صدقاتکم بالمن ولاذیٰ یعنی جو بھلائی تم کسی کے ساتھ کر چکے ہو اس کا احسان جتا کر اس کو کوئی دکھ پہنچا کر برباد نہ کرو۔ یا ارشاد فرمایا گیا یاایھاالذین امنوا لاترفعو اصواتکم فوق صوت النبی ولاتجھروا له بالقول کجھر بعضکم لبعض ان تحبط اعمالکم وانتم لاتشعرون یعنی اے ایمان لانے والو تم اپنی آوازوں کو نبیؐ کی آواز پر اونچا نہ کرو اور نبیؐ سے اس طرح چلا کر نہ بولو جس طرح تم آپس میں زور زور سے باتیں کرتے ہو کہ اس سے تمہارے اعمال باطل ہو جائیں۔ (حجرات آیت 2)

ان مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اعمال حسنہ اپنی جگہ قانونی اعتبار سے صحیح ہونے کے باوجود بھی بعض گناہوں کی وجہ سے کالعدم ہو سکتے ہیں۔

لہٰذا ہم ہر گناہ کے لئے یہ حکم نہیں لگا سکتے کہ اس گناہ کی وجہ سے نماز روزہ وغیرہ قبول نہ ہو گا لیکن اتنا کہہ سکتے ہیں کہ گناہ اعمال حسنہ کی قبولیت میں سدِ راہ ہو سکتے ہیں۔ فیصلہ قبضہ قدرت میں ہے۔

شراب خوری ہو یا چوری کرنا ہو یا داڑھی مونڈنا ہو یا کوئی بھی گناہ ہو جو اس عمل کے مبطلات میں سے نہ ہو اس کو مبطل عمل کہنا تو بالکل غلط ہے لیکن اس کا امکان ضرور ہے کہ عمل کے صحیح ہونے کے باوجود یہ گناہ یا ان میں سے اور ازین قبیل کوئی گناہ مانع قبولیت عمل ہو پھر قبولیت کے معنی جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ اس سے مراد ہے اس عمل کو خدا کا پسند کرنا اور اس عمل کا موجب اجر ہونا یہ ظاہر ہے کہ ہر شخص کا عمل اور کسی کا ہر ایک عمل یکساں اور برابری کے ساتھ تو پسندیدہ خدا نہیں ہو سکتا۔ کسی کا عمل زیادہ پسندیدہ ہو گا اور کسی کا اس سے کم اور کم از کم درجہ میں پسندیدہ ہو گا۔ لہٰذا

قبولیت عمل کے درجات بھی مختلف ہیں۔ اور اسی نسبت سے اجر کے درجات بھی مختلف ہیں لہذا ہر صاحب عمل کو اپنے دل میں خطرہ محسوس کرنا چاہیے کہ میرے عمل خیر کو میرا ارتکاب گناہ کہیں غیر مقبول نہ قرار دلا دے یا میرے گناہوں سے میرے عمل خیر کا درجہ کہیں پست تر نہ ہو جائے۔ اول تو ہر گناہ سے انسان کو اس لئے بچنا چاہیئے کہ وہ موجب عذاب ہے۔ پھر اس کا بھی امکان ہے کہ وہ گناہ عمل خیر کو بھی لے ڈوبے' بہر حال ہم گناہ کو گناہ کہیں گے اور یہ بھی کہیں گے کہ گناہوں کی وجہ سے نیکیاں بے اجر اور غیر مقبول ہو سکتی ہیں لیکن ایسا فیصلہ کرنے کے ہم قطعاً مجاز نہیں کہ داڑھی مونڈنے پر یا فلاں گناہ کرنے پر اس کے اعمال باطل ہیں یا غیر مقبول ہیں۔ معبود کی پسندیدگی اور ناپسندیدگی کو طے کرنا ہمارا کام نہیں۔ یعنی کسی کے عمل خیر کی قبولیت یا عدم قبولیت کو طے کرنے کا ہم کوئی حق نہیں رکھتے۔

داڑھی منڈوانا یا اس طرح کم کرانا جو منڈی ہوئی جیسی ہو حرام ہے ہر بالغ مرد پر داڑھی رکھنا واجب ہے۔ اور داڑھی کم از کم اتنی ہو کہ دیکھنے والے دیکھ کر یہ کہہ سکیں کہ داڑھی ہے۔ اس کا اندازہ اس طرح بھی ہو سکتا ہے کہ داڑھی کا بال چٹکی میں پکڑا جا سکے۔

علیؑ ولی اللہ کے الفاظ جزو کلمہ و اذان ہیں یا جزو ایمان

سوال: میں اہل سنت والجماعت ہوں اور محکمہ تعمیرات میں ملازم ہوں میں نے ایک شیعہ دوست سے سنا ہے کہ اہل شیعہ حضرات اذان و کلمہ میں علی ولی اللہ کے الفاظ جزو اذان و کلمہ کی نیت سے نہیں پڑھتے بلکہ تبرکاً اور جزو ایمان سمجھ کر پڑھتے ہیں۔ اور اگر کوئی جزو اذان و کلمہ سمجھ کر پڑھے تو پڑھنا حرام ہے۔ کیا یہ درست ہے؟ اگر آپ کا جواب ہاں میں ہو تو ہم دین کے مسائل میں بطور تبرکاً جزو ایمان چیزوں کو کسی زمانہ میں بھی شامل کرنے کے مجاز ہو سکتے ہیں۔ نیز یہ علی ولی اللہ کے الفاظ اذان و کلمہ میں جزو ایمان کی حیثیت سے کب اور کون سے زمانے میں شامل کئے گئے۔ آئمہ

معصومین کے حکم سے یا شیعہ مفتیوں کے فتویٰ سے ؟ کوئی ضعیف شیعہ روایت ہی پیش کی جائے ؟

جواب : کلمہ کے الفاظ کا از روئے شریعت کوئی تعین نہیں ہے۔ اقرار توحید اور اقرار رسالت یا اقرار قیامت یا دوسرے ضروریات دین کا اقرار صمیم قلب سے ہونا چاہئے اس طرح سے کہ دین کے اصول میں سے کسی اصل کا انکار نہ کرتا ہو بلکہ دل وجان سے تصدیق کرتا ہو۔ زبان پر الفاظ جاری کرنا ایمان نہیں ہے بلکہ کل ضروریات دین کو تہ دل سے ماننا ایمان ہے اگر اصول دین کو کوئی شخص تہ دل سے مانتا ہے تو اس پر کسی وقت بھی کسی کلمہ کا پڑھنا واجب نہیں ہے البتہ نماز میں جو کلمات شہادت واقرار معین کر دیئے گئے ہیں ان کا زبان پر جاری کرنا فرض ہے ورنہ نماز نہ ہو گی۔ حج و عمرہ کے لئے جو الفاظ احرام باندھتے وقت تلبیہ کے معین ہیں وہ زبان پر لانا لازم ہوں گے لیکن تلبیہ میں اقرار رسالت کا کوئی لفظ نہیں ہے۔ حلال جانور کو ذبح کرتے وقت نام اللہ لینا ضروری ہے ورنہ وہ حلال نہ قرار پائے گا یہاں بھی اقرار رسالت کا کوئی لفظ نہیں ہے صرف نام خدا لینا کافی ہے لیکن شرط یہ ہے کہ جو ذبح کرے اس کے دل میں اقرار رسالت موجود ہو۔ کیونکہ ایمان دل سے تصدیق کرنے کا نام ہے کلمات عقیدۂ قلبی کو ظاہر کرنے کے لئے ہوتے ہیں۔ کلمۂ طیبہ جس کو کہا جاتا ہے اس میں ظاہر بظاہر اقرار توحید اللہ اور اقرار رسالت محمد مصطفیٰؐ کے سوا اور کسی بات کا اقرار نہیں ہے تو کیا اگر کوئی شخص لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہتا ہے اور وہ انبیاء سابقین کو برحق نہیں مانتا وہ مسلمان ہے ؟ اگر وہ کلمہ طیبہ پڑھتا ہو اور تورات و زبور وانجیل کو نہیں مانتا تو کیا وہ مسلمان ہے یا اگر وہ کلمہ طیبہ پڑھتے ہوئے پنجگانہ نماز اور رمضان المبارک کے روزوں کو فرض نہیں مانتا تو کیا وہ مسلمان ہے ؟ یقیناً نہیں ہے اسی طرح یہ سوال ہوتا ہے اگر کوئی شخص تمام اصول اسلام کو مانتا ہے نماز پڑھتا ہے ، حج میں تلبیہ بھی کہتا ہے جانور ذبح کرتے وقت نام خدا بھی لیتا ہے وہ محمدؐ کو اپنا نبی اسلام کو اپنا دین قرآن کو کتاب خدا کعبہ کو قبلہ حلال محمدؐ کو حلال حرام محمدؐ کو حرام اور اس کے ساتھ وہ اللہ کی کتب سابقہ اور اس

کے بھیجے ہوئے انبیاء سابقین کو، قیامت کو ملائکہ کو غرضکہ ہر رکن دین کو مانتا ہے اگر الگ سے اس نے ایک ماہ یا ایک سال تک کلمہ طیبہ نہیں پڑھا تو کیا وہ کافر ہے یا گنہگار ہے؟ ہرگز نہیں اسی طرح یہ سوال ہے کہ اگر کسی کافر نے مسلمان ہوتے وقت کلمہ طیبہ کے بجائے یہ کہہ دیا امنت باللہ وحدہ لاشریك له وامنت برسالة محمد تو کیا وہ شخص اس بنا پر کہ اس نے لاالہ الااللہ محمد رسول اللہ نہیں کہا مسلمان نہ ہوا؟ مختصر یہ کہ مسلمان پر سوائے خاص خاص مواقع نماز وغیرہ کے اور کسی وقت بھی فرض نہیں کہ وہ کوئی کلمہ زبان پر جاری کرے البتہ اگر کافر ایمان لاتا ہے اس کے لئے اظہار ایمان کے لئے ضروری ہے کہ وہ اقرار توحید ورسالت کے کلمات زبان پر لاکر اپنے ایمان کا اظہار کرے تاکہ نبیؐ اور دوسرے مسلمان اس کو مسلمان سمجھ سکیں لیکن اسی اظہار کے لئے مخصوص کلمات کی کوئی شرط نہیں ہے وہ جن لفظوں میں اور جس زبان میں چاہے اپنے عقیدۂ حق کو واضح طور پر واضح کردے۔

مختصر یہ کہ عقیدۂ توحید ورسالت کا اظہار اور زبان سے اقرار ہر وقت فرض نہیں اور جس وقت فرض ہو بھی تو یہ ضروری نہیں کہ وہ اظہار ان ہی کلمات معینہ میں ہو جس کو ہم لوگ عموماً کلمہ طیبہ کہتے ہیں وہ اللہ کی وحدانیت اور لاشریک ہونے کا اقرار واظہار اور رسولؐ کی رسالت کی تصدیق دوسرے الفاظ میں بھی کرسکتا ہے جو اس مفہوم کو واضح کرسکیں۔ لہذا یہ سوال کہ کونسا لفظ کلمہ کا جزو ہے اور کونسا نہیں بیکار ہے۔

ہو سکتا ہے کہ کلمہ طیبہ پڑھنے کے باوجود پڑھنے والا کسی اور رکن دین کے انکار کی وجہ سے کافر ہو۔ اسی طرح وہ شخص یقیناً مومن ہے جو تمام ضروریات دین کو تہ دل سے تسلیم کرتا ہو اور جب اس کے لئے اظہار عقائد کا وقت آئے تو وہ اپنی زبان اور اپنے پیرایہء کلام میں اللہ کی توحید اور نبیؐ کی نبوت اور دوسری ضروریات دین کا اقرار واظہار کردے۔

غرض کہ کلمہ طیبہ ذکر خدا اور ذکر رسولؐ ہے اور افضل الذکر ہے۔ اس کی تلاوت، اس کا ورد عبادت ہے اور موجب ثواب ہے۔ مگر اسی وقت جبکہ نبیؐ کی پیش کی

ہوئی، نبیؐ کی لائی ہوئی اور نبیؐ کی بتائی ہوئی ہر چیز پر ایمان ہو۔ نبیؐ نے جس کو نبیؐ کہا اس کو نبیؐ مانے جس کتاب کو کتاب خدا کہا اس کو کتاب خدا مانے۔ جس کو بلکہ جن کو اپنے بعد امام اور ولی اور خلیفہ کہا اس کو امام، ولی اور خلیفہ مانے۔ ہم بتا چکے کہ دین اختیار کرنے کے لئے یا دینداری کے اظہار کے لئے کسی مخصوص عبارت کی کوئی قید نہیں جو یہ دیکھا جائے کہ فلاں جزو کلمہ کا جزو ہے اور فلاں لفظ کلمہ کا جزو نہیں۔ جزو ہونا یا غیر جزو ہونا تو وہاں دیکھا جائے گا۔ جہاں شریعت اسلام نے کسی چیز کے اجزائے کلام یا اجزاء افعال مقرر کیے ہوں۔ جہاں شریعت نے اقوال وافعال کو منضبط اور معین کر دیا ہو وہاں ہم کسی بھی عمل کو نئے سرے سے جزء نہیں قرار دے سکتے خواہ وہ قول کتنا ہی اہم ہو۔

اذان یا نماز کے شارع مقدس نے اجزاء واجبہ اور اجزاء مستحبہ معین کر دیئے ہیں اب ہم نئے سرے سے کوئی نیا جزو اگر قرار دیں گے تو یہ بدعت اور حرام ہوگا۔ اسی طرح کسی جزء واقعی کو کم کر دینا بھی سرکشی اور سرتابی ہے۔ مثال کے طور پر اذان میں کہیں قیامت کا ذکر نہیں لیکن اگرچہ قیامت کے مانے بغیر ایک لمحہ کے لئے بھی کوئی مسلمان نہیں ہو سکتا پھر بھی ہم قیامت کے اقرار واعلان کے لئے کوئی جملہ جزو اذان سمجھ کر نہیں کہہ سکتے اسی طرح ایمان کی بہت سی باتیں ہیں جو اذان میں نہیں نہ قرآن کا ذکر نہ قبلے کا ذکر نہ ائمہ حق کا ذکر نہ انبیاء سابقین کا ذکر نہ کتب سابقہ کا ذکر کیا ان چیزوں کے مانے بغیر کوئی مومن ہو سکتا ہے؟ لیکن اگر کوئی ضرورت ہم کو ان میں سے کسی چیز کے اظہار کے لئے مجبور کر دے اور کوئی جملہ ایمانی ہم کو اذان میں کہنا پڑ جائے تو ہماری دینداری کا یہ تقاضا ہے کہ ہم بدعت کے جرم سے بچنے کے لئے وہ ایمانی کلمہ یہ سمجھ کر کہیں کہ یہ جملہ اس عمل کا جز نہیں قرار دیا گیا تھا لیکن چونکہ حق سے انکار کر دینے اور حق پر پردہ ڈالنے کے لئے اس رکن ایمانی کو منہدم کر دیا گیا ہے اس لئے ہم اظہار حق کے لئے یہ جملہ اصلاحاً کہہ رہے ہیں تاکہ حق مغلوب اور باطل غالب نہ ہو۔ یہ ہے حقیقت اذان میں اشھد ان امیر المومنین علیاًولی اللہ کہنے کی۔ اگر اس جملہ حق سے انکار نہ ہوتا اگر علی مرتضیٰ پر اسّی بیاسی برس تک منبروں پر مساجد میں خطبوں

میں تبرا نہ کیا جاتا اگر علیؑ کو کافر اور فاسق اور مستوجب لعنت نہ کہا جاتا اور خدا اور رسولؐ کی قرارداد کے مطابق ان کو خلیفہ ء رسول بر حق مانا جاتا تو پھر اس جملہ کے زبان پر بار بار لانے کی ضرورت نہ تھی کیونکہ یہ جملہ حقیقتاً اشھد ان محمداً رسول اللہ میں خود موجود ہے۔ کیونکہ علیؑ کی امامت بندوں کی طرف سے نہیں بلکہ اللہ اور رسولؐ کی طرف سے ہے۔ لہذا رسولؐ کے ماننے والے سے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ رسولؐ کو مانے اور رسولؐ کی بات کو نہ مانے۔

بے شک اذان میں بلکہ نماز کے بھی بعض اجزاء واجبہ میں ہم اس کے مجاز ہیں کہ اجزاء معینہ کے علاوہ مثلاً سجدہ میں قنوت میں دنیا اور آخرت کی فلاح کے لئے دعا کریں۔ آخر میں عرض ہے کہ اذان کا ایک بہترین جزء تھا حی علیٰ خیر العمل یعنی بہترین عمل کے لئے آو لیکن اس کو حضرت عمر نے نکال دیا۔ اور الصلوٰۃ خیر من النوم کو نماز صبح میں بڑھا دیا۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ کیا ان کے زمانہ میں کبھی بھی کسی مسلمان نے نوم سے صلوٰۃ کے افضل ہونے سے انکار کیا جس کی تردید کے لئے یہ جملہ بڑھانا پڑا افسوس کہ یہ تک نہ دیکھا گیا کہ نوم سے صلوٰۃ کو افضل کہنے میں نماز کی توہین ہے کیونکہ تقابل جنس کا جنس سے ہوتا ہے کیا سو جانا بھی عبادات کی کوئی قسم ہے؟ سونا تو حدث ہے جس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے کہاں وہ حدث اور کہاں وہ نماز جو بے وضو پڑھی نہ جا سکے اور تمام عبادات سے افضل ہو۔ کیا کسی گدھے گھوڑے سے کسی انسان کو افضل کہنے میں کہ یہ انسان گدھوں اور گھوڑوں سے افضل ہے اس انسان کی یہ توہین نہیں ہے؟ اس کے مقابلہ میں حی علیٰ خیر العمل بالکل صحیح جملہ تھا کیونکہ نماز بہترین عمل ہے لیکن اس کو نکال دیا گیا۔ ہم الحمد اللہ اس جملہ کو جزو اذان جان کر کہتے ہیں جبکہ علیؑ مرتضیٰ کو ولی اللہ کہنا اور جاننا اس کو ایمان سمجھتے ہیں لیکن جزو اذان نہیں۔ یہ ہے ہماری دیانتداری کہ ہم قرارداد رسول اکرمؐ سے بال برابر بھی تجاوز نہیں کرتے۔

جناب م۔س کے ایک سوال کا جواب۔

جواب :۔ والدین کے زنا کی سزا اس اولاد کو ہر گز نہیں دی جائے گی جو زنا سے

پیدا ہوئی ہو۔ اگر ایسی اولاد مومن اور صالح ہے تو وہ یقیناً لائق مغفرت اور لائق نجات ہے۔ نجات اور عدم نجات کا فیصلہ ہر شخص کے ایمان و عمل کے ہونے اور نہ ہونے پر منحصر ہے کسی کی پیدائش کسی طرح بھی ہوئی ہو معیار نجات سب کے لئے ایک ہے۔

سوال :۔ امام زین العابدین علیہ السلام کی مادر گرامی ایران کے بادشاہ یزدجرد بن شہریار بن کسریٰ کی بیٹی تھیں۔ ان کے مدینہ یا کوفہ آنے کے اسباب و واقعات کے متعلق شیعہ مورخین میں اختلاف ہے کہ یہ حضرت علیؑ کے ظاہری دور خلافت میں آئیں یا علامہ ابن بابویہ کی روایت کے مطابق ان کا مدینہ آنا تیسری خلافت میں ثابت ہے۔ نیز یہ بتائیں کہ علامہ مجلسیؒ نے جلاء العیون میں جو یہ تحریر فرمایا ہے کہ حضرت شہربانو کا نکاح عالم خواب میں رسالت مآبؐ نے حضرت امام حسین علیہ السلام سے پڑھ دیا تھا کیا یہ روایت درست ہے۔ علماء امامیہ شیعہ کا کن مندرجہ بالا روایات پر اتفاق ہے۔

جواب :۔ جناب شہربانو رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہا(۱) کے بارے میں جو چیزیں بلا اختلاف ہیں وہ یہ ہیں کہ اس شاہزادی اور خاتون عفیفہ کا عقد سید امام حسین علیہ السلام سے ہوا۔ اور ان کے بطن پاکیزہ سے صرف امام زین العابدینؑ علی بن حسینؑ پیدا ہوئے۔ اب رہا یہ کہ ان کے مقام رہائش سے بلاد عرب کی طرف آمد کس زمانے میں ہوئی اس کے بارے میں تین مختلف قول پائے جاتے ہیں :

۱۔ یہ کہ جناب شہربانو اور ان کی بہن جناب مہربانو خلیفہ ثانی کے عہد میں آئیں۔

۲۔ یہ کہ ان کی آمد خلیفہ ثالث کے عہد میں ہے۔

۳۔ یہ کہ ان کا ورود امیر المؤمنین علی بن ابی طالب علیہ السلام کی خلافت ظاہرہ کے زمانہ میں ہوا۔

پہلا قول اگرچہ زیادہ مشہور ہے مگر بالکل غلط ہے۔ یہ قول صرف اس قیاس پر مبنی ہے کہ چونکہ فارس خلافت ثانیہ کے عہد میں فتح ہوا ہے اس سے یہ سمجھ لیا گیا کہ ان

(۱) بعید نہیں کہ مولف مرحوم نے سلام اللہ ہی لکھا ہو اور رحمتہ اللہ لکھنا بوجہ سہو کاتب ہو (ناشر)

کی آمد بھی اسی عہد میں ہوئی ہوگی۔ حالانکہ یہ مسلّم ہے کہ فارس فتح ہو جانے پر بھی خاندان شاہی تک مسلمانوں کی دسترس اس لئے نہیں ہو سکی کہ یہ خاندان ایک جگہ سے دوسری جگہ برابر منتقل ہوتا رہا اور گوشہء امن وعافیت حاصل کرتا رہا۔ خلیفہء ثانی کی وفات کے وقت تک یہ خاندان فرغانہ (ترکستان) میں جس پر اب روسی حکومت[1] ہے مقیم رہا۔ سنی اور شیعہ محققین نے ان شاہزادیوں کے خلیفہء ثانی کے عہد میں آنے سے قطعاً انکار کیا ہے۔ ہم علامہ شبلی کی اصل عبارت ان کی کتاب الفاروق سے حرف بحرف نقل کیئے دیتے ہیں۔

''اس موقع پر حضرت شہربانو کا قصہ جو غلط طور پر مشہور ہو گیا ہے اس کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ عام طور پر یہ مشہور ہے کہ جب فارس فتح ہوا تو یزدگرد شہنشاہ فارس کی بیٹیاں گرفتار ہو کر مدینہ آئیں۔ حضرت عمر نے لونڈیوں کی طرح بازار میں ان کے بیچنے کا حکم دیا لیکن حضرت علیؑ نے منع کیا کہ خاندان شاہی کے ساتھ ایسا سلوک جائز نہیں۔ ان لڑکیوں کی قیمت اعلیٰ سے اعلیٰ شرح پر لی جائے چنانچہ حضرت علیؑ نے خود ان کو اپنے اہتمام میں لیا اور ایک امام حسینؑ کو ایک محمد بن ابو بکر کو ایک عبداللہ بن عمر کو عنایت کی۔

اس غلط قصہ کی حقیقت یہ ہے کہ زمخشری نے جس کو فن تاریخ سے کچھ واسطہ نہیں ربیع الابرار میں اس کو لکھا اور ابن خلکان نے امام زین العابدینؑ کے حال میں یہ روایت اس کے حوالہ سے نقل کر دی۔ لیکن یہ محض غلط ہے۔ اولاً تو زمخشری کے سوا طبری، ابن الاثیر، یعقوبی، بلاذری، ابن قتیبہ وغیرہ کسی نے اس واقعے کو نہیں لکھا اور زمخشری کا فن تاریخ میں جو پایہ ہے وہ ظاہر ہے اس کے علاوہ تاریخی قرائن اس کے برخلاف ہیں۔

حضرت عمر کے عہد میں یزدگرد اور خاندان شاہی پر مسلمانوں کو مطلق قابو نہیں حاصل ہوا مدائن کے معرکہ میں یزدگرد مع تمام اہل وعیال کے دارالسلطنت سے نکلا اور حلوان پہنچا جب مسلمان حلوان پر بڑھے تو وہ اصفہان بھاگ گیا اور پھر کرمان

(۱) یادر ہے یہ تحریر روس سے پہلے کی ہے۔ (ناشر)

وغیرہ میں ٹکراتا پھرا۔ مرو میں پہنچ کر 30ھ میں جو حضرت عثمان کی خلافت کا زمانہ ہے مارا گیا اس کے آل اولاد گرفتار ہوئے ہوں گے تو اسی وقت گرفتار ہوئے ہوں گے۔ مجھ کو شبہ ہے کہ زمحشری کو یہ بھی معلوم تھا یا نہیں کہ یزدگرد کا قتل کس عہد میں واقع ہوا اس کے علاوہ جس وقت کا یہ واقعہ بیان کیا جاتا ہے اس وقت حضرت امام حسین علیہ السلام کی عمر بارہ برس کی تھی کیونکہ جناب ممدوح (امام حسینؑ) ہجرت کے پانچویں سال کے بعد پیدا ہوئے اور فارس ۲۷ھ میں فتح ہوا اس لئے یہ امر بھی کسی قدر مستعبد ہے کہ حضرت علیؑ نے ان کی نابالغی میں ان پر اس قسم کی عنایت کی ہوگی۔ (الفاروق علامہ شبلی ص210 و ص211)

لہذا پہلا قول کہ یہ بیبیاں عہد خلیفہ ثانی میں آئیں سنی اور شیعہ محققین کے نزدیک بالکل غلط ہے دوسرا قول کہ خلیفہ ثالث کے عہد میں آئیں علامہ شبلی نے اس پر بھی اظہار یقین نہیں کیا بلکہ بصورت احتمال لکھا ہے اس جملہ کو ایک بار پھر پڑھ لیجئے۔

”اس (یزدگرد) کے آل اولاد گرفتار ہوئے ہوں گے تو اسی وقت گرفتار ہوئے ہوں گے۔“

ظاہر ہے کہ یہ جملہ کوئی فیصلہ کن جملہ نہیں ہے بلکہ اس جملہ سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ علامہ شبلی کو اس میں بھی شک ہے کہ یہ بیبیاں گرفتار ہو کر آئیں یا ان کو آزاد حیثیت سے پہنچایا گیا۔

محققین شیعہ جن میں خاص طور پر جناب شیخ مفید علیہ الرحمہ کا نام لیا گیا ہے کی تحقیق یہ ہے کہ یہ بیبیاں امیر المومنین کی خلافت ظاہرہ کے عہد میں آئی ہیں اور شہربانو کا عقد اسی زمانہ میں مولائے کائنات نے امام حسین علیہ السلام سے کیا اور اسی عہد خلافت میں جناب شہربانو کے بطن مقدس سے امام زین العابدین علیہ السلام پیدا ہوئے۔ امام زین العابدین علیہ السلام جناب شہربانو کی پہلی اور اکلوتی اولاد ہیں۔

یہ امر بھی معمولی اور طبعی حالات کے منافی ہے کہ عقد تو امام حسین علیہ السلام اور جناب شہربانو کا عہد خلافت ثانیہ یعنی ۱۷ھ میں ہو اور بیٹا (امام زین العابدینؑ)

یعنی پہلی ولادت انیس بیس برس کے بعد 36یا37 ہجری میں ہو۔

خواب میں حضرت شہربانو کا یہ دیکھنا کہ آنحضرتؑ نے ان کا عقد امام حسین علیہ السلام سے پڑھا کوئی امر بعید نہیں ایسے بے مثال سعادت اور شرف کی بشارت اور خوشخبری کا آنحضرتؐ کی جانب سے ان کو حاصل ہونا برمحل اور بجا ہے۔ ایسی کسی روایت سے انکار یا ایسی کسی روایت میں شک و شبہ اسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ وہ بے محل اور بے ضرورت ہو۔

☆☆☆☆☆

سوال :۔

(1) کیا غیر مسلموں کے ساتھ (بیٹھ کر) کھانا پینا جائز ہے ؟ جبکہ وہ سور کا گوشت نہ کھاتے ہوں ؟

(2) کیا عیسائی اگر ہمارے برتنوں کو ہاتھ لگادیں تو ہم ان برتنوں میں کھا پی سکتے ہیں یا ان کو پاک کرنا پڑے گا ؟

(3) ہم صرف چھلکے والی مچھلی کھاتے ہیں لیکن ہمارے سنی دوست کہتے ہیں کہ بتائیں اس کے متعلق کوئی واضح احکام ہیں کہ صرف چھلکے والی مچھلی کھاؤ اور بغیر چھلکے والی نہ کھاؤ۔

جواب :۔

(1) غیر مسلم لوگوں کے ساتھ کھانا پینا جائز ہے بشرطیکہ کھانے اور پینے کی چیزیں حلال اور پاک ہوں اور غیر مسلم کے ساتھ کھانے پینے کا ایسا طریقہ نہ ہو کہ جس سے خورد و نوش کی چیزیں نجس ہو جائیں البتہ جس دستر خوان پر شراب پی جاتی ہو اس دستر خوان پر شریک طعام ہو کر حلال اور پاک چیز کا بھی کھانا حرام ہے۔

(2) نجاست کے اعتبار سے عیسائی اور دوسرے کفار میں کوئی فرق نہیں (☆) ہے لہذا اگر برتن کو عیسائی ہاتھ یا کوئی حصہء بدن لگائے اور اس چھون والے عیسائی اور چھوئے جائے والے برتن میں سے کوئی ایک چیز تر ہو تو برتن نجس ہو جائے گا اور اس کو پاک کرنا ہو گا لیکن اگر چھونے والا اور چھوا جانے والا دونوں خشک ہوں تو نجس نہ ہو گا۔

(3) سورۂ واقعہ میں ارشاد ربانی ہے **ومانحن بمسبوقین علیٰ ان نبدل امثالکم وننشئکم فی مالا تعلمون** یعنی ہم اس بات سے عاجز نہیں کہ ہم تمہاری صورت جسمانی کو بدل دیں اور تم کو اس شکل و صورت میں تبدیل کر دیں جس کو تم نہیں جانتے۔ چنانچہ زمانہ سابقہ میں اشقیاء زمانہ کو مختلف جانوروں کی صورت میں مسخ کر کے ہلاک کیا گیا۔ کسی کو بندر، کسی کو ہاتھی، کسی کو ریچھ، کسی کو چھپکلی غرضیکہ کسی کو کچھ اور کسی کو کچھ بنا کر ہلاک کیا گیا۔ ان اشقیاء کی ذلت اور عقوبت اسی حد تک محدود نہیں رہی کہ ان کو صرف جانور بنا دیا گیا بلکہ ان کی انتہائی تذلیل کے لئے ان کو کسی لطیف اور حلال جانور کی شکل بھی نہیں دی گئی صرف حرام اور کثیف جانوروں کی صورت میں مسخ کیا گیا۔ ایسے تمام جانوروں کو اگرچہ یہ خود مسخ شدہ انسان نہیں ہیں مسوخ کہا جاتا ہے جو سب کے سب حرام ہیں۔ وہ دریائی جانور جو مچھلی کی شکل میں مشابہ ہیں اور ان کے جسم پر چاندنا (چھلکہ) نہیں ہوتا صرف مشابہت کی وجہ سے ان کو مچھلی کہہ دیا جاتا ہے لیکن وہ حقیقتاً مچھلی نہیں ہیں بلکہ مسخ شدہ جانور ہیں یعنی ان جانوروں کی شکل پر بدسرشت انسانوں کو مسخ کیا گیا تھا۔ مچھلی صرف وہی

(☆) البتہ اھل کتاب (عیسائی وغیرہ) اس وقت 2001ء کے زندہ مجتہدین (۱) آقائے سید محمد شیرازی (۲) آقائے سید علی خامنہ ای (۳) آقائے سید علی سیستانی (۴) آقائے شیخ جواد تبریزی (۵) آقائے محمد فاضل لنکرانی (۶) آقائے حسین نوری ہمدانی اور (۷) آقائے محمد سعید حکیم طباطبائی دام ظلھم کے نزدیک پاک ہیں۔ ماضی کے بعض مجتہدین مثلاً آقائے سبزواری اور آقائے محسن حکیم طباطبائی بھی پاک جانتے تھے۔ (ناشر)

ہے جس پر چاندنا' چھلکہ ہو۔ چنانچہ مچھلی کو فارسی میں ماہی اسی مناسبت سے کہا جاتا ہے کہ اس پر ماہ یعنی چاند جیسے چھلکے ہوتے ہیں۔ مذہب اہل بیت اور فقہ ء امامیہ میں یہ مسئلہ طے شدہ ہے کہ جس پر چاندنے ہوں وہ مچھلی ہے اور حلال ہے ورنہ حرام۔ مچھلی چھوٹی سے چھوٹی ہو یا بڑی سے بڑی حلال و حرام کا امتیاز اسی چھلکہ اور چاندنے سے ہے۔ رہا حضرات اہل سنت سے اس مسئلہ میں آپ کا مذاکرہ تو اصل میں فقہی احکام ہر فرقہ کے لیے وہی لائق عمل ہیں جن کا حکم اس فرقہ کے آئمہ نے دیا ہو۔ وہ اپنے امام اعظم کا حکم چھوڑ کر آپ کے امام صادقؑ کا حکم کیوں مانیں اور آپ امام صادقؑ کا حکم چھوڑ کر کسی اور امام کا حکم کیوں مانیں ؟ بحث طلب تو یہ امر ہے کہ امام برحق کون ہے جو منجانب اللہ ہے جو علم و فضل ساتھ لے کر دنیا میں آیا اور اس کا علم علم لدنی قرار پایا' نہ یہ کہ اس نے پیدا ہو کر کسی سے لکھ پڑھ کر کچھ سیکھا ہو۔ بلکہ قدرت نے اس کو الراسخون فی العلم اور کہیں فی صدور الذین اوتواالعلم کہہ کر یاد کیا ہو اور ہر رجس سے اس کو تطہیر کی شہادت دی ہو اور وہ معصوم مطلق اور منصوص من اللہ ہو۔

☆☆☆☆☆

سوال :۔

(1) قرآن و حدیث سے ثابت کریں کہ آدم علیہ السلام کے بیٹوں کی شادیاں کہاں ہوئیں ؟

(2) حضرت علی علیہ السلام بڑے بہادر تھے' کیا وجہ ہے کہ حضرت فاطمہ زہراؑ کے گھر جلانے کے موقع پر آپ نے مخالفین سے مقابلہ نہیں کیا ؟

(3) عام شیعہ اگر کسی مجتہد کی تقلید میں نہ ہو تو کیا اس کی عبادت صحیح ہے ؟

جواب :۔

(1) قرآن کریم میں تو نہایت اہم اور مخصوص امور کا ذکر ہے یہاں تک کہ نماز

فرض کی گنتی بھی نہیں ہے کہ وہ پانچ ہیں۔ رکعتوں کا ذکر تو بعد کی بات ہے۔
جناب آدم علیہ السلام کی اولاد کی شادیوں کا ذکر بھی قرآن کریم میں نہیں ہے البتہ احادیث معصومین علیہم السلام میں یہ ذکر اور صراحت ہے کہ ابتداء میں ان کی مناکحت کے لیے حوروں کو بھیجا گیا ہے۔

(2) جناب فاطمۃ الزہرا سلام اللہ علیہا کے گھر کے جلانے کے ارادے سے آگ اور لکڑیوں کا لایا جانا یہ واقعہ پہلی خلافت کے ابتدائی زمانہ کا ہے اور ہر ایک کتاب میں حضرات اہل سنت کی مذکور ہے تا اینکہ علامہ شبلی نے الفاروق میں بھی تسلیم کیا ہے۔ رہا کسی کا یہ سوال کہ حضرت علیؑ خاموش کیوں رہے بالکل غلط ہے اگر خاموش رہے ہوتے تو آگ اور لکڑیاں تو آہی چکی تھیں۔ آگ لگا دی ہی جاتی۔ آگ لگانے کی نوبت تو اس ہی لئے نہیں آئی کہ مولا علیؑ بھی غضب ناک ہوئے اور خاتون جنت نے بھی فریاد کی جس پر آگ لگانے کی نوبت نہیں آسکی اور یہ ظاہر ہے کہ کمزور سے کمزور آدمی بھی اپنے گھر میں خاموشی سے آگ نہیں لگوا سکتا چہ جائیکہ اشجع روزگار اور اسد کردگار۔

(3) مسائل فقہ کچھ تو ایسے ہیں جن میں پورا پورا اتفاق ہے اور کسی کو ان میں اختلاف نہیں اور کچھ مسائل ایسے ہیں جن میں اختلاف ہے اور نظریات الگ ہیں۔ عوام کو ایسے اختلافی مسائل میں کسی نہ کسی کی تقلید کرنا لازمی ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ تقلید بہتر سے بہتر عالم کی ہونا چاہیے جس کو اعلم کہا جاتا ہے۔ ان اختلافی مسائل میں تقلید کے بغیر جو عمل ہو گا وہ غلط اور باطل ہی ہو گا۔ اس لئے ہر بالغ اور عاقل پر تقلید مجتہد اعلم کی واجب ہے۔

☆☆☆☆☆

سوال :۔

(1) سر کا مسح درمیان سے کرنے کی بجائے سر کے سائڈ(Side) سے کر لیا جائے تو کیا وضو ٹھیک ہو جائے گا یا نہیں۔ دوسرے مسح کیا اوپر سے نیچے

کرنا چاہیے یا اگر نیچے سے اوپر کر لیا جائے تو کیا یہ ٹھیک ہے۔

(2) اگر وضو کرنے کے بعد پاؤں گیلے ہوں تو ان کو کسی کپڑے سے صاف کرنا چاہیے یا نہیں کیونکہ گیلے پاؤں پر مسح نہیں ہو سکتا۔

(3) اگر بس میں یا ٹرین میں سفر کر رہے ہوں اور نماز کا وقت راستے میں ہو جائے تو کیا چلتی گاڑی میں نماز پڑھ سکتا ہے یا نہیں۔

(4) نماز قصر کتنے میل پر پڑھنی چاہیے اور کتنے دن رہنے پر نماز قصر پڑھی جاتی ہے۔ ساتھ نفل پڑھے جانے ہیں یا نہیں۔

(5) سونے کی انگوٹھی پہن کر نماز ہو سکتی ہے یا نہیں ؟

جواب :۔

(1) سر کے چار حصے ہیں داہنا' بایاں' پچھلا اور سامنے کا جو سجدہ کے وقت قبلہ کی طرف ہوتا ہے۔ مسح صرف اس ہی حصہ کا ہے اگر اس حصہ کے بالوں پر ہو تو کھال تک تری پہنچانے کی ضرورت نہیں یا اس حصہ کی کھال پر ہو تو بالوں کو شامل کرنے کی ضرورت نہیں بہر حال بال ہوں یا کھال اسی حصہ کے ہوں سر کا مسح اوپر سے نیچے کی طرف ہونا چاہیے۔

(2) مسح کے لیے سر ہو یا پیر ہوں ان کا تقریباً ایسا خشک ہونا ضروری ہے کہ مسح کی تری غالب آجائے کپڑے سے مسح کرنے سے پہلے خشک کیا جا سکتا ہے مگر یہ نہ ہو کہ ہاتھ کی تری جس سے مسح کرنا ہو خشک ہو جائے۔

(3) اس امر کی کوشش کرنا چاہیے کہ نماز کے وقت کے اندر اندر نماز ایسی حالت میں ادا کی جائے کہ بس یا ٹرین رکی ہوئی ہو تاکہ نماز حالت سکون واستقرار میں ادا ہو لیکن اگر نہ ہو سکے اور وقت نماز کے گزر جانے کا اندیشہ ہو تو روانگی ہی کی حالت میں رو بقبلہ ہو کر نماز پڑھے۔

(4) سفر جائز جو اڑتالیس ہزار گز یا اس سے زیادہ مسافت کا ہو موجب قصر ہے یہ مسافت ایک طرف کی ہو یا اگر دس دن کے اندر اندر واپسی ہو رہی ہو تو دونوں طرف

کی ملا کر ہو۔ لیکن اگر دس دن کے بعد واپسی ہو یا کہ جہاں جانا ہے وہ اپنا وطن ہو تو واپسی کی مسافت شامل نہ ہو گی اس صورت میں صرف جانے کی مسافت 48 ہزار گز کی یا زیادہ کی ہو تو اثناء راہ میں قصر ہو گی۔ اپنے وطن میں پہنچ کر یا جہاں دس دن ٹھہرنا ہو وہاں قصر نہیں ہے۔ صبح اور مغرب کے نفل سفر میں پڑھے جائیں گے۔ ظہر' عصر اور عشاء کے نوافل ساقط ہیں لیکن اگر عشاء کے نوافل بہ امید قبولیت پڑھ لے تو کوئی مضائقہ نہیں۔

(5) مردوں کو سونے کی انگوٹھی یا سونے کا کوئی بھی زیور پہننا حرام ہے اور پہن کر نماز پڑھنا نماز کو باطل کرتا ہے۔

☆☆☆☆☆

سوال :۔ جنگ بدر' جنگ خندق' احد کا مختصراً ذکر قرآن میں موجود ہے۔ کیا اسی طرح کسی مقام پر جنگ خیبر کا بھی کہیں قرآن میں ذکر ہے سورہ آیت بتا دیجئے ؟

جواب :۔ آخری علمدار جنگ خیبر کے جو صفات آنحضرتؐ نے فتح خیبر سے ایک روز پہلے بیان فرمائے ہیں لاعطین الرایۃ غداً رجلاً الخ ان مذکورہ صفات کا ذکر پارہ ۶ سورہ مائدہ آیت 54 میں موجود ہے۔ **فسوف یاتی اللہ بقوم یحبھم و یحبونہ اذلة علی المومنین اعزة علی الکافرین یجاھدون فی سبیل اللہ ولایخافون لومة لائمٍ ط ذالك فضل اللہ یئوتیه من یشاء واللہ واسعٌ علیمO**

(ترجمہ) اللہ عنقریب ایسی قوم کو لائے گا جن سے وہ (اللہ تعالیٰ) محبت رکھتا ہے اور جو اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتے ہیں وہ لوگ مومنین کے لئے رحم دل اور کفار پر غالب آنے والے' خدا کی راہ میں جہاد کرنے والے ہیں اور راہ حق میں وہ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے ڈرنے والے نہیں ہیں یہ اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا وہ شرف ہے جو (ہر کس وناکس کو نہیں بلکہ) اس ہی کو اللہ دیتا ہے جس کو وہ چاہتا ہے اور اللہ تعالیٰ بہت کچھ دینے والا اور علم والا ہے۔

نظر جما کر دیکھا جائے تو آیت مذکورہ میں ان تمام صفات کا مفصل ذکر ہے جو

حدیث خیبر میں آنحضرتؐ نے علی المرتضیٰ کے لئے بیان فرمائے۔

جنگ خیبر اور فتح معرکہ خیبر کا ذکر قرآن پاک کے پارہ نمبر26 سورہ فتح میں صلح حدیبیہ کے ضمن میں موجود ہے۔

" لقد رضی الله عن المئومنین اذیبایعونك تحت الشجرة فعلم مافی قلوبهم فانزل السکینة علیهم واثابهم فتحاً قریباً[18] ومغانم کثیرةً یا خذونها وکان الله عزیزاً حکیماً[19] وعدکم الله مغانم کثیرةً تاخذونها فعجل لکم هذه وکف ایدی الناس عنکم ولتکون ایة للمئومنین ویهدیکم صراطاً مستقیما[20] وّاخریٰ لم تقدروا علیها قداحاط الله بهاوکان الله علی کل شئی قدیراً[21]

(ترجمہ) البتہ اللہ خوشنود ہوا مومنین سے جبکہ اے رسول وہ درخت کے نیچے تمہاری بیعت کر رہے تھے پس اللہ ان کے دلوں کی بات کو جانتا تھا پس اللہ نے ان پر سکون و اطمینان نازل کیا اور ایک قریبی فتح بھی عطا کی اور کثیر مال غنیمت بھی جو وہ پائیں گے اور اللہ غالب اور حکیم ہے۔ ایمان والو! اللہ نے تم سے کثیر مال غنیمت کا وعدہ کیا ہے جس کو تم حاصل کرو گے اور یہ خبر فتح جلد ہی پوری ہو گی۔ اور اللہ نے تمہارے دشمنوں کے ہاتھوں کو تمہاری طرف بڑھنے سے روک دیا ہے تاکہ مومنین کے لئے یہ فتح کی راہ دکھادے اور وہ دوسری فتح بھی عطا کر دے جو تمہارے بس کی تو ہرگز نہیں ہے لیکن اللہ کے قبضہ قدرت میں سب کچھ ہے اور وہ ہر شے پر قادر ہے۔

یہاں جس قریبی فتح کی خوشخبری دی گئی ہے اور اس فتح کی بدولت کثیر مال غنیمت مل جانے کا وعدہ بڑی شد و مد سے دو مرتبہ کیا گیا ہے یہ خیبر ہی کی فتح ہے۔ خیبر میں یہودیوں کے متعدد قلعے تھے لیکن ان سب سے زیادہ مضبوط، جنگی سامان اور جنگ جو بہادروں سے بھرا ہوا قلعہ قموص تھا اسی وجہ سے یہودیوں نے دوسرے قلعوں پر طاقت آزمائی نہیں کی چنانچہ وہ سب قلعے معمولی جھڑپ میں ایک کے بعد ایک فتح ہوتے چلے گئے۔ یہودیوں نے اپنی پوری طاقت قلعہ ء قموص کے لئے محفوظ رکھی تھی جب قلعہ ء قموص کے فتح کرنے کی نوبت آئی تو یہودیوں نے ایسی شدید جنگ کی کہ

مسلمان لشکر اور سردار لشکر ہزیمت خوردہ ہو کر واپس آتے رہے اور اس قلعہ کا فتح کرنا ان کے بس سے باہر ہو گیا اور مسلمانوں کی طاقت نے جواب دے دیا واخرىٰ لم تقدروا علیھا یعنی وہ دوسری فتح جو تم قطعاً نہ کر سکے اور تمہارا کوئی قابو نہ چلا یہ اشارہ ظاہر بظاہر اسی قلعہ ء قموص کی فتح کی طرف ہے۔ تفسیر صافی میں امام باقر علیہ السلام کا ارشاد موجود ہے کہ مذکورہ آیات میں جس فتح قریب کا اور جس کثیر مال غنیمت کا ذکر ہے اس سے مراد فتح خیبر ہے جو صلح حدیبیہ کے بعد ہوئی۔

سوال :۔ سیدزادی کا نکاح غیر سید سے ہو سکتا ہے یا نہیں ؟

جواب :۔ سیدزادی کا عقد غیر سید سے جبکہ وہ غیر سید مومن بھی ہو نا جائز تو نہیں ہے لیکن نامناسب ضرور ہے۔

سوال :۔ خمس کے 6 حصے کرنے کے بعد 3 حصے تو سہم امام کے ہوں گے اور 3 حصے سادات کے مگر پڑوس میں اگر سخت غریب (شیعہ) غیر سید ہوں تو کیا انہیں دیا جا سکتا ہے۔

جواب :۔ خمس کا وہ نصف حصہ جو سادات مستحقین سے مخصوص ہے غیر سید کو نہیں دیا جا سکتا' البتہ وہ نصف حصہ جو سہم امام علیہ السلام ہے مقلد کے مجتہد کی اجازت سے دیا جا سکتا ہے۔

سوال :۔ فقہ جعفریہ میں ہے کہ اگر پانی نہ ملے تو استنجا تھوک سے کر لو کیا یہ بات درست ہے ؟

جواب :۔ یہ چیز فقہ جعفریہ میں ہرگز نہیں ہے بلکہ یہ مسلّم ہے کہ پیشاب کی طہارت پانی کے سوا کسی چیز سے نہیں ہو سکتی یہاں تک کہ کسی کپڑے یا ڈھیلے سے خشک کر لینے کے باوجود وہ جگہ بدستور نجس ہی رہتی ہے پاک نہیں ہوتی۔

سوال :۔

(1) متعہ اثنا عشریہ مرد اور سنی عورت کے درمیان بھی ہو سکتا ہے ؟

(2) عورت کے ورثا کی رضا اور غبت کے بغیر یا ان کی عدم موجودگی میں بھی

ہو سکتا ہے ؟

(3) اس کے لئے کتنے گواہان اور دیگر کون سی شرائط ضروری ہیں۔ زیادہ سے زیادہ کتنی مدت کا متعہ ہو سکتا ہے اور اس کی اجرت شرعاً کیا ہے ؟

(4) عورت اور مرد جب روبرو گواہان وغیرہ متعہ کریں تو اس کا اعلان بھی ضروری ہے ؟

(5) میعاد متعہ گزر جانے کے بعد اسی عورت سے دوبارہ متعہ ہو سکتا ہے ؟

(6) عورت کی اولاد شرعاً مرد کی جائز اولاد متصور ہو گی اور وہ جائیداد میں بھی حصہ دار ہو گی ؟

(7) اگر عورت اور مرد اثنا عشری متعہ کر چکے ہوں۔ کیا ان پر جیسا کہ اس وقت ملک میں شرعی قانون نافذ ہونے والا ہے۔ فرقہ اہل سنت کے عقائد کی رو سے شرعی حد لاگو ہو گی یا نہیں ؟

(8) اگر متعہ عورت کے ورثا کی رضا و رغبت کے بغیر ہو سکتا ہے تو متعہ کنندگان کو عدالتیں اور شریعت کیا تحفظ دے سکتے ہیں ؟

(9) کیا متعہ منکوحہ عورت کے سوا ہر قسم کی عورت سے ہو سکتا ہے مثلاً مطلقہ ' کنواری وغیرہ۔

جواب :۔

(1) ہو سکتا ہے۔

(2) باکرہ (کنواری) لڑکی سے متعہ کرنا مکروہ ہے۔ لیکن ناجائز نہیں ہے لیکن اس کے ولی شرعی کی اجازت کے بغیر نہیں ہونا چاہیے۔ شوہر رسیدہ (1) مطلقہ یا بیوہ سے متعہ کرنے میں ولی کی اجازت ضروری نہیں ہے۔

(1) بے شوہر رسیدہ یعنی وہ کنواریاں جو mature اور اپنی مصلحت ' شادی کی ضرورت ' عزت و وقار آبرومندی کی تشخیص پر خود قادر ہوں کے لیے بعض مجتہدین ولی کی اجازت لازمی شرط قرار نہیں دیتے اور شوہر رسیدہ یعنی جو بوجہ شوہر (نہ کہ از زنا) باکرہ نہ رہی ہو مطلقہ یا بیوہ کے لیے بھی۔ (ناشر)

(3) دو گواہ کافی ہیں اور اگر اس وقت کوئی گواہ نہ ہو تو رفع تہمت کے لئے اظہار و اعلان ضروری ہے۔ اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ عورت نہ تو کسی کے حبالہ ء عقد میں ہو اور نہ عدہ طلاق اور عدۂ وفات میں ہو۔ اور یہ کہ جانبین راضی ہوں مہر مقرر کیا گیا ہو اور باقاعدہ صیغہ ء متعہ دونوں طرف سے پڑھا جائے اور متعہ کی مدت کا بھی تعین ہو۔ مہر جس پر بھی طرفین رضامند ہوں۔ مدت کی زیادتی کی کوئی قید نہیں ہے۔

(4) اظہار و اعلان بہر حال ضروری ہے۔

(5) ہو سکتا ہے

(6) متعہ سے جو اولاد ہو گی وہ ہر طرح نکاح والی اولاد کے برابر ہے اور بعد شرط(1) پورے طور پر ہر شے میں اپنے مورث کی وارث ہو گی۔

(7) شرعاً متعہ کی صورت میں حد ہر گز نہ ہونا چاہیے بلکہ یہ امر موجب ثواب ہے باقی امور جو آپ نے کہے ہیں وہ قانونی ہیں شرعی نہیں ہیں

☆☆☆☆☆

سوال :۔ روایت ہے کہ جب یہ آیہ ء ات ذا القربی حقه والمسکین و ابن السبیل نازل ہوئی تو نبی صلعم نے باغ فدک حضرت فاطمہؑ کے حوالے کر دیا۔ یہ روایت طبرانی وابو اعلیٰ و تفسیر درمنثور معراج النبوت وغیرہ بہت بڑی بڑی کتب میں موجود ہے۔ لیکن بعض علماء اس پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ یہ آیت مذکورہ مکہ میں نازل ہوئی اور اس آیت کے وقت نزول نبی علیہ السلام کے پاس باغ فدک نہ تھا۔ باغ فدک کا قبضہ فتح خیبر کے بعد نبیؐ کے ہاتھ آیا۔ اس لیے یہ روایت ضعیف اور ناقابل قبول ہے۔

جواب : آپ کے جواب میں فی الحال لکھا جاتا ہے کہ آیہ ء ات ذا القربی حقه اور آیہ ء قل لااسئلکم علیه اجراً الا المودة فی القربیٰ کے بارے میں علماء اہل سنت اور ان کی معتبر و مستند کتابوں نے صریحاً بیان کیا ہے کہ پہلی

(1) خیال ہے کہ کاتب نے غلطی سے "بہر صورت" کو بعد شرط لکھ دیا ہو گا۔ (ناشر)

آیت دربارۂ فدک اور دوسری آیت دربارۂ علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ، حسینؑ نازل ہوئی ہے یہاں تک کہ شہنشاہ اورنگ زیب (عالمگیر) نے بھی یہ دونوں آیتیں اپنے وصیت نامہ میں دربارۂ سادات کرام بیان کی ہیں۔ رہا یہ اشتباہ پیدا کرنا کہ یہ آیات مکی ہیں بلکل غلط ہے کیونکہ یہ مسلّم ہے کہ موجودہ قرآن کریم میں ترتیب نزدل کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اور یہی نہیں کہ سورتوں کی ترتیب بدلی ہوئی ہے بلکہ آیات بھی کسی سورہ کی کسی سورہ میں شامل کردی گئی ہیں۔ چنانچہ جامعہ ازہر مصر کے مطبوعہ قرآن پاک میں اس امر کی نشاندہی کی گئی ہے کہ فلاں سورۃ کی فلاں فلاں آیت اس سورہ کی نہیں ہیں۔ قل لااسئلکم والی آیت کو بھی صاف لکھا ہے کہ یہ مکی نہیں ہے مدنی ہے لہذا یہ دعویٰ کرنا کہ مذکورہ آیات مکی ہیں بالکل مہمل ہے۔ پھر عقل سلیم سے یہ بھی سوچنا چاہیے کہ مکہ میں سرکارؐ کے پاس کیا ایسی گرانقدر چیز تھی جس کے لیے یہ خاص تاکیدی حکم آیا۔ کون عقلمند یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ تاکیدی حکم محض کسی وقت کی روٹی یا کوئی کپڑا دینے کے لیے آیا ہو کیونکہ مکہ میں تو آنحضورؐ کسی قرابت دار کے لیے زیادہ سے زیادہ اتنا ہی کر سکتے تھے۔ اس کے علاوہ جن حضرات علماء اہل سنت نے اپنی مشہور و معروف تصانیف میں ان آیات کو دربارۂ اہل بیت لکھا ہے کیا انہوں نے قرآن موجودہ کی سورتوں پر جو اوپر لکھا ہے کہ یہ سورہ مکی ہے اور یہ سورہ مدنی ہے۔ نظر ہی نہیں ڈالی تھی اور انہوں نے کبھی قرآن کریم کھول کر دیکھا ہی نہ تھا جو انہوں نے ان آیات کو بحق اہل بیتؑ لکھ دیا۔ ظاہر ہے کہ انہوں نے مکی اور مدنی کی تفصیل مندرجہ کو غیر معتبر اور غیر صحیح مان کر ہی یہ لکھا ہے۔

سوال :۔

(1) پیش نماز کے لیے ''عادل'' ہونا ضروری ہے۔ اس لفظ کی ذرا وضاحت فرمادیجئے؟

(2) کیا نماز جمعہ کے لیے اذان کہنا ضروری ہے؟

(3) کیا پیش امام کے لیے گردن کے پیچھے والے بالوں کا منڈوانا ضروری ہے؟

(4) کیا متعہ والی اولاد اپنے باپ کی وراثت کی حق دار بنتی ہے یا نہیں ؟

(5) کیا موجودہ زمانہ میں متعہ کیا جا سکتا ہے ؟

(6) عقد دائمی کے احکام کی موجودگی میں متعہ کرنے میں کیا مصلحت ہو سکتی ہے ؟

جواب :۔

(1) امام جماعت کے لیے عادل ہونا ضروری ہے اور شرط امامت ہے ۔ عادل ہونے سے مراد یہ ہے کہ گناہان کبیرہ میں سے کسی گناہ کا ارتکاب نہ کرتا ہو اور گناہ صغیرہ پر اصرار نہ کرتا ہو یعنی باربار نہ کرتا ہو۔ اور مذکورہ گناہوں سے بچنا اس کی سیرت اور مستقل عادت ہو۔

(2) اذان ہر نماز کے لیے مستحب ہے خصوصاً نماز جماعت کے لیے اور نماز جمعہ کے لیے چونکہ جماعت لازمی ہے اس لیے بموجب آیہ اذانودی للصلوٰۃ من یوم الجمعۃ نماز جمعہ کے لیے اذان کہنا ضروری ہے۔

(3) امام جماعت کے لیے پس گردن کے بالوں کے منڈوانے کی کوئی شرط نہیں ہے البتہ بالوں کا ایسا طرز نہ ہو جو شرفاء کے طرز کے منافی ہو۔

(4) بے شک متعہ والی اولاد اپنے باپ اور دیگر اقرباء کی اسی طرح وارث ہو گی جس طرح منکوحہ دائمی کی اولاد وارث ہوتی ہے۔

(5) متعہ ہر زمانے میں ہو سکتا ہے۔

(6) متعہ اصل میں جرم زنا سے بچانے کا جائز ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔ دائمی عقد نکاح بعض حالات میں اور بعض مواقع پر چونکہ دشوار اور نامناسب ہوتا ہے۔ اس لیے شریعت سہلہ نے یہ سہولت عطا فرمائی ہے جس کا امت مسلمہ کو شکر گزار ہونا چاہیے تھا لیکن شکر گزاری کے بجائے کفران نعمت کیا گیا۔ متعہ کو اللہ تعالیٰ نے حلال اور جائز قرار دیا ہے اس کے لیے کسی زمانے کی قید نہیں حلال خدا ہر زمانے میں حلال اور حرام خدا ہر زمانے میں حرام ہے۔

سوال :۔ علماء اہل سنت والجماعت یہ کہتے ہیں کہ حضور پر نور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی چار لخت جگر تھیں۔ براہ مہربانی اس پر روشنی ڈالیے۔

جواب :۔ ہمارا یہ دعویٰ ہے اور اس دعوے کی پشت پر دلائل واضح ہیں کہ سرکار رسالتؐ کے صرف ایک دختر جناب فاطمۃ الزہراؑ تھیں۔ علماء اہل سنت اس دعوے پر کہ "چار دختران تھیں" ہماری جن کتابوں کا حوالہ دیتے ہیں یہ کتابیں قرآن حکیم سے تو زیادہ اہم نہیں ہیں۔ قرآن کریم میں آزر کو حضرت ابراہیمؑ کا باپ کہا گیا ہے حالانکہ باپ نہ تھا۔ حضرت اسماعیلؑ کو حضرت یعقوبؑ کا باپ کہا گیا ہے (اله ابائك ابراهيم و اسماعيل و اسحاق) حالانکہ حضرت اسماعیلؑ حضرت یعقوبؑ کے باپ نہ تھے۔ اسی سورۂ یوسف میں دو جگہ عزیز مصر کو ایک قیدی کا رب کہا گیا ہے۔ اذکرنی عندربك فانساه الشيطان ذكر ربه حالانکہ عزیز مصر اس کا رب نہ تھا۔ قرآن کریم میں کہیں خداوند عالم کا ایک اور کہیں دو ہاتھ ہونے کا ذکر ہے۔ بیدك (۱) بل یداه (۲) مبسوطتان۔ اسی قرآن میں خدا کا نفس' خدا کا چہرہ' خدا کا پہلو' یہ سب کچھ موجود ہے تو کیا ہم یہ مان سکتے ہیں کہ خدا کے ہاتھ ہیں' خدا کا چہرہ ہے' خدا کا نفس ہے' خدا کا پہلو ہے۔ ہرگز نہیں! بات یہ ہے کہ لفظ کا استعمال کبھی حقیقی معنی میں ہوتا ہے اور کبھی لفظ تشبیہ کے لیے ہوتا ہے اور کبھی محض بولے جانے کی بناء پر وہ لفظ اسی طرح بولا جاتا ہے اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ہم جس وقت اپنے بیٹے کو بیٹا' اپنی بیٹی کو بیٹی' اپنی ماں کو ماں اور اپنے باپ کو باپ کہتے ہیں اس وقت ہماری مراد حقیقت سے ہوتی ہے اور جس وقت کسی اور کو بیٹا' بیٹی' ماں یا باپ کہتے ہیں اس وقت ہماری مراد محض تشبیہ سے ہوتی ہے۔ غور فرمائیے قرآن حکیم ہی میں ازواج نبیؐ کو مومنین کی ماں (امهات) کہا گیا ہے۔ کیا وہ ازواج نبیؐ ہماری حقیقتاً ماں ہیں؟ کیا ہم ان کے پیٹ سے پیدا ہوئے ہیں؟ کیا انہوں نے ہمیں دودھ پلایا اور پالا ہے؟ کیا ہمارا ان سے اور ان کا ہم سے پردہ نہیں ہے؟ کیا وہ ہماری اور ہم ان کے وارث ہوتے ہیں؟ یہ کچھ بھی نہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ لفظ محض تشبیہ کے لیے استعمال ہوا ہے۔ اگر حقیقت کے لیے ہوتا تو پھر یہ حقیقت ہی ہوتی۔

---

(۱) "بید ک" سورۂ آل عمران آیت 26 (۲) سورۂ مائدہ آیت 64 (ناشر)

چونکہ زینب 'ام کلثوم اور رقیہ کو جناب خدیجہ نے پرورش کیا تھا اور خدیجہ الکبریٰ کے ساتھ وہ نبیؐ کے گھر آئیں اور پلیں اس بنا پر ان کو تشبیہاً اور مجازاً دختران نبیؐ کہا جانے لگا۔ ورنہ وہ دختران نبیؐ نہ تھیں بلکہ دختران خدیجہ بھی نہ تھیں۔ اگر وہ دختران نبیؐ ہوتیں تو نبیؐ کو ان سے ویسی ہی محبت ہوتی جیسی فاطمۃ الزہراؑ سے تھی۔ ان کے لیے سرکارؐ اسی طرح بہترین شوہر منتخب کرتے جس طرح فاطمۃ الزہراؑ کے لیے۔ یہ تفرقہ نہ ہوتا کہ فاطمۃ الزہراؑ کے لیے تو آپ نے کسی مومن کو بھی پسند نہ کیا بلکہ بحکم خدا امیر المومنینؑ کو منتخب کیا اور وحی کا انتظار کیا' مگر ان بیٹیوں کو ابو لہب کے دونوں کافر بیٹوں کو دے دیا۔ پھر زینب کو ابو العاص کافر سے بیاہ دیا۔ نہ ان کی محبت کا حکم دیا نہ ان پر درود بھیجنے کا حکم دیا۔ نہ فاطمۃ الزہراؑ کی طرح ان کے فضائل بیان کیے۔

حیاب القلوب میں علامہ مجلسیؒ نے صرف ایک وہی قول نہیں بیان کیا جس کو علماء اہل سنت پیش کرتے ہیں بلکہ تین قول بیان کیے ہیں۔ ایک قول یہی ہے کہ سرکارؐ کے چار بیٹیاں تھیں' دوسرا قول ان ہی کے الفاظ میں یہ ہے :۔

"جمعے از علماء خاصہ و عامہ اعتقاد آنست کہ رقیہ وام کلثوم دختران خدیجہ بودند' از شوہر دیگر کہ پیش از حضرت رسولؐ داشتہ و حضرت ایشاں را تربیت کردہ بودود دختر حقیقی آنجناب نبودند بعضے گفتہ اند کہ دختران ہالہ خواہر خدیجہ بودہ اند"۔

(ترجمہ) شیعہ اور اہل سنت کے ایک گروہ علماء کا اعتقاد یہ ہے کہ رقیہ اور ام کلثوم خدیجہ کی بیٹیاں تھیں اس دوسرے شوہر سے جو رسولؐ سے پہلے رکھتی تھیں اور رسولؐ نے ان دونوں کو صرف پرورش کیا تھا وہ دونوں رسولؐ کی حقیقی بیٹیاں نہ تھیں اور بعض نے کہا ہے کہ (خدیجہ کی وہ بیٹیاں نہ تھیں) وہ ہالہ کی بیٹیاں تھیں جو خدیجہ کی بہن تھیں۔ (دیکھیے باب 1 :5 حیات القلوب جلد دوئم)

مختصر یہ کہ ان تینوں کو صرف مجازاً اور تشبیہاً رسولؐ کی بیٹیاں کہا گیا ہے

جس طرح کہ ازواج نبیؐ کو امہات المومنین۔ اگر اس تشبیہی لفظ سے کسی شیعہ عالم کو بھی یہ خیال پیدا ہو گیا ہو کہ وہ واقعتاً رسولؐ کی بیٹیاں تھیں تو یہ اس کو دھوکا لگا ہے۔ یہ مسئلہ نہ تو اصول دین کا ہے نہ فروع دین کا۔ ایک واقعاتی مسئلہ ہے جس کو ہم تقلید سے طے نہیں کر سکتے۔ بلکہ تحقیق کرنا اور تحقیق سے صحیح نتیجہ پر پہنچنا ہے اس لیے کسی بھی کتاب کے حوالہ جات بے کار ہیں۔

سوال :۔ جناب بی بی پاک دامن سلام اللہ علیہا کی آمد لاہور کے بارے میں تحریر فرمائیں کہ کس طرح یہاں لاہور تشریف لائیں اور کیوں؟

جواب :۔ بی بی پاک دامن کے روضہ کے لیے یہ شہرت ہے کہ وہ حضرت عباس علیہ السلام کی بہن اور جناب امیر علیہ السلام کی دختر ہیں لیکن ہمارے علماء اسلام نے کہیں اس کا ذکر نہیں کیا اور ان کی یہاں آمد ہماری کسی کتاب میں مذکور نہیں حالانکہ اتنا بڑا واقعہ اور ایسی عظیم ہستی کی یہاں آمد ایسی چیز نہ تھی کہ کہیں اس کا ذکر نہ ہوتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ بیان کی جانے والی بات تو صحیح نہیں ہے مگر غلط شہرت بھی کسی وجہ کے بغیر نہیں ہوتی یہ مزار بعد کی کسی بزرگ مرتبہ اور پاک دامن سیدہ کا ہے جو عنداللہ بڑی مقبول و مقرب ہیں۔

سوال :۔

(1) نابالغ لڑکی کا نکاح اس کے والد کی اجازت سے پڑھا گیا ہے۔ آیا بالغ ہونے کے بعد عورت کو اجازت ہے کہ انکار کر دے؟

(2) نیت نماز رکن ہے یا صرف واجبات نماز میں ہے؟

(3) غسل واجب کے دوران بسم اللہ یا کلمہ شہادت وغیرہ پڑھا جا سکتا ہے۔ ایک صاحب کہتے ہیں کہ انسان برہنہ ہوتا ہے لہذا احتراماً نہیں پڑھنا چاہیے۔

جواب :۔

(1) نابالغ لڑکے یا لڑکی کا نکاح جو ان کے باپ یا دادا نے کیا ہو اس نکاح کو بالغ یا بالغہ ہونے کے بعد وہ لوگ فسخ نہیں کر سکتے کیونکہ باپ اور دادا اپنی نابالغ اولاد کے

ولی شرعی ہیں البتہ اگر باپ یا دادا نے کسی فاسد نیت سے اپنی اولاد کو ضرر پہنچایا ہو اور ان کی نیت ضخیر نہ ہو تو بالغ ہونے کے بعد اولاد کو حق فسخ نکاح ہو گا لیکن عام حالات میں ولی شرعی کا کیا ہوا نکاح نا قابل فسخ ہے۔

(2) نیت نماز رکن ہے اس سے نماز کا وجود ہوتا ہے لیکن نیت کے لیے الفاظ کا زبان پر لانا یا دل میں پیدا کرنا ضروری نہیں ہے یہ سمجھنا کہ یہ کون سی نماز ہے اور کس حیثیت میں ہے ادا یا قضا' فرادی یا بجماعت واجب یا سنت اسی کا نام نیت ہے اور ذھن میں ان چیزوں کا ہونا کافی ہے۔

(3) غسل واجب ہو یا سنت ہو یا برہنگی کی کوئی بھی حالت ہو بسم اللہ یا کلمہ شہادت وغیرہ پڑھنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

سوال :۔ ایک منکوحہ لڑکی کو طلاق ہو گئی۔ طلاق کے دو سال بعد جب نکاح ثانی ہو چکا تو ایک معاند فریق نے طلاق نامہ دیکھنے کا سوال اٹھادیا جو کسی نہ کسی طرح کہیں سے غائب کر دیا گیا تھا۔ ان حالات میں جب طلاق نامہ کی تحریر موجود نہیں تو نکاح ثانی کی کیا صورت ہے ؟

جواب :۔ مسئلہ مذکور کے بارے میں تحریر ہے کہ نکاح ہو یا طلاق اس کا نفاذ کسی تحریر پر منحصر نہیں ہے بلکہ ان شرائط پر ہے جو شریعت نے مقرر کیے ہیں۔ اگر نکاح یا طلاق ممطابق شریعت ہوں اور تحریر نہ ہو تو نکاح اور طلاق اپنی جگہ درست ہے اور اگر نکاح یا طلاق حسب قانون شریعت نہیں تو پھر لاکھ تحریر موجود ہو بیکار ہے لہذا اگر طلاق شرعی لڑکی کو ہو چکا ہے تو یہ ایک حقیقت ہو چکی ہے۔ اس صورت میں جو عقد ثانی پڑھا جا چکا ہے وہ صحیح ہے۔ نکاح خواں کے دستخط کرنے نہ کرنے اور پڑھے ہوئے نکاح پر اس کے راضی یا ناراض ہونے کا کوئی اثر نہیں ہے اور دوبارہ نکاح پڑھے جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔

صدقہ کے اقسام اور اس کے مصرف :

صدقہ کا لفظ جن چیزوں پر مستعمل ہے اس کی دو قسمیں ہیں۔

(1) قانون شریعت نے جس کو شرائط کی موجودگی میں بالاستقلال فرض واجب قرار دیا ہے یعنی زکوٰۃ مال وزکوٰۃ فطرہ۔ صدقہ کی وہ قسم ہے کہ اگر صدقہ سید کی طرف سے ہے تب تو سید اور غیر سید دونوں لے سکتے ہیں اور اگر غیر سید کی جانب سے ہے تو سید پر حرام ہے۔ یہاں یہ نکتہ بھی لائق توجہ ہے کہ اگر سید نے اپنی جانب سے اپنا اور اپنے عیال کا فطرہ نکالا ہے تو چاہے اس کے عیال میں یہ مہمانوں میں کوئی ایک یا سب کے سب غیر سید بھی ہوں تب بھی یہ تمام فطرہ سید ہی کا سمجھا جائے گا۔ اسی طرح اگر غیر سید نے اپنا اور اپنے عیال کا فطرہ نکالا تو چاہے اس کے عیال میں کوئی ایک یا سب کے سب سید ہوں تو یہ فطرہ کل کا کل غیر سید کا قرار پائے گا یعنی فطرہ سید کا ہے یا غیر سید کا یہ بات فطرہ نکالنے والے پر منحصر ہے۔ اگر فطرہ نکالنے والا سید ہے تو کل فطرہ سید کا ہے نہیں تو کل فطرہ غیر سید کا ہے۔

(2) وہ صدقات جو کسی بناء پر واجب ہو گئے ہیں لیکن وہ واجب مستقل نہیں ہیں۔ روزوں کا کفارہ۔

سوال :۔

(1) سفر کرے کہ نماز قصر ہو جاتی ہے ؟

(2) نافلہ نمازوں کے متعلق تفصیل سے ارشاد فرمائیں۔

جواب :۔

(1) جب کوئی شخص اپنی قیام گاہ سے ساڑھے ستائیس میل یا اس سے زیادہ کی مسافت کا سفر جائز کرنے کے لیے روانہ ہو اور وہ شخص اپنی آبادی سے اتنی دور نکل جائے کہ آواز اذان وہاں نہ سنائی دے تو اس سفر میں وہ شخص ہر چار رکعتی نماز میں قصر کرے گا اور صرف دو رکعت پڑھے گا یعنی سفر کے شروع ہوتے ہی چار رکعتی نماز قصر ہو جائے گی۔ پھر ساڑھے ستائیس میل طے کر کے یا اس سے زیادہ مسافت طے کر کے جب یہ اپنی منزل مقصود پر پہنچے تو اگر وہ منزل مقصود اس شخص کا وطن ہے یا وطن تو

نہیں ہے لیکن وہاں دس روز ٹھہرنا ہے یا دس روز سے زیادہ ٹھہرنا ہے تو وطن ہونے کی حالت میں یا کم از کم دس دن ٹھہرنے کی حالت میں دونوں حالتوں میں نماز پوری پڑھے لیکن اگر وہ جگہ وطن بھی نہیں اور وہاں دس دن ٹھہرنا بھی نہیں تو یہ شخص اس جگہ بھی نماز قصر کرے گا اور جب واپس آئے گا تو راستہ میں بھی قصر کرے گا۔ اس کے علاوہ قصر کرنے کی ایک صورت اور بھی ہے۔ وہ یہ کہ یہ شخص اپنے قیام گاہ سے کسی ایسی جگہ پر پہنچنے کے قصد سے روانہ ہو کر جو جگہ نہ تو اس کا وطن ہے نہ وہاں دس روز یا زیادہ ٹھہرنا ہے بلکہ دس دن کے اندر اندر ہی واپس آنا ہے اور یہ ساڑھے ستائیس میل ایک طرف کے راستہ کے تو نہیں بنتے بلکہ دونوں طرف کے راستہ کو ملا کر ساڑھے ستائیس میل یا اس سے زیادہ بنتے ہیں تب بھی اس صورت میں یہ شخص اپنی جگہ سے ہٹتے ہی اور اس سفر کے شروع ہوتے ہی نماز قصر کرے گا اور جب تک اپنی قیام گاہ پر واپس نہ پہنچے نماز قصر ہی کرے گا۔ فرض کیجئے کہ آپ اپنے وطن سے ایسی جگہ جانا چاہتے ہیں جو 14‘15 میل کے فاصلے پر ہے اور آپ وہاں دو چار روز یا زیادہ سے زیادہ نو ساڑھے نو دن ٹھہریں گے پورے دس دن ٹھہرنا نہیں ہے تو آپ اپنے وطن سے نکل کر روانگی میں بھی قصر کریں گے اور وہاں پہنچ کر بھی اور وہاں سے واپسی کے راستہ میں بھی۔ شرط یہ ہے کہ سفر جائز کام کے لیے ہو‘ ناجائز کام کے لیے ہوگا تو قصر کی رعایت کسی بھی صورت میں نہ ہوگی۔

(2) پانچ نمازیں جو روزانہ فرض ہیں ان میں ہر نماز کے ساتھ سنتی نوافل نمازیں ہیں جن کو پڑھنا موجب ثواب ہے اور جن کے پڑھنے کی تاکید ہے البتہ یہ نمازیں واجب اور فرض نہیں ہیں۔ یہ سنتی نمازیں اصل نماز کے وقت فضیلت ہی میں پڑھی جاسکتی ہیں اگر وقت فضیلت گزر گیا ہے تو سنتی نوافل کا وقت نہیں رہا۔ یوں سمجھئے کہ ظہر اور عصر کی نماز تو دن چھپنے سے پہلے پہلے ادا ہو سکتی ہیں۔ لیکن ظہر اور عصر کے نوافل آخری وقت میں نہیں پڑھے جاسکتے بلکہ وقت فضیلت ہی میں پڑھے جائیں گے۔ اسی طرح مغرب‘ عشاء کی اصل نماز تو رات کے دس گیارہ بجے بھی ادا ہو سکتی ہے لیکن

وہ وقت فضیلت کا نہیں ہے اس وقت نوافل نہ ہوں گے۔ صبح کی نماز کا بھی اگر آخری وقت ہے اور وقت فضیلت گزر گیا ہے تو نوافل کا وقت بھی گزر گیا۔ صرف نماز صبح جو فرض ہے اس کو ادا کیجئیے۔

(1) صبح کی نافلہ دو رکعت ہیں اور یہ صبح کی اصل نماز سے پہلے ہے اور اصل نماز جو فرض ہے اس نافلہ کے بعد ہے۔ صبح کی طرح اس کو نماز صبح سے پہلے پڑھیے۔ کھڑے ہو کر پڑھیں تو افضل ہے ورنہ بیٹھ کر بھی پڑھ سکتے ہیں۔

(2) نماز ظہر کا نافلہ آٹھ رکعت ہے۔ دو دو رکعت الگ الگ کر کے چار دفعہ پڑھیے۔ یہ ظہر کا نافلہ بھی ظہر کی نماز سے پہلے ہے اور اصل نماز ظہر اس کے بعد ہے۔ بیٹھ کر بھی پڑھ سکتے ہیں لیکن کھڑے ہو کر پڑھنا افضل ہے۔

(3) نماز عصر کا نافلہ بھی آٹھ رکعت ہے۔ دو دو رکعت الگ الگ کر کے چار دفعہ پڑھیے۔ یہ عصر کا نافلہ بھی نماز عصر سے پہلے ہے نماز عصر اس کے بعد ہے۔ بیٹھ کر بھی پڑھ سکتے ہیں مگر کھڑے ہو کر پڑھنا افضل ہے۔

(4) نماز مغرب کا نافلہ چار رکعت ہے۔ دو دو رکعت الگ الگ دو دفعہ پڑھیے۔ مغرب کا یہ نافلہ نماز مغرب کے فوراً بعد ہے پہلے نہیں ہے کھڑے ہو کر پڑھنا افضل ہے بیٹھ کر بھی پڑھ سکتے ہیں۔

(5) نماز عشاء کا نافلہ دو رکعت ہے جو عشاء کے بعد کھڑے ہو کر نہیں بلکہ صرف بیٹھ کر پڑھا جائے گا۔ یہ نافلہ بھی نماز عشاء کے بعد ہی ہے۔ پانچوں نمازوں کے نافلہ نمازوں میں اگر آپ صرف سورۂ الحمد پڑھیں اور دوسرا سورہ نہ پڑھیں تب بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے البتہ اگر عام نمازوں کی طرح آپ سورۂ الحمد کے بعد کوئی دوسرا سورۂ بھی پڑھیں تو زیادہ ثواب ہے مگر اس دوسرے سورۂ کے لیے کسی خاص سورہ کی قید نہیں جو سورۂ چاہیں پڑھیں۔

اس کے علاوہ نماز تہجد ہے جو آدھی رات گزرنے پر ہے۔ یہ نماز رات کے آخری حصہ میں جو حصہ صبح کے طلوع سے جا ملتا ہے افضل ہے۔ یعنی اس پوری

نماز تہجد کا ایسے وقت ختم کرنا افضل ہے کہ جس کے بعد نماز صبح کا وقت آہی رہا ہو۔ یہ نماز گیارہ رکعت ہے۔ پہلے تو آٹھ رکعت نماز شب کی نیت سے پڑھے دو دو رکعت الگ الگ چار دفعہ پھر دو رکعت نماز شفع کی نیت سے۔ پھر صرف ایک رکعت نماز وتر کی نیت سے۔ اس ایک رکعت میں الحمد کے بعد تین مرتبہ قل ھو اللہ احد' ایک مرتبہ قل اعوذ برب الناس اور ایک مرتبہ قل اعوذ برب الفلق۔ پھر ہاتھ اٹھا کر قنوت' اس نماز میں قنوت کی بہت تاکید ہے اور یہ کہ قنوت طولانی ہو جس میں ستر مرتبہ استغفر اللہ ربی واتوب الیہ بھی پڑھا جائے۔ چالیس مومنوں یا زیادہ کی مغفرت کی دعا بھی کی جائے۔ تین سو مرتبہ یا جتنا ہو سکے العفو' العفو بھی کہا جائے۔ اس نماز کے قنوت کے لیے تحفۃ العوام یا اور کسی کتاب میں دیکھ کر قنوت کی دعاؤں کو یاد کر لیا جائے۔ بلکہ اگر ہو سکے تو کسی عالم سے دعاؤں کی ترتیب اور الفاظ کی صحت معلوم کر لی جائے۔

☆☆☆☆☆

مولانا کے خطوط

سید وحید الحسن ہاشمی

خطوط نویسی ایک باقاعدہ ' لطیف اور شائستہ فن ہے جس کی ابتدا فن تحریر کے ساتھ منسلک ہے خطوط لکھنے والوں نے اس وقت خطوط لکھے جب ان کے دل کی بات یا دل کا کرب مکتوب الیہ کے روبرو بیان کرنے کے مواقع میسر نہ تھے۔ ایسی صورت میں اپنا مافی الضمیر کاغذ پر منتقل کرنے کے سوا کوئی اور چارہ ہی نہ تھا۔

ہمیں ایسے بھی خطوط دستیاب ہوئے ہیں جن میں طنز و مزاح کی چاشنی کا مزہ ملتا ہے اور ہم ہنسی خوشی ایسے خطوط کو حرز جاں بنا لیتے ہیں اور جب کبھی موقع ملتا ہے تو انہیں پڑھ کر اپنا دل بہلا لیتے ہیں اور خط نگار کے مزاج میں ڈوبے ہوئے جملوں سے اس کے بعد اس کی یاد تازہ کر لیتے ہیں۔

خطوط کو نصف ملاقات بھی کہا گیا ہے یہ خط بھیجنے اور پانے والے کے درمیان کا ایک سربستہ راز ہے جس کے دو کردار ہیں اور دونوں نے طے کر لیا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے رازوں کو افشا نہیں کریں گے اس قسم کے خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ دو شخصیات میں کس قدر محبت اور الفت ہے اور دونوں ایک دوسرے پر کتنا اعتبار کرتے ہیں۔

انسان کو ایک سماجی جانور بھی کہا جاتا ہے۔ یہ جانوروں کی طرح اٹھتا بیٹھتا، کھاتا پیتا، سوتا جاگتا اور کھیلتا کودتا ہے۔ آدمی کو صرف عقل کی وجہ سے جانوروں پر تفوق حاصل ہے۔ مکتوب نگار سماجی بندھنوں میں جکڑا ہوتا ہے۔ بظاہر وہ عام انسانوں

کے سے افعال کرتا ہے مگر جب وہ خط تحریر کرتا ہے تو اپنی شخصیت کے تمام پوشیدہ پردے ہٹا کر اس طرح کی گفتگو کرتا ہے جیسے اس کی باتیں سوائے مکتوب الیہ کے اور کوئی نہیں سن رہا ہے۔ اس منزل پر اگر مکتوب نگار صاحب علم و فن ہے اور انسانی نفسیات کا عالم ہے تو اس کے خطوط غیر فانی ہو جاتے ہیں۔

خطوط کی سیکڑوں قسمیں ہیں جن کا تذکرہ یہاں بہتر معلوم نہیں ہوتا۔ البتہ یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ کاغذ کی ایجاد سے قبل خطوط پتوں، درختوں کی چھال اور جانوروں کی کھال پر تحریر کئے جاتے تھے، ایسے خطوط ملے ہیں جو جانوروں کی جھلی پر تحریر کر کے محفوظ کر لئے گئے ہیں۔ قدیم یونان اور روم کے قابل لوگ خطوط لکھتے تھے۔

حضورؐ کی پیدائش سے قبل عرب میں خطوط نویسی کا رواج تھا۔ عہد نبوی میں کاتب کا باقاعدہ عہدہ تھا اور خود حضورؐ نے بیرون ممالک کے فرمانرواؤں کو مذہبی اور سیاسی خطوط تحریر کئے ہیں۔ حضرت علیؑ نے مالک اشتر کو جو اخلاقی، انتظامی، مذہبی، سیاسی اور معاشرتی طویل خط تحریر کیا ہے وہ اصول جہانبانی کا سب سے قدیم خط ہے۔ عباسیوں کے عہد میں عربی زبان کو بڑا فروغ حاصل ہوا اسی زمانے میں دار الخلافہ میں ایک دیوان الانشا قائم ہوا جہاں خطوط آتے تھے اور جہاں سے خطوط ارسال کئے جاتے تھے۔ ہلاکو خان نے سلطنت عباسیہ کا خاتمہ کر دیا اور اسلامی سلطنتوں میں عجمی اثرات پھیل گئے۔ فارسی زبان کی ترقی کے ساتھ ساتھ خطوط نگاری کو بھی فروغ ملا اب کاتب کے عہدے کو منشی یا دبیر کہنے لگے۔ فارسی خطوط کے متعدد مجموعے شائع ہوئے جن میں منشیات رشیدی اور اور رقعاتِ جامی بہت مشہور ہیں۔

اردو زبان میں خطوط کا ایک انبار ہے مگر سادگی اور بے تکلفی کی رو سے مرزا غالب کے خطوط بہت مشہور ہیں۔ ہم ان خطوط سے مرزا کے دور کی پوری خصوصیات کا اندازہ کر لیتے ہیں۔

مولانا محمد جعفر زیدی شہید 1908ء میں پیدا ہوئے اور 1980ء میں شہید

کر دیئے گئے۔ انہوں نے 39 برس متحدہ ہندوستان میں اور 33 سال پاکستان میں بسر کئے۔ میں نہایت افسوس کے ساتھ یہ لکھنے پر مجبور ہوں کہ مجھے 72 سال تک زندہ رہنے والے اہل قلم اور عالم باعمل مولانا کے صرف 23 خطوط دستیاب ہوئے جن میں سے چند میں نجی حالات کا تذکرہ ہے اور ان پریشانیوں کا ذکر ہے جو تقسیم ملک کے نتیجے میں مولانا کے خاندان والوں نے برداشت کیں۔

مولانا کے انداز نگارش کی واحد خصوصیت یہ ہے کہ وہ جو کچھ تحریر فرماتے تھے بے تکلف اور نہایت سادہ زبان میں لکھ دیتے تھے۔ یہ کہیں سے اندازہ نہیں ہوتا کہ انہیں خط لکھنے میں کوئی کاوش یا جستجو کرنی پڑی ہو۔ ان کے خطوط کیا ہیں عام ادبی اور قلبی بول چال ہے۔ ہر خط میں اپنے مقصد کے لئے نہایت مناسب الفاظ استعمال کرتے تھے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آمد ہی آمد ہے آورد برائے نام نہیں۔ چند خطوط اعزہ کے نام ہیں اور چند خطوط اس بانی مجلس کے نام ہیں جو مولانا کو گجرات میں مدعو کرتے تھے۔

مولانا کی والدہ ملتان میں ہیں اور مولانا لاہور سے ان کے نام خط تحریر کر رہے ہیں چونکہ کنبے کے افراد عارضی پاسپورٹ پر پاکستان آئے ہیں اس لئے مولانا کو شدید الجھن ہے کہ معاملات کس طرح حل کئے جائیں۔ 5 جنوری 1957ء کے خط میں تحریر کرتے ہیں۔

> بعد آداب آنکہ کل عزیزہ سلمہا کے دو کارڈ ساتھ ساتھ پہنچے جن سے آپ کے بخار کا حال معلوم ہو کر سخت فکر ہوئی خدا کرے کہ اب طبیعت درست ہو اور آپ بالکل تندرست ہوں ارادہ کر رہا ہوں کہ آپ سے جلد آکر ملوں۔ کچھ ایسی پریشانیاں آج کل لاحق ہیں کہ کوئی ایک راستہ نظر نہیں آتا آپ کسی سے فوراً خط لکھوا کر مفصل اپنی طبیعت کا حال لکھایئے جب تک خط نہ آئے گا فکر اور تردد رہے گا۔

سمجھ میں نہیں آتا ہم کہاں رہیں اور کہاں جائیں پاسپورٹوں کا قصہ آئے دن سر پر سوار رہتا ہے غرضیکہ ہر بات جھگڑے میں ہے۔ (سید محمد جعفر عفی عنہ)

15 جنوری 1957ء کے خط میں والدہ کو تحریر کرتے ہیں

تسلیم! ہم لوگ خیریت سے ہیں اور آپ کی خیرت کے طلبگار ہیں۔ سردی زیادہ ہو رہی ہے۔ خدا کرے کہ آپ بخیریت سے ہوں۔ میں یہاں کی الجھنوں کے سبب سے پھنسا ہوا ہوں اور آپ سے نہ مل سکا۔ قیام کے متعلق ابھی تک کچھ طے نہیں کر سکا کہ یہاں رہنا ہو گا یا کہاں اسی چکر میں پڑا ہوا ہوں۔ (سید محمد جعفر عفی عنہ)

پاکستان میں مولانا کا ذریعہ آمدنی کوئی نہ تھا ان کے صاحبزادے ڈاکٹر نصیر عالم جو رقم بھیجتے تھے مولانا اسی میں گزر بسر کرتے تھے اس کے علاوہ اکثر مقامات پر مجالس یا محافل میں تقاریر کرتے تھے تو بانی مجلس آنے جانے کا کرایہ دیتے تھے۔ مولانا کبھی کبھی بانی مجالس سے قبل انعقاد مجلس کرایہ طلب کر لیتے تھے اور اگر وعدہ کے مطابق کرایہ وصول نہ ہوتا تھا تو اس مقام پر اپنی تقریر کینسل کر دیتے تھے اور کہیں اور چلے جاتے تھے۔ 6 اگست 1960ء کو گجرات کے حکیم رفاقت حسین مرحوم کو تحریر کرتے ہیں۔

جناب مکرم حکیم صاحب۔ تسلیم! مجھ سے 18 صفر کی مجلس کے لئے حضرات شیخوپورہ کہہ گئے تھے کہ ہم کل کرایہ ارسال کر دیں گے چونکہ کرایہ ابھی تک نہیں آیا اس لئے گنجائش ہے کہ میں یہ تاریخیں بھی آپ ہی کو دے دوں والسلام۔ (سید محمد جعفر عفی عنہ)

مولانا مرحوم سے پاکستان کے ہر گوشے کے مومنین دینی سوالات پوچھتے تھے اور مولانا حتی الامکان اس کا جواب دیا کرتے تھے کبھی ایک ماہ کے تمام سوالات کے جوابات رسالہ ''پیام عمل'' میں شائع کر دیئے جاتے تھے۔ 13 نومبر 1979ء کو مولانا کامران رضا کاظمی کے خط کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

جناب مکرم تسلیم! عبادات میں لفظ مکروہ کے معنی ہمیشہ یہ ہوتے ہیں کہ عمل تو صحیح رہے گا اور موجب ثواب بھی ہوگا لیکن مکروہ قرار دینے والے عمل کے بغیر وہ عمل ہوگا تو ثواب زیادہ ملے گا اور مکروہ قرار پانے پر ثواب میں نسبتاً کمی ہوگی جیسے وضو کی تری کو کپڑے سے خشک کرنا اس کا مطلب یہ ہے کہ وضو درست رہے گا موجب ثواب بھی ہوگا مگر اس عمل سے نسبتاً ثواب کم ملے گا۔ اسی طرح مکروہات نماز مکروہات روزہ ہر جگہ عبادات میں ایسے الفاظ کا یہی مطلب ہوتا ہے۔ والسلام! (سید محمد جعفر عفی عنہ)

مولانا کے ان چند خطوط ہی سے اندازہ ہوتا ہے کہ انسانی ہمدردی کا جذبہ آپ کے دل میں بدرجہ اتم تھا۔ ان کے صاحبزادے ڈاکٹر نصیر عالم ان سے رخصت ہونے کے وقت نزلے اور زکام میں مبتلا تھے۔ مولانا کو بیٹے کی یہ معمولی سی تکلیف اس قدر بڑی معلوم ہوئی کہ انہوں نے ایک خط میں اس کا اظہار کیا ہے۔

کاش ہمارے پاس مولانا کے سو پچاس خطوط ہوتے تو ان سے مولانا کی شخصیت کے مزید پہلوؤں پر روشنی پڑتی۔

☆☆☆

شہیدِ لاہور کی آخری نامکمل تحریر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
الحمد للہ رب العالمین والصلوۃ والسلام علی
نبیہ خاتم النبیین وآلہ الطاہرینo

عمدۃ الاحباب الاطیاب عالی جناب ڈاکٹر سید رمضان علی صاحب جو ہماری قوم وملت کی ایک مشہور ومعروف ہستی ہیں اور کسی تعارف کی محتاج نہیں ہیں خود عین الکمال ہیں اور فن ان کا کمال العین ہے۔ سید عالی نسب' دیندار اور اپنے آباء کرام (محمدؐ وآل محمدؐ) کے شیدا اور جاں نثار غرضیکہ موصوف مجسمہ صفات اور پیکر کمالات ہیں۔

عرصہ سے ممدوح کی خواہش تھی کہ ان قرآنی آیات کو ایک جگہ جمع کیا جائے جن سے شان والا شانِ سرکار رسالت ظاہر ہوتی ہے تاکہ ہر صاحبِ نظر ان بکھری ہوئی آیات کو ایک نظر میں دیکھ سکے۔ ساتھ ہی ان آیات کا ترجمہ اور ضروری وضاحت بھی ہو۔ موصوف کی اس خواہش کو پورا کرنے میں مجھے دیر اس لیے لگی کہ میں اس کام کیلئے اطمینان وسکون کی جستجو میں تھا مگر اس دنیا میں سکون واطمینان کہاں۔ موصوف کے باربار فرمانے سے اور یاددہانی سے شرمندہ ہو کر میں نے طے کر لیا کہ جس حالت میں بھی ہوں قلم برداشتہ آغاز کر دوں اور انجام و اتمام سپرد خدا کروں۔ السعی منا والاتمام من اللہ۔

اصل مقصود شروع کرنے سے پہلے قرآن کریم کے متعلق چند ضروری اور مفید باتیں بھی تحریر کرنا ہیں۔

السید جعفر عفی عنہ

اعجاز قرآن :

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ کلام خدا جو بصورت قرآن نازل ہوا ہے عربی زبان کے متداول اور مستعمل الفاظ پر مشتمل ہونے کے باوجود ایک ایسا معجزہ ہے کہ عرب کے قادر الکلام فصحا و بلغاء اس کی مثل لانے سے قطعاً عاجز رہے اور رہیں گے یہاں تک کہ قرآن کریم کا ہر سورہ ہی نہیں بلکہ ہر آیت اور ہر آیت ہی نہیں بلکہ ہر جملہ معجزہ اور بے مثل ہے اور بے مثل بھی ایسا کہ کسی دوسرے کلام کو خواہ وہ کتنا ہی بلند پایہ اور افصح و ابلغ کا کلام ہو کلام ربانی سے کوئی نسبت ہی نہیں اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ایسا بے مثل کلام بے مثل ذات ہی کا ہو سکتا ہے۔ لطف یہ کہ اس کلام کو پیش کرنے والا اور پڑھ کر سنانے والا وہ کہ جس نے بچپن سے لیکر آخر عمر تک کبھی نوشت و خواند کا کام ہی نہیں کیا۔

نوشت و خواند سے سرکار رسالت کیوں الگ تھلگ رہے اور کیوں الگ تھلگ رکھے گئے

خاندانِ رسالت علم و فضل کا مرکز رہا۔ اس خاندان میں بہترین صاحبِ قلم رہے۔ اپنے خاندان کے بارے میں جناب امیر علیہ السلام فرماتے ہیں "رضینا قسمة الجبار فینا + لنا علم و لأ عدائنا مال"" یعنی اللہ تعالیٰ کی تقسیم سے ہم خوش ہیں کہ ہمارے حصہ میں علم رکھا اور ہمارے دشمنوں کے حصہ میں مال رکھا۔ سرکارِ رسالت چند سال کی عمر تک اپنے دادا جناب عبد المطلب کی کفالت میں اور اس کے بعد مستقل طور پر جناب ابو طالب کی تربیت میں رہے۔ دادا اور چچا آپ کو اپنی اولاد سے کہیں زیادہ چاہنے والے جاں نثار اور ناز بردار تھے۔ تعجب کی بات ہے کہ نہ تو ان بزرگوں نے سرکار کو لکھانے پڑھانے کا خیال کیا اور نہ تمام تر صلاحیت کے باوجود خود سرکار نے اس طرف توجہ فرمائی۔ کمال کی بات ہے کہ نبیؐ و علیؑ ایک ہی گھر میں پلے اور ایک ہی مربی نے پالا مگر یہ مسلّم کہ علی مرتضیٰ صاحبِ قلم اور کاتبِ بے مثل اور سرکارؐ کے ہاتھ میں کبھی قلم

تک نہیں' یہ کیوں؟ اس لئے کہ سرکار کے دادا ہوں یا چچا ہوں یا خود آپ ہوں۔ یہ سب کے سب مصالحِ قدرت کے رازدار اور عالمِ اسرار تھے۔ نوشت و خواند سے ظاہر بظاہر آپؐ اس لئے الگ رہے اور الگ رکھا گیا کہ آپ کا یہ کمال اگر ظہور میں آگیا تو قرآن کے پیش کرنے کے وقت ہر شخص کو یہ کہنے کا موقع ملے گا کہ ایک باکمال صاحبِ فن نے اپنے کلام کو کلامِ خدا کا نام دے کر پیش کیا ہے اسی کی طرف آیت قرآنی نے اشارہ کیا ہے "ولا تخطه بيمينك اذاً لا رتاب المبطلون٥" (سورہ عنکبوت آیت 48) یعنی اے رسول تم تو اپنے ہاتھ سے اس کو کبھی لکھتے بھی نہیں ہو اگر تم اپنے ہاتھ سے لکھتے ہوتے تو اس وقت تو اہل باطل اور بھی زیادہ شکوک و شبہات میں پڑ جاتے۔

آیہ مذکورہ نے ہمارے اوپر کے بیان کو بالکل واضح کر دیا کہ ابتداء عمر مبارک سے آپ کو نوشت و خواند سے کنارہ کش رہنا اور آپ کے بزرگوں کا اس امر کی طرف متوجہ نہ ہونا یہ سب منشائے الٰہی کے تحت تھا جس کا اِن حضرات کو علم تھا کیونکہ نبیؐ و علیؑ کے آباء واجداد جناب ابراہیم علیہ السلام کے اوصیاء اور ملهم من اللہ تھے۔

آیہ مذکورہ نے آنحضرت کا نوشت و خواند کا کام نہ کرنا اور اس کی مصلحت کو بیان کیا ہے مگر یہ نہیں کہا کہ آپ لکھنا پڑھنا جانتے نہیں ہیں اور یہ ممکن بھی کیسے ہو سکتا ہے کہ جس ذات کو خداوند عالم نے معلم کتاب و حکمت قرار دیا ہو' جو علم و حکمت کا شہر اور گھر ہو' عالم علم لدنی ہو وہ لکھنا پڑھنا ہی نہ جانتا ہو۔

آنحضرتؐ کو امی کیوں کہا گیا:

بہت سے لوگوں کو آپؐ کے امی لقب سے غلط فہمی ہوئی ہے اور یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ لفظ اُمّی ناخواندہ ہونے کی وجہ سے کہا گیا ہے کمال کی بات ہے کہ اپنی خودساختہ اصطلاح کو کلام اللہ پر بھی مسلط کرنے کی کوشش کی جائے۔

قرآن کریم نے صرف آپ ہی کو اُمّی نہیں کہا بلکہ اہل مکہ کو بھی جا بجا اُمّیّن کہا

ہے جبکہ شہر مکہ کو اُم القریٰ فرمایا جبکہ لتنذر ام القرٰی اور بعث فی الامیین رسولا منھم سے ظاہر ہے۔

چونکہ مکہ کا نام ام القریٰ تھا تو وہاں کا باشندہ اُمّی اور باشندگان اُمّیین کہلائے۔ لفظ اُمّی اصل میں مرادفِ ہے لفظ مکی کا اس لفظ کا خواندہ یا ناخواندہ ہونے سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ قرآنی لفظ اُمّی کے معنی جاہل سمجھنا عین جہل ہے۔

کیا سرکارؐ کی حیثیت صرف پیغام رساں کی ہے:

ہم انشاء اللہ اس مسئلہ پر سیر حاصل بحث کریں گے فی الحال یہاں اتنا اشارہ کر کے آگے بڑھیں گے کہ اگر کسی حاکم کے احکام اس کے محکوم تک پہنچانے کیلئے درمیان میں کوئی قاصد اور پیغام رساں ہے (جیسا کہ عموماً ہوتا ہے) تو اس صورت میں محکوم کو حاکم کے حکم کو بجالانا یہ اطاعت حاکم تو یقیناً ہوگی لیکن حکم حاکم کی بجاآوری کو قاصد اور پیغام رساں کی اطاعت ہرگز نہیں کہا جاسکتا۔ اسی طرح اگر محکوم اپنے حاکم کے حکم پر عمل نہ کرے تو اس کو حاکم کی نافرمانی تو ضرور کہیں گے مگر قاصد اور پیغام رساں کی نافرمانی ہرگز نہیں کہا جاسکتا۔ اس کے برخلاف خداوند عالم نے قرآنِ کریم میں جابجا اطاعتِ رسول کا حکم دیا اور اتباعِ رسول کو قدرت نے اپنے بندوں کی طرف سے خود اپنی محبت کا ثبوت قرار دیا بلکہ یہاں تک فرمایا کہ جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔ اسی طرح قدرت نے فرمانِ رسول پر عمل نہ کرنے کو رسول کی نافرمانی اور رسول کی معصیت کہا من یعص اللّٰہ ورسولہ عصیتم۔

رسولؐ کے فرمان کو امر کہا تنازعتم فی الامر۔

اور رسولؐ کو اُمت کے ہر اختلاف میں حکم قرار دینے کو مومنیت کی شرط قرار دیتے ہوئے فرمایا: فلا وربّك لایومنون حتیٰ یحکّوك فیما شجر بینھم۔

یہ تک فرمایا کہ رسولؐ جو فیصلہ کریں ان کے حکم کو تنگ دلی سے نہیں بلکہ وسعت قلب سے قبول کرو گے تو مومن ہو گے ورنہ نہیں۔

یہ شان صرف قاصد اور پیغام رساں کی ہرگز نہیں ہوتی۔ حقیقتاً قدرت نے آپؐ کو بااختیار اور صاحبِ اقتدار حاکم اور فرمانروا قرار دیا ہے۔

کیا احکامِ شریعت قرآنی آیات کے نزول کے بعد نافذ :

ہم اس موضوع پر عرصہ سے کچھ کہنے اور لکھنے کے آرزو مند تھے۔ یہ مسئلہ بہت اہم ہے اس لیے بھی کہ جو خیالات اور نظریات عام طور پر ذہن نشین بلکہ دل نشین نہیں ان سے ٹکر لینا آسان نہیں۔ عام طور پر یہی نظریہ دیکھا جاتا ہے کہ احکام شریعت کے بارے میں باری باری آیاتِ قرآنی آتی تھیں اور نزول آیات کے بعد احکامِ شریعت مرتب ہوتے تھے مثلاً اقیمو الصلٰوۃ کے آنے کے بعد نماز قائم ہوئی اور آتوا الزکوٰۃ نے زکوٰۃ کی بنیاد رکھی۔ آیہ وضوء کے آنے کے بعد وضوء کا آغاز ہوا اور آیہ غسل کے بعد غسل کا اور آیہ تیمّم کے بعد تیمّم کا اور کتب علیہم الصیام کے بعد روزوں کا اور آیہ قصر کے بعد نماز مسافر کے قصر کا اور اذا نودی للصلٰوۃ من یومِ الجمعۃ کے بعد نماز جمعہ کا آغاز ہوا۔ اسی طرح احلّ یا احلّت آنے کے بعد کوئی شے حلال اور حُرِّم یا حُرمت آنے کے بعد کوئی شے حرام ہوئی۔ اس نظریہ کا مطلب یہ ہے کہ احکامِ شریعت (حلال و حرام) آیاتِ قرانیہ کے نزول کے بعد ہی مرتب ہوئے ہیں پہلے آ رؐ ان احکام کے بارے میں کوئی لب کشائی نہ کر سکے بلکہ خاموش رہے۔

یہ نظریہ بعض احکام کیلئے تو صحیح ہو سکتا ہے کہ پہلے کسی حکم کو لیکر آیت نازل ہوئی اور اس کے بعد آنحضرتؐ نے اس حکم کو پہنچایا مثلاً قل لا اسئلکم علیه اجراً الا المودة فی القربیٰ کے نازل ہونے کے بعد آنحضرتؐ نے مودت اہل بیت کی معرفت میں بحکم خدا اجر رسالت طلب فرمایایا آیۂ یا ایھا الرسول بلغ ما انزل الیك من ربك الخ کے نازل ہونے کے بعد آنحضرت نے خم غدیر کے موقع پر مسلمانوں کو جمع کر کے مولائیت علی مرتضیٰ کا اعلان فرمایا۔

لیکن عام احکام شریعت کے بارے میں یہ نظریہ صحیح نہیں ہے بلکہ اگر معمولی

سی توجہ سے بھی ان آیات قرانیہ پر نظر کی جائے جن کو بناء احکام یعنی سبب حلت و حرمت اور بناء تعین فرائض و محرمات سمجھا جا رہا ہے تو وہ آیات خود اپنے منہ بولتی نظر آئیں گی کہ احکام شریعت پہلی پہل ان آیات نے آکر معین نہیں کئے بلکہ ان آیات نے رسولؐ خدا کے پہلے سے دیئے ہوئے احکام کی تائید کی ہے یعنی احکام شریعت کا ذکر کرلے کر جو آیات قرانیہ آئی ہیں وہ احکام پہلے سے مفصلاً بزبان رسول پہنچ چکے ہیں اب آیات قرآنیہ میں ان احکام میں سے بعض احکام کا ذکر صرف اس لیے کیا گیا ہے کہ آنحضرت کے دیئے ہوئے احکام کی کلام الٰہی سے تائید و تصویب ہو جائے اور بقاء قرآن کے ساتھ ساتھ ان احکام کا تذکرہ یقینی حیثیت میں باقی رہے۔

پہلی مرتبہ کسی عمل کا یا ترکِ عمل کا حکم دیا جائے گا تو حاکم ایسی تفصیل سے بیان کرے گا کہ محکوم اپنے حاکم کی منشا کے مطابق تعمیل کر سکے۔ لیکن اگر کوئی حکم تفصیل کے ساتھ دیا جا چکا ہے تو اس دیئے ہوئے حکم کی طرف صرف اشارہ کافی ہوگا:

یعنی اگر کوئی کسی سے ایسا کام لینا چاہے کہ جس کام کا اس کو پہلے سے کوئی علم ہی نہ ہو اور وہ نہ اس کام کو جانتا ہو نہ اس کا نام جانتا ہو اس کو کچھ خبر ہی نہ ہو کہ وہ کب' کہاں اور کیسے کیا جاتا ہے تو ایسی صورت میں محض اشارہ کر دینا اور صرف اس کام کا نام لے دینا ہرگز کافی نہ ہوگا بلکہ اس طرح تفصیل سے سمجھانا ضروری ہوگا کہ وہ پورے طور پر سمجھ کر وہ کام انجام دے سکے۔ اس کے برخلاف اگر کام کے کرنے والے کو پہلے سے اس کام کا تفصیلی علم حاصل ہو چکا ہو اور اب اس کے بعد اس کام کی یاددہانی یا تاکید و تائید مقصود ہو تو صرف اس کام کیلئے اشارہ کافی ہوگا۔

مثلاً آج کا طبیب اپنے مریض کے نسخہ میں اگر جوارش جالینوس یا شربت بزوری یا اطریفل زمانی لکھتا ہے تو ان مرکبات کے نام لکھ دینے پر طبیب پر کوئی اعتراض

نہ ہوگا کیونکہ یہ چیزیں جانی پہچانی چیزیں ہیں لیکن کوئی وقت ایسا بھی تھا کہ دنیا میں کہیں ان مرکبات کا وجود نہ تھا ابھی کسی طبیب نے نہ ان کے اجزاء کو ترتیب دیا تھا نہ ان ناموں کی کسی کو خبر تھی اس زمانہ میں کسی طبیب کو اگر ان ہی اجزاء سے ترتیب پائے ہوئے یہی مرکبات استعمال کرانا ہوں تو کیا اس کا صرف مرکبات کی طرف اشارہ کر دینا کافی ہوگا جو بعد میں معروف ہوئے صحیح اور لائق عمل ہو سکتا ہے جب تک مرکبات میں شامل مرکب کے اجزاء' اجزاء کی مقدار اور ان کے ملانے سے جو صورت بنے گی ان سب کا تفصیلی حال اور اثرات معلوم نہ ہوں۔ عقل اسے کس طرح سمجھ سکتی ہے مثلاً

وضوء کرو' غسل کرو' نماز پڑھو' روزہ رکھو' زکوۃ دو' حج کرو اور اسی طرح کے دیگر احکام کی تفصیل بتانے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ تمام چیزیں پہلے سے جانی پہچانی ہیں اور ان کا علم ہو چکا ہے لیکن اگر ایسا حکم ان حالات میں دیا جائے کہ کسی کو ان کے نام بھی معلوم نہ ہوں تو اس فضا میں محض نام لے دینا ہرگز کافی نہ ہوگا بلکہ ایسی تفصیل سے بتانا پڑے گا کہ اس کی مدد سے تعمیل حکم ہو سکے اور حاکم کی منشاء کے مطابق عمل ہو سکے۔ لہٰذا اب یہ دیکھنا ہے کہ قرآن کریم میں جن آیات کو احکام شریعت کی اساس اور بنیاد سمجھا جاتا ہے وہ عموماً کس نوعیت کی ہیں' آیا ان آیات میں عمل مطلوب کو اس طرح واضح کیا گیا ہے کہ جس سے حکم کی تفصیل معلوم ہو سکے یا تفصیلات کو چھوڑ کر صرف اشارہ ہی کیا گیا ہے۔

نماز کا حکم:

یہ تو ظاہر اور مسلّم ہے کہ نماز ابتداء اسلام ہی میں قائم ہو گئی تھی اور سرکار کے مبعوث برسالت کے ہونے کے بعد مکہ ہی میں ادا کی جاتی تھی لیکن کوئی بھی صاحبِ نظر یہ نہیں دکھا سکتا کہ مکہ کے تیرہ برس کے دور رسالت میں اور اس کے بعد مدینہ کے دس برس کے دور رسالت میں کوئی بھی ایسی آیت آئی ہو جس کی عبارت کی روشنی میں کوئی شخص نماز ادا کر سکے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ نماز کی ہیئت اور ترتیب کہیں بیان ہی

نہیں کی گئی۔ اسی طرح نمازوں کا شمار اور نمازوں کی رکعات کا بھی کہیں ذکر نہیں ہے۔
اس کے علاوہ یہ امر مسلم ہے کہ سب سے پہلا سورۂ قرآنی سورۂ علق ہے جس کو سورۂ اقرء بھی کہا جاتا ہے۔ قرآن کریم کے اس سب سے پہلے سورہ میں آنحضرت کے نماز پڑھنے کا ذکر ہے۔ ارأیت الّذی ینھٰی عبداً اذا صلّٰی۔
یعنی آیا تم نے دیکھا اس کو جو بندے کو روکتا ہے جبکہ وہ نماز پڑھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ آیت سرکار کے نماز پڑھنے کے بعد آئی اور اس آیت سے پہلے نماز قائم ہو چکی تھی تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب اس سورہ سے پہلے قرآن کی کسی سورت اور آیت کا نزول ہی نہ ہوا تھا تو نماز کس آیت قرآنی سے قائم ہوئی۔ دوسری بات یہ ہے کہ نماز کیلئے نمازیوں کا بدن اور لباس خبث اور حدث سے پاک ہونا ایک عقلی تقاضا ہے یہ نہیں ہو سکتا کہ کوئی شخص خبث اور حدث میں مبتلا ہوتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی حضوری میں کھڑا ہو کر معراج کی سعادت اور اللہ تعالیٰ کی قربت حاصل کرے۔ جب یہ طے ہے کہ آنحضرت اور دوسرے نمازی مکہ ہی میں فریضہ نماز ادا کرتے تھے تو ظاہر ہے کہ نماز کیلئے غسل جنابت اور وضوء کے احکام دیئے جا چکے تھے اور عدم امکان کی صورت میں غسل اور وضوء کا بدل بھی (تیمّم) بتایا جا چکا تھا۔ اور مسلمان پاک وصاف ہو کر ہی نماز پڑھتے تھے لیکن جن آیات قرآنیہ میں خبث اور حدث سے پاک ہونے کا ذکر ہے یعنی وضوء، غسل اور تیمّم بتایا گیا ہے وہ تمام تر آیات مدنی ہیں جو سورۂ مائدہ میں ہیں اور یہ بھی کیا معلوم ہے کہ یہ آیات مدینہ میں ہجرت کے کتنے بعد آئیں تو اس صورت میں اگر یہ مان لیا جائے کہ وضوء، غسل اور تیمّم کا ان ہی آیات کے نزول کے بعد آغاز ہوا تو اب تک یہ نماز گزار وضوء، غسل اور تیمّم کے بغیر ہی نماز پڑھتے رہے اور نجاسات سے آلودہ ہوتے ہوئے ہی خدا کے حضور اور خدا کے حرم محترم میں کھڑے ہوتے رہے۔

قرآن کریم میں روزہ رمضان المبارک کا ذکر:

روزہ رمضان المبارک کے ذکر کی سب سے پہلی آیت جو دوسرے پارہ اور سورہ بقرہ میں ہے اس میں صرف روزہ کا وجوب اور فرض ہونا بیان کیا گیا ہے۔ کتب

علیکم الصیام الخ اور فلیصمه فرما کر روزہ کی فرضیت دکھائی گئی ہے لیکن یہ مطلق ذکر نہیں ہے کہ روزہ کن کن چیزوں کے اور کن کن افعال کے ترک کا نام ہے یہاں تک کہ کھانے پینے اور مباشرت سے بھی پرہیز کرنے کا ذکر نہیں ہے لیکن اس کے باوجود روزہ کا آغاز ہو گیا اور مسلمان روزہ رکھنے لگے۔ ظاہر ہے کہ روزہ صرف آنحضرت کی ہدایات کی بناء پر شروع ہوا اور روزہ کے تمام تر پرہیز اور مبطلات آنحضرت نے بتائے ان ہدایات میں سے یہ بھی ہدایت تھی کہ روزہ کے دن میں اور اس سے پہلی شب میں مباشرت حرام ہے لیکن روزہ تو روزہ دار رکھتے تھے مگر روزہ کی شب میں کچھ لوگ تھے جو مباشرت سے پرہیز نہ کرتے تھے اس حالت کو دیکھ کر جو آیات نازل ہوئیں وہ یہ ہیں :

احلّ لکم لیلة الصیّام الرّفث الی نسائکم هنّ لباس لکم وانتم لباس لهنّ علم الله انکّم کنتم تختانون انفسکم فتاب علیکم و عفاعنکم فالئٰن باشروهنّ وابتغوا ما کتب اللّٰه لکم وکلوا واشربوا حتی یتبیّن لکم الخیط الابیض من الخیط الاسود من الفجر ثم اتمّوا الصیام الی الیلo" (پارہ دوم سورہ البقرہ آیت 187)

"یعنی حلال کر دیا گیا تمہارے لئے شب ہائے ماہ صیام میں اپنی عورتوں سے مباشرت کرنا وہ تمہارے لئے اور تم ان کے لئے لباس ہو۔ اللہ نے جانا کہ تم لوگ اپنے نفسوں سے خیانت کرتے تھے پس اللہ نے تمہاری توبہ کو قبول کیا اور تم سے درگزر کیا لہذا اب عورتوں سے مباشرت کر سکتے ہو اور جو اللہ نے تمہارے لئے لکھ دیا ہے (یعنی اولاد) اس کو حاصل کرو اور کھاؤ پیو سفیدۂ سحر ظاہر ہونے تک پھر روزوں کو رات آنے تک پورا کرو۔

اس تمام عبارت سے ظاہر ہے کہ پہلا بیان قرآنی جو روزوں کے بارے میں تھا اور اس سے روزے شروع ہو چکے تھے اس بیان میں یہ کچھ نہیں بتایا گیا تھا کہ روزہ میں

کن کن باتوں سے پرہیز کرنا ہے یہاں تک کہ کھانے اور پینے کی اور مباشرت کی بندش کا بھی کوئی ذکر نہ تھا۔

ایسی تمام بندشوں کو رسولؐ ہی نے بتایا تھا اور اب بعد کی آیات کا یہ کہنا کہ اب روزوں کی راتوں میں مباشرت کو حلال قرار دے دیا گیا اس امر کی صاف دلیل ہے کہ اس سے پہلے روزوں کی راتوں میں بھی حرام تھا لیکن قرآن بھر میں کوئی آیت ایسی نہیں جس نے شب ہائے ماہ صیام میں مباشرت کو کسی وقت حرام قرار دیا ہو بلکہ آیات مابعد سے تو یہاں تک ظاہر ہوتا ہے کہ رات تو رات روزہ کے دن میں بھی مباشرت کی یا کھانے پینے کی بندش کا ذکر نہیں تھا اور روزہ کا عمل شروع ہو چکا تھا اور مسلمان روزہ رکھتے تھے مگر رات کی پابندی سے کچھ لوگ عہدہ برآنہ ہوتے تھے تب یہ آیات نازل ہوئیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ آیات قرآنیہ رسول اکرم کے دیئے ہوئے احکام شرعیہ کی تائید میں آتی تھیں ورنہ مبدءِ احکام شریعہ آیات نہ تھیں بلکہ ارشاداتِ رسول تھے۔ اور رسول کے دیئے ہوئے احکام کی جب اور جہاں منظور قدرت ہوتا تھا بعد میں آیات تائید کرتی تھیں لہذا یہ سمجھنا کہ پہلے احکام شریعت لیکر آیات کا نزول ہوتا تھا اور اس پر رسول اکرم ان احکام کو نافذ کرتے تھے یہ نظریہ بعض مخصوص مواقع پر تو صحیح ہو سکتا ہے جیسے آیۂ بلّغ ما انزل من ربك کے پہلے نازل ہونا اور اس کے بعد سرکار کا اعلان من کنت مولاہ فعلی مولاہ فرمانا لیکن عمومی احکامِ شریعت کے بارے میں بالکل غلط ہے۔

☆☆☆☆☆

عکس تحریر شہیدِ لاہور

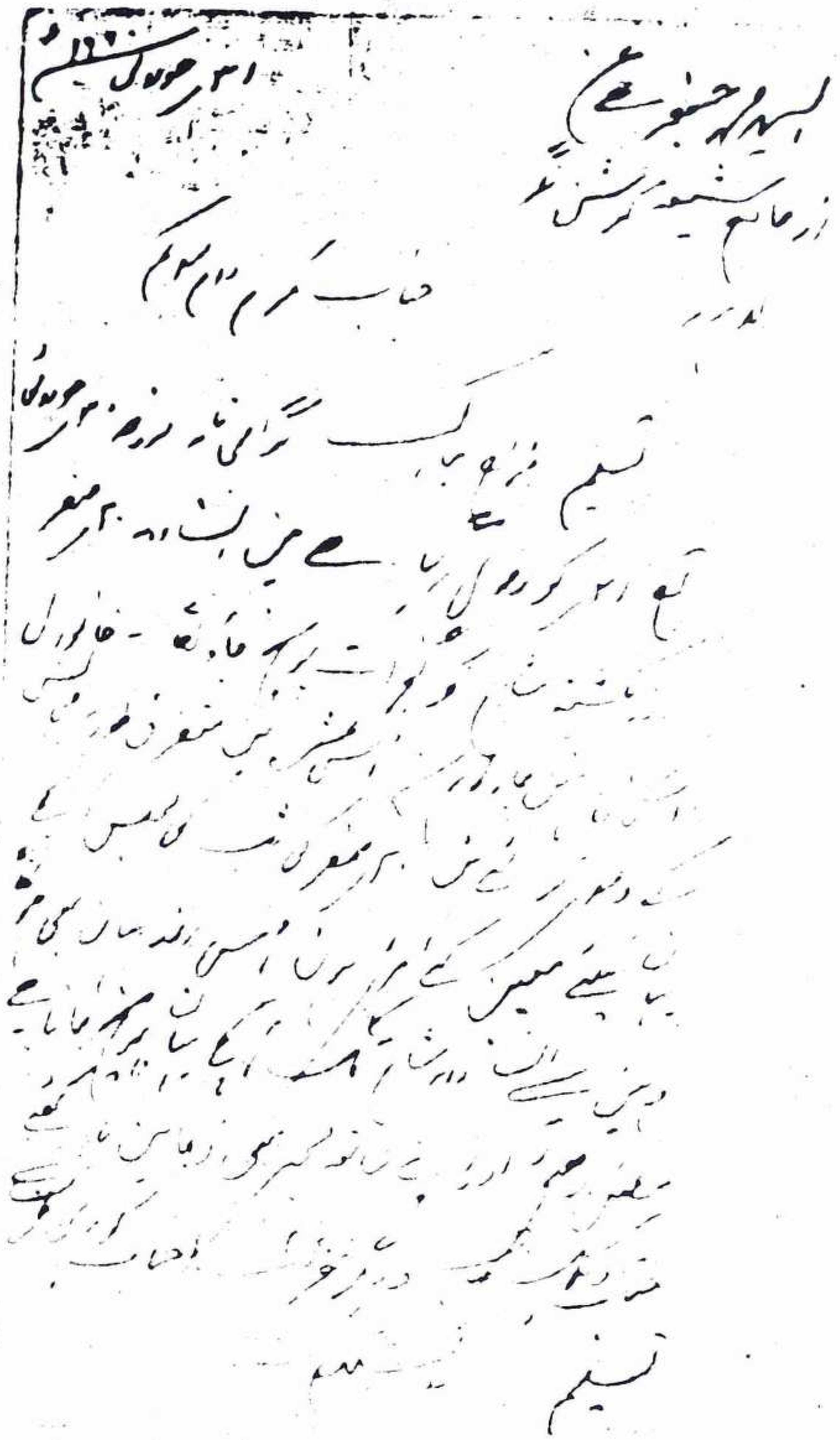

شہیدِ لاہور

وحید الحسن ہاشمی

اہلِ عرفاں کا پاسباں نہ رہا
ہائے اپنا وہ مہرباں نہ رہا

مضطرب ہے بہت زمینِ حروف
خوش بیانی کا آسماں نہ رہا

نخلِ الفاظ بے سہارا ہوئے
رہ گیا باغ باغباں نہ رہا

اُٹھ گیا جب سے ذاکرِ شبیر
خون رونے کا وہ سماں نہ رہا

جو ہے بنیادِ مذہبِ اسلام
اس ولایت کا ترجماں نہ رہا

جس سے قائم تھی رونقِ منبر
اس مقرر کا اب نشاں نہ رہا

کون اہلِ عزا کو دے تسکیں
رہ گئی دھوپ سائباں نہ رہا

فیض اٹھائے گا کس سے اے لاہور
ڈھونڈ اب تیرا میہماں نہ رہا

تک رہے ہیں اِدھر اُدھر راہی
رہ گئی گردِ کارواں نہ رہا

مجلسیں اب بھی ہو رہی ہیں مگر
مجلسوں کا وہ نکتہ داں نہ رہا

اتنا حاوی تھا فہمِ قرآں پر
اس سے معنی کوئی نہاں نہ رہا

اس کا کنبہ ہے اور اشک رواں
جب سے وہ نازِ خانداں نہ رہا

اس کے گھر سے پتہ بس اتنا ملا
تھا یہاں اور اب یہاں نہ رہا

یوں کیا اس نے عام آل کا حق
قلبِ مومن میں پھر گماں نہ رہا

اُٹھ گیا کون صاحبِ ایماں
جس سے ایماں تھا شادماں نہ رہا

یوں دیا خوں بہارِ ماتم کو
اب اسے خطرۂ خزاں نہ رہا

کون بتلائے رازِ غیبِ امام
عاشقِ مہدیِ زماں نہ رہا

جس کی باتوں سے پھول جھڑتے تھے
اب کوئی ایسا تر زباں نہ رہا

غم سے کیسے حیات ملتی ہے
مجلسِ غم کا رازداں نہ رہا

اب کھلا جعفر شہید تھا کون
جب ہمارے وہ درمیاں نہ رہا

بیاد مولانا سید محمد جعفر زیدی (شہید)

سید ظہور حیدر جارچوی

مرحبا اے غمِ شبیر میں رونے والو   مرحبا دامن و رومال بھگونے والو
مرحبا موتیوں کے ہار پرونے والو   مرحبا ظلم سے مغلوب نہ ہونے والو
بن کے مظلوم جو ظالم کو مٹاتے ہو تم
رتبہ انصار اولی الامر کا پاتے ہو تم

ساڑھے تیرہ سو برس ہو گئے روتے روتے   خشک ہوتے ہی نہیں اشک عزاء کے سوتے
دمبدم ظلم جو ہیں اہلِ ولا پر ہوتے   دل پہ بھرپور کبھی پڑتے ہیں نازک تھوتے
زخم پیہم سے ہے غربال تمہارا سینہ
پھر بھی مظلوم کی ہے ڈھال تمہارا سینہ

بے سبب ظلم ہمیشہ ہوئے دینداروں پر   شیر خواروں پہ ہوا رحم نہ بیماروں پر
کبھی دیواروں میں دم توڑے کبھی داروں پر   کبھی شعلوں میں رہا تن کبھی انگاروں پر
در بدر پردہ نشینوں کو پھرائیں ظالم
اور پھر خود کو مسلمان بتائیں ظالم

ظلم سے آج بھی ظالم نہیں باز آتے ہیں زخم تازہ دلِ غمگیں پہ لگا جاتے ہیں
اپنی سفائی کردار جو دہراتے ہیں بے گناہوں کو بھی خاطر میں نہیں لاتے ہیں
جو کسی کو نہ دے تکلیف اسے مارتے ہیں
تیشۂ جہل سرِ علم پہ دے مارتے ہیں

کیوں نہ ہو عالم مقتولِ جفا کا ماتم قتلِ عالم کا حقیقت میں ہے قتلِ عالم
بے خطا ہو گیا یکتائے زمانہ بے دم خاک میں چھپ گیا وہ خاک اڑی ہے پیہم
آ سکے کام نہ شیدائے محمد جعفر
یہی کہتے رہے بس ہائے محمد جعفر

نورِ معبود کی تنویر محمد جعفر تابع صاحب تطہیر محمد جعفر
عاشق شبر و شبیر محمد جعفر ذاکرِ زینب دلگیر محمد جعفر
کر کے قرآن کی تفسیر بڑی خوبی سے
پا گیا خلد کی جاگیر بڑی خوبی سے

وہ مبلغ وہ محدث وہ مفکر جعفر جس کی تقریر تھی جادو وہ مقرر جعفر
صاحب ذوق و ادب پرور و شاعر جعفر پا گیا قرب حبیب ابن مظاہر جعفر
چل دیا ذائقہ آیات کا چکھنے والا
اٹھ گیا موتیوں کا مول پرکھنے والا

نیک دل پاک زباں جامع اوصاف وجیہہ پیکر صبر و رضا۔ حلم و مروت کی شبیہ
منطق و فلسفہ داں۔ صاحب استاد فقیہہ جملے سب شستہ و شائستہ سب الفاظ بدیہہ

زیب منبر جو ہوا کرتا تھا مولائے علوم
باتوں باتوں میں بہا دیتا تھا دریائے علوم

اب کہاں پائیں گے شیدائے علوم ایسی ذات وقف تھی مدح ائمہ کے لیے جس کی حیات
پنجتنؑ خلد میں دیں گے اسے اونچے درجات ہاں ظہور اچھا کہا مصرع تاریخ وفات

جادۂ گلشنِ رضواں ہیں محمد جعفرؒ
۱۳ ۴۰۰ ۱۰۵۷ ۶۵ ۹۲ ۳۵۳ =۱۹۸۰

عاشق بزم شہیداں ہیں محمدؐ جعفر
۴۷۱ ۴۹ ۳۷۰ ۶۵ ۹۲ ۳۵۳ =۱۴۰۰

"نذرانۂ عقیدت"

ڈاکٹر مسعود رضا خاکی مرحوم

برگِ گل کی طرح تھے وہ اتقیاء کے سامنے
لیکن اک کوہِ گراں تھے ہر بلا کے سامنے

مولوی علامہ جعفرؔ سیدِ زیدی نسب
آئینہ کی طرح تھے اہلِ صفا کے سامنے

جتنی تھی پیرانہ سالی اتنا ہی علمی شباب
راہِ باب العلم تھی ذوقِ وِلا کے سامنے

مسجدِ جامع میں پوری ایک چوتھائی صدی
حق پہ وہ قائم رہے حرص و ہوا کے سامنے

تیسری ماہِ نومبر کو کیا قاتل نے وار
خون کے تھالے بہے اہلِ عزا کے سامنے

تین دن تک زندگی اور موت میں تھی کشمکش
سرنگوں تھا مردِ حق حکمِ قضا کے سامنے

چودھویں ہجری صدی کے آخری سورج کے ساتھ
آخری منزل پہ پہنچے ...... کربلا کے سامنے

آخری دم تک نہ چھوڑا مسلکِ آلِ نبیؐ
جان دیدی قائمِ آلِ عبا کے سامنے

عمر بھر کرتے رہے آلِ عبا کا تذکرہ
سرخرو ہو کر گئے جعفرؔ خدا کے سامنے

اُن کی تربت کا نشاں ہے کربلائے گامے شاہ
اب ہیں وہ موجود سبطِ مصطفیٰ کے سامنے

فاتحہ اور سورۂ اخلاص پڑھنے کا ثواب
پیش کیجیے اس شہیدِ باصفا کے سامنے

شہیدِ ملت، سلام تجھ پر

سیف زلفی

میرے خیالوں کی سرزمین میں
مگر گلستاں ...... لہو لہو ہے
کہ زلزلے بھی، لرز اُٹھے ہیں
میری محبت کی سرزمیں بھی لہو لہو ہے

گلاب یادوں کے کھل رہے ہیں
چلی ہے غم کی وہ تیز آندھی
ستوں زمیں کے بھی، ہل رہے ہیں
میری محبت کا آسمان بھی لہو لہو ہے

وہ ایک معصوم
پھول جیسا شگفتہ چہرہ
کہ جس کی ضَو میں علوم و حکمت کی دل لُبھاتی
حَسین پھواریں اُبل رہی تھیں
کہ جس کے ماتھے کی ہر کرن میں
حُسینِ ابنِ علیؑ کی چاہت کے غم میں ڈوبی ہوئی کراہیں مچل رہی تھیں
فرشتہ سیرت، فرشتہ صورت، فرشتہ خصلت، فرشتہ خُو تھا
حسینؑ کا وہ فقیہہ بیٹا
کسی یزیدِ کمینہ فطرت کی سازشوں سے لہو لہو تھا
وہ نیک فطرت، وہ نیک سیرت، وہ نیک صورت

وہ نیک کردار آدمی تھا
حدیث و قرآن کی معرفت کے
چمن کھلاتا تھا گفتگو میں
بڑا ہی فن کار آدمی تھا
کمال تھی اس کی وضع داری
ہزاروں انساں پہ تھا وہ بھاری
عظیم تھا وہ
خدائے اعظم کی عظمتوں کا...... حسیں مفسر
رسولِ اقدسؐ کی حکمتوں کا...... بڑا مقرر
علی اعلیٰؑ کی رفعتوں کے بیاں کا...... ماہر
حسینؑ جیسی بلند سرکار کی بلندی کا ایک شاعر
وہ مرتبے میں عظیم تر تھا
معاشرے میں عظیم تر تھا
مگر زمانہ ذلیل تر ہے
کمینہ فطرت ہے بے بصر ہے
یہی زمانہ یہی اندھیرا
جو روشنی کا لہو بہاتا ہے چپکے چپکے
جو دن کے سورج کو ڈسنے آتا ہے چپکے چپکے
یہی زمانہ...... یہی اندھیرا
کہیں یہ ابلیس بن گیا ہے
کہیں یہ نمرود سا خدا ہے جو بدعتوں میں پھنسا ہوا ہے
کہیں یہ شدادِ بے حیا ہے
کہیں یہ فرعونِ پُر خطا ہے

کہیں یہ بو جہل بے بصر ہے
کہیں یزید کمینہ فطرت
بنائے الحاد و کفر و شر ہے
یہی اندھیرا
کہ جس نے جعفر سے ماہ پیکر پہ اپنا تیشہ چلا دیا ہے
یہی اندھیرا
اُسی اندھیرے کا سلسلہ ہے
خلیلِ حقؑ کو لپکتے شعلوں میں جس نے ڈالا
جنابِ عیسیٰؑ کو جس نے سولی چڑھا دیا ہے
رسولِ حقؐ، محمدِ مصطفیٰؐ کو جس نے ستا ستا کر
وطن بھی اُن سے چھڑا دیا ہے
رسول زادی پہ رنج و غم کے پہاڑ ڈھائے
علیؑ کا سجدے میں خوں بہایا
حسنؑ کو زہرِ دغا پلایا
حسینؑ جیسے ستونِ دیں کے گلوئے اطہر پہ
کُند خنجر پھرا دیا ہے
رسولؐ جیسا رُخِ مطہر بنوکِ نیزہ چڑھا دیا ہے
اُسی زمانے اُسی اندھیرے کا سلسلہ ہے
عظیم جعفر کے سر پہ جس نے ستم کا تیشہ چلا دیا ہے
شریف فطرت، عظیم جعفر
وہ علم و عرفان و کیف و مستی کا ایک پیکر
اگرچہ تھی موت اس پہ طاری
دکھائی اس نے نہ بے قراری

غشی کے عالم میں ذکرِ باری
زباں پہ ہر دم درود جاری
میں پوچھتا ہوں کہ اس زمانے میں ایسے انساں کہاں ملیں گے
کہ جیسے............ جعفر
قرآں و حکمت کا ایک پیکر
لگا جو تیشہ ٗلہو میں ڈوبا
تمام بستی ہی تھر تھرائی
جو اس کے نزدیک بھی نہیں تھی
وہ آنکھ بھی غم سے ڈبڈبائی
خطیب مسجد ٗخطیب منبر
اَجل کے پہلو میں سو گیا ہے
وہ جب سے چپ چاپ ہو گیا ہے
ہمارے لفظ و بیاں میں لکنت سی آگئی ہے
ہمارے ذہنوں کی سرد ھلیوں میں
برف کی تہہ سی جم گئی ہے
ہمارے جذبے بلک رہے ہیں
خطیب اعظم ٗامام مسجد لہو لہو ہے
تمام مسجد میں غم کے بادل برس رہے ہیں
تمام مسجد فغاں میں...... بھیگی ہوئی ہے ایسے
کہ جیسے برسات کی جھڑی ہو
میں سوچتا ہوں
زمینِ کرب و بلا سے زلفی
دیارِ لاہور تک یہ بارش رہے گی کب تک

یزیدِ ملعون کی یہ بدعت چلے گی کب تک

زمانے والو!

خدارا سوچو۔ خدارا سمجھو

رسولِ برحق کی نسل پر یہ ستم کی آندھی چلے گی کب تک

زمانہ بیدار ہو چکا ہے

ضمیر تلوار ہو چکا ہے

شرافتوں کا لہو بہانا

یزیدِ بدبخت کی ہے بدعت

زمانے والو!

یزیدیت کی رذیل سازش کی کیچلی سے نکل کے دیکھو

حسینیت کے مہکتے پھولوں میں زندگی کا نکھار سونگھو

رسولِ اقدس کے راستے کی بہار سونگھو

خدا کی خوشبو میں زندگی کا قرار سونگھو

زمانے والو!

وہ ایک انسان......اِک مجاہد

وہ اِک سپاہی......وہ مردِ کامل

خطیبِ منبر............امامِ مسجد

طریقتِ مصطفیٰؐ کا...... عابد

علومِ حیدرؑ کا اک...... مبلغ

حسینؑ ابنِ علیؑ کے کردار کا مفسر

کہاں ملے گا

سیاہ شب کی مہیب ناگن نے

دن کا سورج نگل لیا ہے

تمہیں یہ سورج کہاں ملے گا

شہید ملت...... عظیم جعفر

شہید ملت تری جدائی ہے شاق دل پر
ہماری آنکھیں تیری محبت میں تر بتر ہیں
ہم عہد کرتے ہیں تیرے خوں سے
تیری دکھائی ہوئی ڈگر پر
تیرے اُجالوں کی رہ گزر پر
چلیں گے چلتے رہیں گے ہم سب
بعزم و ہمت بہ قلبِ مضطر
شہید ملت، عظیم جعفر...... خودی کے پیکر
درود تجھ پر...... سلام تجھ پر

عقیدت کے آنسو

بیادِ شہید مولانا محمد جعفر زیدی اعلی اللہ مقامہ

جعفر رضا ترمذی

جو بنا ہے ایک دن اس کو بگڑنا ہے ضرور
وصل کو صدیوں رہے ایک دن بچھڑنا ہے ضرور

فیصلہ قانونِ قدرت کا بدل سکتا نہیں
موت برحق ہے اور اس کا وقت ٹل سکتا نہیں

زندگی کہتے ہیں جس کو موت کا زندان ہے
حصر میں لفظ فنا کے زیست کا سامان ہے

خلد میں ہو یا فضا میں یا میان بحر و بر
موت کے دستِ قوی سے غیر ممکن ہے مفر

حادثاتی ناگہانی یا کہ طبعی موت ہو
سب کا مقصد ہے یہی ہر جینے والا فوت ہو

صاحبان صولت و جاہ و حشم مرتے رہے
سب شہان کشور و طبل و علم مرتے رہے

موت لازم تھی برائے انبیاء و مرسلینؑ
موت کی منزل سے گزرے رحمت اللعالمینؐ

جاتے جاتے زندگی کے راز سب سمجھا گئے
موت سے بچنے کا ایک نسخہ ہمیں بتلا گئے

وہ ہے الفت اور مودت عترت اطہار سے
لازمی وابستگی ہے حیدر کرار سے!

الفت آل نبیؐ میں مرنے والا ہے شہید
یہ حدیثِ پاک ہے سرکار کا قول سرید

عالمان دین حقہ بندگانِ بوتراب
عترت و قرآن کی تفسیر میں تھے لاجواب

غیبت حجت میں ہر عقدے کو حل کرتے رہے
دے کے ترغیب عمل خود بھی عمل کرتے رہے

مجلسوں میں لب پہ تھا جن کے بیان پنجتن
جس کی خوشبو سے مہک اٹھا مودت کا چمن

جن کی کوشش ہی سے ملت زندہ و پائندہ ہے
کائنات قلب میں مہر علی تابندہ ہے

آل احمدؑ کی ولا کے ترجماں تھے سب کے سب — اس زمیں پر چلتے پھرتے آسماں تھے سب کے سب
قبلہ جعفر کا بھی ہے ایسے ہی لوگوں میں شمار — ذی حشم، ذی منزلت، ذی قدر ذی عز و وقار
زینتِ منبر، فصاحت اور بلاغت کی زباں — ذاکر آل محمدؐ نازشِ علم البیاں
بے بدل عالم تھے جو قرآن کی تفسیر میں — اپنا ثانی آپ تھے تحریر میں تقریر میں
پاک بازو پاک طینت پاک بازو پاک بیں — قبلہ جعفر سا ہمارے شہر میں کوئی نہیں
مومنیں کا دوست مولا کے فقیروں کا حبیب — اب کہاں پائیں گے ایسا جامع مسجد کا خطیب
سوچتا ہوں قاتلانہ حملہ کیوں ان پر ہوا — کون یہ منصور تھا جو قاتل جعفر ہوا
زخمی ہو کر کر گئے ہیں قبلہ جعفر انتقال — وہ مسلسل دل میں ہیں ہر وقت ہے ان کا خیال
قتل ان کا ایک معمہ کیوں پئے اُمت بنا — ان سے کیسا بیر تھا جو قتل کی علت بنا
خدمت حجت میں کیجئے استغاثہ باادب — آپ ہی بتلائیں مولا قتل جعفر کا سبب
لٹ گیا کیوں مسجد و محراب و منبر کا سنگھار — آج جس کے سوگ میں ہے قوم ساری اشکبار

نذرانہ خلوص

راحت نقوی مرحوم

دار پر چڑھ کر پیام حق سناتے ہی رہے
اہل حق ہر دور میں معراج پاتے ہی رہے

آندھیاں اٹھتی رہیں طوفان آتے ہی رہے
یہ قدم لیکن سوئے منزل بڑھاتے ہی رہے

سرخرو ایسے سدا خوں میں نہاتے ہی رہے
سرفراز ایسے کہ سر نیزے اٹھاتے ہی رہے

اُٹھ کے طوفاں ان چراغوں کو بجھاتے ہی رہے
آندھیاں جتنی چلیں یہ لو بڑھاتے ہی رہے

اِن کے پائے استقامت میں نہ جنبش آ سکی
زلزلے رہ رہ کے بام و در ہلاتے ہی رہے

جان کے اموال کے اولاد کے اتلاف سے
قوت ایمان اِن کی آزماتے ہی رہے

زندگی کا مشغلہ اور روز کا معمول تھا
خون میں اہل وفا اپنے نہاتے ہی رہے

عزم کے ایسے دھنی تن سے جدا ہوتا رہا
سر درِ آل محمد پر جھکاتے ہی رہے

بے خطا سادات دیواروں میں چنوائے گئے
فاطمہ کے شیر کے جوہر دکھاتے ہی رہے

دور وہ آلِ امیہ اور بنی عباس کا
موت سے بڑھ چڑھ کے پنجہ آزماتے ہی رہے

زندگی بھر زیورِ طوق و رسن پہنا کئے
اپنے دم سے قسمت زنداں جگاتے ہی رہے

گدیوں سے راست گویوں کی زباں کھنچتی رہی
تذکرے آل محمد کے سناتے ہی رہے

غول صحرائی اُڑاتے ہی رہے گرد و غبار
آسماں پر چاند تارے جگمگاتے ہی رہے

لے کے طوفانوں سے ٹکر اپنی جاں پر کھیل کر
کشتی خیر العمل ساحل پہ لاتے ہی رہے

اِن کی ٹھوکر پر رہے ہر دور کے لات و منات
بت کدے ڈھاتے خدا کا گھر بناتے ہی رہے

خانماں بربادیاں اِن کا مقدر بن گئیں
بستیوں کو چھوڑ کر جنگل بساتے ہی رہے

حق پسند ایسے کہ باطل کے نہ آگے سر جھکے
اپنے قدموں پر سرِ باطل جھکاتے ہی رہے

آندھیاں الحاد کی اطراف سے اٹھتی رہیں
یہ چراغ الفت حیدر جلاتے ہی رہے

تھا حجاب غیب میں جس وقت میر کارواں
سخت تھی منزل مگر منزل کو پاتے ہی رہے

ان شہیدان وفا میں جعفر حق گو بھی تھے
شمع ایماں بزم عالم میں جلاتے ہی رہے

تھے بہارِ گلستانِ مدحتِ آل نبی
اپنی طرز فکر سے غنچے کھلاتے ہی رہے

کوئی کلمہ ذکر اہلبیت سے خالی نہ تھا
دم لبوں پر تھا مگر قرآں سناتے ہی رہے

مجلسوں میں محفلوں میں منبر و محراب پر
عترت و قرآن کا ڈنکا بجاتے ہی رہے

صاحبان علم و عرفاں سالکانِ راہ حق
بڑھ کے ان کی راہ میں آنکھیں بچھاتے ہی رہے

اپنے اوصاف حمیدہ اور بلند اخلاق سے
قلب میں گھر کرلیا دل میں سماتے ہی رہے

بجھ سکا باطل کی پھونکوں سے نہ یہ حق کا چراغ
آفتاب علم بن کر جگمگاتے ہی رہے

بے بصیرت ہو اگر کوئی تو کیا اس کا علاج
زندگی بھر جادۂ ایماں دکھاتے ہی رہے

دشمنوں سے خندہ پیشانی سے پیش آیا کیے
اپنے بدخواہوں کو سینے سے لگاتے ہی رہے

اُسوۂ آلِ محمد پر عمل پیرا رہے
قاتلوں کو آپ بھی شربت پلاتے ہی رہے

فتنہ پرور آئے دن فتنے اُٹھاتے ہی رہے
یہ بھی مانندِ حسن دامن بچاتے ہی رہے

خار صحرا بن کے دشمن دل کو برمایا کیے
یہ ہمیشہ صورت گل مسکراتے ہی رہے

تھی عداوت اِن کی جن کو تاہ بینوں کا شعار
یہ انہیں بڑھ کر کلیجہ سے لگاتے ہی رہے

کچھ منافق مومنیت کا لبادہ اوڑھ کر
سازشیں اپنی بروئے کار لاتے ہی رہے

شعلہ خرمن کو دامن سے ہوا دیتے رہے
گلستان باغی خزاں کی زد پہ لاتے ہی رہے

اِن کے مرنے سے جلے اغیار کے گھی کے چراغ
ہنس نہ سکتے تھے بظاہر مسکراتے ہی رہے

فاتحہ خوانی سے پڑ جاتا ہے پیشانی پہ بل
بعد مرنے کے بھی ان سے خار کھاتے ہی رہے

آگ لگتی ہے کوئی کہتا ہے گر اُن کو شہید
حبث باطن آج تک اپنا دکھاتے ہی رہے

آرزوئے راحت دنیا و عقبیٰ جن کو تھی
در پہ اہلبیت کے کھنچ کھنچ کے آتے ہی رہے

گزرتے ہوئے لمحوں کا نوحہ

سید طاہر ناصر علی

(شہید مسلک محمد و آلِ محمد سید محمد جعفر مرحوم کے لئے)

(1)

اس زمانے میں مسیحا ہمیں کیا دیتا ہے
دور کرتا نہیں غم اور بڑھا دیتا ہے
زخم قرطاسِ دلِ زار پہ تحریر ہیں وہ
پڑھنے والوں کو جریدہ یہ رلا دیتا ہے

(2)

وقت کی دھول میں یادوں کا خزانہ گم ہے
کیوں نہ ہوں نیند سے ہم لوگوں کی محروم آنکھیں
نیند کی بستی سے رخصت ہوئے اب لوگ سبھی
اب بھلا کس سے فسانہ کہیں مظلوم آنکھیں

(3)

اَب نہ آئیں گے کبھی لوٹ کے جانے والے
کیوں نہ گزرے ہوئے ماضی کے ہوں ایام عزیز
گھر تو رہنے کے لئے اور بھی مل جائیں گے
ہم کو لیکن ہیں اِسی گھر کے در و بام عزیز

(4)

ہم جو بکھرے ہیں کوئی کیسے سمیٹے آ کر
ہاتھ ہو جائیں نہ زخمی یہ سبھی کو ڈر ہے
اے صبا تو ہی بتا اب وہ کہاں ہیں چہرے
جن کی یادوں سے معطر یہ ابھی تک گھر ہے

(5)

اب کریں گی یہ گلہ علم و ادب کی روحیں
ہم سے چھوڑے ہوئے ورثے کی حفاظت نہ ہوئی
ہم ہیں وہ بے کس و مجبور یہاں پر جن کے
سامنے لٹ گیا گھر برپا قیامت نہ ہوئی

(6)

اِک ہرا پیڑ ستمگر نے ہے کاٹا صدِ حیف
جس کے اوپر تھے بہت سارے پرندوں کے مکاں
خامشی چھائی ہے اب اتنی کہ وہ ڈستی ہے
اُڑ گئے ہیں جو پرندے انہیں اب ڈھونڈیں کہاں

(7)

مجلسِ شاہ میں آنا کوئی آسان نہیں
سر کو آتے ہیں ہتھیلی پہ سجا کر ہم لوگ
تُو نے بتلایا شہادت ہے ہمارا وَرثہ
زندہ ہی رہتے ہیں دنیا سے بھی جا کر ہم لوگ

(8)

دے کے پیغام گئے سب کو یہ سید جعفؔر
زندگی ہی کی طرح موت سے ہم کرتے ہیں پیار
وقف ہیں سانسیں غمِ سبط پیمبر کے لئے
ہم پہ آتا ہے ہر اِک دور میں اِس غم سے نکھار

(9)

اپنی تخلیق کو لافانی بنانے کیلئے
تیغ کی دھار تلے جا کے یہ سوچا میں نے
یہ گزرتے ہوئے لمحوں کا ہے نوحہ طاہؔر
اپنے ہی گرم لہو سے جسے لکھا میں نے

مولانا محمد جعفر شہید

مظفر نقوی

عجیب شان کے مالک تھے مولوی جعفر
کہ جن سے بزم حسینی میں اک اُجالا تھا
رموز علم حقیقت سے مالا مال تھے وہ
بیاں میں اُن کے فصاحت نے سر نکالا تھا
خطابت ان کو ملی تھی عجب فصیح و بلیغ
ہر ایک زاویہ تقریر کا نرالا تھا
اصول زہد سے بھی آشنائی تھی اُن کی
بہ صدق دل رہِ تقویٰ پہ خود کو ڈالا تھا
وہ صاف گو تھے تصنع کا شائبہ ہی نہ تھا
انہوں نے خود کو بڑے عزم سے سنبھالا تھا
تھے اپنے وقت کے علم الکلام کے ماہر
ادب کے شہر میں بھی اُن کا بول بالا تھا
غم حسینؑ میں روتے تھے برسرِ منبر
انہوں نے لفظوں میں ذکرِ حسین پالا تھا
شفیق ایسے کہ انسانیت نواز کہوں
خدا نے راہ ہدایت پہ اُن کو ڈالا تھا
کہاں تلک میں مظفر کروں بیاں ان کا
جو مجلسوں میں ہمارا بڑا حوالہ تھا

شہیدِ راہِ خدا

سید اعجاز ثقلین بخاری

میں ۱۴۰۰ھ بمطابق ۱۹۸۱ء عید مباہلہ کے روز نماز ظہرین قبلہ موصوف کی امامت میں ادا کر کے علی پور چٹھہ چلا گیا۔ تیسرے روز میرا بھتیجا علی عمران صبح صبح یہ خبرِ بد لے کر پہنچا کہ علامہ سید محمد جعفر زیدی پر قاتلاہ حملہ ہوا ہے۔

قاتلانہ حملہ کسی بھی شخص پر ہو سکتا ہے لیکن علامہ سید محمد جعفر اور اُن پر قاتلانہ حملہ قلب و ذہن ماننے پر تیار نہیں تھے۔ میں نے بہ تکرار علی عمران سے پوچھا کہ میاں کیا کہہ رہے ہو؟ قاتلاہ حملہ کسی کو رنجش یا کسی کو دکھ دینے کا ردِ عمل ہو سکتا ہے۔ علامہ صاحب اور کسی کو ایذا دینا گویا اجتماع ضدین والی بات تھی پھر یہ واقعہ جو وہ بیان کر رہا تھا ۲ روز قبل کا تھا۔ علامہ صاحب جیسے بڑے آدمی کے ساتھ ہونا اور اخبارات' ریڈیو یا ٹی۔ وی پر نہ سنا جانا اور بھی حیران کُن بات تھی تاہم ایک بالغ نوجوان جو خصوصاً یہی اطلاع دینے مجھے ۶۰ میل کا سفر کر کے آیا تھا اسے یکسر قبول نہ کرنا بھی قرین عقل نہ تھا میں چند ہی لمحوں میں تیار ہو کر ممکن ترین عجلت سے لاہور پہنچا۔ اپنے بڑے بھائی صاحب سے گھر جا کر تفصیلات معلوم کیں۔ تفصیلات تھیں ہی کیا بس یہی کہ ایک ملعون انسان نے حضرت علامہ کا شام ۸ بجے کے قریب دروازہ کھٹکھٹایا۔ قبلہ نے گیٹ سے سر باہر نکالا۔ قاتل نے سر میں اینٹیں توڑنے والی تیسی کے کئی وار کئے دماغ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ قبلہ مولانا لہولہان ہو کر گر گئے اور قاتل خود تھانے میں پیش ہو گیا۔

میں سیدھا کوٹ لکھپت ہسپتال پہنچا وہاں پہنچ کر پتہ چلا کہ فی الحال کسی بھی شخص کو مولانا سے ملنے کی اجازت نہیں۔ صرف اتنا پتہ چلا کہ علامہ صاحب مسلسل بے ہوش ہیں اور ڈاکٹروں کا بورڈ انہیں ممکن ترین طبی سہولتیں دے رہا ہے۔ ۲ روز اسی پریشانی میں گزرے کہ اگلے دن علی الصبح خبر آئی کہ وہ عظیم مفکر اور لاہور کے آسمان علم کا آفتاب غروب ہو گیا ہے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

علامہ صاحب موصوف اپنی شرافت، کمال علم اور اتحاد بین المسلمین کی کوششوں کے لئے اہل لاہور میں عموماً اور ملت جعفریہ میں خصوصاً بہت ہی مقبول تھے۔

انہیں مرحوم لکھتے ہوئے کلیجہ منہ کو آتا ہے انہیں مقتول کہتے ہوئے الفاظ حلق میں رکتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں انہیں شہیدِ راہ خدا کہہ کر کچھ جذبات کو ڈھارس ہوتی ہے کیونکہ شہادت موصوف کے اجداد کا شرف خاص تھا۔

آپ کی نماز جنازہ کے لئے پہلے شیعہ جامع مسجد کرشن نگر کا فیصلہ ہوا لیکن اس مظلوم عالم دین کے سوگواروں کا ہجوم اتنا تھا کہ مسجد مذکور میں نمازِ جنازہ کی قطعی گنجائش نہیں تھی لہذا منتظمین نے کربلا گامے شاہ کے وسیع لان میں جہاں علامہ صاحب کی تدفین کے لئے نواب مظفر علی قزلباش نے خصوصی خدمات کے پیش نظر جگہ دے دی تھی نماز جنازہ کا فیصلہ ہوا۔ علامہ مرحوم کا جنازہ جو یقیناً لاہور کے تاریخی جلوس میں سے ایک تھا اور جس نے سرکار علامہ حافظ کفایت حسین مرحوم کے جنازے کی یاد تازہ کر دی تھی بلا مبالغہ ساٹھ ستر ہزار افراد سے کم نہ تھا بلکہ جب جلوس کربلا گامے شاہ کے قریب پہنچا تو محتاط اندازے کے مطابق کوئی ایک لاکھ سوگوار ہوں گے۔

دستور کے مطابق حضرت علامہ کو سپرد خاک کر دیا گیا لیکن علوم محمدؐ و آلؑ محمد کی جو روشنی آپ نے لاہور کی سرزمین پر پھیلائی وہ ہمیشہ اپنی تابناکیوں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ ایصال نور کرتی رہے گی۔

حضرت علامہ کی شخصیت کے بارے میں مجھ جیسا کم علم انسان کیا لکھ سکتا ہے محض کچھ عرصہ ان کے قریب رہنے اور ان کی ذاتِ والا صفات سے کسب فیض کی وجہ سے

چند سطور لکھنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔

حضرت علامہ کا آبائی وطن بجنور تھا۔ ۱۹۵۶ء میں لاہور مجالس پڑھنے کی غرض سے پہلی بار تشریف لائے۔ اہل لاہور نے جو علوم و فنون کی قدر دانی کے لئے مشہور ہیں ان سے یہیں رہ جانے کی گزارش کی۔ حضرت علامہ نے بکمال مہربانی قبول فرمالیا اور شیعہ جامع مسجد کرشن نگر کے امام جماعت بننا منظور فرمالیا اس وقت سے مولانا مسلسل جامع مسجد حیدر روڈ لاہور میں بطور پیش نماز فرائض سر انجام دیتے رہے۔

حضرت علامہ کے مرتبے کے علماء مساجد کی امامت عموماً نہیں فرماتے یہ ان کی عالی ظرفی اور عظمت تھی کہ انہوں نے یہ خدمات قبول فرمالیں اور تاحیات جاری رکھیں۔ عام طور پر کہا یہی جاتا ہے کہ انسان عناصر اربعہ آگ، مٹی، پانی اور ہوا سے تخلیق ہوا ہے لیکن حضرت علامہ کے بارے میں میرا یہ یقین ہے کہ ان کی تخلیق میں علم، نور، شرافت اور ذکاوت بھی شامل تھے۔ مولانا کی سیرت کے سلسلے میں الفاظ کی دنیا پر نظر کی جائے تو الفاظ منہ چھپائے ہوئے نظر آتے ہیں ان کی تصویر کشی کیلئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ دل کے غنی، زبان کے دھنی، دماغ رسا، نگاہ بلند، فہیم و فریس، ان تھک اور بڑھاپے میں بھی جوانوں کا سا حوصلہ رکھتے تھے۔

وہ کئی حیثیات کے جامع تھے ان میں ایک انسان بھی تھا جو گوشت پوست سے بنا تھا وہ عظیم دانشور تھے جنہیں قدرت نے خاص نگاہیں دی تھیں۔ حضرت علامہ کی شخصیت میں اتنی متانت تھی کہ ان سے بے تکلف ہونا مشکل تھا۔ تاہم ان سے بے تکلف ہو کر بھی کوئی اور ان کے ادب اور ان کے احترام سے سرک نہیں سکتا تھا وہ اپنی صلاحیتیں ہر ایک سے منوا سکتے تھے۔

خالق کائنات نے ان میں کیا کچھ نہیں بھر دیا تھا۔ واقعتاً وہ مجموعۂ کمالات تھے۔ وہ زخم خوردگان زمانہ کی پناہ گاہ تھے۔ دنیا کے شدائد کا مارا ہوا انسان جب ان سے ملتا یا ان کا وعظ سنتا تو اللہ کا شکر بجالا کر واپس لوٹتا۔

لوگ تو مرتے ہی رہتے ہیں بڑے بھی اور چھوٹے بھی انسان کو اس سے مفر

نہیں۔ یہ موت و حیات کی کارگاہ ہے۔ حضرت علامہ سے بڑے علماء بھی پیدا ہوں گے چھوٹے بھی اور برابر کے بھی کیونکہ یہ منشائے ایزدی ہے مگر علامہ سید محمد جعفر مرحوم کا پیدا ہونا ممکن نہیں۔ قدرت ایک دفعہ جو صورت اور سیرت بناتی ہے پھر ہو بہو اس کی تصویر نہیں بناتی اس کی یادیں ہی رہ جاتی ہیں۔

مولانا یقیناً اس دار فنا سے رخصت ہو چکے ہیں لیکن قوم نے اس انداز میں ان کا ماتم کیا جیسے انہیں انگاروں پر لٹا دیا گیا ہو۔

مجھ پر وہ کتنے مہربان تھے لکھوں تو شاید غلو ہو۔ میں کسی کا درجہ مجروح نہیں کرنا چاہتا تاہم ان کی شفقت اور انسان دوستی ان کے قدر شناسوں کو ہمیشہ یاد رہے گی۔

اللہ اللہ کیا دن تھے مسجد کی وہ مجلس جن میں کم لیکن خاص افراد ہوا کرتے تھے وہ خاص باتیں بیان فرمایا کرتے تھے جو اکثر بڑی بڑی مجالس میں نہیں کیا کرتے تھے۔ بعض اوقات عقیدت مند ان سے کوئی خاص بات کہلوانے کی سعی کرتے تو بڑی لطیف مسکراہٹ کے ساتھ نازک نکات بیان فرماتے۔

کسی شخص کے ذاتی عیوب پر بات نہ کرتے نہ سنتے اور نہ اس کی اجازت دیتے تھے۔ یہ ان کی عظمت کا خاص پہلو تھا۔ وہ عام انسانوں سے مختلف تھے اور سچی بات تو یہ ہے کہ اب وہ سانچہ ہی ٹوٹتا جا رہا ہے بلکہ ٹوٹ گیا ہے جس میں اس قسم کے انسان ڈھلا کرتے تھے۔

افسوس زمانے نے ان کی قدر نہ کی اور انہیں نہایت سفاکی سے شہید کر دیا گیا۔ اہل حق کو یہی تو گلہ ہے کہ مولانا کی قابلیت، فراست، قومی خدمات اور حق گوئی کا صلہ انہیں دردناک موت کی صورت میں دیا گیا۔

مولانا مرحوم کی پوتیاں انہیں ابا کہہ کر خطاب کرتی تھیں۔ مولانا کی بڑی پوتی نے اسباب شہادت پر تبصرہ کرتے ہوئے بتایا:

"ابا جان شہید کبھی اپنی موت سے غافل نہ تھے۔ صبح ہو یا شام ہمیشہ موت کا ذکر فرمایا کرتے تھے۔ حملے سے دو تین دن قبل ابا کے نام ایک لفافہ ڈاک سے موصول ہوا جسے کسی سرکاری ادارے کے ایک گمنام شخص نے ارسال کیا تھا۔ اس شخص کی تحریر سے اندازہ

ہوتا تھا کہ وہ زیادہ پڑھا لکھا نہ تھا۔ اس نے ابا مرحوم کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا تھا کہ چونکہ آپ آقائے خمینیؒ کی بہت زیادہ وکالت کرتے ہیں اور نماز کے آخر میں ایران کی ترویج و ترقی کی دعا کرتے ہیں اس لئے آپ کی جان کو خطرہ ہے آپ اپنی حفاظت کریں۔ میں آپ کا ہمدرد اور ہم عقیدہ ہوں اسی وجہ سے میں نے آپ کو باخبر کر دیا ہے۔ ابا مرحوم کے علاوہ ہماری والدہ اور بہنوں نے بھی خط پڑھا۔ ہم نے ابا مرحوم سے درخواست کی کہ آپ یہ خط مسجد کے اہم حضرات کو دکھا کر ان سے مشورہ کرلیں مگر انہوں نے بڑے تیقن سے فرمایا بیٹا موت کا ایک دن معین ہے اس لئے اس سے خوفزدہ ہونے کی چنداں ضرورت نہیں۔ یہ کہہ کر انہوں نے وہ خط تلف کر دیا۔"

قاتل گرفتار ہوا اس کے خلاف مقدمہ چلا اور آخر اسے پھانسی کی سزا سنائی گئی۔ کیمپ جیل لاہور میں اس پر پاگل پن کا دورہ پڑا پھر اسے فیصل آباد جیل میں منتقل کیا گیا اور وہیں اسے پھانسی دے دی گئی۔ قوم کے چند نادانوں نے سبب شہادت یہ بتایا کہ قاتل کرائے کا تھا اسے مفتی جعفر حسین مرحوم کو قتل کرنے کے لئے کہا گیا تھا اس نے غلطی سے مولانا محمد جعفر زیدی کو شہید کر دیا۔ یہ بات بالکل لغو اور غلط ہے۔ ابا مرحوم کو صرف اور صرف اس لئے شہید کیا گیا کہ وہ آقائے خمینیؒ کی دل و جان سے حمایت کرتے تھے اسی سبب سے ان کے اصل قاتل کا کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

دعا گو ہوں کہ رب کریم بتصدق امامؑ مظلوم علامہ مرحوم کے درجات بلند فرمائے اور ان کے پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین

☆☆☆☆☆

وہ مقالے جو زیور طبع سے آراستہ ہونے والے ہیں خالص علمی اور تحقیقی ہیں ان میں بعض ایسے اہم موضوعات زیر بحث آئے ہیں جن کی اہمیت گزرتے ہوئے زمانوں میں کبھی کم نہ ہوگی ان مقالوں میں مولانا نے غیر جانبدارانہ علمی و منطقی تحقیقات سے اسلامی حقائق و معارف کو جمع کر دیا ہے۔ حوالے مستند ہیں عبارت سلیس اور رواں ہے اور تفسیر و استدلال دل نشین ہے۔

(علامہ طالب جوہری)

ہمارے دینی معاشرے میں ایسے علما کی تعداد بہت کم ہے جو فن تحریر اور فن تقریر دونوں پر دسترس رکھتے ہوں مولانا سید محمد جعفر زیدی شہید علم بیان کے دونوں رخوں پر کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ میں نے ان کے تمام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مقالات بڑے غور سے پڑھے ہیں مجھے ان مقالات میں توازن اور استدلال کے ایسے بیش بہا نمونے ملے ہیں جن سے میری روح شاداب اور میری فکری سطح بلند ہوگئی ہے۔

(وحید الحسن ہاشمی)

مولانا سید محمد جعفر زیدی شہید جدید دور کے عالم باعمل تھے۔ ان کے مقالات میں دینی علوم سے ارتقاع کے ساتھ ساتھ ادبی چاشنی بھی پائی جاتی ہے تلوار کی کاٹ کا ادب میں بڑا شعر ہے مولانا کی تصنیفات میں اس کے نمونے جابجا نظر آتے ہیں۔ ان مقالات سے مولانا کی دینی اور ادبی حیثیت مکمل طور پر مستحکم نظر آتی ہے۔

(پروفیسر ڈاکٹر شبیہ الحسن)